تعمیرِ شخصیت

کامیاب زندگی کا فارمولا

مولانا وحید الدّین خاں

تعمیرِ شخصیت

کامیاب زندگی کا فارمولا

مولانا وحید الدین خاں

Tameer-e-Shakhsiyat
Kamyab Zindagi ka Formula
By Maulana Wahiduddin Khan

First published 2023
Reprint 2025

This book is copyright free

Centre for Peace and Spirituality International
1, Nizamuddin West Market, New Delhi-110013
e-mail: info@cpsglobal.org
www.cpsglobal.org

Goodword Books
A-21, Sector 4, Noida-201301
Delhi NCR, India
e-mail: info@goodwordbooks.com
www.goodwordbooks.com

Printed in India

فہرست

مقدمہ 4
تعمیر شخصیت 9
انسان کی شخصیت 10
شخصیت کی تعمیر 11
کنڈیشننگ کا عمل 12
زندگی کی تعمیر 13
تعمیر خویش کا طریقہ 14
مومن کا کنسرن 16
اپنی تعمیر آپ 17

شکر ایک عظیم عبادت

شکر کا عمل 22
شکر ایک اعلیٰ عبادت 23
انسان اور نظامِ ربوبیت 28
اسمائے حسنیٰ 29
شکر کی اہمیت 32
حکمت اور شکر 33
شکر: ایک قربانی کا عمل 34
شکر سے اضافہ 35
صبر و شکر 37
شکر کی تربیت 39
سب کچھ خدا کا عطیہ 40
شکر کے دو درجے 43
جذباتِ شکر کی بیداری 45
شکر کا احساس 46
اعلیٰ شکر 47
شکرِ قلیل، شکرِ کثیر 48
شکر سب سے
بڑی عبادت 50
محرّک شکر 52
انسان کا اعتراف 53
اضافۂ ایمان 54
شکر کا ایک آئٹم 55
شکر کی نفسیات میں جینا 57
شکر اور ناشکری 58
شکر یا سرکشی 59
شکر اور سنجیدگی 60
ناشکری نہیں 62
نفس کے خلاف جہاد 63
زوجین کے درمیان
کامل مطابقت 65
شکر اور تقویٰ 67
حمدِ دنیا، حمدِ آخرت 68
حمد خداوندی 70
حمد اور تضرع 71
حمد کلچر 74
حمد اور گنبد کے درمیان 75
بیسویں صدی 76
مذہبی صداقت کا سائنسی ظہور 78
ایک سادہ مثال 79
زندگی کی مددگار 81
پھول اور کانٹا 82
زحمت میں رحمت 86
غلطی کا اعتراف 87
رمضان کا مہینہ 92
انعام کی شکر گزاری 93
شکر گزاری، سرکشی 94
شکر کی حقیقت 95
نعمت کا اعتراف 96
نہ ملنے پر شکایت،
ملنے پر بے اعترافی 97
منعم کا اعتراف نہیں 99
شکر میں جینا سیکھیے 100
ایک تجربہ 101
شکر کا ایروژن 104
دور شکر 106
محرومی ایک نعمت 107
منفی تجربہ سے مثبت تجربہ 108
مالداری، غریبی 110

بے خبر انسان 111
بولنے کی صلاحیت 113
شکر، نہ کہ شکایت 114
فخر اور شکر 116
ڈس ایڈوانٹج میں ایڈوانٹج 117
کامیابی کا فارمولا 118
واقعاتِ شکر 120
ایک خط 146

صبر دین کا خلاصہ

صبر کیا ہے 150
صبر کا فلسفہ 151
سنتِ صبر 154
صبر کی تعلیم 155
صبر 156
صبر خدا کے لیے 158
صبر دین کا خلاصہ 159
صبر بے عملی نہیں 160
قرآنی طریقہ 161
حکمت اور صبر 163
صبر منسوخ نہیں 164
نتیجہ خیز عمل 166
اسٹیٹس کو اِزم 167
صبر کیوں 168
صبر کی اہمیت 169
حکمتِ صبر 170
با اصول زندگی 171
ڈی لنکنگ — ایک سنتِ رسول 174
صبر کی نصیحت 176
سیلف ڈسپلن 177
ایڈجسٹمنٹ کا فارمولا 178
صبر کا مہینہ 179
تواصی بالحق، تواصی بالصبر 180
ڈسپلن کی اہمیت 187
صبر و اعراض کا اصول 188
صبر ہی ایک عظیم عمل 190
صبر پر بے حساب اجر 191
صبر کا فائدہ 192
دانش مندانہ طریقہ 193
صبر کی عظمت 194
اجتماعی صبر 196
صبر پسپائی نہیں 198
اذیت پر صبر 199
صبر کا وقت عبادت کا وقت ہے 200
دعوت اور صبر 201
صبر ذہنی ارتقاء کا ذریعہ 203
صبر و تقویٰ 204
صبر، عجلت 205
صبر ایک عظیم نیکی 206
صبر بہادری ہے 207
صبر کی جیت 208
غیر صابرانہ عمل 209
حقیقت پسندی 211
نظامِ فطرت 212
صبر کا انعام 213
ردعمل نہیں 214
غلط منصوبہ بندی 216
صبر کا بدلہ 217
جنت صبر کے اُس پار ہے 218
صبر: نفسیاتی قربانی 219
قدرت کا پیغام 221
داعیانہ صبر 222
صبر کا سفر 223
آخرت کا راستہ صبر کا راستہ ہے 224
صبر، بے صبری 228
صبر اور دعوت 230
صبر ایک مثبت عمل 231
روزہ صبر کی تربیت 232
صبر کی عبادت 235
صبر اور اعراض 236
مسئلہ کا حل 237

صبر و تقویٰ 238
صبر و توکل 239
عافیت کی زندگی 240
قرآن کی ہدایت 242
صبر و شکر 244
رات اور دن 246
صبر، محاسبہ، توسم 247
صبر کرنے والے 248
قدرت کے باوجود 249
صبر، صبر، صبر 250
صبر و برداشت 252
صبر کی زمین پر 253
صبر بی سپیریر سولیوشن 254
صبر کی طاقت 256
صبر اسلامی تاریخ میں 259
دعوت کا دور 260
خلافت کا دور 261
ملوکیت کا دور 263
اشتعال کے بغیر 264
خاموش تدبیر 266
صبر کا کرشمہ 267
ایک کے بعد دوسرا 268
صبر کا ہتھیار 270
صبر کا طریقہ 272
صبر کب تک 277
صبر ایک پیغمبرانہ عمل 278
صبر اور امن 280
بے صبری کا نتیجہ 282
صبر کا پھل 283
صبر کی ضرورت 285
مسائل پر صبر 286
بے صبری نہیں 287
خدا جلدی نہیں چاہتا 288
ایک خط 291
سوال و جواب 293

اعراض اور رواداری

اعراض 316
اعراض کی حکمت 317
دانش مندانہ طریقہ 318
پریکٹکل وزڈم 319
غلط فہمی 321
رواداری 323
مذہبی رواداری،
تالیفِ قلب 324
ٹالرنس، فطرت کا اصول 325
رواداری کا اصول 329
جاہلوں سے اعراض 333
رُجز سے اعراض 334
اعراض کا طریقہ 336
نفرت، دہشت گردی 337
فساد اور اسبابِ فساد 338
فخر اور نفرت 339
مسلمان عالمی محاصرہ میں 340
شکایت کو نفرت
تک پہنچانا 341
نصفِ ثانی کی سیاست 343
مقامِ نزاع سے پیچھے ہٹنا 344
ردِّ عمل اسلام میں نہیں 345
نفرت کا بم 346
مبنی بر نظام یا مبنی بر نفرت 347
اختلاف کے وقت 348
نفرت کی تیزاب 349
ہجر جمیل 351
غیر فطری ردعمل 360
انسان کی رعایت 362
اشتعال نہیں 364
نفرت نہیں محبت 366
اسلامی رواداری 367
توسع اور رواداری 368
دو ملک ایک واقعہ 368
حکمتِ اعراض 370
ایک واقعہ 372
اس میں سبق ہے 373
تدبیر، نہ کہ اشتعال 377

اعراض کا فائدہ 378
ایم فیکٹر، کیو فیکٹر 379
نفرت کلچر 380
اختلاف کو حل کرنے
کی تدبیر 381
کوئی دشمن نہیں 387
انتہا پسندی نہیں 388
محبت کے بجائے نفرت 389
دشمن میں دوست 391
صبر واعراض کا کرشمہ 392
سماجی ہم آہنگی 396

مثبت سوچ، منفی سوچ

مثبت سوچ 402
مثبت سوچ کی ضرورت 402
منفی سوچ کا نقصان 403
مثبت سوچ، منفی سوچ 404
صحیح طرزِ فکر 406
ہر چیز پرچۂ امتحان 407
مثبت طریقہ 408
مصیبت کا مثبت پہلو 409
مثبت روش کا نتیجہ 411
ری ایکشن کا طریقہ 412
مثبت تجربہ 413
منفی سوچ کا مزاج 414
رُجز کو چھوڑو 415
چُپ کی طاقت 416
بگ برڈ تھنکنگ 417
منفی جذبات کی قربانی 418
مثبت ذہن 419
شخصیت کا ارتقا 420
تعمیر شخصیت 421
ہلاکت کیا ہے 425
تاریخ سے سبق 426
صحیح نقطۂ آغاز 427
تجربہ سے سبق سیکھیے 428
مثبت فکر 429
مثبت جواب 430
سفر کا آغاز 431
بحران کا مثبت پہلو 432
ماضی میں جینا 433
بھولنا ایک مثبت عمل 434
اختلافِ رائے 435
فطرت کا قانون 438
منفی سوچ نہیں 439
منفی تجربہ 440
غصہ کا نقصان 441
غصہ کا مثبت پہلو 442
اینگر انرجی 443
مشتعل نہ ہونے کا کرشمہ 444
نزاع کا معاملہ 446
اپنی سوچ درست کیجیے 448
ایک واقعہ 449
ایک لفظ کا فرق 450
منفی پہلو میں مثبت پہلو 451
مثبت اثر 452
'انا' کی دیوار 453
منفی تأثر، مثبت تأثر 454
احتجاج کوئی پالیسی نہیں 455
مثبت لٹریچر کی ضرورت 456
دشمن سے سیکھنا 457
منفی سوچ اسلام میں نہیں 459
بحران کا مسئلہ 468
شخصیت سازی کا عمل 469
مثبت شخصیت،
منفی شخصیت 474
سوال وجواب 476

خاتمہ

تعمیر شخصیت کا راز 494
کامیابی کے دس اصول 495

مقدمہ

رابرٹ گرین (Robert Greene) ایک امریکن رائٹر ہے۔ اس کی پیدائش 1959ء میں ہوئی۔ وہ دنیا کی پانچ بیسٹ سیلنگ (best selling) کتابوں کا مصنف ہے۔ ایک مختصر ویڈیو میں اس نے اپنی کتاب The Laws of Human Nature کا تعارف کراتے ہوئے اعلیٰ شخصیت کی پہچان یہ بتائی ہے:

I want you to focus not on people's charming exterior, on their funny words, on their wit, on their charisma. Instead, focus on that deep inner quality, that core, character, because that's who they really are. Your character is creating what happens to you in life. There's the famous quote of the ancient philosopher Heraclitus "Character is Fate".

لوگوں کی ظاہری جاذبیت، ان کی لطیفہ گوئی، ان کی ظرافت، ان کے کرشماتی انداز پر آپ توجہ نہ دیں۔ اس کے بجائے، آپ یہ دیکھیں کہ وہ انسان اندرونی خوبی اور اخلاقی کردار کے اعتبار سے کیسا ہے۔ کیوں کہ یہی ایک انسان کے اچھے یا برے ہونے کی حقیقی اور اصل بنیاد ہے۔ آپ جو کچھ اچھا یا برا عمل کر رہے ہیں، یہ آپ کے کردار کا نتیجہ ہے۔ اس معاملے میں قدیم یونانی فلسفی ہیرکلیٹس کا ایک قول کافی مشہور ہے — کیریکٹر قسمت ہے۔

یعنی نتیجہ کے اعتبار سے آپ کا انجام کیا ہوگا، اس کا دار و مدار آپ کے ذاتی کردار پر ہے۔ حقیقی انسان وہ نہیں ہے، جو ظاہر میں اچھا ہو، مگر باطن میں برا۔ حقیقی انسان وہ ہے، جس کا باطن اس کے ظاہر سے بہتر ہو۔ وہ ڈبل اسٹینڈرڈ کا حامل انسان نہ ہو۔ کیوں کہ ڈبل اسٹینڈرڈ ہی کا مذہبی نام منافقت ہے۔ اس دنیا میں منافقت سے بری کوئی اور چیز نہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عمر کو یہ دعا سکھائی تھی: اللَّهُمَّ اجْعَلْ سَرِيرَتِي خَيْرًا مِنْ عَلَانِيَتِي، وَاجْعَلْ عَلَانِيَتِي صَالِحَةً (سنن الترمذی، حدیث نمبر 3586)۔ یعنی اے اللہ، میرے باطن کو میرے ظاہر سے بہتر کردے، اور میرے ظاہر کو بھی اچھا بنا۔

زیر نظر کتاب، جیسا کہ نام سے واضح ہے، مولانا وحید الدین خاں صاحب کے ان مضامین کا مجموعہ ہے جس میں انسانی شخصیت کی تعمیر کے رہنما اصول بتائے گئے ہیں۔

ڈاکٹر فریدہ خانم، نئی دہلی | 11 مارچ 2023

تعمیر شخصیت

انسان کی شخصیت

انسان فطرت کا ایک اعلیٰ عطیہ ہے۔ انسان کے اندر ہر قسم کی اعلیٰ صلاحیت فطری طور پر موجود ہوتی ہے۔ لیکن انسان کے اندر جو صلاحیت ہے، وہ پوٹنشل (potential) کے روپ میں ہے۔ اس پوٹنشل کو ایکچول (actual) بنانا، انسان کا اپنا کام ہے۔ انسان کی اس پیدائشی نوعیت کو سمجھنے کے لیے قرآن کی ان دو آیتوں کا مطالعہ کیجیے: أَلَمْ تَرَ كَيْفَ ضَرَبَ اللهُ مَثَلًا كَلِمَةً طَيِّبَةً كَشَجَرَةٍ طَيِّبَةٍ أَصْلُهَا ثَابِتٌ وَفَرْعُهَا فِي السَّمَاءِ ۔ تُؤْتِي أُكُلَهَا كُلَّ حِينٍ بِإِذْنِ رَبِّهَا وَيَضْرِبُ اللهُ الْأَمْثَالَ لِلنَّاسِ لَعَلَّهُمْ يَتَذَكَّرُونَ (14:24-25)۔ یعنی، کیا تم نے نہیں دیکھا، کس طرح مثال بیان فرمائی اللہ نے کلمۂ طیبہ کی۔ وہ ایک پاکیزہ درخت کی مانند ہے، جس کی جڑ زمین میں جمی ہوئی ہے اور جس کی شاخیں آسمان تک پہنچی ہوئی ہیں۔ وہ ہر وقت اپنا پھل دیتا ہے اپنے رب کے حکم سے، اور اللہ لوگوں کے لیے مثال بیان کرتا ہے تاکہ وہ نصیحت حاصل کریں۔

قرآن کی یہ آیت تمثیل کی زبان میں بتا رہی ہے کہ انسانی شخصیت کی تعمیر کا اصول کیا ہے۔ اس آیت میں شجرۂ طیبہ سے مراد صحت مند پودا (healthy plant) ہے۔ صحت مند پودے کو جب زمین میں نصب کر دیا جائے تو وہ فوراً زمین اور فضا سے اپنی غذا لینا شروع کر دیتا ہے۔ یہ سلسلہ جاری رہتا ہے، یہاں تک کہ وہ ایک پورا درخت بن جاتا ہے۔ یہی معاملہ ایک انسانی وجود کا ہے۔ انسان جب پیدا ہوتا ہے، وہ ایک بالقوۃ انسان کی مانند ہوتا ہے۔ پھر وہ اپنے ماحول سے ہر قسم کی غذا لینا شروع کرتا ہے۔ یہاں تک کہ وہ بڑھتے بڑھتے ایک پورا انسان بن جاتا ہے۔ اس کے اندر وہ تمام علمی اور اخلاقی صفات پیدا ہو جاتی ہیں، جو اس کو اس زمین پر ایک صحت مند زندگی گزارنے کے لیے درکار ہیں۔ انسان کو چاہیے کہ وہ زمین پر موجود تمام امکانات کو اپنے لیے استعمال کرے، اور اپنے آپ کو اللہ کا مطلوب انسان بنائے۔

وہ یہ ہے کہ عملی زندگی میں ہر موقعے پر وہ مطلوب رسپانس (required response) دے، جس کے لیے اس کے خالق نے اس کو موجودہ دنیا میں بھیجا ہے۔

شخصیت کی تعمیر

خدا، انسان کا خالق ہے۔ ذہنی اور جسمانی اعتبار سے انسان جو کچھ ہے، وہ تمام تر خدائی تخلیق کا نتیجہ ہے۔ لیکن موجودہ دنیا میں انسان کی جو شخصیت بنتی ہے، وہ انسان کی خود اپنی تعمیر کا نتیجہ ہوتی ہے۔ اِس اعتبار سے یہ کہنا صحیح ہوگا کہ انسان پچاس فی صد، خدا کی تخلیق ہے اور پچاس فی صد خود اپنی تعمیر:

> Every human being is fifty percent God-made, and fifty percent self-made.

انسان فطری طور پر ہر قسم کی صلاحیت لے کر پیدا ہوتا ہے، لیکن یہ صلاحیتیں اس کے اندر بالقوہ (potential) طور پر ہوتی ہیں۔ اِس بالقوہ کو بالفعل (actual) بنانا، انسان کا اپنا کام ہے۔ یہ ایک عظیم موقع ہے جو ہر عورت اور ہر مرد کو ملا ہوا ہے۔ یہ تمام تر انسان کا اپنا کام ہے کہ وہ اپنے بالقوہ کو بالفعل بنائے، یا اس کے بغیر ہی ایک ناکام انسان کے طور پر اس دنیا سے چلا جائے۔

بالقوہ کو بالفعل بنانا ایک مسلسل عمل ہے جو تا حیات جاری رہتا ہے۔ اِس عمل کا آغاز سنجیدہ غور وفکر سے ہوتا ہے۔ سنجیدہ غور وفکر کے ذریعے آدمی سچائی کی دریافت تک پہنچتا ہے۔ اس کے بعد آدمی کو ہر دن اپنا محاسبہ (introspection) کرنا پڑتا ہے۔ اس کو یہ کرنا پڑتا ہے کہ وہ اپنی کمیوں اور کوتاہیوں کو تلاش کرے اور ان کی اصلاح کرکے اپنے اندر ذہنی اور روحانی ارتقا کے عمل کو جاری رکھے۔

شخصیت کی تعمیر (personality building) کا یہ عمل آدمی خود کرتا ہے، لیکن اِس

عمل کو درست طور پر جاری رکھنے کے لیے ضرورت ہوتی ہے کہ اُس کو مسلسل طور پر خدا کی مدد حاصل رہے۔ اِس مدد کے حصول کا ذریعہ دعا ہے۔ دعا میں جینے والا آدمی ہی اپنی شخصیت کی تعمیر میں کامیاب ہوتا ہے۔ دعا کے بغیر یہ کام اپنی تکمیل تک نہیں پہنچ سکتا۔ انسان جب پیدا ہوتا ہے تو وہ خام لوہا کی مانند ہوتا ہے۔ ہر آدمی کو یہ کرنا ہے کہ وہ اپنے خام لوہے کو ترقی دے کر اسٹیل بنائے۔ یہ کام ہر ایک کو کرنا ہے۔ اِس میں کسی بھی عورت یا مرد کا کوئی استثنا نہیں۔

کنڈیشننگ کا عمل

انسان کی شخصیت کی تعمیر کے بارے میں ایک روایت حدیث کی مختلف کتابوں میں آئی ہے، ایک روایت کے الفاظ یہ ہیں: كُلُّ النَّاسِ يَغْدُو فَبَايِعٌ نَفْسَهُ فَمُعْتِقُهَا أَوْ مُوبِقُهَا (صحیح مسلم، حدیث نمبر 223)۔ یعنی، ہر انسان دن کا آغاز کرتا ہے، پس وہ اپنا سودا کرتا ہے، پھر وہ اپنے آپ کو آزاد کرتا ہے یا اپنے آپ کو تباہ کر لیتا ہے۔

اس حدیث میں تمثیل کی زبان میں انسانی زندگی کی حقیقت کو بیان کیا گیا ہے۔خدا کے منصوبۂ تخلیق کے مطابق، موجودہ دنیا ہر ایک کے لیے امتحان کی جگہ ہے۔ ہر روز جب صبح ہوتی ہے تو وہ انسان کے لیے بیک وقت دو مختلف قسم کے امکانات کا دروازہ کھولتی ہے۔ وہ یا تو خدا کے منصوبے کے مطابق زندگی گزار کر اپنے آپ کو کامیابی کی طرف لے جائے، یا خدائی منصوبے کی خلاف ورزی کر کے اپنے آپ کو تباہی کے گڑھے میں گرا لے۔

ہر آدمی جو اس دنیا میں پیدا ہوتا ہے، وہ ایک ماحول کے اندر پیدا ہوتا ہے۔ وہ اپنے صبح و شام اس ماحول کے اندر گزارتا ہے، وہ شعوری یا غیر شعوری طور پر اپنے ماحول کا اثر قبول کرتا رہتا ہے۔اس کو آج کی زبان میں کنڈیشننگ کا عمل (process of conditioning)

کہا جاتا ہے۔ یعنی اپنے خارجی حالات سے اثر قبول کرنا۔ اس طرح ہر عورت اور ہر مرد کی شخصیت کی تعمیر ایک خارجی ماحول کے زیرِ اثر ہوتی ہے۔ اس عمل کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ہر شخص اپنی اصل فطرت پر باقی رہنے کے بجائے اپنے ماحول کی پیداوار (product) بن جاتا ہے۔

ایسی حالت میں انسان کے لیے اپنے بارے میں دو قسم کے اختیار (options) ہوتے ہیں۔ ایک یہ ہے کہ وہ اپنے آپ کو اپنے ماحول کے حوالے کردے۔ اس کے قریبی حالات اس کو جیسا بنائیں ویسا ہی وہ بنتا چلا جائے۔ اس کے قریبی حالات اگر اس کے اندر منفی شخصیت کی تعمیر کررہے ہوں تو وہ اس سے متاثر ہوتا رہے، یہاں تک کہ وہ ایک منفی ذہن والا انسان بن جائے۔ یہ وہ انسان ہے جس نے اپنے آپ کو ہلاک کرلیا۔ اس کے برعکس، دوسرا انسان وہ ہے جو اپنے ذہن کو بیدار کرے، وہ اپنے اندر سوچنے کی صلاحیت پیدا کرے، وہ ذہنی اعتبار سے اپنے آپ کو اس قابل بنائے کہ وہ چیزوں کا آزادانہ تجزیہ کرسکے، وہ غیر متاثر انداز میں چیزوں کی قدر و قیمت متعین کرنا (evaluation) سیکھ لے۔ ایسا آدمی تاثر پذیری سے بچ جائے گا۔ وہ اپنے اندر ایک آزاد شخصیت بنانے میں کامیاب ہوجائے گا۔

زندگی کی تعمیر

ہر انسان جو اس دنیا میں آتا ہے، وہ خالق کی طرف سے ایک منفرد صلاحیت (unique quality) لے کر آتا ہے۔ اس کے ساتھ ہر انسان ایک غیر معمولی دماغ (mind) لے کر آتا ہے۔ ہر انسان کے لیے یہ ممکن ہوتا ہے کہ وہ اپنے دماغ کو استعمال کرکے اپنی صلاحیت کو دریافت کرے، اور دانش مندانہ پلاننگ کے تحت اپنے پوٹنشل (potential) کو واقعہ (actual) بنائے۔ ہر آدمی کامیابی کے ساتھ اس کو انجام دے سکتا ہے، بشرطیکہ وہ حقیقت پسندانہ انداز میں اپنے ذہن کو استعمال کرے۔

اس معاملہ کا دوسرا پہلو وہ ہے جس کو سپورٹنگ سسٹم کہا جاسکتا ہے۔ فطرت کے مطابق یہ ہونا چاہیے کہ سماج کا نظام مکمل طور پر میرٹ کی بنیاد پر قائم کیا جائے۔ مبنی بر میرٹ سماج (merit based society) کے اندر فطری طور پر ایک موافق عمل قائم ہو جاتا ہے، جس کو آٹو میٹک چینلائزیشن (automatic channelization) کہا جاسکتا ہے۔ اس عمل (process) کے دوران اپنے آپ ایسا ہوتا ہے کہ ہر آدمی آخر کار اپنی اس استثنائی خصوصیت کو دریافت کرلیتا ہے، جس کے لیے وہ پیدا کیا گیا تھا۔

اصل یہ ہے کہ ہر آدمی کے اندر اس بات کا طاقت ور محرک پایا جاتا ہے کہ وہ اپنے سماج میں امتیازی درجہ حاصل کرے۔ یہ داخلی اسپرٹ اپنا کام کرتی ہے۔ آدمی نے اگر غلط چوائس (choice) لے لیا ہے تو وہ اس کو آمادہ کرتی ہے کہ وہ اپنے چوائس کو بدلے، اور اس چوائس کو لے جس میں وہ بہتر (excel) کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ اس داخلی اسپرٹ کے ساتھ سماج کے اندر مبنی بر میرٹ نظام شامل ہو جائے تو اس کے بعد لازمی طور پر ایسا ہوتا ہے کہ ہر آدمی اپنے اس خصوصی رول کو پالیتا ہے، جس کے لیے وہ پیدا کیا گیا تھا۔ یہی زندگی کی تعمیر کا فطری طریقہ ہے۔ کسی خود ساختہ طریقے سے اس مقصد کو حاصل نہیں کیا جاسکتا، خواہ بظاہر وہ کتنا ہی زیادہ خوش نما معلوم ہوتا ہو۔

تعمیر خویش کا طریقہ

قرآن کی سورہ آل عمران میں ایک اصول اِن الفاظ میں بیان کیا گیا ہے: وَإِنْ تَصْبِرُوا وَتَتَّقُوا لَا يَضُرُّكُمْ كَيْدُهُمْ شَيْئًا (3:120)۔ یعنی، اگر تم صبر کرو اور تقویٰ کی روش اختیار کرو تو دوسروں کی سازش تم کو کچھ بھی نقصان نہ پہنچائے گی۔

قرآن کی یہ آیت فطرت کے ایک قانون کو بتاتی ہے۔ اِس سے معلوم ہوتا ہے کہ اِس

دنیا میں سازش کا ہونا، اصل مسئلہ نہیں ہے، بلکہ اصل مسئلہ صبر اور تقویٰ کا نہ ہونا ہے۔ جن لوگوں کے اندر صبر اور تقویٰ کی صفت موجود ہو، اُن کے لیے دوسروں کی سازش اور دشمنی غیر موثر ہو کر رہ جائے گی، وہ اُن کو کچھ بھی نقصان نہ پہنچا سکے گی۔

صبر کوئی انفعالی صفت نہیں۔ صبر کا مطلب وہ اعلیٰ انسانی صفت ہے جس کو سیلف کنٹرول (self-control) کہا جاتا ہے۔ یعنی دوسروں کے پیدا کردہ مسائل سے اوپر اٹھ کر سوچنا اور خود اپنی مثبت سوچ کے تحت اپنی زندگی کا منصوبہ بنانا۔ تقویٰ کا مطلب یہ ہے کہ آدمی کی سوچ خود رُخی سوچ (self-oriented thinking) نہ ہو، بلکہ وہ خدا رُخی سوچ (God-oriented thinking) ہو۔ سماج کے اندر اُس کا سلوک خدا کی تعلیمات کے مطابق ہو، نہ کہ اپنی خواہشات اور جذبات کے مطابق۔ جو لوگ صبر اور تقویٰ کی اِس روش کو اختیار کریں، اُن کے خلاف دوسروں کی منفی کارروائیاں اپنے آپ بے اثر ہو جائیں گی۔ کیوں کہ اِس دنیا کا قانون یہ ہے کہ کوئی بھی غیر مطلوب واقعہ ہمیشہ دوطرفہ کارروائی کے نتیجے میں پیش آتا ہے، نہ کہ صرف یک طرفہ کارروائی کے نتیجے میں۔

یہ فطرت کا ایک قانون ہے کہ کوئی شخص یا گروہ معتدل ذہن کے تحت کسی کے خلاف کوئی مخالفانہ کارروائی نہیں کرتا۔ ایک شخص یا گروہ کسی دوسرے کے خلاف کوئی منفی کارروائی صرف اُس وقت کرتا ہے، جب کہ اُس کو بھڑکا دیا گیا ہو۔ ہر منفی کارروائی کسی اشتعال انگیز کارروائی کے نتیجے میں جوابی طور پر پیش آتی ہے۔ صبر اور تقویٰ آدمی کو اِس سے روکتا ہے کہ وہ کسی دوسرے شخص یا گروہ کے خلاف اشتعال انگیز کارروائی کرے۔ یہی وجہ ہے کہ صبر اور تقویٰ کسی شخص یا گروہ کے لیے حفاظت کا یقینی ذریعہ ہے۔ ایسا شخص یا گروہ کسی بھی حال میں دوسرے کو مشتعل کرنے والا کام نہیں کرے گا، اِس لیے فطری طور پر وہ دوسرے کی طرف سے پیش آنے والی جوابی کارروائی سے بھی محفوظ رہے گا۔

یہ فطرت کا قانون ہے جس کو خود خالقِ فطرت نے مقرر کیا ہے۔ ایسی حالت میں سازش کے خلاف چیخ و پکار کرنا ایک بے فائدہ کام ہے۔ کرنے کا اصل کام یہ ہے کہ خود اپنے آپ کو داخلی طور پر مستحکم بنایا جائے، خود اپنے اندر زیادہ سے زیادہ صبر اور تقویٰ کی اسپرٹ پیدا کی جائے۔ اِس کے بعد شکایت کے اسباب اِس طرح ختم ہو جائیں گے، جیسے کہ وہ تھے ہی نہیں۔

خدا کے تخلیقی پلان (creation plan) کے مطابق، زندگی میں ہمیشہ دو مختلف قسم کی چیزیں موجود رہتی ہیں — مسائل (problems) اور مواقع (opportunities)۔ جس طرح زندگی میں ہمیشہ مسائل موجود رہتے ہیں، اسی طرح زندگی میں ہمیشہ مواقع بھی موجود رہتے ہیں۔ ایسی حالت میں دانش مندی کا طریقہ، اسلام کے مطابق، یہ ہے کہ — مسائل کو نظر انداز کیا جائے اور مواقع کو استعمال کیا جائے۔ مسائل سے الجھنا، صرف اُس وقت کو ضائع کرنا ہے جو اِس دنیا میں ہم کو زندگی کی مثبت تعمیر کے لیے ملا ہوا ہے۔ یہی دانش مندی ہے اور یہی اسلام کا طریقہ بھی۔

مومن کا کنسرن

ایک مومن کا سب سے بڑا کنسرن (concern) یہ ہوتا ہے کہ آخرت میں اس کو جنت میں داخلہ ملے، وہ اپنی ابدی زندگی میں جنت کا باشندہ بن کر رہ سکے۔ جنت میں داخلہ کس کو ملے گا، اِس سوال کا جواب قرآن میں اِن الفاظ میں دیا گیا ہے: ذَٰلِكَ جَزَاءُ مَنْ تَزَكَّىٰ (20:76)۔ یعنی، جنت اس کے لیے ہے جو اپنا تزکیہ کرے۔

تزکیہ کوئی پراسرار چیز نہیں۔ تزکیہ کے حصول کا اصل ذریعہ مثبت طرزِ فکر ہے۔ مثبت

طرزِ فکر سے آدمی کے اندر مثبت شخصیت بنتی ہے، اور مثبت شخصیت آدمی کو اس قابل بناتی ہے کہ اس کو فرشتوں کی صحبت حاصل ہو۔ اِس طرح کسی آدمی کے اندر تزکیہ کا پراسس (process) شروع ہوتا ہے۔ وہ فرشتوں کی صحبت میں تزکیہ کا سفر کرتا رہتا ہے، یہی سفر اس کے اندر مزکّیٰ شخصیت (purified soul) کی تعمیر کرتا ہے، اور یہی مزکّیٰ شخصیت ہے جو کسی آدمی کو جنت میں داخلے کا مستحق بناتی ہے۔ موت سے پہلے جنتی شخصیت کی تیاری ہے اور موت کے بعد اس تیار شدہ شخصیت کا جنت میں داخلہ۔

نفرت اور تشدد کا ماحول تزکیہ کے عمل کے لیے قاتل (killer) کی حیثیت رکھتا ہے۔ نفرت اور تشدد کے ماحول میں شخصیت کے تزکیہ کے عمل کا جاری ہونا ممکن نہیں۔ جس آدمی کے اندر جنت کی طلب ہو، اس کو پہلا کام یہ کرنا ہے کہ وہ اپنے اندر سے نفرت کو مٹائے، وہ تشدد کو ہر قیمت پر ختم کرے۔ جہاں نفرت اور تشدد سے پاک یہ ماحول بنے گا، وہیں یہ ممکن ہوگا کہ تزکیہ کا مثبت عمل جاری ہو، اور اُس مثبت شخصیت کی تعمیر ہو جو جنت میں داخلے کی مستحق قرار پائے۔

جنت، خدا کے پڑوس کا دوسرا نام ہے۔ خدا کے پڑوس میں ایسا انسان کبھی نہیں بسایا جائے گا جس کے اندر نفرت اور تشدد کا مزاج پایا جاتا ہو۔ جو آدمی جنت کا حریص ہو، جو آدمی خدا کے پڑوس میں جینے کی تمنا رکھتا ہو، اس کے لیے فرض کے درجے میں ضروری ہے کہ وہ اپنے اندر سے نفرت اور تشدد کا مکمل خاتمہ کرے۔ موجودہ دنیا میں تشدد جہنم کا نمائندہ ہے اور امن جنت کا نمائندہ۔

اپنی تعمیر آپ

قرآن میں ایک نفسیاتی حقیقت کو ان الفاظ میں بیان کیا گیا ہے: بَلِ الْإِنْسَانُ عَلَى نَفْسِهِ بَصِيرَةٌ وَلَوْ أَلْقَى مَعَاذِيرَهُ (75:14-15)۔ یعنی، انسان (صحیح اور غلط کے معاملے

ہیں) اپنے آپ سے خوب باخبر ہے۔ چاہے وہ کتنے ہی عذرات پیش کرے۔

قرآن کی اس آیت میں ایک نفسیاتی حقیقت، ضمیر، کا حوالہ دیا گیا ہے۔یعنی اس بات کا اندرونی احساس کہ کسی طرزِ عمل یا سوچ میں کیا غلط ہے اور کیا صحیح ۔ یہ نفسیاتی حقیقت ہر انسان کے لیے ایک حجت داخلی کی حیثیت رکھتی ہے۔انسان بظاہر دوسرے حیوانات کی طرح ایک حیوان ہے۔مگر انسان کی خصوصیت یہ ہے کہ اس کے اندر ایک ایسی صفت پائی جاتی ہے، جو کسی اور حیوان کے اندر نہیں ہے۔ یہ ضمیر (conscience) کی صفت ہے۔

خدا کے تخلیقی نقشے کے مطابق، انسان کو اِس بات کی کامل آزادی دی گئی ہے کہ وہ جس طرح چاہے، سوچے اور جس طرح چاہے، بولے اور لکھے۔مگر انسان کے اندر پیدائشی طور پر یہ شعور موجود ہے کہ وہ برائی اور بھلائی میں تمیز کرے۔انسان کا ضمیر صحیح عمل کی طرف اس کی رہنمائی کرتا ہے۔ یہ فرق بتاتا ہے کہ انسان سے یہ مطلوب ہے کہ وہ ایک سیلف میڈ مین (self-made man) بنے، اور اس کی صورت یہ ہے کہ وہ اپنی نگرانی خود کرے۔ وہ اپنے اندر سیلف کرکشن (self-correction) کا پراسس جاری کرے۔وہ تعمیر خویش کا نمونہ بن جائے۔

انسان کو اس کے خالق نے مکسچر آف اپوزٹس (mixture of opposites) بنایا ہے۔ یہ انسان کے اوپر اس کے خالق کا احسانِ عظیم ہے۔ خالق یہ چاہتا ہے کہ انسان سیلف ڈسکوری (self-discovery) کی سطح پر کھڑا ہو۔وہ اپنی غلطی کو خود دریافت کرکے اس کی اصلاح کرتا رہے۔خدا کی کتاب اور کائنات کی نشانیاں بلاشبہ انسان کے لیے مددگار ہیں۔اسی کے ساتھ انسان کو یہ کرنا ہے کہ وہ اپنے آپ کو خود اپنے عمل سے جنت کے لیے ایک مستحق امیدوار (deserving candidate) بنائے۔

انسان کے لیے اللہ نے جنت کو مقدر کیا ہے۔ جنت انسان کا ہیبیٹاٹ (habitat) ہے۔ جنت وہ جگہ ہے جہاں انسان کی تمام خواہشیں پوری ہوں گی، جہاں انسان کو مکمل معنوں میں فل فلمنٹ (fulfilment) حاصل ہوگا۔ اس قسم کی جنت بلا شبہ انسان کے لیے خالق کا سب سے بڑا عطیہ ہے۔

انسان کے اوپر خالق کا مزید احسان یہ ہے کہ اس نے یہ فیصلہ کیا کہ انسان کو جنت یہ کہہ کر دی جائے کہ تم کو جنت بطور استحقاق دی جا رہی ہے۔ اگر چہ دینے والا پھر بھی خالق ہوگا۔ خالق کے بغیر انسان اس دنیا میں کوئی بھی چیز حاصل نہیں کرسکتا۔ لیکن یہ خالق کی خصوصی عنایت ہے کہ وہ انسان کو جنت یہ کہہ کر دے کہ تم نے اپنے عمل سے اپنے آپ کو جنت کا مستحق ثابت کیا ہے، اس لیے تم کو جنت دی جا رہی ہے۔ اب تم اس میں ابدی طور پر خوف اور حزن سے محفوظ ہو کر قیام کرو۔

اس سلسلے میں ایک حدیث کا مطالعہ بہت اہم ہے۔ وہ حدیث ان الفاظ میں آئی ہے: وَالَّذِي نَفْسِي بِيَدِهِ لَوْ لَمْ تُذْنِبُوا لَذَهَبَ اللّٰهُ بِكُمْ، وَلَجَاءَ بِقَوْمٍ يُذْنِبُونَ، فَيَسْتَغْفِرُونَ اللّٰهَ فَيَغْفِرُ لَهُمْ (صحیح مسلم، حدیث نمبر 2749)۔ یعنی، اس ذات کی قسم جس کے ہاتھ میں میری جان ہے اگر تم گناہ نہ کرو تو اللہ تم کو ہٹا دے گا اور ایسی قوم کو لائے گا جو گناہ کرے پھر اللہ سے مغفرت طلب کرے تو اللہ انہیں معاف فرما دے گا۔

اس حدیث میں گناہ اور مغفرت کا ذکر ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس معاملے میں زیادہ اہم بات کیا ہے۔ وہ گناہ اور مغفرت کے درمیان جاری ہونے والا نفسیاتی عمل (psychological process) ہے۔ جب انسان کوئی گناہ کرتا ہے تو وہ اس کے ایگو کا فعل ہوتا ہے۔ مگر عین اسی وقت انسان کی دوسری صفت، ضمیر جاگ اٹھتی ہے۔ اس

کے اندر شدید ندامت کا عمل جاری ہوجاتا ہے۔ اس طرح انسان کے اندر ایک داخلی اسٹرگل (struggle) جاری ہوجاتا ہے۔ یعنی ایگو اور ضمیر یا سیلف اور اینٹی سیلف کے درمیان داخلی اسٹرگل۔ اس داخلی اسٹرگل کے ذریعہ انسان کے اندر ایک نئی شخصیت ایمرج کرتی ہے۔ یہ شخصیت احساسِ خطا کے بغیر بن نہیں سکتی۔

شکر

ایک عظیم عبادت

شکر کا عمل

قرآن کا آغاز بسم اللہ سے ہوتا ہے۔ بسم اللہ کے بعد سب سے پہلی آیت یہ ہے: اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعَالَمِینَ۔ یعنی، شکر ہے خداوندِ عالم کے لیے۔ قرآن کی اِس آیت سے شکر کی اہمیت معلوم ہوتی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اسلام کے تمام اعمال میں شکر ہی ایک ایسا عمل ہے، جس کو انسان اپنی نسبت سے اعلیٰ ترین صورت میں کرسکتا ہے۔ دوسرے تمام اعمال، مثلاً عبادت اور اخلاق اور معاملات کی ادائیگی میں مختلف اسباب سے کچھ نہ کچھ کمی رہ جاتی ہے۔ لیکن شکر کا تعلق دل اور دماغ سے ہے اور جس چیز کا تعلق دل اور دماغ سے ہو، اُس کے بارے میں یہ ممکن ہوتا ہے کہ آدمی اُس کو کامل ترین صورت میں ادا کر سکے۔ یہاں وہ اپنے تمام جذبات اور اپنی ساری سوچ کو خدا کے سامنے پیش کرسکتا ہے۔ یہ خصوصیت صرف شکر کو حاصل ہے۔

شکر کیا ہے، شکر دراصل اعتراف کا دوسرا نام ہے۔ انسانی معاملات میں جس چیز کو اعتراف کہا جاتا ہے، اُسی کا نام خدائی معاملے میں شکر ہے۔ ہر آدمی کے لیے یہ ضروری ہے کہ وہ اپنے شعور کو اتنا زیادہ بیدار کرے کہ ہر ملی ہوئی چیز اُس کو کامل معنوں میں خدا کا عطیہ دکھائی دے۔ وہ کامل جذبۂ اعتراف کے ساتھ یہ کہہ سکے کہ خدایا، تیرا شکر ہے۔ خدا کی نعمتوں اور رحمتوں کا کامل احساس کرکے یہ کہہ پڑنا کہ الحمدللہ ربّ العالمین، یہی شکر ہے اور یہ شکر بلاشبہ سب سے بڑی عبادت ہے۔

موجودہ دنیا میں وہ چیز بہت بڑے پیمانے پر موجود ہے جس کو لائف سپورٹ سسٹم کہا جاتا ہے۔ یہاں کی ہر چیز اِس طرح بنائی گئی ہے کہ وہ کامل طور پر انسان کے لیے موافق اسباب کی حیثیت رکھتی ہے۔ ایسی حالت میں یہ ہونا چاہیے کہ انسان جب اِس دنیا میں چلے پھرے اور اس کو استعمال کرے تو وہ شکر اور اعتراف کے جذبے سے سرشار ہو۔ موجودہ دنیا کی تمام قیمتی چیزیں

انسان کو سرتا سر مفت میں ملی ہوئی ہیں، سچا شکر ہی اِن چیزوں کی قیمت ہے۔ جو آدمی یہ قیمت ادا نہ کرے، اُس کی حیثیت اِس دنیا میں غاصب کی ہے، اور غاصب کے لیے بلا شبہ سزا ہے، نہ کہ انعام۔ شکر کے احساس کے بغیر اِس دنیا میں رہنا بلا شبہ ایک ناقابلِ معافی جرم کی حیثیت رکھتا ہے، عورت کے لیے بھی اور مرد کے لیے بھی۔

شکر ایک اعلیٰ عبادت

شکر کیا ہے۔ شکر اُس داخلی کیفیت کا نام ہے جو کسی نعمت کے گہرے احساس سے آدمی کے اندر پیدا ہوتی ہے۔ انگریزی میں اس کو گریٹ فُل نیس (gratefulness) کہا جاتا ہے۔ عربی زبان کی مشہور ڈکشنری لسان العرب (جلد 4، صفحہ 423) کے مطابق، احسان کی معرفت اور اس کے تذکرے کا نام شکر ہے (الشُّكْرُ: عِرْفانُ الإِحسان ونَشْرُه)۔ راغب الاصفہانی کی کتاب المفردات فی غریب القرآن (صفحہ 265) میں بتایا گیا ہے کہ شکر کا مطلب ہے— نعمت کے بارے میں سوچنا اور اس کا اظہار کرنا (الشُّكْرُ: تصوّر النّعمة وإظهارها)۔ مفسر القرطبی نے لکھا ہے: وَالشُّكْرُ مَعْرِفَةُ الْإِحْسَانِ وَالتَّحَدُّثُ بِهِ (تفسیر القرطبی، جلد 2، صفحہ 172)۔ شکر نام ہے احسان شناسی اور اس کے اعتراف کا۔

نعمت کا اعتراف (acknowledgement) ایک اعلیٰ انسانی صفت ہے۔ یہ اعتراف جب خدا کی نسبت سے ہو تو اِسی کا نام شکر ہے۔ انسان کے اوپر خدا کی نعمتیں سب سے زیادہ ہیں، اِس لیے انسان کو چاہیے کہ وہ سب سے زیادہ خداوندِ ذوالجلال کا شکر ادا کرے۔ حدیث میں آیا ہے کہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ نے اپنی ایک دعا میں فرمایا: رَبِّ اجْعَلْنِي لَكَ شَكَّارًا (سنن ابن ماجہ، حدیث نمبر 3831؛ سنن الترمذی، حدیث نمبر 3551؛ مسند احمد، حدیث نمبر 1997)۔ یعنی اے میرے رب! تو مجھ کو اپنا بہت زیادہ شکر کرنے والا بنا۔

قرآن میں بار بار یہ کہا گیا ہے کہ اے لوگو! خدا کے شکر گزار بندے بنو۔ مثلاً میٹھے پانی کا ذکر کرنے کے بعد اللہ تعالیٰ نے فرمایا: فَلَوۡلَا تَشۡكُرُونَ (56:70)۔ یعنی، تم شکر کیوں نہیں کرتے۔ انسان سے جو چیز سب سے زیادہ مطلوب ہے، وہ یہی شکر ہے۔ شیطان کی ساری کوشش یہ ہوتی ہے کہ وہ انسان کو شکر کے راستے سے ہٹا دے۔ قرآن کے مطابق، آغازِ حیات میں اُس نے خدا کو چیلنج کرتے ہوئے کہا تھا کہ میں انسانوں کو بہکاؤں گا، یہاں تک کہ تو اُن میں سے اکثر لوگوں کو اپنا شکر گزار نہ پائے گا — وَلَا تَجِدُ أَكۡثَرَهُمۡ شَاكِرِينَ:

And you will not find most of them grateful (7:17)

قرآن میں مختلف انداز سے یہ بات کہی گئی ہے کہ خدا کے بندوں میں بہت کم ایسے لوگ ہیں جو شکر کرنے والے ہیں: وَقَلِيلٌ مِّنۡ عِبَادِيَ الشَّكُورُ (34:13)۔ شکر کا مطلب اگر یہ ہو کہ آدمی زبان سے شکر کے الفاظ بولتا رہے، تو ایسے لوگ ہمیشہ بہت زیادہ رہے ہیں اور آج بھی وہ بہت زیادہ ہیں۔ ایسے لوگ بے شمار ہیں جو اپنی گفتگو کے دوران بار بار الحمدللہ، اللہ کا شکر ہے اور اللہ کا فضل ہے، جیسے الفاظ بولتے رہتے ہیں۔ ایسی حالت میں دنیا بظاہر شکر کرنے والوں سے بھری ہوئی ہے، پھر مذکورہ قرآنی بیان کا کیا مطلب ہے کہ لوگوں میں بہت کم ہیں جو شکر کرنے والے ہیں۔

اصل یہ ہے کہ شکر کی دو قسمیں ہیں — لسانی شکر، اور قلبی شکر۔ لسانی شکر کو نارمل شکر، اور قلبی شکر کو تھرلنگ (thrilling) شکر کہہ سکتے ہیں۔ خدا کی خدائی شان کے مطابق، شکر صرف وہ ہے جو تھرلنگ شکر ہو۔ نارمل شکر صرف ایک لِپ سروس (lip-service) ہے۔ اِس قسم کا شکر خدا کو مطلوب نہیں۔ اِسی کے ساتھ ضروری ہے کہ خدا کے لیے انسان کا شکر ایک اضافہ پذیر شکر ہو۔ جو شکر ایک حالت پر قائم ہو جائے، وہ ایک جامد شکر ہے۔ اور جامد شکر وہ شکر نہیں جو خدا کے نزدیک مطلوب شکر کی حیثیت رکھتا ہے۔

تھرلنگ شکر صرف اُس شخص کو ملتا ہے جو خدا کے احسانات (blessings) پر مسلسل غور کرتا رہے۔ انسان کے اوپر خدا کے احسانات لامحدود ہیں۔ اِس لیے جو آدمی اِس پہلو سے غور وفکر کرتا رہے، وہ ہر وقت ایک نئے خدائی احسان کو دریافت کرے گا، وہ ہر وقت ایک نئے سببِ شکر کا تجربہ کرے گا۔ اس کے یہ تجربات کبھی ختم نہ ہوں گے۔ اِس لیے اس کے اندر شکرِ خداوندی کا احساس بھی مسلسل طور پر زندہ رہے گا۔

میں اپنے دفتر میں بیٹھا ہوا تھا۔ اچانک ٹیلی فون کی گھنٹی بجی۔ میں نے سوچا کہ انسان کی قوتِ سماعت بھی کیسی عجیب ہے کہ اس کے کان میں بے شمار قسم کی آوازیں آتی ہیں۔ وہ ہر آواز کو ممیّز (differentiate) کرکے اس کو الگ سے پہچان لیتا ہے۔ اس کے بعد میں نے اپنے ایک ہاتھ کو حرکت دی اور بات کرنے کے لیے ریسیور کو اٹھایا۔ دوبارہ میں نے سوچا کہ میرے جسم میں بہت سے اعضا ہیں، لیکن میرے دماغ نے صرف ایک عضو (ہاتھ) کو متحرک کیا کہ وہ ریسیور کو اٹھائے۔ اِس عمل میں آنکھ کا بھی ایک حصہ تھا، کیوں کہ اگر آنکھ اپنا عمل نہ کرتی تو مجھے یہ معلوم ہی نہ ہوتا کہ ریسیور کہاں ہے۔

جب میں نے ٹیلی فون پر بات کرنا شروع کیا تو معلوم ہوا کہ ٹیلی فون کے دوسری طرف جو آدمی ہے، وہ انگریزی زبان میں بول رہا ہے۔ میں اس کی بات کو پوری طرح سمجھ رہا تھا۔ میں نے سوچا کہ میری مادری زبان اردو ہے، اور دوسرے شخص کی زبان انگریزی۔ میں کسی بات کو صرف اُس وقت سمجھ پاتا ہوں، جب کہ میں اس کو اردو الفاظ میں ڈھال لوں۔ میں نے سوچا کہ دماغ کیسی عجیب نعمت ہے۔ جو اپنے اندر یہ انوکھی صلاحیت رکھتا ہے کہ وہ انگریزی الفاظ کو فی الفور (instantly) اردو میں ڈھال دے۔ اور اِس طرح متکلم کی بات کو بلا تاخیر میرے لیے قابلِ فہم بنا دے۔

اِس طرح کی بہت سی باتیں اُس وقت میرے ذہن میں آتی رہیں۔ میں ایک طرف دور کے ایک شخص سے ٹیلی فون پر بات کر رہا تھا اور دوسری طرف، عین اُسی وقت میں خدا کے

بارے میں تھرلنگ شکر کا تجربہ کررہا تھا۔ یہ تجربہ اتنا زیادہ شدید تھا، جیسے کہ شکر کا ایک دریا میرے سینے میں جاری ہوگیا ہو۔ اِسی طرح ہر لمحہ انسان کو ایسے تجربات پیش آتے ہیں جن کے اندر شکر کا سمندر چھپا ہوا ہوتا ہے۔ اِس اعلیٰ شکر تک آپ کی رسائی صرف غور وفکر کے ذریعے ہوسکتی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ سوچ ہی اعلیٰ شکر کا دروازہ ہے۔ جس آدمی کے اندر سوچ نہ ہو، اس کے اندر شکر بھی نہ ہوگا۔ ایسا آدمی ہر چیز کو فار گرانٹیڈ (for granted) لیتا رہے گا۔

جو انسان چیزوں کو فار گرانٹیڈ لے گا، وہ خدا کی نعمتوں کی کوئی قدر نہیں کرے گا، وہ شکر کے سمندر کے درمیان رہتے ہوئے بھی تھرلنگ شکر کا تجربہ نہیں کرے گا۔ یہی وہ لوگ ہیں جن کے بارے میں قرآن میں آیا ہے:

لَهُمْ قُلُوبٌ لَا يَفْقَهُونَ بِهَا وَلَهُمْ أَعْيُنٌ لَا يُبْصِرُونَ بِهَا وَلَهُمْ آذَانٌ لَا يَسْمَعُونَ بِهَا أُولَئِكَ كَالْأَنْعَامِ بَلْ هُمْ أَضَلُّ أُولَئِكَ هُمُ الْغَافِلُونَ (7:179)۔ یعنی، ان کے دل ہیں جن سے وہ سمجھتے نہیں، ان کی آنکھیں ہیں جن سے وہ دیکھتے نہیں، ان کے کان ہیں جن سے وہ سنتے نہیں۔ وہ ایسے ہیں جیسے چوپائے، بلکہ ان سے بھی زیادہ بے راہ۔ یہی لوگ ہیں غافل۔

اصل یہ ہے کہ ہر چیز کے دو پہلو ہوتے ہیں۔ ایک، اس کا ابتدائی اور ظاہری پہلو۔ اور دوسرا، اس کا زیادہ گہرا پہلو۔ چیزوں کا ظاہری پہلو ہر آدمی کو کسی کوشش کے بغیر اپنے آپ دکھائی دیتا ہے۔ لیکن اس کا جو گہرا پہلو ہے، وہ صرف سوچنے کے بعد کسی کو سمجھ میں آتا ہے۔ اعلیٰ شکر کا تجربہ کرنے کے لیے آدمی کو یہ کرنا پڑتا ہے کہ وہ چیزوں کے گہرے پہلو پر غور کرے، تاکہ وہ ایک معمولی چیز کو غیر معمولی روپ میں دیکھ سکے:

It is the result of taking an ordinary thing as extraordinary.

ایک دن مجھے پیاس لگی۔ میرے سامنے میز پر شیشے کا ایک گلاس پانی سے بھرا ہوا رکھا تھا۔ میں نے اس کو اپنے ہاتھ میں لیا تو اس کو دیکھ کر میرے دماغ میں ایک فکری طوفان برپا ہوگیا۔

اچانک ایک پوری تاریخ میرے ذہن میں آ گئی۔ میری زبان سے نکلا کہ خدایا، تیرا شکر ہے کہ تو نے پانی جیسی نعمت انسان کو عطا کی۔ یہ کوئی سادہ بات نہیں تھی۔ یہ ایک سپر (super) شکر تھا، جس نے میری پوری شخصیت میں طوفان برپا کر دیا تھا۔ میں نے سوچا کہ کئی بلین سال پہلے ایسا ہوا کہ دو گیسوں، آکسیجن اور ہائڈروجن، کے ملنے سے پانی جیسی سیّال چیز بنی۔ یہ پانی گہرے سمندروں میں ذخیرہ ہو گیا۔ اِس کے بعد خدا نے تحفّظاتی مادّہ (preservative) کے طور پر اِس میں دس فی صد نمک ملا دیا۔ یہ پانی براہِ راست طور پر انسان کے لیے ناقابلِ استعمال تھا۔ اِس کے بعد خدا نے ایک عالمی نظام کے تحت، پانی کو نمک سے الگ کرنے کے لیے، اِزالۂ نمک (desalination) کا ایک آفاقی عمل جاری کیا۔ اِس کے بعد یہ ہوا کہ سمندروں کا کھاری پانی، میٹھا پانی بن کر بارش کی صورت میں ہم کو حاصل ہو گیا۔

یہ ایک مثال ہے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ تھرلنگ شکر کی توفیق کسی آدمی کو کس طرح حاصل ہوتی ہے۔ اِس کا واحد ذریعہ سوچ ہے۔ یہ دراصل سوچ ہے جو آدمی کو اِس قابل بناتی ہے کہ وہ سپر شکر کا ہدیہ اپنے رب کے حضور پیش کرے۔ سوچ کے سوا کوئی بھی دوسری چیز نہیں ہے جو آدمی کو اُس اعلیٰ شکر کا تجربہ کرائے جو کہ خدا کو انسان سے مطلوب ہے۔

جیسا کہ اوپر عرض کیا گیا، پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے دعا کرتے ہوئے فرمایا: ربّ اجْعَلنِی لَک شکّاراً۔ کوئی انسان، شَکّار یا بہت زیادہ شکر کرنے والا کیسے بنتا ہے۔ اس کا طریقہ یہ نہیں ہے کہ آدمی شکر کے کلمہ کو ہزاروں بار دہرائے، یا اور کوئی وظیفہ پڑھے۔ اِس کو حاصل کرنے کا واحد ذریعہ غور وفکر ہے۔ مذکورہ دعا کا مطلب یہ ہے کہ خدایا، تو مجھ کو ربّانی غور وفکر کی توفیق دے، تاکہ میرے اندر اعلیٰ شکر کی کیفیات پیدا ہوں، جو کہ حقیقی معنوں میں کسی انسان کو خدا کا شکر گزار بندہ بناتی ہیں۔ آپ قرآن کا مطالعہ کریں تو آپ پائیں گے کہ قرآن میں شکر کو صبر کے ساتھ جوڑا گیا ہے۔ مثلاً قرآن میں دنیا کی نعمتوں کا ذکر کرتے ہوئے

ارشاد ہوا ہے: إِنَّ فِي ذَٰلِكَ لَآيَاتٍ لِّكُلِّ صَبَّارٍ شَكُورٍ (31:31)۔ یعنی، اِس میں نشانیاں ہیں ہر اُس انسان کے لیے جو بہت زیادہ صبر کرنے والا اور بہت زیادہ شکر کرنے والا ہو۔ اِس قسم کی آیات پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ قانونِ الٰہی کے مطابق، اعلیٰ شکر کی توفیق صرف اُن لوگوں کو ملتی ہے جو بہت زیادہ صبر کرتے ہوئے اِس دنیا میں زندگی گزاریں۔

ایسا کیوں ہے۔ اِس کا سبب یہ ہے کہ موجودہ دنیا میں انسان کو مکمل آزادی دی گئی ہے۔ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ انسان اپنی آزادی کا غلط استعمال کرتا ہے۔ اِس بنا پر یہاں مختلف قسم کی برائیاں (evils) پیدا ہوجاتی ہیں۔ یہ صورتِ حال خدا کے قانون کی بنا پر ہے، انسان اس کو بدلنے پر قادر نہیں۔ اِس معاملے میں انسان کو ایک ہی اختیار (option) حاصل ہے، وہ یہ کہ وہ صبر و برداشت سے کام لے، تاکہ وہ دنیا میں نارمل طریقے سے رہ سکے۔

شکر ایک ایسا جذبہ ہے جو صرف ایک ایسے مائنڈ میں پیدا ہوتا ہے جو کامل طور پر مثبت (positive) ہو، کسی بھی قسم کا منفی فکر (negative thought) اس کے ذہن میں موجود نہ ہو۔ مثبت ذہن کا آدمی ہی خدا کی توفیق سے اعلیٰ شکر ادا کرنے کے قابل ہوتا ہے۔ صبر دراصل شکر کی قیمت ہے۔ جو آدمی یہ قیمت ادا نہ کرے، وہ شکر جیسی اعلیٰ عبادت بھی انجام نہیں دے سکتا۔

انسان اور نظامِ ربوبیت

انسان ایک مکمل وجود ہے، مگر اِسی کے ساتھ وہ مکمل طور پر خارجی سہارے کا محتاج وجود ہے۔ یعنی، انسان کو اپنے وجود کی تکمیل کے لیے ہر لمحہ ایک مددگار نظام درکار ہے۔ اِس نظام کے بغیر وہ اپنے وجود کو باقی نہیں رکھ سکتا۔ اس حقیقت کو قرآن میں ان الفاظ میں بیان کیا گیا ہے: وَاللَّهُ الْغَنِيُّ وَأَنتُمُ الْفُقَرَاءُ (47:38)۔ یعنی، اور اللہ بے نیاز ہے، تم محتاج ہو۔

اِس مددگار نظام کا نام نظامِ ربوبیت ہے، یعنی رب العالمین کا قائم کردہ نظام۔ مثلاً انسان کے اندر نظامِ ہضم (digestive system) ہے، مگر غذائی اشیا کی سپلائی باہر سے ہوتی

ہے۔ انسان کے اندر نظامِ تنفس (respiratory system) ہے، مگر آکسیجن اس کو خدا کے کارخانے سے ملتا ہے۔ انسان کے پاس نظامِ بصارت ہے، مگر وہ روشنی خدا کی طرف سے آتی ہے جس کے بغیر وہ دیکھ نہیں سکتا۔ انسان کے پاس نظامِ سماعت ہے، مگر اُس ہوا کو چلانے والا خدا ہے جس کے ذریعہ انسان کے کانوں تک آواز پہنچتی ہے، وغیرہ۔ انسانی وجود کے اندر اِس قسم کے بہت سے نظام ہیں، مگر ہر نظام اپنی کارکردگی کے لیے خارجی مدد کا محتاج ہے۔ یہ مختلف قسم کے خارجی نظام جن پر انسانی زندگی کا انحصار ہے۔ ان کے مجموعہ کو لائف سپورٹ سسٹم کہا جاتا ہے۔ یہ اگر سسٹم موجود نہ ہو تو انسان کا پورا وجود بے معنی ہو جائے گا۔

مچھلی پانی کے باہر مسلسل تڑپتی رہتی ہے۔ ایسا اس لیے ہوتا ہے کہ اس کو زندہ رہنے کے لیے آکسیجن کی ضرورت ہے اور مچھلی صرف پانی سے آکسیجن لے سکتی ہے۔ مچھلی کی یہ مثال ہر آدمی کے لیے بہت زیادہ سبق آموز ہے۔ ہر وقت انسان کو سوچنا چاہیے کہ خدا اگر لائف سپورٹ سسٹم یا بالفاظ دیگر اپنے نظامِ ربوبیت کو واپس لے لے تو میرا کیا حال ہوگا۔ قرآن میں ہے: بتاؤ، اگر اللہ قیامت کے دن تک تم پر ہمیشہ کے لیے رات کر دے تو اللہ کے سوا کون معبود ہے جو تمہارے لیے روشنی لے آئے۔ تو کیا تم لوگ سنتے نہیں (28:71)۔ یہ سوچ اگر آدمی کے اندر حقیقی طور پر پیدا ہو جائے تو یہی ایک بات اس کے اندر تمام اعلیٰ انسانی قدروں (human values) کو پیدا کرنے کا ذریعہ بن جائے گی۔ مثلاً تواضع (modesty)، شکر، عفو و درگزر، خیر خواہی، انصاف، وغیرہ۔

اسمائے حسنیٰ

اسمائے حسنیٰ کا مطالعہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ خدا کے یہ تمام نام انسان کی نسبت سے خدا کا تعارف ہیں۔ انسان فطری طور پر اپنے سے ایک برتر ہستی کو چاہتا ہے۔ نفسیاتی مطالعے سے یہ ثابت ہوا ہے کہ انسان پیدائشی طور پر ایک متلاشی (seeker by birth) مخلوق

ہے۔ انسان اپنے پورے وجود کے اعتبار سے ایک ذاتِ اعلیٰ کا متلاشی ہے، ایک ایسی اعلیٰ اور برتر ذات جو اُس کی کمیوں کی تلافی کرے، جو اُس کے جذبات اور احساسات کا مرکز ومحور بن سکے۔

اسمائے حسنیٰ دراصل اِسی سوال کا جواب ہیں۔ اسمائے حسنیٰ کا مطلب ہے، صفاتِ حسنیٰ۔ خدا کی یہ صفات جو اسمائے حسنیٰ کے ذریعے بتائی گئی ہیں، وہ علی الاطلاق حیثیت سے خدائے برتر کا تعارف نہیں ہیں، بلکہ وہ انسان کی نسبت سے اُس کے مطلوب خدا کا تعارف ہیں۔ چنانچہ جب کوئی انسان اِن اسمائے حسنیٰ کو اُن کی پوری معنویت کے ساتھ جان لیتا ہے تو اچانک اُس کو دریافت ہوتا ہے کہ وہ جس خدائے برتر کی تلاش میں تھا، اُس کا تعارف اُس کو اسمائے حسنیٰ کی صورت میں مل گیا۔

مثال کے طور پر اسمائے حسنیٰ میں سے ایک نام 'الغنی' ہے۔ غنی کے لفظی معنیٰ بے نیاز کے ہیں، یعنی وہ ہستی جس کو دوسروں سے کچھ لینے کی ضرورت نہ ہو، لیکن اس کو یہ طاقت ہو کہ وہ دوسروں کی تمام حاجتوں کو پورا کرسکے۔ یہ احساس ہر انسان کے اندر، شعوری یا غیر شعوری طور پر، چھپا ہوا ہے۔ اِس کے بعد جب انسان اسمائے حسنیٰ کے ذریعے یہ جانتا ہے کہ خدا کی ایک صفت اُس کا غنی ہونا ہے، تو فوراً ہی وہ جان لیتا ہے کہ وہ جس خدا کی تلاش میں تھا، اُس کو اُس نے یہاں دریافت کرلیا۔ یہی وہ حقیقت ہے جو قرآن کی اِس آیت میں بتائی گئی ہے: يَاأَيُّهَا النَّاسُ أَنْتُمُ الْفُقَرَاءُ إِلَى اللَّهِ وَاللَّهُ هُوَ الْغَنِيُّ الْحَمِيدُ (35:15)۔ یعنی، اے لوگو، تم اللہ کے محتاج ہو، اور اللہ تو بے نیاز ہے، تعریف والا ہے۔

اِسی طرح ایک اور جذبہ، جو سارے انسانوں کے اندر شعوری یا غیر شعوری طور پر پایا جاتا ہے، وہ یہ کہ ہر انسان یہ محسوس کرتا ہے کہ وہ ایک ایسی مخلوق ہے جو رزق کی محتاج ہے۔ رزق سے مراد وہ تمام چیزیں ہیں، جن پر انسانی زندگی کا انحصار ہے۔ انسان ہر لمحہ یہ محسوس کرتا ہے کہ وہ بہت سی چیزوں کا ضرورت مند ہے — پانی غذا، ہوا، آکسیجن اور روشنی،

وغیرہ۔ یہ تمام چیزیں نہایت متناسب انداز میں اور نہایت وافر طور پر دنیا میں موجود ہیں۔

انسان فطری طور پر یہ جاننا چاہتا ہے کہ وہ کون ہے جو اِن تمام ضروری چیزوں کو اُس کے لیے مہیّا کر رہا ہے، بغیر اِس کے کہ وہ انسان سے اُس کی کوئی قیمت طلب کر رہا ہو۔ انسان چاہتا ہے کہ وہ اپنے اِس محسنِ اعلیٰ کے احسانات کا اعتراف کرے، وہ کامل اعتراف اور شکر کے جذبے سے اپنے آپ کو اُس کے آگے بچھا دے۔ یہاں اسمائے حسنیٰ میں اُس کو رہ نمائی ملتی ہے۔

خدا کے اِن ناموں میں سے ایک نام 'الرّزّاق' ہے۔ انسان جب خدا کو رزّاق کی حیثیت سے دریافت کرتا ہے تو اچانک اُس کو محسوس ہوتا ہے کہ اُس نے اپنی طلب کا جواب پالیا۔ یہی وہ حقیقت ہے، جس کو قرآن کی اِس آیت میں بیان کیا گیا ہے: إِنَّ اللَّهَ هُوَ الرَّزَّاقُ ذُو الْقُوَّةِ الْمَتِينُ (51:58)۔ یعنی، بے شک، اللہ ہی رزق دینے والا، زور آور، زبردست ہے۔

اِسی طرح ہر انسان کی ایک اور ضرورت ہے۔ موجودہ دنیا جس میں انسان کو زندگی گزارنا ہے، وہ اِس انداز سے بنی ہے کہ کوئی انسان اُس کے اندر معیاری انداز میں نہیں رہ سکتا۔ اِسی طرح انسان کے اندر بہت سی خواہشیں اور تمنائیں ہیں۔ اِن خواہشوں اور تمناؤں کے زیرِ اثر ہر آدمی بار بار غلطیاں کر بیٹھتا ہے۔ اِن حالات میں ہر انسان یہ سوچتا ہے کہ کیسے وہ اپنی غلطیوں کے احساس سے اپنے آپ کو بچائے۔ کس طرح ایسا ہو کہ وہ اپنے آپ کو ایک پاکیزہ روح کا درجہ دے سکے۔ یہاں اسماء حسنیٰ میں وہ اپنے لیے تسکین کا سامان پالیتا ہے۔

جیسا کہ معلوم ہے، خدا کا ایک نام 'الغفور' ہے۔ غفور کے تصور میں انسان پوری طرح اپنے لیے ذہنی تسکین کا سامان پالیتا ہے۔ قرآن کی یہ آیت اِس معاملے میں انسان کی رہ نما ہے:

قُلْ يَا عِبَادِيَ الَّذِينَ أَسْرَفُوا عَلَى أَنْفُسِهِمْ لَا تَقْنَطُوا مِنْ رَحْمَةِ اللَّهِ إِنَّ اللَّهَ يَغْفِرُ الذُّنُوبَ جَمِيعًا إِنَّهُ هُوَ الْغَفُورُ الرَّحِيمُ (39:53)۔ یعنی، کہو کہ اے میرے بندو، جنھوں نے اپنی جانوں پر زیادتی کی ہے، تم اللہ کی رحمت سے مایوس نہ ہو۔ بے شک، اللہ تمام گناہوں کو معاف کر دیتا ہے۔ وہ بڑا بخشنے والا، مہربان ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ خدا تمام رحمتوں کا خزانہ ہے اور جس کی رحمتیں ہر وقت ابلتی رہتی ہیں۔ دین یہ ہے کہ آدمی اپنے خالق کو اس طرح دریافت کرلے کہ اس کی یاد میں اور اس کی شکر گزاری میں اس کے صبح وشام بسر ہونے لگیں۔ اس قسم کی زندگی ہی تمام خوشیوں اور لذتوں کا خزانہ ہے۔ اسماء حسنیٰ انسان کو کامل معنوں میں اپنے خالق کی دریافت کا موقع عطا کرتا ہے۔ اس تجربہ سے اس کے اندر اپنے رب کے شکر کا بے پناہ جذبہ پیدا ہوتا ہے۔ اسماء حسنیٰ کے ذریعہ بندہ اپنے آپ کو اللہ کی شکر گزاری کے قابل بناتا ہے اور یہ صلاحیت پیدا کرتا ہے کہ وہ ان کیفیتوں کو محسوس کرسکے جو اللہ کو اپنے بندوں سے مطلوب ہیں۔ اسماء حسنیٰ کی اسپرٹ انسان کو اس قابل بناتی ہے کہ اللہ کی شکر گزاری میں اس کا سینہ تڑپے اور اللہ کے خوف سے اس کے اندر کپکپی پیدا ہو۔ جب آدمی اس نفسیاتی حالت کو پہنچتا ہے، اسی وقت وہ اس قابل بنتا ہے کہ وہ اللہ کی نعمتوں پر ایسا شکر ادا کرے جس میں اس کے دل کی دھڑکنیں شامل ہوں۔ وہ ایسے تقویٰ کا تجربہ کرے جو اس کے بدن کے رونگٹے کھڑے کردے۔ وہ اللہ کو ایسے بڑے کی حیثیت سے پائے جس میں اس کا اپنا وجود بالکل چھوٹا ہو گیا ہو۔

شکر کی اہمیت

طاغوت کا لفظی مطلب ہے، حد سے تجاوز کرنے والا۔ قرآن میں یہ لفظ شیطان کے لیے آیا ہے۔ کیوں کہ اس نے اللہ رب العالمین سے بغاوت کی۔ شیطان کی سب سے بڑی کوشش یہ ہے کہ وہ انسان کو شکایتی ذہن میں مبتلا کرکے اللہ سے دور کردے۔ شیطان نے آدم کی تخلیق کے وقت اللہ رب العالمین کو چیلنج کرتے ہوئے کہا تھا: وَلَا تَجِدُ أَكْثَرَهُمْ شَاكِرِينَ (7:17)۔ یعنی، تو اکثر انسانوں کو اعتراف کرنے والا نہ پائے گا۔

دین کا خلاصہ اللہ سے تعلق ہے۔ اللہ سے تعلق اگر انسان کو دریافت کے درجے میں حاصل ہوا ہو تو انسان کے اندر اپنے آپ میں یہ واقعہ ہوجاتا ہے کہ وہ اپنے پورے دل وجان

کے ساتھ اِن انعامات کے منعم (giver) کا اعتراف کرے۔ اس کے برعکس، جہاں اللہ کا اعتراف (شکر) نہ ہو، یقینی طور پر وہاں اللہ سے حقیقی تعلق بھی نہ ہوگا۔ انسان کے اندر اللہ کے شکر کا جذبہ کیسے پیدا ہوتا ہے۔ وہ تدبر و تفکر سے پیدا ہوتا ہے۔ اصل یہ ہے کہ اِس دنیا میں انسان کو اپنے وجود سے لے کر لائف سپورٹ سسٹم (life support system) تک جو چیزیں ملی ہیں، وہ سب کا سب اللہ کا یک طرفہ عطیہ ہیں۔ اس دریافت کے بعد انسان کے اندر اپنے مُنعم حقیقی کے لیے اعتراف (acknowledgement) کا جذبہ ابھرتا ہے۔ اللہ رب العالمین کے اِسی اعتراف کا مذہبی نام 'شکر' ہے۔

تعلق باللہ فقہی یا قانونی حکم کے طور پر کسی کے اندر پیدا نہیں ہوتا، بلکہ وہ دریافت کے نتیجے کے طور پر پیدا ہوتا ہے۔ اگر ایسا ہو کہ بندے کے اندر ڈسکوری کے درجے میں اللہ سے تعلق پیدا ہو تو اس کے بعد اپنے آپ اس کے نتائج ظاہر ہوں گے، اس کی سوچ میں تعلق باللہ کی جھلک دکھائی دے گی۔ تعلق باللہ کا ایک ظاہرہ شکر ہے۔ اور جب اس قسم کا شکر کسی کو حاصل ہو جائے تو فطری طور پر اس کے اندر غور و فکر کا مزاج پیدا ہوتا ہے، یعنی وہ ہمیشہ اللہ رب العالمین کے بارے میں غور و فکر کرتا رہے۔ معرفت اسی غور و فکر کا نتیجہ ہے۔ اسی لیے دین میں تدبر یا غور و فکر کی اہمیت بہت زیادہ ہے۔

حکمت اور شکر

قرآن کی سورہ لقمان کی ایک آیت یہ ہے: وَلَقَدْ اٰتَيْنَا لُقْمٰنَ الْحِكْمَةَ اَنِ اشْكُرْ لِلّٰهِ ۭ وَمَنْ يَّشْكُرْ فَاِنَّمَا يَشْكُرُ لِنَفْسِهٖ ۚ وَمَنْ كَفَرَ فَاِنَّ اللّٰهَ غَنِيٌّ حَمِيْدٌ (31:12)۔ یعنی، اور ہم نے لقمان کو حکمت عطا فرمائی کہ اللہ کا شکر کرو۔ اور جو شخص شکر کرے گا تو وہ اپنے ہی لیے شکر کرے گا اور جو ناشکری کرے گا تو اللہ بے نیاز ہے، خوبیوں والا ہے۔

اس سے معلوم ہوا کہ شکر سے پہلے حکمت ضروری ہے۔ شکر بلاشبہ سب سے بڑی

عبادت ہے، لیکن صاحبِ شکر بننے سے پہلے ضروری ہے کہ آدمی صاحبِ حکمت بن چکا ہو۔ شکر اگر شکر ہے تو حکمت پری شکر (pre-shukr) کی حیثیت رکھتی ہے۔

شکر کی نسبت سے حکمت (wisdom) کی اہمیت یہ ہے کہ فطرت کے قانون کے تحت زندگی میں ہمیشہ ایسا ہوتا ہے کہ یہاں ناشکری کے اسباب موجود رہتے ہیں۔ کوئی انسانی معاشرہ کبھی شکایت، منفی سوچ اور ناخوشگوار تجربے سے خالی نہیں ہوسکتا۔ اس قسم کے حالات انسان کو نہایت آسانی سے ناشکر گزاری کی نفسیات میں مبتلا کر دیتے ہیں۔ اس کا دماغ نفرت اور شکایت کے خیالات سے بھر جاتا ہے۔ ایسی حالت میں شکر کی نفسیات میں جینے کے لیے اس چیز کی ضرورت ہوتی ہے، جس کو قرآن میں حکمت کہا گیا ہے۔ حکمت آدمی کو اس قابل بناتی ہے کہ وہ منفی حالات کے باوجود مثبت انداز میں سوچ سکے۔ شکایت کے اسباب کے باوجود وہ شکایت کا ذہن اپنے اندر نہ پیدا ہونے دے۔ دوسروں کی طرف سے اشتعال انگیزی کے باوجود وہ اپنے آپ کو مشتعل ہونے سے بچائے۔ ناانصافی کا تجربہ ہونے کے باوجود وہ ناانصافی اور حق تلفی سے اوپر اٹھ کر سوچے۔

اسی قسم کی اعلیٰ سوچ کا نام حکمت ہے۔ جو لوگ اپنے اندر اس قسم کی اعلیٰ سوچ پیدا کریں، انھیں کے لیے ایسا ممکن ہے کہ ان کے اندر حقیقی معنوں میں شکر کے جذبات پرورش پائیں۔ شکر کے لیے ایک تیار ذہن (prepared mind) درکار ہے۔ تیار ذہن کے بغیر شکر کی عبادت ممکن نہیں۔

شکر: ایک قربانی کا عمل

شکر سب سے بڑی عبادت ہے۔ شکر جنت کی قیمت ہے۔ شکر کے بغیر ایمان نہیں۔ شکر کے بغیر سچی خدا پرستی نہیں۔ شکر کے بغیر آدمی اُن اعلیٰ کیفیات کا تجربہ نہیں کرسکتا جس کو قرآن میں ربّانیت (2:79) کہا گیا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ دین داری کی اصل روح شکر ہے۔

شکر کے بغیر دین داری ایسی ہی ہے جیسے پھل کا اوپری چھلکا۔

لیکن شکر محض زبان سے کچھ الفاظ ادا کردینے کا نام نہیں، شکر ایک قربانی کا عمل ہے، بلکہ سب سے بڑی قربانی کا عمل۔ جو آدمی سب سے بڑی قربانی دینے کے لیے تیار ہو، وہی اُس شکر کا تجربہ کرسکتا ہے جو خدا کو مطلوب ہے۔

اصل یہ ہے کہ موجودہ دنیا میں ہر انسان کسی نہ کسی اعتبار سے احساسِ محرومی کا شکار ہوتا ہے۔ ہر انسان کے دل میں کسی نہ کسی کے خلاف منفی جذبات موجود رہتے ہیں۔ ہر انسان مختلف اسباب سے شکایت اور نفرت کی نفسیات میں جینے لگتا ہے۔ یہی وہ صورتِ حال ہے جو شکر کو کسی انسان کے لیے مشکل ترین کام بنا دیتی ہے۔ آدمی زبان سے شکر کے الفاظ بولتا ہے، لیکن اس کا دل حقیقی جذباتِ شکر سے بالکل خالی ہوتا ہے۔

ایسی حالت میں صرف وہی انسان شکر کا عمل کرسکتا ہے جس کا شعور اتنا زیادہ بیدار ہو چکا ہو کہ وہ ناشکری کے اسباب کے باوجود شکر کر سکے، جو منفی خیالات کے جنگل میں رہتے ہوئے مثبت احساس میں جینے والا بن جائے۔ وہ اپنے اندر سے ڈھونڈ ڈھونڈ کر خلافِ شکر چیزوں کو نکالے، وہ اپنے اندر حقیقی جذباتِ شکر کی تخلیق کر سکے۔

شکر ایک عبادت ہے جو ہر حال میں مطلوب ہے۔ جو آدمی یہ سمجھے کہ شکر اُس وقت کرنا ہے جب کہ ہر چیز اُس کو اس طرح حاصل ہو جائے جیسا کہ وہ انھیں حاصل کرنا چاہتا تھا، ملی ہوئی چیز اُس کی مرضی کے مطابق اُس کو مل جائے۔ ایسا آدمی کبھی شکر کرنے والا نہیں بن سکتا۔ خدا کا حقیقی شکر گزار وہی ہے جو شکایت کے باوجود شکر گزاری کا راز دریافت کرے۔

شکر سے اضافہ

قرآن کی سورہ ابراہیم میں ارشاد ہوا ہے: وَإِذْ تَأَذَّنَ رَبُّكُمْ لَئِن شَكَرْتُمْ لَأَزِيدَنَّكُمْ وَلَئِن كَفَرْتُمْ إِنَّ عَذَابِي لَشَدِيدٌ (14:7)۔ یعنی، اور جب تمھارے رب نے تم کو آگاہ کردیا کہ اگر

تم شکر کروگے، تو میں تم کو زیادہ دوں گا۔ اور اگر تم ناشکری کروگے، تو میرا عذاب بڑا سخت ہے:

And remember also the time when your Lord declared: 'If you are grateful, I will surely bestow more favours on you; but if you are ungrateful, then know that My punishment is severe indeed' (14:7)

قرآن کی اِس آیت میں نعمت میں اضافہ سے مراد یہ ہے کہ دنیا کی زندگی میں جو انسان خدا کی نعمتوں کا سچا شکر ادا کرے گا، اُس کو آخرت میں جنت کی صورت میں حقیقی طور پر زیادہ بڑا انعام دیا جائے گا۔ حقیقت یہ ہے کہ انسان کو اس کی ذات کے اعتبار سے یا خارجی دنیا کے اعتبار سے جو چیزیں ملی ہیں، ان میں سے ہر چیز اس کے لیے عظیم نعمت (great blessing) ہے۔ انسان سے یہ مطلوب ہے کہ وہ چیزوں کو فارگرانٹیڈ (for granted) نہ لے، بلکہ وہ ان کو شعوری طور پر دریافت کرے۔ وہ ان نعمتوں کے لیے کامل معنوں میں خالق کا اعتراف (acknowledgement) کرے۔

شکر دراصل اعتراف کا دوسرا نام ہے۔ نعمت کے ملنے پر منعم کا اعتراف سب سے بڑی عبادت ہے۔ اور یہی عبادت وہ چیز ہے جو کسی انسان کو جنت کا مستحق بنائے گی۔ نعمت کا احساس کس طرح ہوتا ہے۔ انسان کے اندر خالق نے ایک فیکلٹی رکھی ہے، اس کو احساسِ لذت (sense of enjoyment) کہتے ہیں۔

کائنات میں انسان واحد مخلوق ہے جو لذت کا احساس رکھتا ہے۔ موجودہ دنیا میں انسان کو عارضی طور پر اِسی لیے رکھا گیا ہے کہ وہ لذتوں کو محسوس کرکے خدا کا شکر ادا کرے۔ جو انسان اِس دنیا میں حقیقی شکر کا ثبوت دے گا، وہ اگلی دنیا میں ابدی جنت میں بسایا جائے گا، جہاں وہ اپنے احساسِ لذت کی کامل تسکین پاسکے۔ موجودہ دنیا انسان کے لیے عارضی شکر کا مقام ہے۔ یہی عارضی شکر وہ قیمت ہے جو کسی انسان کو ابدی جنت میں داخلے کا مستحق بناتی ہے۔

صبر وشکر

اکتوبر 1988 میں میرا کابل کے لیے ایک سفر ہوا۔ میں نظام الدین ویسٹ نئی دہلی اپنے آفس سے ایر پورٹ کے لیے روانہ ہوا تو سڑک کے دونوں طرف سرسبز درختوں کی قطاریں مسلسل چلی جارہی تھیں۔ اس کو دیکھ کر مجھے شارجہ کا ایک صحرائی منظر یاد آیا۔ 1984 کے شارجہ کے سفر میں الشیخ علی المحویتی (قاضی شارجہ) مجھے اپنے رہائشی مکان پر لے گئے تھے جو شہر سے تقریباً 25 کیلومیٹر کے فاصلہ پر واقع تھا۔ یہ سفر پورا کا پورا صحرا کے ریتیلے میدان میں طے ہوا تھا۔ دہلی کا سفر سرسبز ماحول میں تھا تو شارجہ کا یہ سفر صحرائی ماحول میں۔ اس دنیا میں ''درخت'' اس لیے ہیں کہ آدمی ان کو دیکھ کر شکر کرے، اور ''صحرا'' اس لیے ہیں کہ آدمی ان کو دیکھ کر صبر کرنا سیکھے۔ آدمی دونوں قسم کی چیزوں کو دیکھتا ہے مگر وہ ان سے نہ شکر کا سبق لیتا ہے اور نہ صبر کا۔

مومن انسان کا معاملہ اس کے برعکس ہوتا ہے۔ صحابیٔ رسول صہیب رومی (وفات 38ھ) کی ایک روایت سے سمجھا جا سکتا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ مومن کا معاملہ بڑا عجیب ہے۔ اس کا ہر معاملہ اس کے لیے خیر ہے۔ اور ایسا مومن کے سوا کسی اور کے لیے نہیں۔ اگر اس کو آرام ملتا ہے تو (وہ اللہ کی حمد کرتا ہے، اور) شکر کرتا ہے۔ پس وہ اس کے لیے خیر بن جاتا ہے۔ اور اگر اس پر مصیبت آتی ہے تو وہ (اللہ کی حمد کرتا ہے، اور) صبر کرتا ہے۔ پس وہ اس کے لیے خیر بن جاتا ہے:

عَنْ صُهَيْبٍ، قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: عَجَبًا لِأَمْرِ الْمُؤْمِنِ، إِنَّ أَمْرَهُ كُلَّهُ خَيْرٌ، وَلَيْسَ ذَاكَ لِأَحَدٍ إِلَّا لِلْمُؤْمِنِ، إِنْ أَصَابَتْهُ سَرَّاءُ (وفی روایة لاحمد: حَمِدَ رَبَّهُ وَ) شَكَرَ، فَكَانَ خَيْرًا لَهُ، وَإِنْ أَصَابَتْهُ ضَرَّاءُ، (وفی روایة لاحمد: وَإِنِ أَصَابَتْهُ مُصِيبَةٌ حَمِدَ رَبَّهُ وَ) صَبَرَ فَكَانَ خَيْرًا لَهُ (صحیح مسلم، حدیث نمبر 2999؛ مسند احمد، حدیث نمبر 1487)۔

The affair of the believer is truly strange. Every situation proves good for him and this is special to a believer alone. If he finds himself in a pleasant situation, he is thankful to God, and that is good for him. If he is faced with unpleasant situation he keeps patience and again that is good for him.

اللہ کی حمد وہی کرسکتا ہے جو منفی نفسیات سے خالی ہو۔ مومن کے ساتھ دوطرفہ خیر کا یہ معاملہ کسی پراسرار سبب سے نہیں ہوتا، وہ مکمل طور پر ایک معلوم سبب کے تحت پیش آتا ہے۔ اصل یہ ہے کہ مومن اس انسان کا نام ہے جس کو دریافت کی سطح تک خدا کی معرفت حاصل ہوئی ہو۔ ایسے انسان کے اندر ایک ذہنی انقلاب آجاتا ہے۔ اس کے اندر شعوری بیداری کی صفت پیدا ہوجاتی ہے۔ وہ اس قابل ہوجاتا ہے کہ معاملات اور تجربات کو حقیقت کی نظر سے دیکھے۔ وہ وقتی جذبات سے بلند ہوکر معاملہ کی گہرائی کو سمجھ سکے۔

مومن اپنی اس حقیقت شناسی کی بنا پر اس قابل ہوجاتا ہے کہ وہ جس تجربہ سے بھی گزرے وہ اس کو مثبت نتیجہ میں تبدیل کرسکے۔ وہ ہر واقعہ میں خدا کی کارفرمائی کو دیکھے۔ وہ ذاتی تجربہ کو خدا کے تخلیقی نقشہ میں رکھ کر دیکھ سکے۔ مومن کی یہی وہ صفات ہیں جو اس کے اندر یہ بامعنٰی صلاحیت پیدا کردیتی ہیں کہ اس کو جب خوشی اور راحت کا تجربہ ہوتو وہ سرکش نہ بن جائے۔ وہ اس کو خدا کا عطیہ سمجھ کر خدا کی خدائی کا اعتراف کرے۔ اسی اعتراف خداوندی کا نام شکر ہے۔ شکر بلاشبہ ایک عظیم عبادت ہے۔

تاہم دنیا کی زندگی میں آدمی کو ہمیشہ خوش گوار تجربے نہیں ہوتے۔ بار بار ایسا ہوتا ہے کہ آدمی کو ناخوش گوار تجربات سے گزرنا پڑتا ہے۔ اس وقت مومن کی شعوری بیداری اس کو اس سے بچالیتی ہے کہ وہ اس پر شکایت یا فریاد کرنے لگے۔ وہ ناخوش گوار تجربہ کو خدا کے تخلیقی نقشہ کے مطابق سمجھتا ہے۔ وہ ناخوش گوار تجربہ کو ایک فطری عمل سمجھ کر اس سے یہ یقین حاصل کرتا ہے کہ یہ ایک وقتی چیز ہے۔ حالات یقیناً بدلیں گے اور وہ جلد ہی مجھ کو زیادہ بہتر زندگی

عطا کریں گے، خواہ آج کی دنیا میں یا آج کے بعد بننے والی دوسری ابدی دنیا میں۔

حقیقت یہ ہے کہ صبر بھی شکر ہی کی ایک صورت ہے۔ ناخوش گوار صورت حال کو رضامندی کے ساتھ قبول کرنا اور اس کو خدا کی طرف سے آیا ہوا مان کر مثبت ذہن کے تحت اس کا استقبال کرنا یہی صبر ہے۔ اور یہ صبر ہمیشہ شاکرانہ قلب سے ظاہر ہوتا ہے۔ ناشکری سے بھرا ہوا دل کبھی صبر کا ثبوت نہیں دے سکتا۔

شکر کی تربیت

شکر کا مزاج کیسے پیدا ہوتا ہے، اس کو ایک واقعہ سے سمجھا جا سکتا ہے۔ ایک صاحب سے ملاقات ہوئی۔ دوران گفتگو انھوں نے کہا کہ ہمارے یہاں اسلامی ذہن بنانے کے لیے بے شمار سرگرمیاں جاری ہیں، مگر پچاس سالہ کوششوں کے باوجود اب تک اسلامی انداز میں لوگوں کی ذہنی تربیت نہ ہوسکی۔ میں نے کہا کہ مجھے آپ کے بیان کے نصف ثانی سے اتفاق ہے۔ مگر مجھے اس کے نصف اول سے اتفاق نہیں۔ صرف اسلام کا نام لینے سے اسلامی تربیت نہیں ہوتی۔ اصل یہ ہے کہ اسلامی ذہن بنانے کے لیے صحیح رخ میں کوشش نہیں کی گئی۔ جب سمت درست نہ ہو تو مطلوب نتیجہ کیسے نکل سکتا ہے۔ اسلامی مزاج بنانے کی ابتدا خدا کی معرفت اور خدا کے شکر کا مزاج پیدا کرنے سے ہوتی ہے۔

یہ مزاج کیسے پیدا ہوتا ہے۔ اس کو ایک مثال سے سمجھا جا سکتا ہے۔ پاکستان سے شائع ہونے والے پندرہ روزہ المنبر کے شمارہ 25 ستمبر 1991ء میں "ضیاء الحق شہید فاؤنڈیشن" کے زیر اہتمام ہونے والی کانفرنس کا تفصیلی تذکرہ کیا گیا تھا۔ اس میں یہ بھی کہا گیا تھا کہ "ضیاء الحق فاونڈیشن کو فوری طور پر قوم کے کردار اور فکر کی تہذیب وتربیت کا کام شروع کرنا چاہیے"۔

مگر محض اس طرح اسلام کا نام لینے سے خدا کی معرفت اور اسلامی کردار پیدا نہیں ہوسکتا۔ اس کے لیے ضرورت ہوتی ہے کہ لوگوں کو حیات وکائنات کا اس طرح مطالعہ کرایا جائے کہ

ان کے گردو پیش کی پوری دنیا ان کے لیے رزق ربانی کا دسترخوان بن جائے، تاکہ انسان خدا کی بلیسنگ کے ذریعہ خدا کی معرفت حاصل کرے، اور خدا کا شکر گزار بنے۔ مگر مذکورہ میگزین میں سابق صدر جنرل ضیاء الحق صاحب کے تذکرہ کے تحت درج ہے کہ "یہ شہید صدر ہی تھے جن کی بدولت (سویت یونین ٹوٹنے کے بعد) قرآن مجید کے لاکھوں نسخے روس میں تقسیم ہوتے رہے" (صفحہ 22)۔ المنبر میں دعوتی عمل کے واقعہ کو تمام تر ایک انسان کی بدولت ظہور میں آنے والا واقعہ بتایا گیا ہے۔

اسی واقعہ کا ذکر الرسالہ (نومبر 1990، صفحہ 27) میں بھی کیا گیا۔ سوویت سسٹم کا تجزیہ کرتے ہوئے راقم الحروف نے لکھا کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی اعلیٰ تدبیروں کے ذریعہ حالات میں وہ تبدیلی پیدا کی جس کے نتیجہ میں سوویت یونین کی آہنی دیواریں ٹوٹ گئیں اور وہاں اسلام کا داخلہ ممکن ہو گیا۔

کوئی واقعہ پیش آئے تو اس کو دیکھنے کے دو طریقے ہیں — اس واقعہ کو اکابر قوم یا قومی ہیرو کے خانے میں ڈال کر دیکھنا۔ اس کے برعکس، دوسرا طریقہ ہے اس واقعہ کو خدا کے خانہ میں ڈال کر دیکھنا۔ الرسالہ کے مضمون کو پڑھ کر آدمی کے اندر شکر خداوندی کا جذبہ امنڈے گا۔ مزید اس کے اندر یہ جذبہ ابھرے گا کہ موجودہ زمانہ میں اسلامی دعوت کے نئے امکانات پیدا ہوئے ہیں، ہم کو چاہیے کہ ہم ان کو استعمال کریں۔ جب کہ المنبر کے بیان سے صرف ہیرو ورشپ کا جذبہ ابھرے گا، اس کے سوا اور کچھ نہیں۔ اس سے آپ اندازہ کر سکتے ہیں کہ اسلامی تربیت کے لیے مسلمانوں کا موجودہ طریقہ کس طرح ناکافی ہے۔

سب کچھ خدا کا عطیہ

1938 میں عرب میں پٹرولیم کی دریافت ہوئی۔ اس کے بعد عربوں کی زندگی کا نقشہ بدل گیا۔ ایک عرب بدو کا واقعہ ہے، وہ پہلے معمولی خیمے میں رہتا تھا۔ اُس کی زندگی کا انحصار

تمام تراونٹ کے اوپر تھا، پھر اچانک اُس کے پاس پٹرول کی دولت آ گئی۔ اس کے ایک دوست نے اس کے لیے سوئٹزرلینڈ میں جدید طرز کا ایک شان دار مکان خریدا۔ عرب بدو ہوائی جہاز سے سفر کر کے وہاں پہنچا اور اپنے خوب صورت مکان کو دیکھا تو اس کو یقین نہیں آتا تھا کہ یہ اُسی کا مکان ہے۔ اس کو ایسا محسوس ہوا جیسے کہ وہ کوئی خواب دیکھ رہا ہے۔

وہ اپنے مکان کی دیوار اور اس کے فرنیچر کو ہاتھ سے چھو کر دیکھتا تھا کہ وہ سچ مچ اپنے مکان میں ہے، یا وہ خواب میں کوئی تصوراتی محل دیکھ رہا ہے۔ بہت دیر کے بعد جب اس کو یقین ہوا کہ یہ ایک حقیقی مکان ہے اور وہ اُسی کا اپنا مکان ہے تو وہ خوشی کے آنسوؤں کے ساتھ سجدے میں گر پڑا اور دیر تک اِسی حالت میں پڑا رہا۔

یہ کیفیت جو ایک عرب بدو کے اوپر گزری، یہی کیفیت ہر انسان کے اوپر بہت زیادہ بڑے پیمانے پر گزرنا چاہیے۔ اس لیے کہ موجودہ دنیا کی صورت میں ہر انسان کو وہی چیز ملی ہوئی ہے، جو عرب بدو کو سوئٹزرلینڈ کے مکان کی صورت میں ملی۔ سوئٹزرلینڈ کا مکان عرب بدو کے لیے جتنا عجیب تھا، اس سے بے شمار گُنا زیادہ عجیب موجودہ کائنات ہے جو کوئی قیمت ادا کیے بغیر ہر اِنسان کو ہر لمحہ ملی ہوئی ہے۔ ہر انسان کا کیس مزید اضافے کے ساتھ وہی ہے جو مذکورہ عرب بدو کا کیس تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ ہر انسان، کامل طور پر عاجز اور محروم انسان ہے۔ اس فطری حقیقت کو قرآن میں اس طرح بیان کیا گیا ہے: اے لوگو! تم سب اللہ کے محتاج ہو (35:15)۔ پھر اس کو موجودہ دنیا کی صورت میں سب کچھ دے دیا جاتا ہے۔ فطرت اپنے تمام خزانوں کے ساتھ تاحیات اس کی خدمت گزار بن جاتی ہے۔

انسان کا پیدا ہونا ایک حیرت ناک عجوبہ ہے۔ انسان اگر اپنے بارے میں سوچے تو وہ ایک ایک چیز پر دہشت زدہ ہو کر رہ جائے گا۔ ایک ایسا انسان جو زندگی رکھتا ہے، جس کے اندر دیکھنے اور سننے کی صلاحیت ہے، جو سوچتا ہے اور چلتا ہے، جو منصوبہ بناتا ہے اور اس کو

اپنے حسب منشا عمل میں لاتا ہے۔ یہ سب اتنی زیادہ انوکھی صفات ہیں جو انسان کو اپنے آپ بلا قیمت ملی ہوئی ہیں۔ انسان اگر اِس پر سوچے تو وہ شکر کے احساس میں ڈوب جائے۔

پھر یہ دنیا جس کے اندر انسان رہتا ہے، وہ حیرت ناک حد تک ایک موافقِ انسان دنیا ہے۔ زمین جیسا کُرہ ساری وسیع کائنات میں کوئی دوسرا نہیں۔ یہاں پانی ہے، یہاں سبزہ ہے، یہاں ہوا ہے، یہاں دھوپ ہے، یہاں کھانے کا سامان ہے اور دوسری اَن گنت چیزیں خالق کے یک طرفہ عطیے کے طور پر موجود ہیں۔ یہ چیزیں زمین کے سوا کہیں اور موجود نہیں۔

اگر آدمی اِس حقیقت کو سوچے تو وہ مذکورہ عرب بدو کی طرح، شکر کے احساس سے، سجدے میں گر پڑے، مگر ایسا نہیں ہوتا۔ اِس کا سبب یہ ہے کہ انسان دنیا کی چیزوں کو فار گرانٹیڈ (for granted) لیے رہتا ہے۔ وہ شعوری یا غیر شعوری طور پر یہ سمجھتا ہے کہ جو کچھ ہے، اُس کو ہونا ہی چاہیے۔ جو کچھ اُس کو ملا ہوا ہے، وہ اُس کو ملنا ہی چاہیے۔ یہی وہ مقام ہے جہاں انسان کا امتحان ہے۔

انسان کو چاہیے کہ وہ اِس معاملے میں اپنے شعور کو زندہ کرے۔ وہ بار بار سوچ کر اِس حقیقت کو سمجھے کہ وہ سراپا ایک عاجز مخلوق ہے۔ اس کو جو کچھ ملا ہوا ہے، وہ مکمل طور پر خدا کے دینے سے ملا ہے۔ خدا اگر نہ دے تو اُس کو کچھ بھی ملنے والا نہیں۔ جو چیزیں انسان کو بظاہر اپنے آپ مل رہی ہیں، اُن کو وہ اِس طرح لے، جیسے کہ وہ ہر وقت براہِ راست خدا کی طرف سے بھیجی جا رہی ہیں۔ وہ ملی ہوئی چیزوں کو دی ہوئی چیزوں کے طور پر دریافت کرے۔

خدا کا مطلوب انسان وہ ہے جو اپنے ذہن کو اتنا زیادہ بیدار کرے کہ وہ بظاہر اسباب کے تحت ملنے والے سامانِ حیات کو بلا اسباب خدا کی طرف سے ملا ہوا سمجھے، وہ معمول (usual) کو خلافِ معمول (unusual) کے طور پر دیکھ سکے، وہ غیب کو شُہود کے درجے میں دریافت کرے۔ یہی وہ لوگ ہیں جن کو آخرت میں خدا کا دیدار نصیب ہوگا اور یہی وہ لوگ ہیں جو خدا کے پڑوس میں بنائی جانے والی ابدی جنت میں جگہ پائیں گے۔

شکر کے دو درجے

اِس دنیا میں انسان کو اپنے وجود سے لے کر لائف سپورٹ سسٹم تک جو چیزیں ملی ہیں، وہ سب کا سب اللہ کا عطیہ ہیں۔ انسان کے لیے ضروری ہے کہ وہ اپنے پورے دل وجان کے ساتھ اِن کے منعم (giver) کا اعتراف کرے۔ اِس اعتراف کا مذہبی نام 'شکر' ہے۔ اِس کے دو درجے ہیں — ایک، نارمل شکر یا نارمل اعتراف (normal acknowledgement)۔ دوسرا، تخلیقی شکر یا تخلیقی اعتراف (creative acknowledgement)۔ نارمل شکر کی مثال یہ ہے کہ آپ کو پیاس لگی۔ آپ نے گلاس میں پانی لے کر اس کو پیا۔ اِس سے آپ کو سیرابی حاصل ہوئی اور پھر آپ نے کہا کہ خدایا، تیرا شکر ہے کہ تو نے مجھ کو پانی دیا جس سے میں اپنی پیاس بجھاؤں۔

تخلیقی شکر کی مثال یہ ہے کہ آپ نے جب پانی پیا تو آپ کو پانی کی وہ پوری تاریخ یاد آ گئی جو جدید سائنس نے دریافت کی ہے، یعنی تقریباً 15 بلین سال پہلے وسیع خلا میں بے شمار ستارے (stars) وجود میں آئے۔ پھر ایک عرصے کے بعد لٹل بینگ (little bang) ہوا، جس سے موجودہ نظامِ شمسی وجود میں آیا۔ اِس کے بعد زمین کی سطح پر بہت بڑی مقدار میں ہائڈروجن گیس اور آکسیجن گیس کے بادل چھا گئے، پھر دو گیسوں کے ملنے سے وہ استثنائی چیز وجود میں آئی جس کو "پانی" کہا جاتا ہے۔ پھر یہ پانی سمندروں میں کھاری پانی کی حیثیت سے جمع ہو گیا، پھر بارش کے نظام کے تحت، اِس کھاری پانی کا ازالۂ نمک (desalination) ہوا۔ اِس طرح ہمیں وہ میٹھا پانی حاصل ہوا جس سے ہم اپنی پیاس بجھائیں اور دوسرے کام کریں۔ مثلاً زراعت، وغیرہ۔

پانی کے معاملے میں پہلی صورت نارمل شکر کی ہے اور دوسری صورت تخلیقی شکر کی۔ دوسرے الفاظ میں، پہلا شکر اگر صرف شکر ہے تو دوسرا شکر برتر شکر۔ شکر اور برتر شکر کا یہی معاملہ دوسری تمام چیزوں کے بارے میں پیش آتا ہے۔

اِسی طرح اِس معاملے کی ایک مثال خون (blood) ہے۔ انسان جو غذا اپنے جسم میں داخل کرتا ہے، وہ ایک پیچیدہ نظام کے تحت خون میں تبدیل ہوتی ہے، پھر یہ خون ایک اور پیچیدہ نظام کے تحت سارے جسم میں رگوں کے ذریعے مسلسل دوڑتا ہے۔ یہ بلاشبہ ربوبیت کے نظام کی ایک اعلیٰ مثال ہے۔ خون کا بننا، خون کا مسلسل گردش کرنا اور خون کی صفائی کا انتظام، وغیرہ۔ یہ سب چیزیں انسان کو خدا کی نعمتیں یاد دلاتی ہیں اور وہ اللہ کے لیے سراپا شکر میں ڈھل جاتا ہے۔

قدیم زمانے میں خون کا تصور صرف یہ تھا کہ وہ ایک سرخ سیال ہے جو جسم کی طاقت کے لیے جسم کے اندر گردش کرتا رہتا ہے۔ پھر یہ دریافت ہوئی کہ خون دو قسم کے ذرات سے مل کر بنتا ہے — سرخ ذرات (red blood corpuscles)، اور سفید ذرات (white blood corpuscles)۔ اب یہ دریافت ہوئی ہے کہ خون میں اِس کے سوا، ایک اور خوردبینی ذرہ ہوتا ہے۔ اس کو پلیٹ لیٹس (platelets) کا نام دیا گیا ہے۔ یہ تیسرا ذرہ انسان کی زندگی اور صحت کے لیے بے حد اہم ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ خون ہر اعتبار سے، اللہ تعالیٰ کی ایک عظیم نعمت ہے۔ اِس نعمت کا احساس آدمی کے اندر شکر وحمد کے چشمے جاری کر دیتا ہے۔

اِس قسم کے بے شمار انتظامات ہیں جن کے اوپر انسان کی زندگی قائم ہے۔ یہ نظام براہِ راست خدا کی قدرت کے تحت قائم ہے اور اِسی کو قرآن میں ربوبیت کہا گیا ہے۔ یہ نظامِ ربوبیت تمام تر اللہ کی جانب سے قائم ہے۔ انسان سے یہ مطلوب ہے کہ وہ ربوبیت کے اِس نظام سے واقفیت حاصل کرے اور پورے معنوں میں اللہ کا شاکر بندہ بن کر اِس دنیا میں رہے۔

قرآن میں بتایا گیا ہے کہ رب صرف اللہ ہے اور اُسی کی ربوبیت اِس دنیا میں قائم ہے (6:164)۔ اِسی طرح فرمایا کہ حکم صرف اللہ کا ہے اور تمام چیزیں اُسی کے زیر حکم

ہیں (12:40)۔ یہ دونوں الفاظ (رب اور حکم) اللہ کی ذات کی نسبت سے قرآن میں آئے ہیں، اس کا کچھ بھی تعلق سیاسیات یا معاشیات سے نہیں ہے۔ مگر موجودہ زمانے میں کچھ لوگوں نے یہ کیا کہ انھوں نے مذکورہ الفاظ قرآن سے لیے اور اس کے اندر اپنے خودساختہ مفہوم کو شامل کردیا۔ یہ گویا کہ 'رب' اور 'حکم' کے لفظ کو سیاسی بنانا (politicisation) تھا۔ قرآنی الفاظ میں اِس قسم کا خودساختہ مفہوم شامل کرکے انھوں نے یہ اعلان کیا کہ مسلمان کا یہ مشن ہے کہ وہ دنیا میں نظامِ ربوبیت یا نظامِ حاکمیت قائم کرے۔ یہ بلاشبہ ایک غیر علمی بات ہے۔ اس کی غلطی اتنی زیادہ واضح ہے کہ وہ بداہۃً ہی قابلِ رد ہے۔

جذباتِ شکر کی بیداری

حضرت عبد اللہ بن عمر سے روایت ہے، وہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے روزہ رکھ کر شام کو پانی سے افطار کیا تو آپ کی زبان سے یہ الفاظ نکلے: ذَهَبَ الظَّمَأُ وَابْتَلَّتِ الْعُرُوقُ، وَثَبَتَ الْأَجْرُ إِنْ شَاءَ اللّٰهُ (سنن ابو داؤد، حدیث نمبر 2357)۔ یعنی، پیاس چلی گئی اور رگیں تر ہوگئیں اور روزے کا اجر ان شاء اللہ ثابت ہوگیا۔

پانی ایک غیر معمولی قسم کی نعمت ہے۔ پانی پر انسانی زندگی کا انحصار ہے۔ پانی نہیں تو زندگی نہیں۔ مگر عام حالات میں پانی کی اِس خصوصی نعمت کا احساس نہیں ہوتا۔ مگر ایک آدمی جب روزہ رکھ کر سارے دن پانی کا استعمال نہ کرے اور اُس پر پیاس کا تجربہ گزرے، اُس وقت جب آدمی پانی پیتا ہے تو اس کو محسوس ہوتا ہے کہ پانی کیسی عجیب نعمت ہے۔

اُس وقت آدمی کے تمام احساسات جاگ اٹھتے ہیں۔ وہ سوچتا ہے کہ کس طرح دو گیسوں کے ملنے سے سیال (liquid) پانی بن گیا۔ اتھاہ مقدار میں پانی کے ذخیرے زمین کے اوپر جمع ہوگئے، پھر پانی سے زندگی کی تمام ضرورتیں پوری ہوگئیں۔ انھیں میں سے ایک یہ ہے کہ

پانی آدمی کی پیاس کو بجھا کر اس کے لیے زندگی کا سبب بنتا ہے۔ یہ احساسات جب جاگتے ہیں تو نہ صرف یہ ہوتا ہے کہ آدمی کی پیاس بجھتی ہے، بلکہ اِسی کے ساتھ شکرِ خداوندی کا ایک دریا آدمی کے اندر رواں ہوجاتا ہے۔

اللہ، انسان کا منعمِ حقیقی ہے۔ اللہ نے انسانوں کو ان گنت نعمتیں عطا کی ہیں۔ ان نعمتوں پر اللہ کا حقیقی شکر ادا کرنا، اللہ کی سب سے بڑی عبادت ہے۔ روزہ کے ذریعہ جب انسان کے اندر ان نعمتوں کا احساس جگایا جاتا ہے تو آدمی کا شعور بیدار ہوجاتا ہے۔ وہ غفلت سے باہر آجاتا ہے۔ وہ احساسِ نعمت سے سرشار ہوکر حقیقی معنوں میں اللہ کا شکر گزار بندہ بن جاتا ہے۔ روزہ، جذباتِ شکر کی بیداری کا ذریعہ ہے۔ انسان ہر وقت انعاماتِ خداوندی کے سمندر میں رہتا ہے، مگر عام حالات میں اس کو ان نعمتوں کا شعوری احساس نہیں ہوتا۔ روزہ آدمی کو اس قابل بناتا ہے کہ وہ اِن نعمتوں کو ازسرِ نو دریافت کر کے اپنے رب کی اعلیٰ معرفت حاصل کرے۔

شکر کا احساس

اگر آپ لذیذ کھانا کھائیں اور اس کو کھا کر لپ سروس کے طور پر الحمد للہ کہیں تو یہ حیوانی درجے کا شکر ہے۔ کیوں کہ یہ مشاہدہ اور ذائقہ پر مبنی ہے، اور مشاہدہ اور ذائقہ کے درجے کا شکر صرف حیوانی درجے کا شکر ہے، وہ اعلیٰ انسانی درجے کا شکر نہیں۔

اعلیٰ درجے کا شکر یہ ہے کہ جب کھانا آپ کے سامنے آئے تو اس کو دیکھ کر خدا کا پورا تخلیقی نظام آپ کو یاد آجائے۔ آپ سوچیں کہ یہ تمام غذائی چیزیں پہلے غیر غذائی چیزیں تھیں۔ خدا نے ایک برتر عمل (process) کے ذریعے ایک عظیم واقعہ برپا کیا۔ وہ تھا غیر غذا (non-food) کو غذا (food) میں تبدیل کرنا۔ اِس طرح ایک کائناتی عمل کے ذریعے یہ تمام غذائی چیزیں وجود میں آئیں۔

پھر آپ یہ سوچیں کہ یہ غذائی چیزیں اپنی ابتدائی صورت میں میرے لیے توانائی (energy) کا ذریعہ نہیں ہوسکتی تھیں۔ چنانچہ خدا نے مزید یہ کیا کہ اُس نے میرے جسم کے اندر ایک پیچیدہ قسم کا نظام ہضم (digestive system) رکھ دیا۔ یہ نظامِ ہضم ایک خود کار نظام ہے۔ جب میں کوئی چیز کھاتا ہوں تو یہ نظام ہضم اِن غذائی چیزوں کو حیرت انگیز طور پر زندہ خلیات (living cells) میں تبدیل کر دیتا ہے، پھر یہ زندہ خلیات میرے جسم میں گوشت اور خون جیسی چیزوں میں ڈھل جاتے ہیں۔ یہ سوچ کر آپ کے اندر شکر کا گہرا احساس پیدا ہوگا، جس کو الفاظ میں ظاہر کرنے کے لیے آپ خود کو عاجز پائیں گے۔

اِس مثال سے اندازہ ہوتا ہے کہ انسانی شکر کیا ہے اور حیوانی شکر کیا۔ اگر آپ کے اندر صرف حیوانی درجے کا شکر ہے تو آپ ہمیشہ ناشکری کے احساس میں جئیں گے۔ شکر کے اعلیٰ احساس میں جینے کے لیے انسانی درجے کا جذبۂ شکر درکار ہے۔ مگر یہی وہ چیز ہے جو دنیا میں سب سے زیادہ کم پائی جاتی ہے: وَقَلِيلٌ مِنْ عِبَادِيَ الشَّكُورُ (34:13)۔ یعنی، اور میرے بندوں میں کم ہی شکر گزار ہیں۔ انسان سے اللہ تعالیٰ کو جو شکر مطلوب ہے، وہ انسانی درجے کا شکر ہے۔ صرف حیوانی درجے کا شکر انسان جیسی مخلوق سے قابلِ قبول نہیں ہوسکتا۔

اعلیٰ شکر

قرآن کے مطابق، شیطانی اغوا کا اصل نشانہ یہ ہے کہ وہ انسان کو شکر کے راستے سے ہٹا دے (7:17)۔ ہدایت اور گم راہی دونوں کا اصل خلاصہ یہی ہے۔ ہدایت یہ ہے کہ آدمی شکر کے احساس میں جینے والا ہو۔ اِس کے مقابلے میں، گم راہی یہ ہے کہ آدمی کا دل شکر کے جذبات سے خالی ہوجائے۔ شیطان یہی کام ہمیشہ کرتا رہا ہے، لیکن بعد کے زمانے میں شیطان کے لیے یہ ممکن ہوجائے گا کہ وہ لوگوں کو زیادہ بڑے پیمانے پر شکرِ خداوندی کے راستے سے ہٹا سکے۔ اِسی لیے حدیث میں اِس فتنے کو دجّال یا دجّالیت سے تعبیر کیا گیا ہے۔

شکر کیا ہے۔ شکر دراصل، خدا کی نعمتوں کے اعتراف (acknowledgement) کا دوسرا نام ہے۔ یہ شکر ہر زمانے میں انسان سے مطلوب تھا۔ پچھلے زمانے میں بھی اور موجودہ زمانے میں بھی۔ کسی انعام پر مُنعم کا اعتراف کرنا، ایک فطری انسانی جذبہ ہے۔ لیکن اعتراف کے لیے ہمیشہ کسی پوائنٹ آف ریفرنس (point of reference) کی ضرورت ہوتی ہے۔ مثلاً جب آپ کھانے کی کوئی چیز کھاتے ہیں، تو آپ کو فوڈ آئٹم کی صورت میں شکر، یا اعتراف کا ایک پوائنٹ آف ریفرنس مل جاتا ہے اور آپ کہتے ہیں کہ خدایا، تیرا شکر ہے کہ تو نے مجھے یہ چیز کھانے کے لیے عطا کی۔

لیکن ایک شخص جو جدید علم نباتات (Botany) اور جدید علم زراعت (Agriculture) اور جدید علم باغبانی (Horticulture) سے واقف ہو، اس کے لیے یہ ممکن ہوجائے گا کہ وہ کسی فوڈ آئٹم کی معنویت کو ہزاروں گُنا زیادہ اہمیت کے ساتھ دریافت کرسکے۔ اِس طرح اس کا احساسِ شکر، عام انسان کے مقابلے میں بہت زیادہ بڑھ جائے گا۔ جب وہ کہے گا کہ خدایا، تیرا شکر ہے کہ تو نے مجھے کھانے کے لیے یہ فوڈ آئٹم دیا، تو وہ ایک عظیم اہتزاز (super thrill) کے جذبے کے تحت، وہ الفاظ بولے گا جس کا تجربہ پہلے کسی انسان کو نہیں ہوسکتا تھا۔ پہلا شخص جس حقیقت کو صرف ذائقہ لسانی کی سطح پر جانے گا، دوسرا شخص اس کو وسیع تر علم سائنس کی سطح پر دریافت کرے گا۔ پہلے شخص کا اعتراف اگر ایک سادہ اعتراف ہوگا، تو دوسرے شخص کا اعتراف ایک ہمالیائی اعتراف بن جائے گا۔

شکرِ قلیل، شکرِ کثیر

ایک روایت کے مطابق، پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: مَنْ لَمْ یَشْکُرِ الْقَلِیلَ، لَمْ یَشْکُرِ الْکَثِیرَ (مسند احمد، حدیث نمبر 18449)۔ یعنی، جو شخص کم پر شکر نہیں کرے گا، وہ زیادہ پر بھی شکر نہیں کرے گا۔ اِس حدیثِ رسول میں فطرت کے

ایک قانون کو بتایا گیا ہے۔ وہ قانون یہ ہے کہ چھوٹے واقعے کو یاد کرنے سے بڑے بڑے واقعات ذہن میں تازہ ہوجاتے ہیں۔

نفسیاتی مطالعہ بتاتا ہے کہ انسان کے دماغ میں بہت سے الگ الگ فولڈر (folder) ہوتے ہیں۔ مثلاً محبت کا فولڈر، نفرت کا فولڈر، اعتراف (acknowledgement) کا فولڈر، ظلم کا فولڈر، وغیرہ۔ جو چیزیں انسان کے تجربے اور مشاہدے میں آتی ہیں، اُن کو دماغ الگ الگ کرکے ان کے متعلق فولڈر میں ڈالتا رہتا ہے۔ آدمی جب کسی ایک واقعے سے متاثر ہوتو اُس وقت انسان کا دماغ ٹریگر (trigger) ہوجاتا ہے اور پھر فوری طور پر ایسا ہوتا ہے کہ اُس سے متعلق (relevant) فولڈر کھل جاتا ہے اور اس نوعیت کے تمام واقعات آدمی کے ذہن میں تازہ ہوجاتے ہیں۔

فطرت کا یہ قانون شکر اور اعتراف کے معاملے میں بھی بے حد اہمیت رکھتا ہے۔ مثلاً آج آپ کو ایک موبائل ملا۔ اُس سے آپ نے کسی دوسرے مقام پر موجود ایک شخص سے بات کی۔ اُس وقت آپ نے سوچا کہ پہلے زمانے میں ایک آدمی کو کسی دوسرے پر موجود آدمی سے رابطہ قائم کرنے میں کتنی مشکلیں پیش آتی تھیں۔ اِس پر آپ نے گہرے تاثر کے ساتھ خدا کا شکر ادا کیا تو اس کے بعد فوراً یہ ہوگا کہ آپ کا دماغ ٹریگر ہوجائے گا۔ اُسی وقت دماغ کا وہ فولڈر کھل جائے گا، جس میں آپ کی پوری زندگی میں پیش آنے والے شکر واعتراف کے تمام آئٹم محفوظ ہیں۔ فطرت کے اِس نظام کے تحت ایسا ہوتا ہے کہ شکر کے چھوٹے واقعے کی یاد، شکر کے دوسرے تمام واقعات کو یاد دلا دیتا ہے۔ اِس طرح شکر کا چھوٹا واقعہ بڑے شکر کا سبب بن جاتا ہے، یہاں تک کہ آدمی کے دل میں شکر کا چشمہ جاری ہوجاتا ہے۔ شکر کا احساس خدا سے آدمی کے تعلق کو بڑھاتا رہتا ہے، یہاں تک کہ وہ اعلیٰ معرفت کے درجے تک پہنچ جاتا ہے۔

شکر سب سے بڑی عبادت

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک حدیث مختلف کتابوں میں آئی ہے۔ مثلاً صحیح البخاری (حدیث نمبر 6490)، صحیح مسلم (حدیث نمبر 2963)، جامع الترمذی (حدیث نمبر 2513)، سنن ابن ماجہ (حدیث نمبر 4142)، وغیرہ۔ مسند احمد (حدیث نمبر 10246) کے الفاظ یہ ہیں: انْظُرُوا إِلَى مَنْ أَسْفَلَ مِنْكُمْ، وَلَا تَنْظُرُوا إِلَى مَنْ هُوَ فَوْقَكُمْ، فَهُوَ أَجْدَرُ أَنْ لَا تَزْدَرُوا نِعْمَةَ اللهِ۔ قَالَ أَبُو مُعَاوِيَةَ - عَلَيْكُم۔ یعنی، تم اس کو دیکھو جو تم سے نیچے ہے اور تم اس کو نہ دیکھو جو تم سے اوپر ہے، کیوں کہ اس طرح تم اپنے اوپر اللہ کی نعمت کو کم نہیں سمجھو گے۔

اس حدیث کی مزید تشریح ایک اور حدیث سے ہوتی ہے۔ ایک مرفوع روایت کے مطابق رسول اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: خَصْلَتَانِ مَنْ كَانَتَا فِيهِ كَتَبَهُ اللّٰهُ شَاكِرًا وَصَابِرًا، مَنْ نَظَرَ فِي دِينِهِ إِلَى مَنْ هُوَ فَوْقَهُ، وَنَظَرَ فِي دُنْيَاهُ إِلَى مَنْ هُوَ دُونَهُ، فَحَمِدَ اللّٰهَ، كَتَبَهُ اللّٰهُ شَاكِرًا صَابِرًا وَمَنْ نَظَرَ فِي دُنْيَاهُ إِلَى مَنْ هُوَ فَوْقَهُ فَأَسِفَ عَلَى مَا فَضَّلَهُ اللّٰهُ عَلَيْهِ، لَنْ يَكْتُبَهُ اللّٰهُ شَاكِرًا وَلَا صَابِرًا (مسند الشامیین للطبرانی، حدیث نمبر 505)۔ یعنی، دو صفتیں ہیں جو کسی کے اندر ہوں تو اللہ اس کو شاکر اور صابر لکھ دیتا ہے۔ جو اپنے دین کے معاملہ میں اس کو دیکھے جو اس کے اوپر ہے، اور دنیا کے معاملہ میں اس کو دیکھے جو اس سے کم ہے پھر وہ اللہ کا شکر ادا کرے، اللہ اس کو شاکر اور صابر لکھ دیتا ہے۔ اور جو اپنے دنیا کے معاملہ میں اس کو دیکھے جو اس سے بڑھ کر ہے پھر وہ اس پر افسوس کرے جو مادی برتری اللہ نے اس کے مقابل کو دی تو اللہ اس کو ہرگز شاکر و صابر نہیں لکھے گا۔

شکر سب سے بڑی عبادت ہے۔ کسی بندے سے جو چیز سب سے زیادہ مطلوب ہے وہ

یہ ہے کہ وہ اللہ کو ایک عظیم منعم کے طور پر دریافت کرے۔ اللہ کی نعمتوں کے احساس سے اس کا سینہ بھرا ہوا ہو۔ اس کی روح میں شکر کا ابدی چشمہ جاری ہو جائے۔ وہ اللہ کو ایک ایسی ہستی کے طور پر پائے جو اس پر بے پایاں نعمتوں کی بارش کر رہا ہے۔ یہ شعور اتنا زیادہ قوی ہو کہ کسی بھی حال میں اس کا سینہ شکر خداوندی کے احساس سے خالی نہ ہو۔

مگر یہ کوئی آسان بات نہیں۔ اپنے آپ کو شکر کے جذبہ سے سرشار رکھنے کے لیے یہ ضروری ہے کہ آدمی کا شعور اس معاملہ میں پوری طرح زندہ ہو۔ وہ اس کا مسلسل اہتمام کرے۔ وہ کسی ایسے خیال کو اپنے دل میں جگہ نہ دے جو اس کے جذبۂ شکر کو مجروح کرنے والا ہو۔ وہ سب کچھ برداشت کر لے مگر وہ اپنے جذبۂ شکر کا انحطاط (erosion) کبھی برداشت نہ کرے۔ موجودہ دنیا میں فطری طور پر ہمیشہ ایسا ہوتا ہے کہ لوگوں کے درمیان نابرابری قائم رہتی ہے۔ اس بنا پر ہر آدمی یہ محسوس کرتا ہے کہ مادی اعتبار سے کوئی اس سے کم ہے اور کوئی اس سے زیادہ۔ اب اگر آدمی اپنا مقابلہ اس شخص سے کرے جو بظاہر اس سے زیادہ ہے تو اس کے اندر کمتری کا احساس پیدا ہوگا اور اس کا جذبۂ شکر دب کر رہ جائے گا۔ اس لیے آدمی کو ایسا کبھی نہیں کرنا چاہیے کہ وہ اپنا موازنہ (comparison) اس سے کرے جو مادی اعتبار سے بظاہر اس سے زیادہ ہے۔ اس کے بجائے آدمی کو یہ کرنا چاہیے کہ وہ اپنا موازنہ ان لوگوں سے کرے جو مادی اعتبار سے اس سے کم ہیں۔ اس طرح اس کا جذبۂ شکر زندہ رہے گا۔ اس کا دل کبھی نعمت کے احساس سے خالی نہ ہو سکے گا۔

موجودہ دنیا میں ہمیشہ ایسا ہوتا ہے کہ تمام لوگ مادی اعتبار سے یکساں نہیں ہوتے۔ کوئی زیادہ ہوتا ہے اور کوئی کم، کوئی پیچھے ہوتا ہے اور کوئی آگے، کوئی طاقت ور ہوتا ہے اور کوئی کمزور۔ اس قسم کے تمام فرق امتحان کی مصلحت کی بنا پر ہیں۔ ان کا مقصد یہ ہے کہ آدمی مختلف قسم کے حالات سے گزرے، مگر وہ حالات سے متاثر ہوئے بغیر اپنے ایمانی شعور

کو زندہ رکھے۔ وہ ناشکری والے حالات سے دوچار ہو، پھر بھی اس کے شکر کے جذبہ میں کوئی کمی نہ آئے۔ وہ بے اعترافی کی صورتِ حال سے گزرے، مگر وہ اپنے اعتراف کی صفت کو نہ کھوئے۔ وہ منفی جذبات پیدا کرنے والے حالات سے دوچار ہو، اس کے باوجود وہ اپنے آپ کو مثبت طرزِ فکر پر قائم رکھے۔ شکر وہ سب سے قیمتی متاع ہے جس کو انسان اپنے رب کے سامنے پیش کرسکتا ہے۔ ایسی حالت میں عقل مند انسان وہ ہے جو اپنے سینہ کو شکر کے احساس سے خالی نہ ہونے دے، حتیٰکہ انتہائی غیر موافق صورت حال میں بھی۔

محرّک شکر

تقریباً تیرہ بلین سال پہلے سولر سسٹم وجود میں آیا۔ اس وقت زمین کے اوپر صرف گیس تھی۔ پھر گیس کے ذریعے پانی بنا۔ پانی کا فارمولا H_2O ہے، یعنی زمین میں ایسے مالیکیول (molecule) رکھ دیے گئے، جس میں ہائڈروجن کے دو ایٹم ہوتے تھے، اور آکسیجن کا ایک ایٹم۔ اس طرح زمین کے اوپر پانی وجود میں آیا۔ یہ پانی بڑے پیمانے پر سمندر کی گہرائیوں میں جمع ہوگیا۔ ابتدا میں نیچر نے اس پانی میں حفاظتی مادہ (preservative) کے طور پر نمک (salt) شامل کیا۔ یہ نمک آمیز پانی براہ راست طور پر انسان کے لیے قابل استعمال نہ تھا۔ پھر زمین کے اوپر سورج کی حرارت اور پانی کے تعامل سے حیرت انگیز طور پر بارش کا انتظام ہوا۔ فطری طور پر نمک کا وزن زیادہ تھا، اور پانی کا وزن کم۔ چنانچہ جب سمندر کی سطح پر سورج کی حرارت پہنچی تو سمندر کا پانی فطری قانون کے تحت ازالۂ نمک (desalination) کے پراسس سے گزرا، یعنی پانی بھاپ بن کر نمک سے الگ ہو گیا۔ نمک سمندر میں رہ گیا، اور پانی بھاپ بن کر فضا میں بلند ہوا، وہاں وہ بادل بنا اور آخرکار وہ پانی بارش کی صورت میں دوبارہ زمین پر برسا۔ اس پانی نے زمین کو سیراب کیا، اور چشموں اور دریاؤں کی صورت میں محفوظ ہوگیا۔

فطرت کے نظام کے تحت یہ ایک سائیکل (cycle) ہے، جو مسلسل طور پر جاری ہے۔ پانی کا یہی نظام ہے، جس نے زمین کو انسان کے لیے حیات بخش سیارہ بنا کر رکھا ہے۔ اگر یہ نظام نہ ہوتو انسان زمین کے اوپر زندہ سماج نہ بنا سکے۔ زمین پر تہذیب کی تشکیل پانی کے بغیر ناممکن ہو جائے۔ اس پورے عمل پر غور کیا جائے، تو اس میں حکمت کے اتنے زیادہ پہلو ہیں، جو انسان کے لیے مائنڈ باگلنگ ظاہرہ (mind-boggling phenomena) کی حیثیت رکھتے ہیں۔ قدیم زمانے کا انسان ان حقیقتوں سے بے خبر تھا، مگر اب سائنسی مطالعے کے ذریعے یہ حقیقتیں انسان کے علم میں آ گئی ہیں۔ ان حقیقتوں کو جاننا انسان کے لیے اتھاہ خزانے کی حیثیت رکھتا ہے۔ غالباً یہی وہ عظیم حقیقت ہے، جس کو قرآن میں ان الفاظ میں بیان کیا گیا ہے: وَإِنْ تَعُدُّوا نِعْمَةَ اللَّهِ لَا تُحْصُوهَا (16:18)۔ یعنی، اگر تم اللہ کی نعمتوں کو گنو تو تم ان کو گن نہ سکو گے۔

انسان کا اعتراف

عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ، قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَ سَلَّمَ: مَنْ لَمْ يَشْكُرِ النَّاسَ، لَمْ يَشْكُرِ اللّٰهَ (مسند احمد، حدیث نمبر 7504)۔ یعنی، ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ نے فرمایا: جو آدمی لوگوں کا شکر نہ کرے، وہ خدا کا شکر بھی نہیں کرے گا۔

شکر ایک کیفیت کا نام ہے۔ یہ کیفیت کسی آدمی کے دل میں پیدا ہو جائے تو وہ منقسم ہو کر نہیں رہ سکتی۔ اگر وہ ایک معاملہ میں ظاہر ہوگی تو یہ ناممکن ہے کہ وہ اسی قسم کے دوسرے معاملہ میں ظاہر نہ ہو۔ جب آدمی ایک کا شکر گزار ہوگا تو وہ دوسرے کا بھی ضرور شکر گزار ہوگا۔

بندہ کا احسان آنکھ سے دکھائی دیتا ہے، وہ ایک براہ راست تجربہ ہے۔ اس کے برعکس، خدا کا جو احسان ہے وہ ظاہری آنکھ سے دکھائی نہیں دیتا، وہ آدمی کے لیے براہِ راست تجربہ نہیں۔ خدا کے احسان کو سوچ کر جاننا پڑتا ہے۔ بندہ کے احسان کو آدمی

بذریعہ مشاہدہ جانتا ہے اور خدا کے احسان کو بذریعہ تفکر۔ جو آدمی براہِ راست مشاہدہ میں آنے والے واقعہ کا احساس نہ کر سکے، وہ ایسے واقعہ کو کیوں کر محسوس کرے گا جو بالواسطہ غور وفکر کے ذریعہ معلوم کیا جا سکتا ہے۔

کوئی احسان کرنے والا جب احسان کرتا ہے تو آدمی اس کے احسان کا اعتراف اس لیے نہیں کرتا کہ وہ سمجھتا ہے کہ اس طرح میں محسن کی نگاہ میں چھوٹا ہو جاؤں گا۔ حالانکہ ایسا کر کے وہ خود اپنا نقصان کرتا ہے۔ اس کے بعد وہ اپنے ضمیر کی نگاہ میں چھوٹا ہو جاتا ہے۔ وہ اپنے ضمیر کے نزدیک کم بن جاتا ہے۔ اور بلاشبہ اپنے ضمیر کے نزدیک کم ہونا، دوسرے کے نزدیک کم ہونے سے زیادہ سخت ہے۔

اس سے بھی زیادہ بڑا نقصان یہ ہے کہ بندوں کے احسان نہ ماننے سے آدمی کے اندر بے اعترافی کا مزاج بنتا ہے۔ اولاً وہ انسان کا اعتراف نہیں کرتا۔ اور اس کے بعد اس کا بگڑا ہوا مزاج اس کو یہاں تک لے جاتا ہے کہ وہ رب العالمین کا بھی سچا اعتراف نہیں کر پاتا۔ اور بلاشبہ اس سے زیادہ گھاٹا اٹھانے والا اور کوئی نہیں جو اپنے رب کا اعتراف کرنے سے عاجز رہے۔

اضافۂ ایمان

سائنسی اندازہ کے مطابق، سورج ہماری زمین سے تقریباً نو کروڑ تیس لاکھ میل دور ہے۔ سورج ہماری زمین سے ایک لاکھ تیس ہزار گنا بڑا ہے۔ سورج زمین کی مانند ٹھوس نہیں ہے، بلکہ وہ پورا کا پورا ایک عظیم دہکتا ہوا شعلہ ہے۔ اس کی گرمی گیارہ ہزار ڈگری فارن ہائٹ ہے۔ یہ گرمی اتنی زیادہ ہے کہ سخت ترین مادہ بھی اس میں پگھلے بغیر نہیں رہ سکتا۔ زمین اگر اس کے قریب کی جائے تو وہ ایک سکنڈ سے بھی کم عرصے میں پگھل کر گیس بن جائے گی۔

سورج کیسے چمکتا ہے اور کیسے اتنی بڑی مقدار میں وہ روشنی اور گرمی دے رہا ہے۔ قدیم خیال یہ تھا کہ سورج مسلسل جل رہا ہے، جیسے کوئی لکڑی یا کوئلہ جلتا ہے۔ مگر جب فلکیاتی

تحقیق سے معلوم ہوا کہ وہ ہزاروں ملین سال سے اسی طرح روشن ہے تو یہ خیال غلط ثابت ہوگیا۔ سورج میں اگر کوئی مادہ جل رہا ہوتا تو اب تک سورج بجھ چکا ہوتا، کیوں کہ کوئی چیز اتنی زیادہ لمبی مدت تک جلتی ہوئی حالت میں نہیں رہ سکتی۔

اب سائنس دانوں کا نظریہ یہ ہے کہ سورج کی گرمی اُسی قسم کے ایک عمل (process) کا نتیجہ ہے جو ایٹم بم کے اندر وقوع میں آتا ہے، یعنی سورج، مادہ کو توانائی میں تبدیل کرتا ہے۔ یہ عمل جلنے سے مختلف ہے۔ جلنا مادہ کو ایک صورت سے دوسری صورت میں تبدیل کرتا ہے، مگر جب مادہ کو توانائی میں بدلا جائے تو بہت زیادہ توانائی صرف تھوڑے سے مادہ کے ذریعہ حاصل کی جاسکتی ہے۔ مادہ کا ایک اونس اتنی زیادہ توانائی پیدا کرسکتا ہے جو ایک ملین ٹن سے زیادہ چٹان کو پگھلا دے:

The sun changes matter into energy. This is different from burning. Burning changes matter from one form to another. But when matter is changed into energy, very little matter is needed to produce a tremendous amount of energy. One ounce of matter could produce enough energy to melt more than a million tons of rock.

کائنات میں اس قسم کی ان گنت نشانیاں پائی جاتی ہیں۔ یہ نشانیاں بتاتی ہیں کہ کائنات کے پیچھے ایک عظیم خالق کی ہستی کام کررہی ہے۔ عظیم خالق کے بغیر کبھی اس قسم کی عظیم تخلیق ظہور میں نہیں آسکتی۔ قرآن میں بار بار کائناتی نشانیوں پر غور کرنے کے لیے کہا گیا ہے۔ یہ غور وفکر ایک خالص دینی عمل ہے، وہ مومن کے ایمان میں غیر معمولی اضافے کا سبب بنتا ہے، وہ مومن کے شکر کے جذبے کو بے پناہ حد تک بڑھا دیتا ہے۔

شکر کا ایک آئٹم

ایک روایت کے مطابق، پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: إِذَا عَطَسَ أَحَدُكُمْ فَلْيَقُلْ: الحَمْدُ لِلّٰهِ، وَلْيَقُلْ لَهُ أَخُوهُ أَوْ صَاحِبُهُ: يَرْحَمُكَ اللّٰهُ، فَإِذَا قَالَ لَهُ: يَرْحَمُكَ

اللّٰہُ، فَلْیَقُلْ: یَہْدِیکُمُ اللّٰہُ وَیُصْلِحُ بَالَکُمْ (صحیح البخاری، حدیث نمبر 6224)۔ یعنی، جب تم میں سے کسی شخص کو چھینک آئے تو وہ کہے: اللہ کا شکر ہے۔ اُس وقت اس کا ساتھی یہ کہے اللہ کی رحمت ہو تم پر۔ اس کے بعد چھینکنے والا کہے: اللہ تم کو ہدایت دے اور تمھارے حالات کو درست کردے۔

چھینک آنے پر الحمدللہ کہنا محض کوئی رسمی بات نہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ چھینک آنا شکر کا ایک آئٹم ہے۔ یہ بات ایک تازہ تحقیق سے علمی طور پر ثابت ہوئی ہے۔ اِس تحقیق سے معلوم ہوا ہے کہ چھینک کوئی بری چیز نہیں، وہ فطرت کا ایک عمل ہے۔ چھینک سے جسم میں تازگی آتی ہے:

Sneezing revives your body: A sneeze is your body's way of rebooting naturally and patients with disorders of the nose such as sinusitis sneeze more often as they can't reboot easily, a new study said. Researchers from the University of Pennsylvania found that our noses require" reboot"by the pressure force of a sneeze.

(*The Times of India,* New Delhi, August 2, 2012, p. 15)

اِس سے معلوم ہوا کہ چھینک آنا کوئی سادہ بات نہیں، چھینک آنا بھی شکر کا ایک آئٹم ہے۔ ہر چھینک پورے جسم کو تازگی عطا کرتی ہے۔ مزید یہ کہ چھینک اللہ کی نعمتوں کی ایک یاد دہانی ہے۔ چھینک کے ذریعے ایک انسان اللہ کی ایک نعمت کو یاد کرکے جب اُس پر شکر ادا کرتا ہے تو اُس وقت اس کا ذہن بیدار ہوجاتا ہے۔ اِس ذہنی بیداری کی بنا پر انسان کو شکر کے دوسرے آئٹم بھی یاد آنے لگتے ہیں۔ شکر کے ایک آئٹم پر شکر کرکے آدمی شکر کے دوسرے آئٹم پر بھی شکر کرنے کے قابل ہوجاتا ہے۔

شکر کی نفسیات میں جینا

مسلمان ہر روز اپنی نماز میں قرآن کی یہ آیت پڑھتے ہیں: اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ (1:1)۔ یعنی ساری حمد صرف اللہ کے لیے ہے جو سارے جہان کا رب ہے۔ حمد کی حقیقت شکر ہے۔ ”ساری حمد اللہ کے لیے ہے“ کا مطلب یہ ہے کہ سارا شکر اللہ کے لیے ہے۔

قرآن کی اس آیت کا تقاضا یہ نہیں ہے کہ اس کو صرف زبان سے پڑھ دیا جائے، بلکہ وہ ایک تربیت کا کلمہ ہے۔ وہ ہر روز مسلمان کو ایک حقیقت کی یاد دلاتا ہے۔ وہ یہ کہ انسان کو چاہیے کہ وہ روزانہ پیش آنے والے واقعات پر غور کرے۔ وہ واقعات کی ایسی مثبت توجیہ (positive explanation) تلاش کرے، جو اس کو ہر حال میں شکر کرنے والا انسان بنا دے، وہ ہر دن اس احساس سے بھرا رہے کہ کائنات کا خالق ایک نہایت مہربان خالق ہے، وہ ہر وقت خالق کے لیے اور تمام انسانوں کے لیے شکر واعتراف کا رسپانس (response) دیتا رہے۔

قرآن کی یہ آیت مومن کی حقیقی تصویر کو بتارہی ہے۔ سچا مومن وہ ہے جو الحمد للہ کی نفسیات میں جیے۔ اس کے برعکس، جو انسان عملاً لا حَمدَ للّٰه کی نفسیات میں جیتا ہو، وہ سچا مومن نہیں۔ وہ زبان سے تو الحمد للہ کہتا ہے، لیکن اس کا دل شکایتی مزاج کی بنا پر عملاً یہ کہہ رہا ہوتا ہے کہ لا حَمدَ للّٰه، یعنی اللہ کے لیے کوئی حمد نہیں۔ یہ نفسیات منافقت کی نفسیات ہے، نہ کہ ایمان کی نفسیات۔

اس معاملہ کا تعلق حالات کی توجیہ سے ہے۔ جو آدمی حالات کی مثبت توجیہ کرے، وہ الحمد للہ کی نفسیات میں جیے گا، اور جو آدمی حالات کی مثبت توجیہ نہ کر سکے، وہ لا حَمدَ لِلّٰه کی نفسیات میں جینے والا انسان بن جائے گا۔ الْحَمْدُ لِلّٰهِ شکر کا کلمہ ہے اور لا حَمدَ لِلّٰه ناشکری کا کلمہ۔ گویا کہ الحمد للّٰہ کہنے سے پہلے ایک اور چیز مطلوب ہے، اور وہ ہے الحمد للّٰہ کی شعوری

معرفت۔ جو آدمی الحمدللہ کہنے سے پہلے اس کی شعوری معرفت حاصل کر چکا ہو، وہی درست طور پر الحمدللہ کہے گا، اور جو آدمی اس شعوری معرفت سے خالی ہو، اس کی زندگی میں الحمدللہ ایک حقیقت کے طور پر شامل نہیں ہوسکتا۔

شکر اور ناشکری

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں ایک غزوہ پیش آیا جس کو غزوۂ حنین کہا جاتا ہے۔ اس غزوہ میں کافی بھیڑ بکری غنیمت کی صورت میں حاصل ہوئیں۔ رسول اللہ نے غنیمت کا سامان مہاجرین میں تقسیم کر دیا اور انصار کو کچھ نہیں دیا (وَلَمْ يُعْطِ الْأَنْصَارَ شَيْئًا)۔ یہ دیکھ کر انصار کے کچھ افراد کو شکایت پیدا ہوئی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو معلوم ہوا تو آپ نے انصار کے لوگوں کو جمع کر کے ایک تقریر کی۔ آپ نے فرمایا کہ اے انصار! کیا تم اس پر راضی نہیں ہو کہ لوگ بھیڑ بکری لے جائیں اور تم اللہ کے رسول کو اپنے ساتھ لے جاؤ (أَتَرْضَوْنَ أَنْ يَذْهَبَ النَّاسُ بِالشَّاةِ وَالبَعِيرِ، وَتَذْهَبُونَ بِالنَّبِيِّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ إِلَى رِحَالِكُمْ) صحیح البخاری، حدیث نمبر 4330۔

اس کا مطلب دوسرے لفظوں میں یہ تھا کہ دوسروں کو اگر میں نے بھیڑ بکری دی ہے تو تم کو تو میں نے خود اپنے آپ کو دے دیا ہے، یعنی اللہ کے رسول کو۔

یہ انسان کی عام کمزوری ہے کہ وہ اپنے ملے ہوئے کو نہیں دیکھ پاتا اور دوسرے کو جو کچھ ملے وہ اس کو بہت زیادہ نظر آتا ہے۔ فطرت کے قانون کے مطابق ہمیشہ ایسا ہوتا ہے کہ ملی ہوئی چیز بظاہر زیادہ ہوتی ہے، اور نہ ملی ہوئی چیز بظاہر کم۔ ایسی حالت میں مذکورہ قسم کا مزاج بے حد خطرناک ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ آدمی کے اندر سے شکر کا جذبہ نکل جائے گا، وہ ناشکری میں جینے لگے گا۔ اور یہ نقصان بلاشبہ تمام نقصانات سے زیادہ ہے۔ جو چیز آدمی کے اندر ناشکری پیدا کرے اس کے غلط ہونے میں کوئی شک نہیں۔

دین میں سب سے زیادہ اہمیت یہ ہے کہ انسان اپنے رب کا شکر گزار بندہ بنے۔ اس کے صبح وشام شکر کی نفسیات میں بسر ہوتے ہوں۔ لیکن ضروری ہے کہ آدمی اس معاملے میں اپنے شکر کی حفاظت کرے۔ شکر کی حفاظت کرنے سے شکر باقی رہے گا، اور حفاظت نہ کرنے سے شکر کا احساس آدمی کے اندر سے رخصت ہوجائے گا۔ ایسا اسی وقت ہوسکتا ہے، جب کہ آدمی ہر لمحہ اپنا نگراں بنا رہے۔

شکر یا سرکشی

ایک اچھی چیز آپ کو ملتی ہے۔ اس کو اگر آپ اپنی محنت اور قابلیت کا نتیجہ سمجھیں تو آپ کے اندر سرکشی کا جذبہ پیدا ہوگا۔ اور اگر آپ اس کو خدا کی طرف سے ملی ہوئی چیز سمجھیں تو آپ کے اندر شکر کا جذبہ جاگ اٹھے گا۔ پہلی کیفیت کا نام گمراہی ہے اور دوسری کیفیت کا نام ہدایت یابی۔

موجودہ دنیا کو امتحان (test) کی مصلحت کے تحت بنایا گیا ہے۔ دنیا کے تمام واقعات بلاشبہ اللہ کی مرضی سے اور اس کی پلاننگ کے تحت سے ہو رہے ہیں۔ مگر تمام واقعات پر اسباب کا پردہ ڈال دیا گیا ہے۔ آدمی کا امتحان یہ ہے کہ وہ اسباب کے ظاہری پردہ کو ہٹا کر اصل واقعہ کو دیکھے اور اس پر ایمان لائے۔

آپ کے اندر ایک چیز کی طلب پیدا ہوتی ہے۔ آپ اس کے لیے کوشش شروع کرتے ہیں۔ آپ کی کوشش مختلف مراحل سے گزرتی ہے۔ کہیں آپ اپنا ذہن استعمال کرتے ہیں کہیں اپنی عملی طاقت لگاتے ہیں اور کہیں اپنا اثاثہ خرچ کرتے ہیں۔ اس طرح بظاہر اسباب وعلل کے راستہ سے گزرتی ہوئی آپ کی کوشش اپنے انجام تک پہنچتی ہے۔ آپ اپنے مقصود کو پالیتے ہیں۔

اب اگر آپ کو صرف ظاہر بیں نگاہ حاصل ہے تو آپ اپنی کامیابی کو اپنی کوشش کا نتیجہ سمجھیں گے لیکن اگر آپ کو وہ نگاہ حاصل ہو جو باتوں کو اس کی گہرائی کے ساتھ دیکھ سکے تو

آپ جان لیں گے کہ جو ہوا وہ خدا کے کیے سے ہوا، یہ میرا کوئی ذاتی کارنامہ نہیں۔

یہی وہ مقام ہے جہاں آدمی کا امتحان ہو رہا ہے۔ آدمی پر لازم ہے کہ وہ ظاہری پردہ کو پھاڑ کر اندرونی حقیقت کو دیکھے۔ بظاہر اپنے ہاتھ سے ہونے والے کام کے بارے میں یہ دریافت کرے کہ وہ حقیقت میں خدا کے ذریعہ انجام پا رہا ہے۔ جو لوگ اس بصیرت کا ثبوت دے سکیں وہی معرفت والے لوگ ہیں اور جو لوگ اس بصیرت کا ثبوت نہ دیں وہی وہ لوگ ہیں جو معرفت سے محروم رہے۔

شکر اور سنجیدگی

قرآن کی سورہ الاحقاف میں ایک بندہ صالح کی دعا ان الفاظ میں آئی ہے: رَبِّ أَوْزِعْنِي أَنْ أَشْكُرَ نِعْمَتَكَ الَّتِي أَنْعَمْتَ عَلَيَّ وَعَلَى وَالِدَيَّ وَأَنْ أَعْمَلَ صَالِحًا تَرْضَاهُ وَأَصْلِحْ لِي فِي ذُرِّيَّتِي إِنِّي تُبْتُ إِلَيْكَ وَإِنِّي مِنَ الْمُسْلِمِينَ (46:15)۔ یعنی، اے میرے رب، مجھے توفیق دے کہ میں تیرے احسان کا شکر ادا کروں جو تو نے مجھ پر کیا اور میرے ماں باپ پر کیا اور یہ کہ میں وہ نیک عمل کروں جس سے تو راضی ہو۔ اور میری اولاد میں بھی مجھ کو نیک اولاد دے۔ میں نے تیری طرف رجوع کیا اور میں فرماں برداروں میں سے ہوں۔

سورہ النمل (آیت 19) میں الفاظ کے جزئی فرق کے ساتھ یہی دعا حضرت سلیمان علیہ السلام کے حوالہ سے آئی ہے۔ اس دعا کے ذریعہ ایک سنجیدہ انسان (sincere person) کو یہ تعلیم دی گئی ہے کہ جب اس کو نعمت ملے تو اس کا حال کیا ہونا چاہیے۔ عام طور پر لوگوں کا حال یہ ہوتا ہے کہ جب ان کو کوئی نعمت (favor) ملتی ہے تو وہ اس کا کریڈٹ خدا کو نہیں دیتے ہیں، بلکہ اپنی ذات کو اس کا کریڈٹ دیتے ہیں۔ اس قسم کا کوئی بڑا واقعہ ایک عام انسان کو فخر وغرور میں مبتلا کرنے کے لیے کافی ہوتا ہے۔ مگر ایک بندہ صالح، جس کو خدا کی معرفت حاصل ہوئی ہو، اللہ سے تعلق قائم ہونے کے بعد اس کے اندر اپنے مُنعم حقیقی کے

لیے اعتراف (acknowledgement) کا جذبہ ابھرتا ہے۔ وہ نعمت کو دیکھ کر سراپا شکر بن جاتا ہے۔ جو کچھ بظاہر اس کو ذاتی محنت سے حاصل ہوتا ہے اس کو بھی وہ پورے طور پر خدا کے خانہ میں ڈال دیتا ہے۔ یہی ہر سنجیدہ انسان کا طریقہ ہونا چاہیے۔ اِسی اعتراف کا شرعی نام شکر ہے۔ یعنی کسی نعمت کے حصول پر مُنعِم کے لیے دل کی گہرائی سے قدردانی کا اظہار کرنا:

deep appreciation for kindness received

جہاں شکر نہ ہو، یقینی طور پر وہاں دین بھی نہ ہوگا۔ اس دنیا کے اندر شکر کے آئٹم اتنے زیادہ ہیں کہ ان کو گنا نہیں جا سکتا ہے (النحل، 16:18)۔ اگر انسان سنجیدہ (sincere) ہو تو نعمت کا احساس انسان کے اندر شکر وحمد کے چشمے جاری کر دیتا ہے۔ یہی اللہ سے تعلق کا خلاصہ ہے۔

انسان کے اندر یہ کمزوری ہے کہ اس کی نفسیات میں کسی کیفیت کا تسلسل باقی نہیں رہتا۔ انسان سے یہ مطلوب ہے کہ وہ ہمیشہ شکرِ خداوندی کی کیفیات میں زندگی گزارے۔ اِس لیے انسان پر مختلف قسم کے ناخوشگوار حالات لائے جاتے ہیں، تا کہ اس کے ذریعے سے انسان کے اندر نعمت اور منعم کی اہمیت کا احساس ابھرے۔ تا کہ آدمی کبھی شکر کی کیفیت سے خالی نہ ہونے پائے، وہ اِس دنیا میں رہتے ہوئے ہر تجربے کے بعد شکر کا رسپانس (response) دیتا رہے۔

اِس دنیا میں انسان کو اپنے وجود سے لے کر لائف سپورٹ سسٹم (life support system) تک جو چیزیں ملی ہیں، وہ سب کا سب اللہ کا عطیہ ہیں۔ انسان کے لیے ضروری ہے کہ وہ اپنے پورے دل وجان کے ساتھ اِن انعامات کے منعم (giver) کا اعتراف کرے۔

ناشکری نہیں

صحابی رسول ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ سلم نے فرمایا: جب تم میں سے کوئی اپنے اوپر اللہ کی نعمت کا اندازہ کرنا چاہے تو وہ اس کو دیکھے جو اس سے کمتر ہو، وہ اس کو نہ دیکھے جو اس سے برتر ہو (عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ يَقُولُ: قَالَ رَسُولُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: إِذَا أَحَبَّ أَحَدُكُمْ أَنْ يَعْلَمَ قَدْرَ نِعْمَةِ اللّٰهِ عَلَيْهِ، فَلْيَنْظُرْ إِلَى مَنْ هُوَ تَحْتَهُ، وَلَا يَنْظُرْ إِلَى مَنْ هُوَ فَوْقَهُ) الزہد والرقائق لابن المبارک، حدیث نمبر 1433۔

خدا کے منصوبۂ تخلیق کے مطابق، دنیا کی چیزوں کی تقسیم میں یکسانیت نہیں۔ یہاں کسی کو کم ملا ہے اور کسی کو زیادہ۔ کسی کو ایک چیز دی گئی ہے اور کسی کو دوسری چیز۔ اس صورت حال نے دنیوی معاملات میں ایک شخص اور دوسرے شخص کے درمیان فرق کر دیا ہے۔ اب اگر آدمی اپنا مقابلہ اس شخص سے کرے جو بظاہر اس کو اپنے سے کم نظر آتا ہے تو اس کے اندر شکر کا جذبہ پیدا ہوگا۔ اس کے برعکس، اگر آدمی اپنا مقابلہ اس شخص سے کرنے لگے جو بظاہر اس کو اپنے سے زیادہ دکھائی دیتا ہے تو اس کے اندر ناشکری کا احساس ابھرے گا۔ اس نفسیاتی خرابی سے بچنے کا آسان حل یہ بتایا گیا ہے کہ ہر آدمی اس کو دیکھے جو اس کے نیچے ہے، وہ اس کو نہ دیکھے جو اس کے اوپر ہے۔

شیخ سعدی نے لکھا ہے کہ میرے پاؤں میں جوتے نہیں تھے۔ میں نے کچھ لوگوں کو جوتا پہنے ہوئے دیکھا۔ مجھے خیال آیا کہ دیکھو، خدا نے ان کو جوتا دیا اور مجھے بغیر جوتے کے رکھا۔ وہ اسی خیال میں تھے کہ ان کی نظر ایک شخص پر پڑی جس کا ایک پاؤں کٹا ہوا تھا۔ یہ دیکھ کر انھوں نے اللہ کا شکر ادا کیا کہ اس نے انھیں اس سے بہتر بنایا اور ان کو دو تندرست پاؤں عطا کیے — اللہ تعالیٰ کو اپنے ہر بندہ سے یہ مطلوب ہے کہ وہ اس کا شکر گزار بنے۔ مگر موجودہ دنیا میں شکر گزار وہی شخص رہ سکتا ہے جو اس اعتبار سے اپنا نگراں بن گیا ہو — ملے

ہوئے پر شکر کا جذبہ آدمی کے اندر حوصلہ پیدا کرتا ہے۔ نہ ملے ہوئے پر شکایت کا ذہن آدمی کو جھنجلاہٹ اور مایوسی میں مبتلا کر دیتا ہے۔

نفس کے خلاف جہاد

ایک روایت کے مطابق، پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم ایک غزوہ سے واپس ہو کر مدینہ پہنچے تو آپ نے فرمایا: قَدِمْتُمْ مِنَ الْجِهَادِ الأَصْغَرِ إِلَى الْجِهَادِ الأَكْبَرِ قَالُوا: وَمَا الْجِهَادُ الأَكْبَرُ يَا رَسُولَ اللَّهِ قَالَ: مُجَاهَدَةُ الْعَبْدِ هَوَاهُ (تاریخ بغداد للخطیب بغدادی، حدیث نمبر 7297)۔ یعنی، تم لوگ چھوٹے جہاد سے بڑے جہاد کی طرف واپس آئے ہو۔ لوگوں نے پوچھا کہ اے اللہ کے رسول، جہاد اکبر کیا ہے؟ آپ نے کہا کہ بندہ کا اپنے نفس سے جہاد کرنا۔ اس کا مطلب دوسرے لفظوں میں یہ ہے کہ ہم وقتی جہاد سے مستقل جہاد کی طرف واپس آئے ہیں:

We have come back from temporary jihad to permanent jihad.

غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ وقتی جہاد سے مراد دفاعی جہاد (defensive jihad) ہے جو کبھی کبھی پیش آتا ہے، اور مستقل جہاد سے مراد اسپریچول جہاد (spiritual jihad) ہے جو ہر آدمی کی زندگی میں مستقل طور پر جاری رہتا ہے۔ اِس بات کو مالک بن دینار تابعی (وفات 130ھ) کے حوالے سے اِس طرح بیان کیا گیا ہے: جَاهِدُوا أَهْوَاءَكُمْ كَمَا تُجَاهِدُونَ أَعْدَاءَكُمْ (الکامل فی اللغۃ والأدب للمبرد، جلد 2، صفحہ 128)۔ یعنی، اپنی خواہشات سے جہاد کرو، جس طرح تم اپنے دشمن سے جہاد کرتے ہو۔

دشمن کے خلاف جہاد انتہائی وقتی چیز ہے، جو اُس وقت پیش آتا ہے جب کہ کسی نے باقاعدہ طور پر ریاست کے اوپر حملہ کر دیا ہو۔ یہ دفاعی جہاد ہے، اور اِس میں صرف کچھ

تربیت یافتہ افراد حصہ لیتے ہیں، نہ کہ ساری مسلم کمیونٹی۔ اِس کے برعکس، اپنے نفس کے خلاف جہاد ایک انفرادی نوعیت کی چیز ہے اور وہ ہر مومن کی زندگی میں جاری رہتا ہے۔

اصل یہ ہے کہ موجودہ دنیا امتحان کی دنیا ہے۔ اِس لیے اس دنیا میں ہر عمل کو کرنے کے لیے اپنے نفس کے ساتھ مقابلہ پیش آتا ہے۔ اپنے نفس سے کامیاب مقابلے کے بغیر کوئی آدمی جہادِ نفس کے کام کو انجام نہیں دے سکتا۔ مثال کے طور پر یہ ایک ثواب کا کام ہے کہ آپ جب کسی شخص سے ملیں تو کہیں 'السلام علیکم' (تمھارے اوپر سلامتی ہو)۔ یہ کلمہ اتنا بڑا عمل ہے کہ اِس کے کہنے پر حدیث میں جنت کی بشارت دی گئی ہے۔ مگر موجودہ دنیا میں جب آدمی لوگوں کے ساتھ رہتا ہے تو بار بار اُس کو دوسروں کی طرف سے تلخ تجربات پیش آتے ہیں۔ اِس بنا پر ہر آدمی کے دل میں دوسروں کے خلاف شکایت کے جذبات موجود رہتے ہیں۔ ایسی حالت میں حقیقی معنوں میں 'السلام علیکم' صرف وہ شخص کہہ سکتا ہے جو اس سے پہلے اپنے دل کو ہر قسم کے منفی جذبات سے پاک کرے اور اس کے بجائے اپنے دل کو لوگوں کے لیے خیر خواہی کے جذبات سے بھر دے۔ غور کیجیے تو یہ کام اتنا مشکل ہے کہ اِس کے لیے وہی زبردست کوشش کرنی پڑے گی جس کو جہاد کے لفظ سے تعبیر کیا گیا ہے۔

اِسی طرح حدیث میں آیا ہے کہ: الْحمد للہ تملأ الْمِیزَان (المعجم الکبیر للطبرانی، حدیث نمبر 14657)۔ یعنی، الحمد للہ کا کلمہ میزان کو بھر دیتا ہے۔ غور کیجیے تو یہ بھی کوئی سادہ بات نہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ سچا الحمد للہ کہنے کے لیے بہت بڑا ذہنی عمل درکار ہے۔ الحمد للہ کہنا، خدا کی نعمتوں پر شکر کا اظہار کرنا ہے۔ خدا کی یہ نعمتیں آدمی کو مسلسل طور پر لاتعداد صورتوں میں ملتی رہتی ہیں۔ یہ نعمتیں ہر آدمی کو اپنے آپ ملتی ہیں۔ چنانچہ آدمی ان کا عادی ہو جاتا ہے اور عادی ہونے کی بنا پر شعوری طور پر ان کو بطور نعمت محسوس نہیں کرتا۔ ایسی حالت میں الحمد للہ کہنے کے لیے ایک فکری جہاد کرنا پڑتا ہے۔ اُس کو یہ کرنا پڑتا ہے کہ وہ اپنی

تفکیری قوتوں کو عمل میں لاکر غیر شعور کو اپنے شعور میں لائے، اپنے جذبات کی نئی رُخ بندی کرے، وہ اپنی فکری قوتوں کو بیدار کرنے کے لیے مجاہد بن جائے۔ اِس کے بعد ہی اس کی زبان سے وہ کلمۂ حمد نکلتا ہے جو میزان کو بھر دینے والا کلمہ ہے۔

آدمی کے اندر طرح طرح کی خواہشیں ہیں — حرص، علو پسندی، دوسرے کو حقیر سمجھنا، بے صبری، غصہ اور انتقام، وغیرہ۔ آدمی ہر وقت اِن منفی جذبات کے تابع رہتا ہے۔ اِسی کے ساتھ وہ کچھ چیزوں کو اپنا محبوب بنالیتا ہے۔ مثلاً دولت، شہرت اور اولاد، وغیرہ۔ آدمی کی یہ بے پناہ خواہش ہوتی ہے کہ یہ تمام چیزیں اس کو بھر پور طور پر حاصل ہو جائیں۔

نفرت اور محبت کے یہ مختلف جذبات، آدمی کے اوپر ہر وقت چھائے رہتے ہیں، وہ جو کچھ سوچتا ہے، اِنھیں جذبات سے مغلوب ہو کر سوچتا ہے۔ وہ شعوری یا غیر شعوری طور پر انھیں جذبات کے تحت اپنی زندگی کا نقشہ بناتا ہے۔ ایسی حالت میں یہ بلاشبہ ایک جہادی عمل ہے کہ آدمی خدا کو مسلسل طور پر اپنا مرکزِ توجہ بنائے، وہ صراطِ مستقیم سے اپنے آپ کو ہٹنے نہ دے — یہی وہ پُر مشقت عمل ہے جس کو حدیث میں جہادِ نفس کہا گیا ہے۔

زوجین کے درمیان کامل مطابقت

ایک عورت اور ایک مرد جب نکاح کے بعد ایک دوسرے کے ساتھی بنتے ہیں تو یہ اجتماع ساری کائنات کا سب سے زیادہ انوکھا واقعہ ہوتا ہے۔ وسیع کائنات میں اَن گنت چیزیں ہیں۔ یہاں کی اکثر چیزیں جوڑے (pair) کی صورت میں ہیں، مگر کسی بھی دو چیز کے درمیان وہ کامل مطابقت (complete compatibility) نہیں جو عورت اور مرد کے درمیان پائی جاتی ہے۔ جب ایک عورت اور ایک مرد جیون ساتھی بن کر ایک دوسرے سے ملتے ہیں تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ دونوں شعوری منصوبے کے تحت ایک دوسرے کے لیے بنائے گئے تھے۔

انسانی زندگی کا مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ خدا نے کسی عورت یا مرد کو کم تر پیدا

نہیں کیا۔ حقیقت یہ ہے کہ ہر عورت اور ہر مرد اپنے آپ میں باعتبارِ تخلیق کامل ہوتے ہیں۔ یہ ہمارے اپنے فہم کا قصور ہے کہ ہم کسی کو کم اور کسی کو زیادہ سمجھ لیتے ہیں۔ عورت اور مرد اگر اِس حقیقت کو جان لیں تو ان کی زندگی شکر کی زندگی بن جائے، شکایت یا محرومی کا احساس ان کے اندر باقی نہ رہے اور پھر وہ زیادہ بہتر طور پر زندگی کی تعمیر کے قابل ہوجائیں۔

زوجین کے درمیان یہ شعور اگر زندہ ہو تو دونوں ایک دوسرے کو پا کر شکر کے جذبات میں سرشار ہوجائیں۔ دونوں اہتزاز (thrill) کے درجے میں ایک دوسرے کو اپنے لیے نعمت سمجھیں۔ یہ اہتزاز اتنا زیادہ طاقت ور ہو جو کبھی اُن سے جُدا نہ ہو۔ دونوں ایک ساتھ اِس طرح رہیں جیسے کہ دونوں کو ان کی سب سے زیادہ محبوب چیز مل گئی ہو۔ دونوں آخری حد تک مثبت احساس میں جینے لگیں۔

دنیا میں اگر صرف عورتیں ہوں اور کوئی مرد وہاں موجود نہ ہو۔ اِسی طرح اگر ایسا ہو کہ صرف مرد ہوں اور کوئی عورت موجود نہ ہو۔ ایک ایسی دنیا میں بظاہر زندگی ہوگی، مگر وہ خوشیوں سے خالی ہوگی۔ ایسی دنیا میں ہر طرف ایک ایسی کمی کا احساس چھایا رہے گا جو کبھی اور کسی حال میں ختم نہ ہوگا۔ صرف مردوں کی دنیا بھی ایک بے معنی دنیا ہے، اور صرف عورتوں کی دنیا بھی ایک بے معنیٰ دنیا۔ موجودہ دنیا اِسی لیے ایک بامعنیٰ دنیا ہے کہ یہاں عورت اور مرد دونوں موجود ہیں۔

عورت اور مرد اگر اِس حقیقت پر غور کریں تو اُنھیں اُس سے بھی زیادہ خوشی حاصل ہو جو کسی سائنس داں کو ایک نئی چیز کی دریافت سے حاصل ہوتی ہے۔ ایک دوسرے کے خلاف شکایت کی بات اُن کو آخری حد تک بے معنیٰ دکھائی دینے لگے۔ حقیقت یہ ہے کہ عورت اور مرد دونوں تخلیق کا شاہ کار ہیں۔ نکاح کا مطلب دو تخلیقی شاہ کاروں کی یک جائی ہے۔ اِس سے بڑا واقعہ پوری معلوم کائنات میں کوئی دوسرا نہیں۔

شکر اور تقویٰ

روزہ اسلام کے پانچ ارکان میں سے ایک ہے۔ اسلام کی دوسری عبادتوں کی طرح اس کا بھی ایک ظاہری فارم ہے، اور دوسرا اس کی روح یا حقیقت ہے۔ قرآن کے مطابق روزہ کی حقیقت شکر (2:185) اور تقویٰ (2:183) ہے۔ یعنی اپنی عبادت میں تقویٰ کی اسپرٹ بڑھانا، اپنی روحانیت میں اضافہ کرکے زیادہ سے زیادہ اللہ کی قربت حاصل کرنا، بھوک اور سیری کا تجربہ کرکے اپنے اندر شکر کا احساس جگانا، مادی مشغولیت کو کم کرکے آخرت کی طرف زیادہ سے زیادہ متوجہ ہونا، خارجی سفر کو روک کر داخلی سفر کی طرف رواں دواں ہونا، ایک مہینہ کے تربیتی کورس سے گزر کر پورے ایک سال کے لیے شکر وتقویٰ کی غذا حاصل کر لینا، وغیرہ۔ یہی روزہ کا مقصد ہے اور یہی روزہ کی مقبولیت کا اصل معیار بھی۔

قرآن میں بتایا گیا ہے: وَإِنْ تَعُدُّوا نِعْمَةَ اللَّهِ لَا تُحْصُوهَا (16:18)۔ یعنی، اگر تم اللہ کی نعمتوں کو گنو تو تم ان کو گن نہ سکو گے۔ اس آیت کا مطلب یہ ہے کہ ہمارے خالق نے ہمارے لیے اتنی زیادہ نعمتیں عطا کی ہیں، جن کی کوئی گنتی نہیں۔ مثلاً سورج کی روشنی، آکسیجن، سوائل (soil) سے غذا (food) کا نکلنا، بارش کا برسنا، وغیرہ۔

یہ سب وہ عطیات (نعمتیں) ہیں، جو رات دن انسان کو خود بخود ملتی رہتی ہیں۔ لیکن یہ نعمتیں چونکہ یک طرفہ طور (unilateral) پر سپلائی کی جارہی ہیں۔ اس بنا پر ایسا ہوتا ہے کہ انسان اس کو فار گرانٹیڈ (for granted) لے لیتا ہے، اور جو اعتراف (acknowledgement) مطلوب ہے، اس کو وہ کر نہیں پاتا۔ زیادہ سے زیادہ یہ ہوتا ہے کہ انسان لپ سروس کے طور پر الحمد للہ، وغیرہ زبان سے ادا کر دیتا ہے۔ گہرے سنس میں انسان ان نعمتوں کا اعتراف نہیں کر پاتا۔ روزہ ایک اعتبار سے یاد دہانی ہے کہ انسان

جس چیز کو فار گرانٹیڈ لیے ہوئے ہے، اس کو وہ خالق کے عطیے کے طور پر ڈسکور کرے۔

حدیث کی کتابوں میں آتا ہے کہ رسول اللہ روزہ رکھ کر جب شام کو افطار کرتے، تو آپ کی زبان سے یہ الفاظ نکلتے تھے: ذَهَبَ الظَّمَأُ وَابْتَلَّتِ الْعُرُوقُ، وَثَبَتَ الْأَجْرُ إِنْ شَاءَ اللّٰهُ (سنن ابی داؤد، حدیث نمبر 2357)۔ یعنی، پیاس بجھ گئی، رگیں تر ہوگئیں، اور اجر ثابت ہو گیا ان شاء اللہ۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ نعمتوں کو evaluate کرنے کا تخلیقی (creative) طریقہ کیا ہے۔ وہ یہ ہے کہ روزہ رکھ کر آدمی کے اندر انعاماتِ الٰہی کے احساس کا طوفان برپا ہو جائے، روزہ رکھ کر آدمی کے اندر وہ زندہ احساس پیدا ہو، جیسا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے الفاظ سے معلوم ہوتا ہے۔

حمدِ دنیا، حمدِ آخرت

قرآن کی ایک آیت یہ ہے: الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ (1:2)۔ یعنی، ساری حمد اللہ رب العالمین کے لیے ہے۔ یہ آیت دنیا کی زندگی میں اہلِ ایمان کے روز وشب کا حال بتاتی ہے۔ اہلِ جنت جب آخرت میں پہنچیں گے اور جنت میں داخل کر دئے جائیں گے تو وہاں ان کا مشغلہ کیا ہوگا، اس کے بارے میں قرآن میں یہ الفاظ آئے ہیں: وَآخِرُ دَعْوَاهُمْ أَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ (10:10)۔ یعنی، وہاں ان کی آخری بات یہ ہوگی کہ ساری تعریف اللہ کے لیے ہے جو رب ہے سارے جہان کا۔ اہلِ جنت کا ایک اور قول ان الفاظ میں بیان کیا گیا ہے: الْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِي أَذْهَبَ عَنَّا الْحَزَنَ (35:34)۔ یعنی، شکر ہے اللہ کا جس نے ہم سے غم کو دور کر دیا۔

ان آیتوں پر غور کیجیے تو اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اہلِ جنت دنیا میں کس طرح زندگی گزاریں گے۔ اور پھر آخرت میں ان کو کس قسم کی زندگی حاصل ہوگی۔ اس کا خلاصہ یہ ہے کہ دنیا میں بھی

ان کی زندگی، حمدِرب کی زندگی ہوگی، اور آخرت میں بھی ان کے صبح وشام رب العالمین کی حمد میں گزریں گے۔فرق یہ ہے کہ دنیا میں انھوں نے حمدِرب کی زندگی دارالکبد (البلد،90:4) میں گزاری ہوگی، آخرت میں ان کو یہ موقع ملے گا کہ وہ حزَن سے خالی دنیا (الفاطر،35:34) میں اعلیٰ معیاری درجے میں حمدِرب کی توفیق پائیں۔اس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ جنت میں داخلے کی قیمت کیا ہے۔وہ یہ ہے کہ آدمی اپنے آپ کو ذہنی طور پر اتنا ارتقا یافتہ بنائے کہ وہ حزَن اور کبَد کے حالات میں بھی اعلیٰ معرفت کی سطح پر زندگی گزارے۔

گویا کہ انسان سے جو چیز اصلاً مطلوب ہے، وہ حمدرب ہے۔دنیا میں بھی حمد، آخرت میں بھی حمد۔ایسا کیوں ہے۔اس کا سبب یہ ہے کہ انسان اپنے پورے وجود کے ساتھ اللہ کی رحمت (blessing) کا نتیجہ ہے۔پھر پیدا ہونے کے بعد جس دنیا میں وہ زندگی گزارتا ہے، وہ پوری کی پوری رحمتوں کی دنیا ہے۔ایسی حالت میں انسان کے لیے واحد طرزِ زندگی صرف یہ ہے کہ وہ ہر لمحہ اس حقیقت کو یاد رکھے، وہ ہر موقع (occasion) پر اللہ کی بے پایاں رحمت کا اعتراف کرے۔اس کی شعوری بیداری اس درجہ تک پہنچ جائے کہ ہر چیز سے اس کو حمد خداوندی کا رزق ملنے لگے۔یہ حالت ایک اعتبار سے دنیا میں اللہ رب العالمین کا اعتراف ہے۔یہ اس فطری تقاضے کو پورا کرنا ہے جو تخلیق کے اعتبار سے انسان کے اندر ہونا چاہیے۔یہی انسان وہ ہے جس نے دنیا میں سچا انسان بن کر زندگی گزاری۔

دنیا میں اس طرح زندگی گزارنے کا دوسرا پہلو یہ ہے کہ یہی سچا انسان وہ انسان ہے جس کو آخرت کی جنت میں وہ درجہ ملے گا جس کو قرآن میں ان الفاظ بیان کیا گیا ہے: فِي مَقْعَدِ صِدْقٍ عِنْدَ مَلِيكٍ مُقْتَدِرٍ (54:55)۔یعنی، وہ بیٹھے ہوں گے سچی بیٹھک میں، قدرت والے بادشاہ کے پاس۔دنیا میں جو لوگ سچائی کی زندگی گزاریں، ان کو اس کا یہ انعام ملے گا کہ وہ آخرت میں سچائی کی سیٹ (seat of truth) پر بیٹھنے کا اعزاز حاصل کریں گے۔

حقیقت یہ ہے کہ انسان کے لیے زندگی کا سب سے اعلیٰ درجہ یہ ہے کہ وہ معرفت خداوندی میں زندگی گزارے۔ وہ اپنی زندگی کے لمحات اس طرح گزارے کہ وہ مسلسل طور پر اللہ کی نشانیوں کو دریافت کررہا ہو۔ آلاءُ اللہ (wonders of God) بلاشبہ کائنات کی سب سے بڑی چیزیں ہیں۔ سچا انسان وہ ہے جو دنیا کی زندگی میں الاء اللہ میں جیے۔ اور آخرت میں وہ زیادہ اعلیٰ صورت میں الاء اللہ اور حمد الٰہی میں جینے کا مرتبہ پائے۔

قرآن کی ایک آیت یہ ہے: أَلَا بِذِكْرِ اللَّهِ تَطْمَئِنُّ الْقُلُوبُ (13:28)۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ انسان کے لیے سب سے زیادہ لذیذ لمحہ (joyous moment) وہ ہے، جب کہ وہ اپنے رب کی قربت حاصل کرے، جب کہ وہ کائنات میں تخلیق کی معنویت کو دریافت کرے، جب کہ اس کا اعلیٰ تصور اس کو فرشتوں کا ہم نشین بنادے، جب کہ وہ اعلیٰ معرفت کا شعوری تجربہ حاصل کرے، جب کہ وہ جنت میں داخل ہونے سے پہلے جنت کی معرفت حاصل کرلے۔

یہی انسان کی حقیقی زندگی ہے۔ یہ زندگی ایک سچے انسان کو دنیا میں ابتدائی طور پر حاصل ہوتی ہے، اور آخرت کی جنت میں یہی زندگی اس کو اپنی اعلیٰ صورت میں حاصل ہوگی۔ گویا کہ سچا انسان وہ ہے جو اسی دنیا میں اللہ رب العالمین کے پڑوس میں جینے لگے، یہی وہ زندگی ہے، جو جنت میں اس کو زیادہ اعلیٰ درجے میں حاصل ہوگی۔

حمد خداوندی

بسم اللہ کے بعد قرآن کی پہلی آیت یہ ہے: الْحَمْدُ لِلَّهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ (1:2)۔ یعنی، سب تعریف اللہ کے لیے ہے جو سارے جہان کا مالک ہے۔ اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ رب العالمین نے انسان کو جو نعمتیں (blessings) دی ہیں، ان کے جواب میں انسان سے کیا رسپانس مطلوب ہے۔ یہ حمد کا رسپانس ہے۔ حمد کا مطلب شکر اور تعریف کے

الفاظ میں بیان کیا جاتا ہے۔ مگر انسانی استعمال کے اعتبار سے شاید زیادہ بامعنی لفظ ہے اعتراف (acknowledgement)۔ یعنی ان نعمتوں کو دریافت کرنا، اور دل کے سچے جذبہ کے ساتھ ان کا اعتراف کرنا۔

اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ زبان سے شکر یا تعریف کا لفظ بول دیا جائے۔ اعتراف کا آغاز دریافت (discovery) سے ہوتا ہے۔ پہلے انسان ان نعمتوں کو دریافت کرتا ہے، اس کے بعد اس کے دل میں اعتراف کا جذبہ امڈتا ہے، اور پھر ان وفور جذبات کا اظہار مختلف الفاظ کی صورت میں بے ساختہ طور پر اس کی زبان سے نکل پڑتا ہے۔ گویا شکر وہ ہے، جس کے اندر گہرے جذبات کا طوفان شامل ہو۔ شکر وہ ہے، جو دل کو تڑپا دے، جو آنسوؤں کی صورت میں امڈ پڑے۔ شکر وہ ہے، جس کے اندر انسان کی پوری شخصیت شامل ہوجائے۔

شکر یہ نہیں ہے کہ زبان سے کچھ الفاظ بول دیے جائیں۔ شکر گہرے اعتراف کا دوسرا نام ہے۔ ایک شاعر نے ایک گہرے جذبے کا ذکر کرنا چاہا، تو اس کی زبان سے یہ الفاظ نکلے:

اس بات کے کہنے کو کہاں سے جگر آئے

حقیقت یہ ہے کہ سچا اعتراف وہ ہے، جس کے احساس سے آدمی کا دل پھٹنے لگے، جس کو بیان کرنے کے لیے انسان کی ڈکشنری کے الفاظ ناکافی نظر آئیں۔ سچا اعتراف انسان کی پوری شخصیت کا اظہار ہوتا ہے۔ سچے اعتراف میں آنکھ کے آنسو، اور زبان کے الفاظ اس طرح ایک دوسرے میں شامل ہوجاتے ہیں کہ ان کو الگ کرنا ناممکن ہوجاتا ہے۔

حمد اور تضرع

عَنْ أَبِي أُمَامَةَ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَ سَلَّمَ قَالَ: عَرَضَ عَلَيَّ رَبِّي لِيَجْعَلَ لِي بَطْحَاءَ مَكَّةَ ذَهَبًا. فَقُلْتُ: لَا يَا رَبِّ وَلَكِنْ أَشْبَعُ يَوْمًا وَأَجُوعُ يَوْمًا، أَوْ نَحْوَ ذَلِكَ، فَإِذَا

جُعْتُ تَضَرَّعْتُ إِلَيْكَ وَ ذَكَرْتُكَ، وَإِذَا شَبِعْتُ حَمِدْتُكَ وَ شَكَرْتُكَ (مسند احمد، حدیث نمبر22190؛ سنن الترمذی، حدیث نمبر2347)۔ یعنی، حضرت ابو امامہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میرے رب نے میرے سامنے یہ پیش کش کی کہ مکہ کی وادی کو تمہارے لیے سونا بنا دیا جائے۔ میں نے کہا کہ اے میرے رب! نہیں، بلکہ مجھے یہ پسند ہے کہ میں ایک دن کھاؤں اور ایک دن بھوکا رہوں۔ پس جب مجھے بھوک لگے تو میں تیری طرف عاجزی کروں اور تجھ کو یاد کروں۔ اور جب مجھے سیری حاصل ہو تو میں تیری تعریف کروں اور تیرا شکرادا کروں۔

اللہ تعالیٰ کو اپنے بندوں سے دو چیزیں مطلوب ہیں— ایک یہ کہ وہ اللہ کی قدرت کا اعتراف کرکے اس کے آگے اپنے عجز کا اظہار کریں۔ دوسرے یہ کہ وہ اللہ کی نعمتوں کو محسوس کر کے اس پر شکر کرنے والے بن جائیں۔ یہ دونوں باتیں نہایت وضاحت کے ساتھ قرآن وحدیث میں بتائی گئی ہیں۔ مگر اس کا سب سے بڑا عملی تجربہ وہ ہے جو بھوک اور سیری کی صورت میں انسان کے ساتھ پیش آتا ہے۔ جب آدمی کو بھوک لگتی ہے، جب اس کو پیاس ستاتی ہے، اس وقت اس کو آخری حد تک اس حقیقت کا احساس ہوتا ہے کہ وہ کس قدر کمزور اور محتاج ہے۔ اسی طرح جب بھوک پیاس کی شدت میں مبتلا ہونے کے بعد اس کو کھانا اور پانی ملتا ہے تو اس وقت اس کو آخری طور پر محسوس ہوتا ہے کہ کھانا اور پانی کتنی زیادہ قیمتی چیزیں ہیں۔

اس دنیا میں آدمی کو بھوک کا تجربہ بھی ہونا چاہیے اور سیری کا بھی۔ اس پر یہ کیفیت بھی گزرنی چاہیے کہ اس کا حلق پیاس کی وجہ سے سوکھ گیا ہو، اور اسی کے ساتھ یہ کیفیت بھی کہ اس نے ٹھنڈا پانی پیا اور اس کے بعد اس کا وہ حال ہو گیا جس کو حدیث میں ان لفظوں میں بیان کیا گیا ہے: ذَهَبَ الظَّمَأُ وَ ابْتَلَّتِ الْعُرُوقُ (شعب الایمان للبیہقی، حدیث نمبر3902)۔

مذکورہ حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ حالات کے بغیر کیفیات پیدا نہیں ہوتیں۔ روزہ اسی

قسم کے حالات پیدا کرنے کی ایک سالانہ تدبیر ہے۔ روزہ کے ذریعہ آدمی کو بھوک اور سیری دونوں کا تجربہ کرایا جاتا ہے، تاکہ وہ خدا کے آگے عاجزی کرنے والا بھی بنے اور اسی کے ساتھ اس کا شکر کرنے والا بھی۔

قرآن میں روزہ کا حکم دیتے ہوئے کہا گیا ہے کہ اے ایمان والو! تم پر روزہ فرض کیا گیا جس طرح تم سے اگلوں پر فرض کیا گیا تھا، تاکہ تم پرہیزگار بنو... رمضان کا مہینہ جس میں قرآن اتارا گیا... پس تم میں سے جو شخص اس مہینہ کو پائے، وہ اس کے روزے رکھے... اور اللہ کی بڑائی کرو اس پر کہ اس نے تم کو راہ بتائی، اور تاکہ تم اس کے شکر گزار بنو (2:183-185)۔

ان آیات میں روزہ کے دو خاص فائدے بتائے گئے ہیں۔ ایک یہ کہ روزہ آدمی کے اندر تقویٰ پیدا کرنے کا ذریعہ ہے۔ دوسرے یہ کہ اس سے آدمی کے اندر یہ صلاحیت پیدا ہوتی ہے کہ وہ اپنے رب کا شکر کرنے والا بنے۔

قرآن میں جس دینی کیفیت کے لیے تقویٰ اور شکر کا لفظ استعمال ہوا ہے، اسی کو حدیث میں تضرع اور شکر کہا گیا ہے۔ یہی دونوں کیفیتیں عبدیت کی اصل ہیں۔ اللہ کے مقابلہ میں اپنے عجز کا احساس آدمی کے اندر تضرع اور تقویٰ کے احساسات ابھارتا ہے۔ اور اللہ کے عطیات کا احساس اس کے اندر حمد اور شکر کے جذبات پیدا کرتا ہے۔

اگر آدمی کا شعور بیدار ہو تو یہ دونوں کیفیتیں ہر روز ہر تجربہ سے آدمی کے اندر پیدا ہوتی رہیں گی۔ وہ ہر واقعہ سے یہ دونوں ربانی غذائیں حاصل کرتا رہے گا۔ پھر انھیں دونوں کیفیات کو مزید شدت اور عمومیت کے ساتھ حاصل کرنے کے لیے رمضان کے مہینہ کا روزہ مقرر کیا گیا ہے۔ رمضان کا روزہ گویا عمومی تربیت کا خصوصی کورس ہے۔

حمد کلچر

قرآن میں خالق کائنات کو رب العالمین کہا گیا ہے۔ راغب الاصفہانی (وفات 502ھ) نے رب کی تفسیر ان الفاظ میں کی ہے: هو إنشاء الشيء حالا فحالا إلى حدّ التمام (المفردات فی غریب القرآن، صفحہ 336)۔ یعنی کسی چیز کی پرورش کرکے اس کو درجہ بدرجہ کمال تک پہنچانا۔ رب العالمین کی اس صفت کا اظہار مادی کائنات میں بھی ہوا ہے، اور انسانی تاریخ میں بھی۔ مادی کائنات میں ربوبیت کی مثال یہ ہے کہ انسان جب پیدا ہوتا ہے تو اس کی سب سے پہلی دریافت، شعوری طور پر تو نہیں، مگر غیر شعوری طور پر یہ ہوتی ہے کہ کیسا عجیب ہے، وہ خالق جس نے پوری دنیا کو میرے لیے کسٹم میڈ دنیا بنا دیا۔ رحم مادر اور خارجی دنیا کا پورا نظام عین وہی ہے، جو انسان کے لیے مطلوب تھا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ انسان دنیا کے لیے بنا ہے، اور دنیا انسان کے لیے بنائی گئی ہے۔

انسانی تاریخ میں اللہ تعالی صفت ربوبیت کا اظہار مختلف اعتبار سے ہوتا ہے۔ اس کی ایک مثال قرآن کی یہ آیت ہے: قُلْ يَا عِبَادِيَ الَّذِينَ أَسْرَفُوا عَلَىٰ أَنفُسِهِمْ لَا تَقْنَطُوا مِن رَّحْمَةِ اللَّهِ إِنَّ اللَّهَ يَغْفِرُ الذُّنُوبَ جَمِيعًا إِنَّهُ هُوَ الْغَفُورُ الرَّحِيمُ (39:53)۔ یعنی، کہو کہ اے میرے بندو، جنھوں نے اپنی جانوں پر زیادتی کی ہے، اللہ کی رحمت سے مایوس نہ ہو۔ بیشک اللہ تمام گناہوں کو معاف کردیتا ہے، وہ بڑا بخشنے والا، مہربان ہے۔ قرآن کی اس آیت میں مایوسی سے بچنے کی تعلیم دی گئی ہے۔ اس آیت کا مطلب یہ ہے کہ تمھارے پچھلے لمحات ختم ہوگئے، مگر اگلا لمحہ ابھی باقی ہے۔ اپنی پوری طاقت کے ساتھ اس کو اویل کرو۔

اس معاملے میں انسان سے یہ مطلوب ہے کہ وہ خدا کی حمد کرے، اور الحمد للہ کلچر کو اپنائے۔ حمد کی حقیقت شکر ہے۔ جیسا کہ ایک حدیث رسول میں آیا ہے: الْحَمْدُ رَأْسُ

الشُّکْرِ، مَا شَکَرَ اللّٰہَ عَبْدٌ لَا یَحْمَدُہُ (شعب الایمان للبیہقی، حدیث نمبر 4085)۔یعنی، حمد شکر کی بنیاد ہے، اس بندے نے اللہ کا شکر ادا نہیں کیا، جو اس کی حمد نہ کرے۔

حمد اور کَبَد کے درمیان

قرآن میں ایک طرف حمد خداوندی کی تعلیم دی گئی ہے۔ دوسری طرف یہ بتایا گیا ہے کہ خدا کے تخلیقی نقشہ کے مطابق دنیا انسان کے لیے کبد کی دنیا ہے (90:4)۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ مسائل کے درمیان رہتے ہوئے خدا کا شکر کرنے والے بنو۔ ناپسندیدہ حالات میں بھی تمہارا دل شکر الٰہی کے مثبت جذبات سے معمور رہے۔ حمد اللہ کی نسبت سے مطلوب ہے، اور صبر انسان کی نسبت سے۔

قرآن کے اس بیان کے مطابق، دنیا انسان کے لیے دار الکبد ہے۔ ایسی حالت میں، وہ کس طرح سچا شکر گزار بن کر رہ سکتا ہے۔ جواب یہ ہے کہ حمد اللہ کی نسبت سے ہے، اور کبد انسان کی نسبت سے۔ انسان سے اصل چیز جو مطلوب ہے، وہ حمد اور شکر ہے۔ دار الکبد میں انسان شکر گزار کیسے بنے۔ اس کا جواب صبر ہے۔ مومن کو انسان کی زیادتیوں پر صبر کرنا ہے تاکہ اس کے اندر شکر کی اسپرٹ باقی رہے، وہ ہر حال میں اپنے رب کے لیے شکر کا رسپانس دیتا رہے۔ دوسروں کے مقابلے میں صبر کرنا کوئی منفی بات نہیں۔ اس میں خود انسان کی اپنی بھلائی چھپی ہوئی ہے۔

جو شخص انسان کی زیادتیوں پر صبر کرے گا اس کے اندر ذہنی انضباط (intellectual discipline) کی صلاحیت پرورش پائے گی۔ اس کے اندر ذہنی بیداری آئے گی۔ وہ ایک سنجیدہ انسان بن جائے گا۔ اس کی فطرت میں چھپے ہوئے امکانات (potential) اَن فولڈ (unfold) ہونے لگیں گے۔ اس کے اندر گہری سوچ (deep thinking) پیدا ہوگی۔ اس طرح وہ اس قابل ہوجائے گا کہ اعلیٰ معرفت کی سطح

پر جینے لگے۔ وہ ایک دانش مند انسان (man of wisdom) بن جائے گا۔

انسان کو چاہیے کہ وہ دنیا کے کبد (مسائل) پر ری ایکٹ (react) کرنے کے بجائے ان کے بارے میں آرٹ آف مینجمنٹ سیکھے۔ یہی وہ واحد قیمت ہے جس کو ادا کر کے انسان اس قابل ہوسکتا ہے کہ وہ دنیا میں اپنے خالق کی مرضی کے مطابق رہے، اور آخرت میں جنت میں داخلے کا مستحق قرار پائے۔

بیسویں صدی

20ویں صدی انسانی تاریخ کی وہ صدی ہے، جب کہ قدیم روایتی دور کا خاتمہ اپنی انتہا کو پہنچا۔ بیسویں صدی میں پہنچ کر دنیا کے حالات مکمل طور پر بدل گئے ہیں۔ اس صدی میں ایسے واقعات پیش آئے، جس نے دنیا کے سیاسی اور سماجی ڈھانچے کو نئی شکل دی۔ نئے تاریخی عمل کے نتیجہ میں اب دنیا میں نہ شخصی حکمرانی ہے اور نہ جابرانہ سیاسی نظام۔ 1991ء میں سوویت ایمپائر کا ٹوٹنا انسانی تاریخ میں نظام جبر کے خاتمہ کی آخری تکمیل تھی۔ اب اس قسم کا سیاسی جبر بھی دنیا میں واپس آنے والا نہیں۔

آج کے توحید پرستوں کو نہ اس کی ضرورت ہے کہ وہ ایک ملک سے دوسرے ملک کی طرف ہجرت کریں اور نہ یہ ضرورت ہے کہ وہ وقت کے حکمرانوں سے مسلح ٹکراؤ کریں، تا کہ انہیں ختم کر کے اپنے لیے آزادانہ دینی زندگی کے مواقع حاصل کرسکیں۔ کیوں کہ یہ چیزیں تو اب تاریخی عمل کے نتیجہ میں اپنے آپ انہیں حاصل ہو چکی ہیں۔ اس انقلابی تبدیلی کے دو بڑے پہلو ہیں— (1) مکمل مذہبی آزادی (2) جدید وسائل۔

موجودہ زمانہ انسانی تاریخ کا پہلا زمانہ ہے جب کہ ایک طرف فکری انقلابات اور دوسری طرف اقوام متحدہ کے قیام کے نتیجہ میں ہر فرد اور ہر گروہ کا ناقابل تنسیخ حق مان لیا گیا

ہے کہ وہ مکمل طور پر یہ حق رکھتا ہے کہ جس مذہب کو چاہے مانے، اس پر عمل کرے اور اس کی تبلیغ کرے، صرف اس ایک شرط کے ساتھ کہ وہ دوسروں کے خلاف تشدد کا کوئی فعل نہ کرے، دوسرے لفظوں میں یہ کہ پر امن مذہبی زندگی یا پر امن دعوت وتبلیغ کے راستہ میں آج کسی بھی قسم کی کوئی خارجی رکاوٹ موجود نہیں۔

قرآن میں اصحاب رسول کو یہ دعا تلقین کی گئی تھی کہ اے ہمارے رب، تو ہمارے اوپر وہ بوجھ نہ ڈال جو تو نے پچھلی امتوں پر ڈالا تھا: رَبَّنَا وَلَا تَحْمِلْ عَلَيْنَآ إِصْرًا كَمَا حَمَلْتَهُۥ عَلَى ٱلَّذِينَ مِن قَبْلِنَا (2:286)۔ یہ گویا دعا کی صورت میں اس آنے والے دور کا پیشگی اعلان تھا جو پیغمبر آخر الزماں کی امت کے لیے اللہ نے مقدر کیا تھا۔ خاتمہ عسر کا یہ دور اب دنیا میں پوری طرح آچکا ہے۔

ایسی حالت میں آج کے مسلمانوں کا کام یہ ہے کہ وہ نئے دور آزادی پر اللہ کا شکر ادا کرتے ہوئے اس کا بھر پور استقبال کریں، نہ کہ وہ خود ساختہ نظریات کی بنا پر نئے دور کے سیاسی حکمرانوں سے غیر ضروری ٹکراؤ شروع کر دیں اور پھر صحابی رسول حضرت عبداللہ بن عمر کے اس پیشگی انتباہ کا مصداق ہیں کہ اللہ کی توفیق سے اصحاب رسول نے سیاسی فتنہ کا خاتمہ کر دیا تھا، مگر تم لوگوں نے اپنی نادان کارروائیوں کے ذریعہ سیاسی فتنہ کو دوبارہ اپنے خلاف زندہ کرلیا (صحیح البخاری، حدیث نمبر 4515)۔

اس سلسلہ میں دوسری اہم چیز جدید وسائل کا ظہور ہے۔ موجودہ زمانہ میں سائنسی اور صنعتی انقلاب کے بعد ایسے نئے وسائل کا ظہور میں آئے ہیں جو اپنی تاثیر کے لحاظ سے اتنا زیادہ دوررس ہیں کہ اب سیاسی اقتدار عملاً ثانوی درجہ کی چیز بن گیا ہے۔ آج وہ سب کچھ مزید اضافہ کے ساتھ حاصل کیا جاسکتا ہے جس کی امید قدیم زمانہ میں صرف سیاسی اقتدار کے ذریعہ کی جاسکتی تھی۔ حقیقت یہ ہے کہ اگر ان وسائل کو حکمت اور بصیرت کے ساتھ استعمال

کیا جائے تو آج کی دنیا میں ایسا دینی ایمپائر بنایا جا سکتا ہے جس کا تصور بھی قدیم سیاسی ایمپائر کے زمانہ میں نہیں کیا جا سکتا تھا۔

مذہبی صداقت کا سائنسی ظہور

قرآن کے مطابق، تفکر اور تدبر کی تشریح کا صحیح طریقہ وہ ہے جس کو ربانی تعقل کہا جا سکتا ہے۔ یعنی قرآن کے اشارات کو رہنما بنا کر تخلیق خداوندی کا مطالعہ کرنا اور حقائق فطرت کی روشنی میں اُن کی تشریح و تفصیل کرنا۔ مطالعہ کا یہی اسلوب حقیقی اسلوب ہے۔ اس سے وہ اہل ایمان پیدا ہوتے ہیں جو معرفتِ الٰہی اور خشیتِ ربانی کی نعمت سے سرشار ہوں۔ قرآن کی سورہ آل عمران کے آخری رکوع میں یہی حقیقت بیان ہوئی ہے۔ قرآن کے دوسرے مقامات پر بھی اس حقیقت کی طرف بار بار اشارہ کیا گیا ہے۔

اس سلسلہ کی دو قرآنی آیتوں کا ترجمہ یہ ہے: کیا تم نہیں دیکھتے کہ اللہ نے آسمان سے پانی اُتارا۔ پھر ہم نے اُس سے مختلف رنگوں کے پھل پیدا کر دیئے۔ اور پہاڑوں میں بھی سفید اور سرخ مختلف رنگوں کے ٹکڑے ہیں اور گہرے سیاہ بھی۔ اور اسی طرح انسانوں اور جانوروں اور چوپایوں میں بھی مختلف رنگ کے ہیں۔ اللہ سے اُس کے بندوں میں سے صرف وہی ڈرتے ہیں جو علم والے ہیں۔ بے شک اللہ زبردست ہے، بخشنے والا ہے (35:27-28)۔

ربانی تعقل کی تشریح کے لیے موجودہ زمانہ میں نئے وسیع امکانات کھل گئے ہیں۔ جدید سائنس کی تحقیقات نے موجودہ زمانہ میں فطرت کی جن چھپی ہوئی حقیقتوں کو دریافت کیا ہے وہ گویا اسی ربّانی تعقل کی تفصیل ہیں۔ ربانی تعقل کے ان جدید امکانات کو پیشگی طور پر قرآن میں بتا دیا گیا تھا۔ اس سلسلہ میں قرآن کی ایک متعلق آیت کا ترجمہ یہ ہے: ہم عنقریب اُن کو اپنی نشانیاں دکھائیں گے آفاق میں بھی اور خود ان کے اندر بھی۔ یہاں تک کہ اُن پر ظاہر ہو جائے گا کہ یہ قرآن حق ہے (41:53)۔

احمد اور الترمذی نے حضرت انس بن مالک کے حوالہ سے ایک حدیث نقل کی ہے۔ اس کے مطابق، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: مَثَلُ أُمَّتِي مَثَلُ الْمَطَرِ لَا يُدْرَى أَوَّلُهُ خَيْرٌ أَمْ آخِرُهُ (مسند احمد، حدیث نمبر 12327؛ سنن الترمذی، حدیث نمبر 2869)۔ یعنی، میری امت کی مثال بارش کی مانند ہے۔ نہیں معلوم کہ اس کا اوّل بہتر ہوگا یا اُس کا آخر۔

بارش جب ہوتی ہے تو اُس کے ابتدائی دور میں بھی انسان کو بہت سی برکتیں حاصل ہوتی ہیں۔ مگر بعد کے مرحلہ میں جب بارش سے سیراب ہو کر زمین سبزہ اور درخت اُگاتی ہے تو اس دوسرے مرحلہ میں اُس کی برکتیں اور زیادہ بڑھ جاتی ہیں۔ اب فصل اور پھول اور پھل، وغیرہ پیدا ہوتے ہیں جو انسان کے لیے بے پناہ خیر و برکت کا ذریعہ ہیں۔

یہی معاملہ دین محمدی کا ہے۔ دین محمدی کا ظہور ہوا تو اُس وقت دنیا اپنے روایتی دور میں تھی۔ اُس دور میں بھی اس دین کے پیروؤں کو اُس سے بے پایاں فائدے حاصل ہوئے۔ بعد کے زمانہ میں جب کہ دنیا سائنسی دور میں داخل ہوگی تو اُس وقت بھی اس دین کے پیروؤں کو نئے امکانات کے اعتبار سے عظیم فائدے حاصل ہوں گے۔ دین کی علمی وفکری عظمت ازسرِ نو نئی شان کے ساتھ لوگوں کے ذہنوں پر قائم ہوجائے گی۔

اس حدیث میں امت کے دورِ آخر میں جس عظیم خیر کی پیشین گوئی کی گئی ہے اُس سے مراد غالباً وہی سائنسی حقیقتیں ہیں جنھوں نے نئے وسیع تر انداز میں اس امکان کا دروازہ کھول دیا کہ انسان اُن کو استعمال کر کے یقین کے اعلیٰ درجات حاصل کرے۔ اور اسلام کی صداقت کو نئے دلائل و براہین کے ذریعہ لوگوں کے اوپر ثابت شدہ بنائے۔

ایک سادہ مثال

مذکورہ حدیث میں جس حقیقت کو بتایا گیا ہے اُس کو اگر لفظ بدل کر کہا جائے تو وہ یہ ہوگی کہ انسانی تاریخ کے دو بڑے دور ہیں۔ ایک قبل از سائنس دور (pre-scientific

period) اور دوسرا بعد از سائنس دور (post-scientific period)۔ اس تقسیم کے مطابق، پہلے دور کا انسان روایتی معلومات کی روشنی میں سوچتا تھا۔ اور دوسرے دور میں وہ سائنسی معلومات کی روشنی میں سوچنے لگا۔ اس حدیث کے مطابق، امت محمدی کے افراد کے لیے روایتی دور بھی ایمانی خوراک کا ذریعہ تھا۔ اسی طرح سائنسی دور میں بھی وہ اپنے ایمانی اضافہ کے لیے علمی خوراک حاصل کرتے رہیں گے۔ اس معاملہ کو سمجھنے کے لیے یہاں ایک سادہ مثال درج کی جاتی ہے۔

قرآن میں بار بار زمین کی نعمتوں کا ذکر آیا ہے۔ اس سلسلہ کی ایک قرآنی آیت یہ ہے: اللّٰہُ الَّذِی جَعَلَ لَکُمُ الْأَرْضَ قَرَارًا (40:64)۔ یعنی، وہ اللہ ہے جس نے بنایا تمہارے لیے زمین کو ٹھہراؤ۔ اس آیت میں روایتی دور کے مؤمنین کو بھی ایمان کی غذا ملی تھی۔ یہ سوچ کر اُن کا سینہ شکر خداوندی کے جذبہ سے سرشار ہو گیا تھا کہ زمین کس طرح اُن کے لیے پُرسکون جائے قیام بنی ہوئی ہے۔ اگر زمین ہلتی رہتی یا وہ ہچکولے کھاتی تو اس کے اوپر پُرسکون زندگی گزارنا کس قدر دشوار ہو جاتا۔

جدید سائنسی دور میں نئے ذرائع سے جو مطالعہ کیا گیا اس سے معلوم ہوا کہ زمین، سابق تصور کے خلاف ساکن اور بے حرکت نہیں ہے بلکہ وہ مسلسل حرکت میں ہے۔ نئی تحقیقات بتاتی ہیں کہ زمین بیک وقت دو طریقہ سے گردش کر رہی ہے۔ ایک اپنے مدار (orbit) پر سورج کے گرد، اور دوسرے خود اپنے محور (axis) کے اوپر۔

اس نئی سائنسی تحقیق نے مذکورہ آیت کی معنویت کو اور زیادہ بڑھا دیا۔ نئے حالات میں یہ آیت گویا مزید اضافہ کے ساتھ یہ کہہ رہی ہے کہ — کیسا مہربان ہے وہ اللہ جس نے زمین کو تمہارے لیے جائے سکون بنایا، باوجود یکہ زمین مسلسل طور پر دہرا حرکت کر رہی ہے:

It is God who made the earth a stable home for you, inspite of continuous double movement of the earth.

حدیث کی تمثیل کے مطابق، "بارش" کے پہلے دور میں اگر انسان سادہ طور پر یہ سمجھ کر زمین کو اپنے لیے خدا کی رحمت جانتا تھا کہ وہ اُس کے لیے پُرسکون جائے قیام بنی ہوئی ہے، تو اب بارش کے دوسرے دور میں وہ اس اضافہ کے ساتھ اس معاملہ میں خدا کا شکر کرے گا کہ دہرا طور پر مسلسل حرکت میں ہونے کے باوجود خدا نے زمین کو اُس کے لیے سکون کا مقام بنا دیا ہے۔

زندگی کی مددگار

ثوبان رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ قرآن میں جب یہ آیت اُتری کہ جو لوگ سونا اور چاندی جمع کرتے ہیں اُن کے لیے وعید ہے (9:34) تو بعض صحابہ نے کہا کہ اگر ہم یہ جانتے کہ کون سا مال بہتر ہے تو ہم اسی کو لیتے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: سب سے افضل چیز خدا کو یاد کرنے والی زبان ہے۔ اور خدا کا شکر کرنے والا دل ہے۔ اور وہ مومنہ بیوی جو آدمی کے ایمان پر اُس کی مدد کرے: عَنْ ثَوْبَانَ قَالَ: لَمَّا أُنْزِلَتْ: الَّذِينَ يَكْنِزُونَ الذَّهَبَ وَالْفِضَّةَ، وَلَا يُنْفِقُونَهَا فِي سَبِيلِ اللَّهِ [التوبة: 34] قَالَ: كُنَّا مَعَ رَسُولِ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فِي بَعْضِ أَسْفَارِهِ. فَقَالَ: بَعْضُ أَصْحَابِهِ قَدْ نَزَلَ فِي الذَّهَبِ وَالْفِضَّةِ مَا نَزَلَ، فَلَوْ أَنَّا عَلِمْنَا أَيُّ الْمَالِ خَيْرٌ اتَّخَذْنَاهُ فَقَالَ: أَفْضَلُهُ لِسَانًا ذَاكِرًا، وَقَلْبًا شَاكِرًا، وَزَوْجَةً مُؤْمِنَةً تُعِينُهُ عَلَى إِيمَانِهِ (**مسند احمد، حدیث نمبر** 22392)۔

مادی دولت صرف دنیا کی عارضی زندگی میں کچھ راحت دے سکتی ہے۔ مگر ذکر اور شکر اور ایمان کی دولت وہ دولت ہے جو آخرت کی ابدی زندگی میں زیادہ بڑی راحت کا ذریعہ بنے گی۔ ذکر کا مطلب یہ ہے کہ آدمی خدا کو یاد کرے، اس کا ذہن خدا کی سوچ میں لگا رہے۔

شکر یہ ہے کہ آدمی کو خدا کی نعمتوں کا گہرا احساس ہو جائے۔ وہ دل کی گہرائیوں کے ساتھ خدا کے انعامات کا اعتراف کرنے لگے۔ ایمان سے مراد خدا کی معرفت ہے۔ خدا کی شعوری دریافت کے نتیجہ میں آدمی کے اندر جو عقیدہ بنتا ہے اُسی کا نام ایمان ہے۔

کسی مرد کے لیے عورت ان پہلوؤں سے سب سے بڑی مددگار ہے۔ مرد اور عورت اپنی روزانہ کی زندگی میں جب ایک دوسرے سے فکری تبادلہ (intellectual exchange) کرتے ہیں تو دونوں کو اس سے یہ فائدہ ملتا ہے کہ وہ خدا کی یاد کا گہرا روحانی تجربہ کرتے ہیں۔ وہ خدا کے عطیات کا تذکرہ کر کے ایک دوسرے کے اندر شکر کے جذبات کو بڑھاتے ہیں۔ وہ خدا کی ذات وصفات میں باہمی غور وفکر کرتے ہیں جس کے نتیجہ میں دونوں کی معرفت (realization) میں اضافہ ہوتا ہے۔

پھول اور کانٹا

انسان کا عرصۂ حیات (life span) بلین سال سے بھی زیادہ ہے۔ مگر یہ عرصۂ حیات دو مختلف دوروں میں بٹا ہوا ہے۔ موت سے پہلے تقریباً سو سال اور بقیہ پوری مدت موت کے بعد۔ پہلے دور کی زندگی آج کی دنیا میں گزرتی ہے اور بعد کے دور کی زندگی کل کی دنیا میں گزرے گی۔

آج کی دنیا ایک مخلوط جنگل کی مانند ہے۔ یہاں پھول بھی ہیں اور اسی کے ساتھ کانٹے بھی۔ کل کی دنیا میں پھول اور کانٹے ایک دوسرے سے الگ کر دئیے جائیں گے۔ اس کے بعد ایک ایسی ابدی دنیا بنے گی جس کے ایک حصے میں کانٹے ہی کانٹے ہوں گے اور دوسرے حصے میں پھول ہی پھول۔ آج کی دنیا میں ہر آدمی کے لیے یہ موقع ہے کہ وہ اپنے ابدی مستقبل کی تشکیل کرے۔ وہ اپنی زندگی کے ریکارڈ سے بتائے کہ کل کی دنیا میں وہ کانٹوں کے جنگل میں بسائے جانے کے قابل ہے یا پھولوں کے باغ میں۔

آج کی دنیا میں یہی گروپ بندی ہو رہی ہے۔ ہر آدمی اپنی زندگی کے ریکارڈ سے یہ بتا رہا ہے کہ وہ دونوں گروپوں میں سے کس گروپ میں شامل جانے کے لائق ہے۔ کانٹوں والے گروپ میں یا پھولوں والے گروپ میں۔آج کی دنیا کے حالات دراصل اسی شخصیت سازی کا ذریعہ ہیں۔ ہر عورت اور مرد اسی عمل سے گزر رہے ہیں۔ کوئی اپنے اندر کانٹوں والی شخصیت بنا رہا ہے اور کوئی اپنے اندر پھولوں والی شخصیت کی تعمیر کر رہا ہے۔ آج کی دنیا میں یہ دونوں قسم کے لوگ بظاہر الگ الگ دکھائی نہیں دیتے مگر کل کی دنیا میں دونوں قسم کے لوگ ایک دوسرے سے پوری طرح الگ ہو جائیں گے۔ وہاں پھولوں والی شخصیت صرف پھول کے روپ میں دکھائی دے گی اور کانٹوں والی شخصیت صرف کانٹے کے روپ میں۔

شخصیت سازی کے اس دوطرفہ عمل کو دوسرے لفظوں میں مثبت شخصیت اور منفی شخصیت کہہ سکتے ہیں۔آج کی دنیا میں ہر آدمی کو منفی تجربات پیش آتے ہیں۔اب ایک شخص وہ ہے جو ان منفی تجربات کو منفی حیثیت ہی سے لے لے۔ ایسے آدمی کے اندر منفی شخصیت بنے گی، دوسرا آدمی وہ ہے جو منفی تجربہ کو مثبت غذا میں تبدیل کر سکے۔مثلاً ایک شخص آپ کو برا کہتا ہے۔ ایک شخص آپ کو ستاتا ہے۔ایک شخص آپ کے ساتھ اشتعال انگیزی کرتا ہے۔ایک شخص آپ کو نقصان پہنچاتا ہے۔ایک شخص آپ کے خلاف تخریب کاری کرتا ہے۔اب آپ کے لیے جواب (response) کے دو طریقے ہیں۔ایک یہ کہ آپ ویسا ہی کریں جیسا کہ دوسرے شخص نے آپ کے ساتھ کیا۔یعنی جو شخص آپ کو برا کہے آپ بھی اس کو برا کہیں، جو شخص آپ کو ستائے آپ بھی اس کو ستائیں۔ جو شخص آپ کو نقصان پہنچائے آپ بھی اس کو نقصان پہنچائیں جو شخص آپ کے خلاف تخریب کاری کرے آپ بھی اس کے خلاف تخریب کاری کریں۔ جو شخص آپ کو اشتعال دلائے آپ بھی اس کے مقابلہ میں مشتعل ہو جائیں، وغیرہ۔

جو آدمی ایسا کرے اس نے اپنے اندر منفی شخصیت بنائی۔ اس نے اپنے سینہ میں کانٹوں

کی فصل اگائی۔ ایسے آدمی کی شخصیت کانٹوں والی شخصیت ہے۔ وہ موت کے بعد کی اگلی دنیا میں کانٹوں والی شخصیت کے طور پر اٹھے گا اور پھر کانٹوں سے بھرے ہوئے جنگل کے اندر اس کو ڈال دیا جائے گا تا کہ ابد تک وہ حسرت اور غم کی زندگی گزارتا رہے۔

اس کے برعکس، دوسرا انسان وہ ہے جس نے دوسروں کی منفی روش کا مقابلہ مثبت رسپانس (response) سے کیا۔ جس کو دوسروں نے برا کہا مگر خود اس نے کسی کو برا نہیں کہا۔ دوسروں نے اس کو ستایا مگر اس نے کسی کو نہیں ستایا۔ جس کے خلاف دوسروں نے انتقامی کارروائی کی مگر اس نے دوسروں کے خلاف کوئی انتقامی کارروائی نہیں کی۔ جس کے خلاف دوسروں نے تخریب کاری کی مگر اس نے اپنی طرف سے کسی کے خلاف تخریب کاری نہیں کی۔ جس کو دوسروں نے نقصان پہنچایا مگر اس نے کبھی کسی کو نقصان نہیں پہنچایا۔ جس کے خلاف دوسروں نے اشتعال انگیزی کی مگر اس نے کسی کے خلاف کبھی اشتعال کے تحت کوئی کارروائی نہیں کی۔

یہ دوسرا انسان وہ ہے جو کانٹوں کے درمیان پھول بن کر رہا۔ اس نے اپنے اندر پھول جیسی شخصیت کی تعمیر کی۔ ایسے انسان کو اگلی دنیا میں یہ موقع دیا جائے گا کہ وہ پھولوں کے باغ میں رہے۔ آج کی کانٹوں بھری دنیا میں پھول والی شخصیت بنانے کی تدبیر کیا ہے۔ اس کے لیے فطرت نے آج کی دنیا میں کچھ زندہ نمونے قائم کر دیے ہیں۔ گائے اِسی قسم کا ایک نمونہ ہے۔ گائے فطرت کی ایک انڈسٹری ہے جس کو باہر کی دنیا سے گھاس کھانے کو ملتی ہے مگر وہ اپنے داخلی میکانزم کے تحت گھاس کو دودھ میں کنورٹ کرتی ہے۔ یہی معاملہ ہر عورت اور مرد کو اس دنیا میں کرنا ہے۔ ہر عورت اور مرد کو مسلسل یہ کرنا ہے کہ وہ ”گھاس“ کو ”دودھ“ کی صورت میں تبدیل کرتا رہے۔

انسان کے ذہن کے دو بڑے خانے ہیں۔ ایک شعوری ذہن (conscious mind)

دوسرا لاشعوری ذہن (unconscious mind) ۔ جب بھی کوئی بات آدمی کے ذہن میں آتی ہے تو پہلے وہ اس کے ذہن کے شعور کے خانہ میں آتی ہے۔ اس کے بعد دھیرے دھیرے وہ آگے بڑھ کر اس کے ذہن کے لاشعور کے خانہ میں پہنچ جاتی ہے۔ لاشعور آدمی کے ذہن کا وہ خانہ ہے جہاں ہر بات دوامی طور پر محفوظ رہتی ہے مگر وہ آدمی کے شعور کی گرفت میں نہیں رہتی۔ جو آدمی پھول والی شخصیت بننا چاہے اس کو یہ کرنا ہوگا کہ جب بھی کوئی منفی آئٹم اس کے شعوری ذہن میں آئے تو اُسی وقت وہ اپنی سوچ کو متحرک کر کے اس منفی آئٹم کو مثبت آئٹم میں تبدیل کرے تا کہ جب آگے بڑھ کر یہ آئٹم آدمی کے لاشعور کے اسٹور میں محفوظ ہو تو وہاں وہ مثبت آئٹم کے طور پر محفوظ ہو نہ کہ منفی آئٹم کے طور پر۔ مثلاً کوئی بات اس کے شعور میں نفرت کے احساس کے طور پر آئے تو وہ اس کو diffuse کر کے وہ اس کو محبت کے احساس میں تبدیل کرے۔ کوئی بات حسد کے احساس کے طور پر اس کے دماغ میں آئے تو وہ اس کو بدل کر اعتراف کے احساس میں تبدیل کر لے۔ کسی بات پر اس کا ایگو (ego) بھڑ کے تو وہ اس کو بدل کر تواضع کی صورت دے دے۔ کوئی تجربہ اس کے اندر خود غرضی کا احساس پیدا کرے تو وہ بدل کر اس کو بے غرضی کا احساس بنا دے۔ کسی واقعہ میں اس کو اپنی حق تلفی دکھائی دے تو اس کو وہ بدل کر شکر کے احساس میں ڈھال لے۔

جو عورت یا مرد اپنے اندر اس طرح کی شخصیت تعمیر کریں ان کا حال یہ ہوگا کہ ان کے شعور کا اسٹور مکمل طور پر مثبت آئٹم کا خزانہ بن جائے گا۔ وہ منفی آئٹم سے پوری طرح خالی ہوگا۔ ایسی مثبت شخصیت والے لوگ ہی موت کے بعد کی ابدی دنیا میں پھولوں والے باغ میں جگہ پائیں گے۔ جہاں وہ ابدی طور پر خوشی اور آرام کی زندگی گزاریں۔

زحمت میں رحمت

ایک صاحب سے بات کرتے ہوئے میں نے شیلے کا ذکر کیا اور کہا کہ پی۔ بی۔ شیلے (Percy Bysshe Shelley) ایک برٹش شاعر تھا۔ وہ 1792ء میں پیدا ہوا، اور 1822ء میں اس کی وفات ہوئی۔ اس کا قول ہے کہ — ہمارے سب سے زیادہ شیریں نغمے وہ ہیں جو سب سے زیادہ پُردرد نغمے ہیں:

Our sweetest songs are those that tell our saddest thoughts.

یہ کوئی سادہ بات نہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ جن لوگوں کو دردمند زندگی ملتی ہے انھیں کی زبان سے پُرسوز کلام جاری ہوتا ہے۔ پُرراحت اور پُرمسرت زندگی گزارنے والے کبھی پُرسوز کلام کی تخلیق نہیں کرسکتے۔ اِسی حقیقت کو فانی بدایونی نے اِن الفاظ میں نظم کیا ہے:

زمانہ بَرسرِ آزار تھا مگر فانی　　　تڑپ کے ہم نے بھی تڑپا دیا زمانے کو

جب کسی انسان کو خدا پُردرد زندگی دے تو یہ خدا کی طرف سے اس کے لیے ایک خاموش پیغام ہوتا ہے۔ یہ اِس بات کی علامت ہے کہ خدا اُس انسان کے اندر چھپی ہوئی صلاحیتوں کو جگانا چاہتا ہے۔ خدا اس انسان کو انتہائی سنجیدہ انسان بنانا چاہتا ہے۔ یہ خدا کی منصوبہ بندی کا ایک حصہ ہے۔ ایسے انسان کو چاہیے کہ وہ خدا کے فیصلے پر راضی ہو اور انسانیت کی تعمیر کی راہ میں اپنا وہ حصہ ادا کرے جو اس سے مطلوب ہے۔ یعنی اپنے سنجیدہ کلام اور پُردرد پیغام کے ساتھ لوگوں کی رہنمائی۔

ایسا انسان گویا کہ خدا کی طرف سے ایک چنا ہوا انسان (choosen person) ہوتا ہے۔ اس کو خدا کی خصوصی رحمت کا ایک حصہ ملا ہوتا ہے۔ ایسی حالت میں اس کو چاہیے کہ وہ خدا کا شکر گزار بندہ بنے۔ وہ اپنے آپ کو احساسِ محرومی کے منفی جذبے سے بچائے۔ وہ مکمل طور پر مثبت نفسیات والا ایک انسان بنے۔ تا کہ وہ خدا کے بندوں کے درمیان وہ اصلاحی رول ادا کرسکے جو خدا نے اس کے لیے مقدر کیا ہے۔

غلطی کا اعتراف

میں نے ایک صاحب سے کہا کہ اگر کسی معاملے میں آپ دیکھیں کہ ننانوے فیصد غلطی فریقِ ثانی کی ہے اور صرف ایک فیصد غلطی آپ کی ہے تب بھی آپ یہ مان لیجیے کہ ساری غلطی آپ ہی کی ہے۔ آپ کھلے طور پر فریقِ ثانی سے کہہ دیجیے کہ آپ صحیح ہیں، میں ہی غلطی پر تھا:

You are right, I was worng.

اعتراف کی اِس روش کا فائدہ صرف یہ نہیں ہے کہ نزاع فوری طور پر ختم ہوجاتی ہے۔ اس کا اس سے بھی زیادہ بڑا فائدہ یہ ہے کہ آپ کی یہ روش آپ کے ذہنی اور روحانی ارتقاء میں مددگار بنتی ہے۔

میرے تجربے کے مطابق، معروف قسم کی متصوّفانہ ورزشوں کا کوئی تعلق تزکیۂ روحانی سے نہیں۔ تزکیہ کا سب سے بڑا ذریعہ اپنی غلطی کا کھلا اعتراف ہے۔ حضرت عمر کے اندر اپنی غلطی کے اعتراف کا مادہ اتنا زیادہ تھا کہ وہ مبالغہ آمیز طور پر اپنی غلطی کا اعتراف کرتے تھے۔ مثلاً وہ کہتے کہ: لو لا فلان لهلك عمر (اگر فلاں شخص نہ ہوتا تو عمر ہلاک ہوجاتا)۔

حقیقت یہ ہے کہ سب سے بڑا تزکیہ یہ ہے کہ آدمی کے اندر حقیقی تواضع کی صفت پیدا ہو۔ اس کے اندر سے کبر کا مزاج نکل جائے۔ غلطی کے اعتراف کا مزاج آدمی کے اندر یہی اعلیٰ صفت پیدا کرتا ہے۔ تزکیہ کا سب سے بڑا کورس یہی ہے۔

ایک صاحب سے گفتگو کے دوران میں نے خلیفۂ دوم عمر فاروق کے ایک قول کا حوالہ دیا۔ اس کے الفاظ یہ ہیں: إِنَّهُ لَا يَصْلُحُ لِهَذَا الأَمْرِ إِلَّا قَوِيٌّ في غَيْرِ عُنْفٍ، لينٌ فِي غَيْرِ ضَعْفٍ، جَوَادٌ في غَيْرِ سَرَفٍ، مُمْسِكٌ فِي غَيْرِ بُخْلٍ (الطبقات الکبریٰ لابن سعد، جلد 6، صفحہ 330)۔ یعنی، اس کام کا اہل صرف وہی شخص ہے جو شدید ہو بغیر اکڑ کے، نرم ہو بغیر کمزوری کے، سخی ہو و بغیر فضول خرچی کے، مال روکنے والا ہو بغیر بخل کے۔

اسـس کی وضاحت کرتے ہوئے میں نے کہا کہ کوئی بڑا کام کرنے کے لیے اہل صرف وہ شخص ہوتا ہے جو مجموعۂ تضادات (mixture of opposites) ہو۔ مثلاً نہایت اعلیٰ ذہن کا حامل ہونے کے باوجود وہ آخری حد تک متواضع (modest) ہو۔

مزید وضاحت کرتے ہوئے میں نے کہا کہ عالم حقائق (universe of facts) اتنا زیادہ وسیع ہے کہ کبھی کوئی شخص اس کا احاطہ نہیں کرسکتا۔ مگر حقائق کا ادراک کرنے کے لیے صرف اعلیٰ ذہن کافی نہیں۔ اسی کے ساتھ کامل تواضع لازمی طور پر ضروری ہے۔ کامل تواضع اس بات کی ضمانت ہے کہ اس کے لرننگ پراسـس (learning process) پر کوئی فُل اسٹاپ نہ آئے۔ یہ ایک نفسیاتی حقیقت ہے کہ کِبر، تعلّم (learning) کے عمل کو روک دیتا ہے۔ اِس کے برعکس، تواضع تعلّم کے عمل کو مسلسل طور پر جاری رکھتا ہے۔ میں اپنے تجربے سے یہ سمجھتا ہوں کہ ذہنی ارتقاء کے لیے سب سے زیادہ ضروری شرط یہ ہے کہ آدمی ہر لمحہ یہ کہنے کے لیے تیار ہو کہ میں غلطی پر تھا:

I was wrong.

غلطی کو فوراً مان لینا، آدمی کے علم میں اضافہ کرتا ہے۔ اس کے برعکس، جس آدمی کے اندر اپنی غلطی کو ماننے کا مزاج نہ ہو وہ ذہنی جمود کا شکار ہو جائے گا، اس کے اندر ذہنی ارتقاء کا سفر کبھی جاری نہیں رہ سکتا۔

اعتراف کے ذریعے فکری ارتقاء کا جاری رہنا کوئی پُراسرار بات نہیں۔ بلکہ وہ ایک معلوم بات ہے۔ اصل یہ ہے کہ ہر آدمی کا دماغ مختلف معلومات کا جنگل ہوتا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ہر آدمی کنفیوژن میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ وہ صحیح اور غلط کو ایک دوسرے سے الگ الگ کرکے دیکھ نہیں پاتا۔ یہ چیز آخر کار آدمی کو تشکیک تک لے جاتی ہے۔

اِس مسئلے کا حل صرف ایک ہے۔ اور وہ یہ کہ جب بھی مطالعہ یا ڈسکشن کے درمیان آدمی پر

یہ واضح ہو کہ اس کے دماغ میں فلاں بات جو پڑی ہوئی ہے وہ غلط ہے، اس کو چاہیے کہ وہ اسی وقت کھلے طور پر اس کو مان لے کہ میں اِس معاملے میں غلطی پر تھا۔ اسی کا نام اعتراف ہے۔

اِس اعتراف کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ آدمی کے ذہن میں کر کشن اور تصحیح کا عمل شروع ہوجاتا ہے۔ ایک غلط بات جو اس کے ذہن میں صحیح بات کی حیثیت سے موجود تھی اب اس کا ذہن غلط مان کر اس کو غلطی کے خانے میں ڈال دیتا ہے۔ جب کہ اس سے پہلے وہ صحیح کے خانے میں پڑی ہوئی تھی۔ عام حالت میں یہ ہوتا ہے کہ صحیح آئٹم اور غلط آئٹم دونوں انسان کے دماغ میں ملے جُلے رہتے ہیں۔ غلطی ماننے کا مزاج یہ کرتا ہے کہ جو بات صحیح ثابت نہ ہو اس کو غلط کے خانے میں ڈالتا رہتا ہے، اِس طرح وہ اِس کنفیوژن سے باہر آجاتا ہے کہ وہ صحیح اور غلط میں فرق نہ کرے اور دونوں کو یکساں طور پر درست سمجھتا رہے۔

غلطی کو نہ ماننا کوئی سادہ بات نہیں۔ غلطی کو نہ ماننے کی نفسیات ہمیشہ یہ ہوتی ہے کہ آدمی اپنے کِبر کے مزاج کو توڑنا نہیں چاہتا۔ کبر دوسرے لفظوں میں خود پسندی کا نام ہے۔ اپنی خود پسندی کی حفاظت میں آدمی یہ کرتا ہے کہ وہ غلطی کا اعتراف نہیں کرتا۔ اِس طرح فرضی طور پر وہ اپنے آپ کو اِس جرم میں مبتلا رکھتا ہے کہ میں درست ہوں، میرے اندر کوئی غلطی نہیں۔ بظاہر آدمی اپنی اِس خود پسندی کی حفاظت کر کے خوش ہوجاتا ہے۔ وہ سمجھتا ہے کہ میں نے اپنے آپ کو بچالیا۔ حالاں کہ وہ اپنے کو تباہی کے غار میں ڈال رہا ہوتا ہے۔ اپنے اِس عمل کی اس کو یہ بھیانک قیمت دینی پڑتی ہے کہ اس کا علمی اور روحانی ارتقاء رُک جائے اور وہ معرفت کے اعلیٰ تجربے سے محروم ہو کر رہ جائے۔

معرفت تواضع کے ساتھ جڑی ہوئی ہے۔ تواضع نہیں تو معرفت بھی نہیں۔ اور سچی تواضع کی علامت یہ ہے کہ آدمی کسی تحفظِ ذہنی کے بغیر حق کا کھلا اعتراف کرے۔ وہ بے اعترافی کا تحمل نہ کر کے حق کے آگے ڈھہ پڑے۔ جو شخص سچائی کا اعتراف نہیں کرتا وہ عملاً اِس بات کا

ثبوت دیتا ہے کہ وہ حق سے اوپر ہے۔ سچائی اِس دنیا میں خدا کی نمائندہ ہے۔ ایک شخص کے سامنے جب سچی دلیل آئے اور وہ اس کو نظر انداز کردے تو گویا اس نے خدا کو نظر انداز کردیا۔ ایسے لوگوں کے لیے خدا کے یہاں ابدی محرومی کے سوا اور کوئی انجام مقدر نہیں۔

قرآن میں آیا ہے: وَقَلِيلٌ مِنْ عِبَادِيَ الشَّكُورُ (34:13)۔ یعنی میرے بندوں میں بہت کم ہیں جو شکر کرنے والے ہیں۔ شکر کیا ہے۔ شکر دراصل وہ چیز ہے جس کو اعتراف (acknowledgement) کہا جاتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اعتراف سب سے بڑی عبادت ہے۔ ایک طرف خدا کی نعمتوں کا اعتراف اور دوسری طرف انسان کے مقابلے میں اعتراف۔ یہ دو چیزیں گویا دین کا خلاصہ ہیں۔

لوگوں کا حال یہ ہے کہ یا تو وہ اعتراف کے وقت اعتراف نہیں کرتے یا دل سے تو مان لیتے ہیں مگر زبان سے بول کر وہ اپنی غلطی کا اعتراف ضروری نہیں سمجھتے۔ میں سمجھتا ہوں کہ دونوں میں بہت زیادہ فرق نہیں ہے۔ یہ سمجھنا کہ ہم نے دل سے تو مان لیا ہے زبان سے بولنے کی کیا ضروت۔ یہ اپنی حقیقت کے اعتبار سے اعتراف نہیں ہے بلکہ منافقت ہے۔ جب آدمی قلبی اعتراف کے باوجود زبان سے کھُلے طور پر اس کا اظہار نہ کرے تو یہ بے اعترافی ہی کی ایک صورت ہوتی ہے۔ کیوں کہ بے اعترافی کا سبب یہ ہوتا ہے کہ آدمی دوسروں کے سامنے یہ ظاہر نہیں کرنا چاہتا کہ وہ اِس معاملے میں بے خبر تھا۔

ٹھیک یہی نفسیات اُس انسان کی ہوتی ہے جو دل میں محسوس کرنے کے باوجود زبان سے بول کر اس کا اظہار نہ کرے۔ یہ نہ بولنا بھی اسی لیے ہوتا ہے کہ آدمی اپنی پوزیشن کو بچانا چاہتا ہے۔ وہ نہیں چاہتا کہ دوسرے لوگ اِس بات کو جان لیں کہ وہ اب تک بے خبری کا شکار تھا، یا اس سے کوئی غلطی ہوگئی ہے، یا اس نے ایسی کوئی غلطی کردی جس کی اُسے تصحیح کرنا چاہیے۔

آدمی جب معاملے کی وضاحت کے باوجود اعتراف نہیں کرتا تو اس کا سبب یہ ہوتا ہے

کہ وہ سمجھتا ہے کہ ایسا کرکے وہ اپنی پوزیشن کو گھٹا لے گا، دوسرے کے مقابلے میں اس کی برتری باقی نہ رہے گی۔ یہ نفسیات مکمل طور پر شیطانی نفسیات ہے۔ اللہ تعالیٰ نے جب شیطان کو حکم دیا کہ وہ آدم کے آگے جُھکے تو یہ اعتراف ہی کا ایک معاملہ تھا۔ مگر شیطان نے اِس اعتراف سے انکار کیا، اُس نے کہا کہ میں آدم سے برتر ہوں: أَنَا خَيْرٌ مِنْهُ (7:12)۔

جب بھی کوئی آدمی بے اعترافی کا مظاہرہ کرے تو اس کا سبب یہی ہوتا ہے کہ وہ اپنی بڑائی کے احساس میں جی رہا ہوتا ہے۔ اپنی بڑائی کو باقی رکھنے کے لیے وہ اعتراف نہیں کرتا۔ حتیٰ کہ اگر اس کا دل یہ محسوس کرلے کہ اِس معاملے میں میں غلطی پر ہوں تب بھی وہ زبان سے اِس کا اظہار نہیں کرنا چاہتا تاکہ ظاہری طور پر اس کی پوزیشن برقرار رہے۔ اس کی پوزیشن پر کوئی حرف نہ آئے۔

یہ بلاشبہ بہت بڑی بھول ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ جو آدمی سچائی کے لیے اپنے آپ کو جُھکا لے اُسی کو اس دنیا میں سرفرازی ملتی ہے، اور جو آدمی اپنے جھوٹے بچاؤ کے لیے کُھلے اعتراف سے پرہیز کرے وہ حقیقت کی نظر میں اپنے آپ کو نیچے گرالیتا ہے۔ حتیٰ کہ خود اپنے ضمیر کے سامنے بھی وہ چھوٹا بن جاتا ہے۔

غلطی کا اعتراف ایک اعلیٰ درجے کی نیکی ہے۔ غلطی کا اعتراف دراصل اپنی تواضع کو ثابت شدہ بنانا ہے۔ جس شخص کے اندر غلطی کے اعتراف کا مزاج نہیں وہ یقینی طور پر تواضع سے بھی خالی ہوگا۔ اور تواضع کے بغیر کسی کا ایمان مکمل نہیں ہوتا۔

لوگوں کا حال یہ ہے کہ وہ یا تو غلطی کا اعتراف نہیں کریں گے۔ یا اپنے دل کے اندر غلطی کو محسوس کرکے یہ سمجھیں گے کہ انھوں نے غلطی کا اعتراف کرلیا۔ حالاں کہ غلطی کا ماننا وہی معتبر ہے جب کہ آدمی زبان سے بول کر اس کا کُھلا اقرار کرے۔ دل میں غلطی کو محسوس کرنا اور زبان سے اس کا کُھلا اعتراف نہ کرنا منافقت کی علامت ہے۔ ضمیر ہر انسان کے اندر

ہے، اِس بنا پر ایسا ہوتا ہے کہ منافق انسان بھی اپنے دل میں محسوس کرتا ہے کہ اس معاملے میں مجھ سے غلطی ہوئی۔ لیکن وہ زبان سے الفاظ کی صورت میں اس کا اظہار نہیں کرتا۔ اس کے برعکس، مؤمن کا طریقہ یہ ہے کہ جب اس کی غلطی اس پر واضح ہوجاتی ہے تو وہ فوراً کہہ اٹھتا ہے کہ میں نے غلطی کی۔ یہی وجہ ہے کہ حضرت عمر فاروق غلطی کے احساس کے بعد فوراً بول پڑتے تھے۔ مثلاً ایک بار انھوں نے کہا کہ:

أَصَابَتِ امْرَأَةٌ وَأَخْطَأَ عُمَرُ۔ اور کُلُّ النَّاسِ أَفْقَهُ مِنْكَ يَا عُمَرُ! (تفسیر القرطبی، جلد 5، صفحہ 99)۔ یعنی، ایک عورت نے صحیح کہا، اور عمر نے غلطی کی۔ اے عمر، ہر آدمی تجھ سے زیادہ جانتا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ دل میں غلطی کو محسوس کرنا اور زبان سے بول کر اس کا اظہار نہ کرنا منافقانہ روش ہے۔ اور دل میں غلطی کا احساس پیدا ہوتے ہی زبان سے بول کر لفظوں میں اس کا کُھلا اعتراف کرنا مؤمنانہ روش۔

رمضان کا مہینہ

رمضان میں ایک مہینے کے لیے روزہ رکھا جاتا ہے۔ یعنی دن کے اوقات میں کھانے اور پینے کو پوری طرح چھوڑ دینا۔ دوسرے لفظوں میں آدمی سال کے گیارہ مہینے تک کھانے اور پینے کا تجربہ کرتا ہے اور سال کے ایک مہینے میں وہ یہ تجربہ کرتا ہے کہ نہ کھانا کیا ہے اور نہ پینا کیا۔ یہ باخوراک زندگی کے بعد بے خوراک زندگی کا تجربہ ہے۔ یہ آزاد زندگی کے بعد پابند زندگی کا تجربہ ہے۔

غذا کی حیثیت ایک علامت کی ہے۔ غذا علامتی طور پر یہ بتاتی ہے کہ خدا نے اِس دنیا میں استثنائی طور پر انسان کے لیے وہ عظیم سسٹم بنایا ہے جس کو لائف سپورٹ سسٹم کہا جاتا ہے۔ وسیع کائنات میں اَن گنت ستارے اور سیّارے ہیں لیکن کہیں بھی وہ لائف سپورٹ

سسٹم نہیں جو صرف ہماری زمین میں خصوصی طور پر پایا جاتا ہے۔

رمضان کا مہینہ دراصل اِسی عظیم نعمت کی یاددہانی ہے۔ رمضان کا مہینہ یہ یاد دلاتا ہے کہ اگر زمین پر لائف سپورٹ سسٹم موجود نہ ہوتو انسان کا کیا حال ہوگا۔ لائف سپورٹ سسٹم کے بغیر انسان بے یارومددگار ہو کر رہ جائے گا۔ وہ عجز کے آخری مقام پر پہنچ جائے گا۔ اس کے بعد زمین پر پانی نہ ہوگا جس کو وہ پیے۔ خوراک نہ ہوگی جس کو وہ کھائے۔ آکسیجن نہ ہوگا جس میں وہ سانس لے۔ سورج کی روشنی نہ ہوگی جس میں وہ چلے پھرے۔ زمین میں قوتِ کشش نہ ہوگی جس کے اوپر وہ اپنے تمدّن کی تعمیر کرے، وغیرہ۔

قرآن میں رمضان کے فائدے کو بتانے کے لیے دو لفظ استعمال کیے گیے ہیں: لَعَلَّكُمْ تَتَّقُونَ (2:183)، لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُونَ (2:185)۔ اِس کا مطلب یہ ہے کہ رمضان، آدمی کو لائف سپورٹ سسٹم کی اہمیت یاد دلاتا ہے، تاکہ وہ شکرِ خداوندی کے احساس میں غرق ہوجائے۔ اِسی طرح وہ یہ بھی یاد دلاتا ہے کہ اگر یہ لائف سپورٹ سسٹم نہ ہوتو اس کی پوری زندگی تباہ ہو کر رہ جائے گی۔ رمضان کا مہینہ ایک اعتبار سے تقویٰ کا مزاج پیدا کرتا ہے، اور دوسرے اعتبار سے شکر کا مزاج۔ اور بلاشبہ انھیں دونوں قسم کے احساسات میں جینے کا نام اسلام ہے۔

انعام کی شکر گزاری

رمضان کا مہینہ نزولِ قرآن کا مہینہ ہے۔ قرآن میں ارشاد ہوا ہے کہ:

> رمضان کا مہینہ جس میں قرآن اتارا گیا لوگوں کی ہدایت بنا کر اور ہدایت اور حق و باطل کے درمیان امتیاز کے کھلے دلائل کے ساتھ، پس جو کوئی تم میں سے اس مہینہ میں موجود ہو وہ اس کے روزے رکھے: شَهْرُ رَمَضَانَ الَّذِي أُنْزِلَ فِيهِ الْقُرْآنُ هُدًى لِلنَّاسِ وَبَيِّنَاتٍ مِنَ الْهُدَى وَالْفُرْقَانِ فَمَنْ شَهِدَ مِنْكُمُ الشَّهْرَ فَلْيَصُمْهُ (2:185)۔

اس آیت سے رمضان میں روزہ کی سالانہ عبادت کی حقیقت معلوم ہوتی ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اسی قمری مہینہ میں قرآن کے نزول کا آغاز ہوا۔ قرآن جیسی الہامی کتاب کا انسان کو دیا جانا بلا شبہ انسان کے اوپر بہت بڑا انعام تھا۔ اس انعام کی شکر گزاری یہی تھی کہ اس مہینہ کو خصوصی طور پر اللہ کے ذکر اور اللہ کی عبادت میں گزارا جائے۔

خدا کی شکر گزاری اور اس کی بڑائی کا اعتراف یہ ہے کہ آدمی قرآن کو اُس حیثیت سے پالے جس حیثیت سے خدا نے اس کو اپنے بندوں کے پاس بھیجا ہے۔ وہ اسی طرح آدمی کی ضرورت بن جائے جس طرح کھانا آدمی کی ضرورت ہے۔ وہ اس کو پا کر اسی طرح سیراب ہو جائے جس طرح ایک بھوکا آدمی کھانا کھا کر اور پانی پی کر آخری حد تک سیراب ہو جاتا ہے۔

شکر گزاری، سرکشی

ابو امامہ سے روایت ہے کہ ثعلبہ بن حاطب انصاری نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا کہ میرے لیے دعا کیجیے کہ خدا مجھے مال دے دے۔ آپ نے فرمایا: تھوڑے مال پر شکر گزار ہونا اس سے بہتر ہے کہ تم کو زیادہ مال ملے اور تم شکر ادا نہ کرسکو: عَنْ أَبِي أُمَامَةَ، أَنَّ ثَعْلَبَةَ بْنَ حَاطِبٍ الْأَنْصَارِيَّ، أَتَى رَسُولَ اللهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ، فَقَالَ: يَا رَسُولَ اللهِ، ادْعُ اللّٰهَ أَنْ يَرْزُقَنِي اللّٰهُ. قَالَ: وَيْحَكَ يَا ثَعْلَبَةُ، قَلِيلٌ تُؤَدِّي شُكْرَهُ خَيْرٌ مِنْ كَثِيرٍ لَا تُطِيقُهُ (المعجم الکبیر للطبرانی، حدیث نمبر 7873)۔

خدا کسی انسان کو دولت دے تو اس کو خدا کا شکر گزار بندہ بن کر رہنا چاہیے۔ لیکن اگر ذہن صحیح نہ ہو تو دولت مندی آدمی کے لیے سرکشی کا سبب بن جاتی ہے۔ اس کے برعکس، اگر ذہن صحیح ہے تو مفلسی میں بھی آدمی خدا کو نہیں بھولتا۔ جو کچھ ملا ہے اس پر قانع رہ کر وہ امید رکھتا ہے کہ اس کا خدا اس کو مزید دے گا۔

آدمی اگر آنکھ کھول کر دنیا میں رہے تو کبھی وہ سرکشی میں مبتلا نہ ہو۔ انسان ایک حقیر وجود

کی حیثیت سے پرورش پاتا ہے۔ اس کو حادثات پیش آتے ہیں۔ اس کو بیماری اور بڑھاپا لاحق ہوتا ہے۔ پانی اور دوسری چیزیں جن کے ذریعہ وہ اس دنیا میں اپنا "باغ" اگاتا ہے ان میں سے کوئی چیز بھی اس کے ذاتی قبضہ میں نہیں۔ یہ سب اس لیے ہے کہ آدمی متواضع بن کر دنیا میں رہے۔

اللہ نے جو کچھ انسان کو دیا ہے، خواہ وہ زرعی پیداوار کی صورت میں ہو یا دوسری صورت میں، سب کا سب رزق ہے۔ آدمی اگر ان چیزوں کو خدا کا دیا ہوا سمجھے اور خدا کے بتائے ہوئے طریقہ کے مطابق ان میں تصرف کرے تو اس کے اندر خدا کے شکر کا جذبہ ابھرے گا۔ مگر شیطان ہمیشہ اس کوشش میں رہتا ہے کہ وہ اس نسبت کو بدل دے، تاکہ اس "رزق" کے استعمال کے وقت آدمی کو خدائی یاد نہ آئے بلکہ دوسری چیزوں کی یاد آئے۔

شکر کی حقیقت

شکر یہ ہے کہ آدمی خدا کی نعمتوں کا اعتراف کرے۔ یہ اعتراف اصلاً دل میں پیدا ہوتا ہے۔ اور پھر وہ الفاظ کی صورت میں آدمی کی زبان پر آجاتا ہے۔

انسان کو خدا نے بہترین جسم اور دماغ کے ساتھ پیدا کیا۔ اس کی ضرورت کی تمام چیزیں افراط کے ساتھ مہیا کیں۔ زمین و آسمان کی تمام چیزوں کو انسان کی خدمت میں لگا دیا۔ زمین پر زندگی گزارنے یا تمدن کی تعمیر کرنے کے لیے جو جو چیزیں مطلوب تھیں، وہ سب وافر مقدار میں یہاں مہیا کر دیں۔ انسان ہر لمحہ ان نعمتوں کا تجربہ کرتا ہے۔ اس لیے انسان پر لازم ہے کہ وہ ہر لمحہ خدا کی نعمتوں پر شکر کرے۔ اس کا قلب خدا کی نعمتوں کے احساس سے سرشار رہے۔

شکر کی اصل حقیقت اعتراف ہے۔ جس چیز کو انسان کے سلسلہ میں اعتراف کہا جاتا

ہے اسی کا نام خدا کی نسبت سے شکر ہے۔ اعتراف کا لفظ انسان کے مقابلہ میں بولا جاتا ہے اور شکر کا لفظ خدا کے مقابلہ میں۔ شکر تمام عبادتوں کا خلاصہ ہے۔ عبادت کی تمام صورتیں دراصل شکر کے جذبہ ہی کی عملی تصویر ہیں۔ شکر سب سے زیادہ جامع اور سب سے زیادہ کامل عبادت ہے۔ شکر خدا پرستانہ زندگی کا خلاصہ ہے۔

شکر کا تعلق انسان کے پورے وجود سے ہے۔ ابتدائی طور پر آدمی اپنے دل اور اپنے دماغ میں شکر کے احساس کو تازہ کرتا ہے، پھر وہ اپنی زبان سے بار بار اس کا اظہار کرتا ہے۔ اس کے بعد جب شکر کے جذبات قوی ہو جاتے ہیں تو انسان اپنے مال اور اپنے اثاثہ کو اظہار شکر کے طور پر خدا کی راہ میں خرچ کرنے لگتا ہے۔ اسی طرح اس کا جذبۂ شکر اس کو مجبور کرتا ہے کہ وہ اپنے وقت اور اپنی طاقت کو اس خدا کی راہ میں صَرف کرے جس نے اس کو وقت اور طاقت کا یہ سرمایہ دیا ہے۔ ہمارا وجود پورا کا پورا خدا کا دیا ہوا ہے۔ ہم ایک ایسی دنیا میں جیتے ہیں جو سب کا سب خدا کا عطیہ ہے۔ اسی حقیقت کے اعتراف اور اظہار کا دوسرا نام شکر ہے۔

نعمت کا اعتراف

قرآن میں بتایا گیا ہے کہ انسان کو احسن تقویم کی صورت میں پیدا کیا گیا ہے۔ اس کے ساتھ فرمایا کہ انسان کو اسفل سافلین کی حالت میں ڈال دیا گیا ہے۔ قرآن کے الفاظ یہ ہیں: لَقَدْ خَلَقْنَا الْإِنْسَانَ فِي أَحْسَنِ تَقْوِيمٍ ثُمَّ رَدَدْنَاهُ أَسْفَلَ سَافِلِينَ (95:4-5)۔ یعنی، ہم نے انسان کو بہترین ساخت پر پیدا کیا۔ پھر اس کو سب سے ادنیٰ درجے میں ڈال دیا۔ یہ بات لفظی معنی میں نہیں ہو سکتی۔ کیوں کہ خود قرآن سے ثابت ہوتا ہے کہ موجودہ دنیا انسان کے لیے جنت سے مشابہ دنیا ہے۔ قرآن کے الفاظ یہ ہیں: كُلَّمَا رُزِقُوا مِنْهَا مِنْ ثَمَرَةٍ رِزْقًا

قَالُوا هٰذَا الَّذِي رُزِقْنَا مِنْ قَبْلُ (2:25)۔ یعنی، جب بھی ان کو ان باغوں میں سے کوئی پھل کھانے کو ملے گا تو وہ کہیں گے یہ وہی ہے جو اس سے پہلے ہم کو دیا گیا تھا۔ اور ملے گا ان کو ایک دوسرے سے ملتا جلتا۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ موجودہ دنیا کی زندگی مادی معنوں میں اسفل نہیں ہے۔ بلکہ وہ نفسیاتی معنی میں احساس محرومی کی زندگی ہے۔ ایسا اس لیے ہے کہ انسان کو اعلیٰ ذوق (high taste) کے ساتھ پیدا کیا گیا ہے۔ اس لیے ایسا ہے کہ موجودہ دنیا کی مادی نعمتیں انسان کو فل فلمنٹ (fulfillment) کے درجہ میں تسکین نہیں دیتیں۔ خواہ انسان کو دنیوی نعمتیں کتنی ہی زیادہ حاصل ہوجائیں۔ مثلاً امریکا کے بل گیٹس (Bill Gates, b. 1955) کے لیے اس کی دولت تسکین کا ذریعہ نہیں بنی۔ امریکا کے صدر ڈونالڈ ٹرمپ (Donald Trump, b. 1946) کو وائٹ ہاؤس میں پہنچ کر سکون نہیں ملا۔ چنانچہ انھوں نے اپنے پہلے دورِ صدارت (2017-2021) میں وائٹ ہاؤس کو ”کوکون“ (cocoon)، یعنی ریشم کے کیڑے کا خول، بتایا تھا۔

اس معاملہ پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ انسان سے یہ مطلوب ہے کہ وہ موجودہ دنیا کو جنت کے مشابہ دنیا کے طور پر دریافت کرے۔ اس کو چاہیے کہ وہ دنیا کی نعمتوں کو جنتِ دنیا کے طور پر دریافت کرے۔ تاکہ اس کے اندر شکر کا جذبہ پیدا ہو، اور لَئِنْ شَكَرْتُمْ لَأَزِيدَنَّكُمْ (14:7) — یعنی، اگر تم شکر کروگے تو میں تم کو زیادہ دوں گا — کے مطابق وہ جنتِ آخرت کا مستحق بنے۔

نہ ملے پر شکایت، ملے پر بے اعترافی

انسان کا سب سے بڑا جرم یہ ہے کہ وہ شیطان کا پیرو بن جائے۔ شیطان کی پیروی

کیا ہے۔ شیطان کی پیروی ہے، ظلوم و کفار بن جانا (ابراہیم، 14:34)۔ یعنی بہت زیادہ ظالم، اور بہت زیادہ ناشکرا۔ شیطان کا واقعہ یہ ہے کہ اللہ نے شیطان کو پیدا کیا، اور اس کو غیر معمولی طاقت دی۔ لیکن شیطان نے اس عطیے (gift) کا اعتراف نہیں کیا۔ لیکن جب اللہ نے انسان کو پیدا کیا، اور اس کو زمین کا خلیفہ (incharge) بنا دیا، تو شیطان غصہ ہو گیا، اور ابدی طور پر اپنے خالق کا دشمن بن گیا۔ شیطان کی یہ صفت کیا ہے — نہ ملنے پر شکایت، اور ملنے پر بے اعترافی۔

یہ عادت بلاشبہ سب سے بری عادت ہے۔ اللہ رب العالمین کا ایک تخلیقی نظام (creation plan) ہے۔ اس کے تحت اس دنیا میں انسان کو کبھی کوئی چیز ملتی ہے، اور کبھی کوئی چیز نہیں ملتی۔ اس نظام کے تحت یہ ناممکن ہے کہ انسان کو ہر چیز ملے، وہ کسی چیز سے محروم نہ رہے۔ ایسا ہونا فطرت کے قانون کے مطابق ناممکن ہے۔ انسان کو چاہیے کہ جب اس کو کوئی ملنے والی چیز ملے، تو وہ اس پر شکر ادا کرے۔ اس کے برعکس، جب اس کو کوئی نہ ملنے والی چیز نہ ملے، تو وہ اس پر صبر کرے۔ یہی ایک سچے انسان کا طریقہ ہے۔ یہی وہ انسان ہے، جو اللہ کے یہاں صابر اور شاکر قرار پائے گا، اور اس کو ابدی جنتوں میں داخلہ ملے گا۔

اس کے برعکس، جس کا حال یہ ہو کہ وہ ظَلوم اور کَفّار بن جائے۔ یعنی جو چیز اس کو نہ ملے، اس پر وہ خوب شکایتیں کرے۔ اس کے برعکس، جو چیز اس کو ملی ہوئی ہے، اس سے وہ بے خبر رہے۔ اس کی زبان سے اس کا اعتراف نہ نکلے۔ وہ منفی چیز (negative item) کو تو خوب جانے، لیکن مثبت چیز (positive item) کے بارے میں وہ ایسا بنا رہے، جیسے کہ وہ اس کو جانتا ہی نہیں۔ اس کی زبان منفی باتوں پر خوب کھلی ہوئی ہو، لیکن مثبت باتوں پر اس کی زبان ہمیشہ بند رہے۔ ایسا انسان خالق کی نظر میں شیطان کا پیرو ہے۔ آخرت میں ایسے انسان کو شیطان کے پڑوس میں جگہ ملے گی۔ اس کو جنتیوں کے پڑوس میں جگہ ملنے والی نہیں۔

منعم کا اعتراف نہیں

موجودہ زمانے کا یہ عام مزاج ہے — نعمتوں کا استعمال، لیکن مُنعم کا اعتراف نہیں۔ ویکلی اخبار تہلکہ (Tehelka) کے شمارہ 11 مارچ 2006ء میں ایک مفصل رپورٹ بمبئی کے مدرسوں کے بارے میں تھی۔ رپورٹ کے مطابق، بمبئی میں ان مدرسوں کی تعداد 80 ہے۔ دو صفحے کی اِس رپورٹ کا عنوان یہ تھا:

Please leave us to our devices, they work fine

اِس رپورٹ میں محمد علی روڈ پر واقع ایک مدرسے کی تصویر تھی۔ اِس میں تحفیظ القرآن کے ایک کلاس کا منظر دکھایا گیا تھا۔ تقریباً 25 طلبا قرآن کے نسخے لے کر اس کو حفظ کر رہے ہیں۔ درمیان میں ایک استاد مخصوص انداز سے گاؤ تکیے پر ٹیک لگائے ہوئے بیٹھے ہیں۔ منہ میں پان ہے اور سر پر اونچی ٹوپی۔ اتنے میں ان کے موبائل ٹیلی فون کی گھنٹی بجتی ہے۔ وہ اپنے ہاتھ میں موبائل لے کر نہایت اطمینان کے ساتھ بات کرنے لگتے ہیں۔ تصویر کے نیچے یہ الفاظ لکھے ہوئے تھے:

Wait and watch: a phone call interrupts classes.

موجودہ زمانے میں خدا نے انسان کو نہایت قیمتی چیزیں عطا کیں۔ مگر میرے تجربے کے مطابق، بیش تر لوگ ان کا صرف غلط استعمال کرتے ہیں۔ مثلاً جدید کمیونی کیشن خدا کی ایک عظیم نعمت ہے مگر غالباً اس نعمت کا تقریباً 95 فیصد حصہ صرف بے فائدہ یا غلط مقاصد کے لیے استعمال ہو رہا ہے۔ یہ زمانہ گویا موبائل انفجار (mobile explosion) کا زمانہ ہے۔ موبائل کا استعمال اتنا عام ہو گیا ہے کہ ہر مولوی اور غیر مولوی کے ہاتھ میں موبائل دکھائی دیتا ہے۔ موبائل بلاشبہ موجودہ زمانے کی ایک عظیم نعمت ہے۔ اِس کے بے شمار فائدے ہیں۔ مگر عجیب بات ہے کہ میں نے موبائل استعمال کرنے والوں میں سے کسی میں

اس پر حقیقی شکر کا جذبہ نہیں پایا۔ اور جہاں تک کہ اس نعمت پر شکر کا تعلق ہے وہ تو میں نے اپنے تجربے میں حقیقی طور پر کسی کے اندر پایا ہی نہیں، نہ مذہبی لوگوں میں نہ سیکولر لوگوں میں۔ اس معاملے میں دونوں کی حالت ایک ہے۔

شکر میں جینا سیکھیے

کسی انسان کو شکر کا اعلیٰ درجہ کیسے حاصل ہوتا ہے۔ مئی 2012 میں میں نے ترکی کا سفر کیا۔ وہاں مجھ کو جو پانی پینے کے لیے دیا گیا، وہ پانی اتنا زیادہ فریش (fresh) تھا، اور پینے میں اتنا زیادہ میرے اعلیٰ ذوق کے عین مطابق تھا۔ میں نے پانی کا گلاس میز پر رکھ دیا، اور سوچنے لگا کہ خالق نے یہ کیسے جانا کہ میرے بندے کو ایسا پانی چاہیے، اور اس نے فرشتوں کو حکم دیا کہ میرے بندے کی عین طلب کے مطابق، اس کو پانی فراہم کریں۔

کوئی چیز پُرلذت اِسی لیے ہے کہ ہمارے اندر لذت کا احساس موجود ہے۔ اگر لذت کا احساس نہ ہو، تو کوئی بھی چیز لذت کا ذریعہ نہیں بن سکتی۔ سائنسی ریسرچ سے معلوم ہوا ہے کہ انسان کی زبان میں تقریباً دس ہزار ذائقہ خانے (taste buds) ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ انسان کے اندر جتنے ذائقہ خانے ہیں، ان کے عین مطابق خدا نے ہمارے آس پاس کی دنیا میں فل فلمینٹ (fulfillment) کا سامان بھی مہیا کر دیا ہے۔ یہ خدا کی قدرت کا انتہائی انوکھا ظاہرہ ہے۔ کیوں کہ انسان کا معاملہ یہ ہے کہ وہ کسی ذائقے کو اس وقت جانتا ہے، جب کہ وہ خود اس کا تجربہ کرے۔ ذاتی تجربے کے بغیر کسی ذائقے کو جاننا انسان کے لیے ممکن نہیں۔

ایک سنجیدہ انسان جب دنیا میں کسی ذائقے کا تجربہ کرتا ہے تو یہ احساس اس کو شکر کے اتھاہ جذبے سے سرشار (overwhelm) کر دیتا ہے۔ وہ چاہتا ہے کہ وہ اس منعم کا اعتراف کرے، لیکن وہ محسوس کرتا ہے کہ اس کے پاس وہ الفاظ نہیں، جن کے ذریعے

وہ اس عظیم نعمت کا اعتراف کر سکے۔ یہ اس کے لیے ایک ناقابلِ تصور تجربہ ہوتا ہے۔ اسی تجربے کا نام شکر ہے۔

یہ تجربہ اتنا زیادہ اعلیٰ ہوتا ہے کہ منعم کے لیے زبان سے شکر کی ادائیگی کے ہر الفاظ اس کو کمتر لگنے لگتے ہیں۔ وہ چاہتا ہے کہ اس کی پوری شخصیت ایک زبان بن جاتی، اور وہ اپنے پورے وجود کے ساتھ اپنے رب کا شکرادا کرتا۔ اس کا پورا وجود شکر کے احساس میں ڈھل جاتا، اور وہ زبان سے شکر کے الفاظ بولنے والا نہیں، بلکہ سراپا شکر میں جینے والا انسان بن جاتا۔

ایک تجربہ

میں نے 1999ء میں مانچسٹر (انگلینڈ) کا سفر کیا۔ اس سفر میں میں نے چند دن ایک نوجوان عرب میزبان العارف احمد کے یہاں قیام کیا تھا۔ وہ وہاں رفیوجی (asylum) کی حیثیت سے ٹھہرے ہوئے تھے۔ وہاں رہتے ہوئے ایک واقعہ میرے ساتھ پیش آیا۔ یہ واقعہ یہاں نقل کیا جاتا ہے:

جمعرات کی صبح، 17 جون 1999ء کا دن تھا۔ میں مانچسٹر میں میزبان کے گھر ٹھہرا ہوا تھا۔ جب میں بالائی منزل کے ایک کمرے میں بیٹھا ہوا تھا، تو میں نے دروازے پر ایک ہلکی سی دستک سنی۔ میں نے دروازہ کھولا تو مجھے تقریباً پانچ سال کی عمر کی ایک بچی کھڑی دکھائی دی۔ یہ ہمارے میزبان العارف صاحب کی بیٹی، قانتہ تھی۔ اس نے انتہائی معصومیت سے پوچھا: ترید حاجة (آپ کو کسی چیز کی ضرورت ہے؟)۔ اگرچہ یہ ایک معمولی قسم کا سوال تھا، لیکن میں اس معصوم آواز سے اُوَروِہلم (overwhelm) ہوگیا۔ اس قدر اُوَروِہلم ہوگیا کہ جواب میں مَیں اپنی زبان سے ایک لفظ بھی نہیں کہہ سکا۔

بظاہر یہ ایک معمولی واقعہ (normal event) تھا۔ لیکن میرے ذہن میں یہ ایک عظیم واقعہ (supernatural event) میں کنورٹ ہوگیا۔ چنانچہ اس بچی کی معصوم آواز

سن کر مجھے ایسا لگا جیسے خدا نے گویا میرے پاس ایک فرشتہ بھیجا ہے، تاکہ وہ میری ضروریات کو دریافت کرے، اور اسے پورا کرے۔اسی لمحے ایک حدیث میرے ذہن میں آئی: رب العالمین روزانہ آسمانِ دنیا پر آتا ہے، اور پکارتا ہے: کیا کوئی ہے جو محتاج ہو، اور مجھ سے مانگے، تو میں اسے عطا کروں؟ (صحیح البخاری، حدیث نمبر 1145)

" کیا آپ کو کسی چیز کی ضرورت ہے؟" ایک چھوٹا سا سوال تھا جو ایک معصوم بچی نے پوچھا تھا۔لیکن میرے اندرونی وجود میں ایک بہت بڑا انقلاب برپا کرنے کے لیے یہ سوال کافی تھا۔وہ انقلاب جس کو آج کی زبان میں برین اسٹارمنگ (brainstorming) کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔

تھوڑی دیر کے لیے میں نے محسوس کیا کہ کائنات کی تمام چیزیں میرے مائنڈ کی اسکرین پر موجود ہیں۔ یہ ایک بہت بڑا روحانی تجربہ تھا، جس کا اظہار انسانی الفاظ میں نہیں کیا جاسکتا تھا۔ ابتدا میں یوں لگتا تھا، جیسے خدا ایک "ننھے فرشتے" کے ذریعہ کہہ رہا ہے: اے میرے بندے، کیا تم کو کسی چیز کی ضرورت ہے؟ پھر اس عمل میں گویا پوری کائنات بھی شامل ہوگئی۔

میرے سامنے بظاہر ایک چھوٹی سی لڑکی تھی، جو مجھ سے پوچھ رہی تھی: کیا آپ کو کسی چیز کی ضرورت ہے؟لیکن اپنے توسیعی معنی کے اعتبار سے یہ ایسا ہی تھا جیسے پوری کائنات ایک ہی سوال پوچھ رہی ہو۔ وسیع آسمان کہہ رہا ہو: کیا آپ کو کسی پناہ گاہ کی ضرورت ہے؟ میں آپ کی خدمت میں حاضر ہوں، تاکہ میں آپ کو پناہ گاہ مہیا کروں، کیونکہ خدا نے مجھے ایسا کرنے کا حکم دیا ہے۔ چمکتا ہوا سورج کہہ رہا ہو: کیا آپ کو روشنی کی ضرورت ہے؟ میں یہاں روشنی کی فراہمی کے لیے اور آپ کے اندھیرے کو دور کرنے کے لیے حاضر ہوں۔ اونچے پہاڑ اعلان کر رہے ہوں: کیا آپ انسانیت کے اعلیٰ مقام پر فائز ہونا چاہتے ہیں؟ میں یہاں آپ کی خدمت میں

حاضر ہوں، تاکہ آپ کو انسانیت کا اعلیٰ مقام حاصل کرنے میں مدد کروں۔ بہتے ہوئے دریا کی روانی یہ کہہ رہی ہو: کیا آپ کو اپنے تزکیہ کے لیے روحانی غسل کی ضرورت ہے؟ میں یہاں آپ کو روحانی غسل دینے کے لیے حاضر ہوں۔ ہوا کے جھونکے پوچھ رہے ہوں: کیا آپ خدا کے عجائبات (wonders) کو دیکھنے کے لیے کائنات کی سیر کرنا چاہتے ہیں؟ آپ کے لیے اس روحانی سفر پر جانے کے لیے میری پشت موجود ہے۔

درخت سرگوشی کر رہے ہوں: کیا آپ ہماری طرح کی نمو پذیر اور مثبت شخصیت رکھنا پسند کریں گے؟ ہم یہاں آپ کی خواہش کو حقیقت بنانے کے لیے نمونہ کی حیثیت سے موجود ہیں۔ ان کی شاخوں پر پھل اور ان کی پتیاں اعلان کر رہی ہوں: اگر آپ اپنی شخصیت کے لیے فکری اور روحانی غذا (intellectual food) کی خواہش رکھتے ہیں، تو ہم آپ کو اس کی فراہمی کے لیے حاضر ہیں۔

جب یہ سین میرے دماغ میں چل رہا تھا، تو میں نے پرندوں کے چہچہانے کو سنا، جو گویا یہ پیغام دے رہے تھے: اے خدا کے بندے! یہاں تمہارے لیے خوشخبری ہے، اگر تمہیں کوئی ضرورت ہے، تو خدا نے پوری کائنات تمھاری ضروریات کو پورا کرنے کے لیے بنایا ہے۔ خدا اتنا فیاض ہے کہ اس نے ساری کائنات کو دن رات تمھاری خدمت میں حاضر رہنے کے لیے پیدا کیا ہے۔ پوری کائنات تمھارے لیے کسٹم میڈ کائنات (custom-made universe) ہے۔ مزید یہ کہ اگر آپ خدا کا شکر ادا کرتے ہیں تو وہ آپ کو ان سب سے بھی ایک بڑا انعام عطا کرے گا، یعنی ابدی جنت، جہاں نہ کوئی خوف ہوگا، اور نہ وہ غمگین ہوں گے (الانعام، 6:48)۔

پھر میرے ذہن میں قرآن کی یہ آیت آئی: وَآتَاكُمْ مِنْ كُلِّ مَا سَأَلْتُمُوهُ (14.34)۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ انسان کو اس زمین پر مناسب طور پر زندگی گزارنے کے لیے جو بھی

ضرورت ہے، وہ براہ راست اور بالواسطہ طور پر خدا نے پہلے سے تیار کر کے رکھ دی ہے۔ مثلاً انسانی خدمت کے لیے گھوڑے اور دوسرے جانور براہِ راست عطیات ہیں، جب کہ ہوائی جہاز بالواسطہ انداز میں نیچر میں پوٹنشل (potential) طور پر رکھ دیے گئے تھے، جو دورِ جدید میں دریافت ہوئے۔ ہوا کے ذریعے آواز کا سفر براہِ راست عطیے کی ایک مثال ہے، جب کہ الیکٹرانک آلات کے ذریعے اس کی ترسیل بالواسطہ عطیہ ہے۔ اس حقیقت کو قرآن میں اس طرح بیان کیا گیا ہے: اس نے گھوڑے اور خچر اور گدھے پیدا کیے تاکہ تم ان پر سوار ہو اور زینت کے لیے بھی اور وہ ایسی چیزیں پیدا کرتا ہے جو تم نہیں جانتے (16:8)۔

اہلِ ایمان کو چاہیے کہ وہ اپنی سوچ کی اس طرح تربیت کریں کہ زندگی کا ہر تجربہ اور آس پاس کا ہر واقعہ ان کے لیے شکر کا آئٹم بن جائے۔

شکر کا ایروژن

ایک صاحب سے گفتگو کے دوران میں نے کہا کہ دین میں سب سے زیادہ اہمیت شکر کی ہے۔ ہماری زندگی میں بار بار ایسے واقعات پیش آتے ہیں جو شکر کے جذبے کو گھٹانے والے ہوتے ہیں۔ ایسے موقع پر مومن کو بہت زیادہ باشعور ہونا چاہیے۔ مومن کے لیے شکر کا ایروژن (erosion) ناقابلِ برداشت ہونا چاہیے۔

اصل یہ ہے کہ اگر کسی معاملے میں 99 فی صد شکر کی بات ہو اور صرف ایک فی صد منفی بات تو شیطان یہ کرتا ہے کہ وہ ایک فی صد منفی بات کو اتنا زیادہ بڑھاتا ہے کہ 99 فی صد مثبت بات آدمی کی نظر سے اوجھل ہو جاتی۔ وہ شکر کے سمندر میں رہتے ہوئے بھی ناشکری کے احساس میں جینے لگتا ہے۔ ایسے موقع پر آدمی کو چاہیے کہ وہ فوراً یہ کہے کہ: رَبِّ أَعُوذُ بِكَ مِنْ هَمَزَاتِ الشَّيَاطِينِ (23:97)۔ یعنی، اے اللہ! میں پناہ مانگتا ہوں شیطانوں کے وسوسوں

سے۔ اِس کے بعد ان شاء اللہ، شیطان بھاگ جائے گا۔ یہ صرف عقیدہ کی بات نہیں، بلکہ یہی میرا تجربہ ہے۔

میں نے کہا کہ ناشکری کی کوئی بات دماغ میں آئے تو آدمی کو چاہیے کہ وہ اس کو سرتاسر بے اصل سمجھے۔ کسی بھی عذر کی بنا پر وہ اس کو اپنے دماغ میں جگہ نہ دے۔ وہ اس کو بداہۃً قابلِ رد (prima facie its stands rejected) سمجھتے ہوئے فی الفور اپنے دماغ سے نکال دے۔

مثلاً 19 اکتوبر 2009 کا واقعہ ہے۔ ایک کانفرنس میں شرکت کے لیے قطر کا سفر ہوا۔ ہم لوگ تین آدمی تھے۔ کانفرنس میں لوگوں کو دینے کے لیے ہم قرآن کا انگریزی ترجمہ اور دوسرے اسلامی لٹریچر اپنے ساتھ لے گئے تھے۔ ائر پورٹ پر پہنچ کر ہمارے ساتھیوں نے اس کو چیک ان (check-in) کر دیا۔ قطر کے اِس سفر میں غیر معمولی قسم کی سہولیات کا تجربہ ہوا۔ حقیقت یہ ہے کہ قطر کے اِس چار روزہ سفر میں ہم کو غیر متوقع طور پر اتنی زیادہ سہولتیں (facilities) حاصل رہیں کہ ان کو اگر شاہانہ سفر کہا جائے تو یہ مبالغہ نہ ہوگا۔

دہلی کے اندرا گاندھی انٹرنیشنل ائر پورٹ پر ہم لوگ داخل ہوئے تو فوراً ہی ائرلائن کی ایک خاتون نے آگے بڑھ کر ہمارا استقبال کیا اور ہم کو ضروری رہنمائی دی۔ یہ منظر دیکھ کر دل سے دعاء نکلی کہ خدایا، جب میں آخرت کے گیٹ پر پہنچوں تو وہاں بھی رحمت کا ایک فرشتہ اِس عاجز انسان کے استقبال کے لیے موجود ہو۔

دہلی ائر پورٹ پر میں نے قدم قدم پر خدا کی نصرت اور رحمت کے ایسے مناظر دیکھے کہ میری آنکھوں میں آنسو بھر آئے اور میری زبان پر یہ الفاظ جاری ہو گئے — خدایا، اگر میں دنیا کی تمام زبانیں جانتا اور تمام زبانوں کی ڈکشنریوں کے تمام الفاظ مجھ کو یاد ہوتے اور میں تیری حمد اور تیرا شکر ادا کرتا تو میں اس کا حق ادا نہیں کرسکتا تھا۔ خدایا، اگر دنیا کے تمام

درخت میرے لیے قلم بنا دیے جاتے اور تمام سمندر میرے لیے سیاہی ہوتے اور میں تیرے احسانات کو لکھنے بیٹھتا تو یقیناً ایسا ہوتا کہ تمام قلم ختم ہوجاتے اور تمام سمندر خشک ہوجاتے، تب بھی تیری حمد کا بیان ختم نہ ہوتا۔

یہ الفاظ جب میری زبان پر آئے تو اُس وقت میں نے سوچا کہ قرآن (31:27) میں جو یہ بات کہی گئی ہے، بظاہر وہ خدا کی طرف سے ہے، لیکن اپنی حقیقت کے اعتبار سے وہ انسانی جذبات کا اظہار ہے۔ وہ علم الٰہی کا بیان نہیں، بلکہ وہ بندۂ مومن کا احساس ہے۔ انسان سے یہ مطلوب ہے کہ وہ کائنات میں تدبر کرکے انعامِ خداوندی کو اِس طرح دریافت کرے کہ واقعتاً اس کو یہ محسوس ہونے لگے کہ تمام درختوں کے قلم اور تمام سمندروں کی سیاہی بھی اس کے جذباتِ حمد کو بیان کرنے کے لیے ناکافی ہیں۔

دورِ شکر

نومبر 1992ء میں میرا ایک سفر ناگپور کے لیے ہوا۔ 8 نومبر کو میں نے فجر کی نماز نظام الدین کی سات سو سالہ قدیم کلاں (کالی) مسجد میں پڑھی تھی۔ پھر ظہر کی نماز میں نے دہلی ایرپورٹ پر پڑھی، اور عصر کی نماز ناگپور پہنچ کر ادا کی۔ بظاہر یہ ایک سادہ سا واقعہ ہے جو ہر روز بہت سے مسلمانوں کے ساتھ پیش آتا ہے۔ مگر جب میں نے غور کیا تو مجھے اس چھوٹے سے واقعہ میں بہت بڑا سبق چھپا ہوا نظر آیا۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ میں دہلی میں بھی اسلامی عبادت کرنے کے لیے آزاد تھا۔ اسی طرح میں راجدھانی کے ایرپورٹ پر بھی اسلامی عبادت آزادانہ طور پر کرسکتا تھا۔ اور دہلی سے گیارہ سو کیلومیٹر دور ناگپور میں بھی یہ آزادی حاصل تھی کہ میں اطمینان کے ساتھ اسلام کے بتائے ہوئے طریقہ کے مطابق اللہ کی عبادت کروں۔

پھر اس کا مقابلہ میں نے قدیم مکی دور سے کیا جب کہ اسلام کا ابتدائی زمانہ تھا۔ اس

وقت پیغمبر اسلام اور اہل اسلام کو یہ آزادی حاصل نہ تھی کہ کھلے طور پر وہ نماز ادا کرسکیں۔ حتیٰکہ نماز باجماعت ادا کرنے کے مواقع بھی اس وقت موجود نہ تھے مگر آج تمام مسلمانوں کو مکمل طور پر دینی آزادی حاصل ہے۔

یہ واقعہ میرے لیے ایک علامت بن گیا جس میں مجھے اسلام کی تاریخ آگے کی طرف سفر کرتی ہوئی نظر آنے لگی۔ مجھے دکھائی دیا کہ آج مسلمانوں کی حالت لائق شکر ہے، نہ کہ لائق شکایت۔آج ہم اسلام کے حوصلہ افزا مرحلہ میں ہیں، نہ کہ حوصلہ شکن مرحلہ میں۔

میں نے سوچا کہ جدید تہذیب نے انسانوں (بشمول مسلمان) کے لیے ہر اعتبار سے کتنی زیادہ آسانیاں پیدا کردی ہیں۔اس کے باوجود انسان خدا کا شکرادا نہیں کرتا۔موجودہ زمانہ میں جو چیز سب سے زیادہ اٹھ گئی ہے وہ شکر ہے۔سائنسی دریافت، صنعتی انفجار، اور مذہبی آزادی کے اس دور میں یہ ہونا چاہیے تھا کہ انسان ہمیشہ سے زیادہ شکر کرنے والا بن جائے،مگر برعکس طور پر ایسا ہوا کہ وہ ہمیشہ سے زیادہ ناشکری کرنے والا بن گیا۔اس معاملہ میں مسلمانوں اور غیر مسلمانوں کا کوئی فرق نہیں ہے۔

محرومی ایک نعمت

مئی 2000ء میں، میں نے بہار کا سفر کیا۔اس سفر میں مجھے بتیا (بہار) کا یتیم خانہ دیکھنے کا اتفاق ہوا۔یہ یتیم خانہ 1928ء سے قائم ہے۔حقیقت یہ ہے کہ کسی بچہ یا بچی کا یتیم ہونا کوئی برائی نہیں۔یہ ایک نعمت ہے جو فطرت کی طرف سے کسی کو دی جاتی ہے۔اگر یتیم ہونا نعمت نہ ہوتا تو اللہ تعالیٰ پیغمبر اسلام کے لیے یتیمی کا انتخاب نہ فرماتے۔یتیم ہونا کسی بچہ یا بچی کے لیے قدرت کی طرف سے ایک خوشخبری ہے۔اس بات کی خوشخبری کہ تم کو زندگی کے سفر کے لیے وہ کورس عطا کیا گیا ہے جو اس انسان کو عطا ہوا جس کے بارے میں نہ صرف مسلمان بلکہ غیر مسلم حضرات بھی اس بات کی گواہی دے رہے ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ

وسلم تاریخ بشری کے سب سے زیادہ کامیاب انسان تھے۔

یتیم بچہ یا بچی کو پیدا ہونے کے بعد دنیا میں اپنے فطری امکان کو بروئے کار لانے کے لیے اور کیا چیز ملنی چاہیے اس کا اشارہ اس قرآنی آیت میں ملتا ہے: أَلَمْ يَجِدْكَ يَتِيمًا فَآوَىٰ (93:6)۔ یعنی کیا اللہ نے تم کو یتیم نہیں پایا، پھر اس نے تم کو ٹھکانا دیا۔ اپنے آغاز حیات میں اپنی زندگی کی تعمیر کے لیے ایک ماویٰ۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہ یتیم خانہ اور اسی طرح تمام یتیم خانے اسی آیت کی عملی تفسیر ہیں۔ وہ یتیموں کو ماویٰ فراہم کرتے ہیں۔ اس طرح کے کام کو میں اپنی زبان میں منصوبۂ خداوندی سمجھتا ہوں۔

ایک صاحب نے اپنا قصہ بتاتے ہوئے کہا کہ میں بچپن میں یتیم ہو گیا تھا۔ میرے رشتہ داروں نے مجھے یتیم خانہ میں داخل کر دیا۔ میرے ساتھ دو یتیم بچے اور تھے۔ ہم تینوں نے یتیم بچوں کی حیثیت سے یتیم خانہ میں پرورش پائی۔ اس وقت بظاہر ہمارا کوئی مستقبل نہ تھا۔ مگر آج ہم تینوں اللہ کے فضل سے کامیاب زندگی گزار رہے ہیں۔ میں نے کہا کہ یہ آپ کے اسی یتیم ہونے کا نتیجہ ہے۔ یتیمی کی حالت بہترین حالت ہے۔ یتیمی آدمی کے اندر خودشناسی پیدا کرتی ہے۔ وہ آدمی کے اندر خودکفیل بننے کا جذبہ ابھارتی ہے۔ یتیم آدمی سمجھتا ہے کہ میرا کوئی سہارا نہیں، اس لیے مجھ کو خود ہی سارا عمل کرنا ہے۔ اس طرح وہ دوسروں سے زیادہ محنت کرنے لگتا ہے۔ یتیمی کے حالات آدمی کو ہیرو بنا دیتے ہیں۔

منفی تجربہ سے مثبت تجربہ

میں جس روحانی مدرسۂ فکر کو مانتا ہوں وہ روایتی روحانیت سے مختلف ہے۔ اِس دوسرے مدرسۂ فکر کے مطابق، آدمی کو چاہیے کہ وہ اپنے منفی تجربات کو کنورٹ کر کے ان کو مثبت تجربے کی شکل دے۔ وہ مادّی واقعات کو روحانی تجربے میں تبدیل کر سکے۔ وہ ایک غیر روحانی واقعے کو روحانی واقعے کی صورت دے دے۔

یہ وہی اصول ہے جس پر انسان کے باہر کی پوری مادّی دنیا قائم ہے۔ اِس اصول کو تبدیلی کا اصول (principle of conversion) کہا جاسکتا ہے۔ مثال کے طور پر پانی کیا ہے، دو گیسیں جو اپنے آپ میں پانی نہیں ہیں وہ مل کر ایک اور چیز کی شکل اختیار کرتی ہیں جس کو ہم سیّال پانی کہتے ہیں۔ درخت کیا ہے، درخت دراصل غیر نباتاتی چیزوں کے کنورژن کا نتیجہ ہے۔

اسی کی ایک مثال گائے ہے۔ گائے اپنے جسم میں دودھ نہیں داخل کرتی۔ بلکہ وہ اپنے جسم کے اندر گھاس داخل کرتی ہے۔ پھر مخصوص نظام کے تحت، یہ گھاس کنورٹ ہو کر دودھ بن جاتی ہے۔ گویا کہ گائے ایک ایسی انڈسٹری ہے جو نان مِلک کو مِلک میں تبدیل کرتی ہے۔ اسی حقیقت کو ایک اردو شاعر نے اِس طرح بیان کیا ہے:

کل جو گھاس چری تھی بَن میں ۔۔۔ دودھ بنی وہ گائے کے تھن میں

کہا جاتا ہے کہ ایک شخص ایک بزرگ سے ملا۔ وہ کسی بات پر بزرگ سے غصہ ہو گیا۔ بزرگ اُس وقت بیٹھے ہوئے تھے۔ وہ آدمی اٹھا اور اپنے پاؤں سے بزرگ کے سینے پر مار دیا۔ یہ بزرگ کے لیے ایک منفی ردِّعمل کا واقعہ تھا۔ مگر انھوں نے اِس منفی واقعے کو ایک مثبت تجربے میں تبدیل کیا اور اس آدمی سے کہا میرے آہنی سینے سے تمہارے نرم پاؤں کو چوٹ تو نہیں لگی (واضح ہو کہ یہ ایک قصہ ہے، نہ کہ ایک واقعہ)۔

حدیث میں آیا ہے کہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے کہا کہ جب کسی بندے کو کوئی تکلیف پہنچے اور وہ اس پر صبر کر لے تو خدا اس کے گوشت کو ایک اور بہتر گوشت اور اس کے خون کو ایک اور بہتر خون بنا دیتا ہے (أَبْدَلْتُهُ لَحْمًا خَيْرًا مِنْ لَحْمِهِ، وَدَمًا خَيْرًا مِنْ دَمِهِ) حلیۃ الاولیاء لابی نعیم الاصفہانی، جلد 7، صفحہ 117۔

یہ تبدیلی فزیکل معنوں میں نہیں ہوتی بلکہ وہ اسپریچول معنوں میں ہوتی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ مصیبتوں پر صبر وشکر کا رسپانس پیش کرنا آدمی کے لیے ایک روحانی تربیت بن جاتا

ہے۔ یہ اس کو منفی سوچ کے بجائے مثبت سوچ والا انسان بنا دیتا ہے۔ یہ اس کو دشمنی کرنے والے انسان کے بجائے محبت کرنے والا انسان بنا دیتا ہے۔ یہ اس کو پست سطح پر جینے والے انسان کے بجائے اونچی سطح پر جینے والا انسان بنا دیتا ہے۔ یہ اس کو دوطرفہ اخلاقیات (bilateral ethics) کے بجائے، یک طرفہ اخلاقیات (unilateral ethics) کا حامل بنا دیتا ہے۔

مالداری، غریبی

الہدیٰ انٹرنیشنل کی دعوت پر امارات کا سفر ہوا۔ یہ سفر 5 مئی 2004ء کو شروع ہوا اور 10 مئی 2004 کو ختم ہوا۔ اس سفر میں ایک صاحب سے ملاقات ہوئی۔ انہوں نے کہا کہ آپ نے ابھی دبئی کے امیر لوگوں کو دیکھا ہے۔ یہاں غریب لوگ بھی ہیں۔ ان غریب لوگوں سے آپ کی ملاقات نہ ہوسکی۔ اگر آپ ان کو دیکھتے تو آپ جانتے کہ یہاں معاشی فراوانی کے ساتھ معاشی عدم مساوات بھی موجود ہے۔

میں نے کہا کہ میں دیکھے بغیر اس حقیقت کو جانتا ہوں۔ مجھ کو معلوم ہے کہ نہ صرف دبئی بلکہ ہر ملک میں، حتیٰ کہ لندن اور نیویارک میں بھی ”غریب“ لوگ موجود ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ معاشی فرق فطرت کا ایک قانون ہے۔ وہ کسی سرمایہ دار یا کسی حکومت کا پیدا کردہ نہیں، بلکہ خود خالقِ فطرت کا پیدا کیا ہوا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ کارل مارکس اور اس کے انقلابی ساتھی ہر قسم کی اکھیڑ پچھاڑ کے باوجود دنیا میں معاشی مساوات نہ لا سکے۔

قرآن سے ثابت ہے کہ خدا نے تقسیمِ رزق میں ایک دوسرے کے درمیان فرق رکھا ہے (43:32)۔ اس فرق کی بہت سی حکمتیں ہیں۔ اسی فرق سے انسانی سماج میں مسابقت اور چیلنج کا ماحول قائم رہتا ہے۔ اسی فرق کی بنا پر یہ ممکن ہوتا ہے کہ دنیا میں حالتِ امتحان قائم رہے اور لوگوں کی جانچ ہوتی رہے۔ اسی فرق کی بنا پر لوگوں کو یہ موقع ملتا ہے کہ وہ صبر

اور شکر جیسی نیکیاں اپنے نامۂ اعمال میں درج کرواسکیں۔ اسی فرق کی بنا پر سماجی فلاح اور انسانی خدمت جیسی سرگرمیاں برابر جاری رہتی ہیں۔ اسی فرق کی بنا پر وہ تجربات پیش آتے ہیں جو لوگوں کو عمل کی زبان میں بتاتے ہیں کہ اس دنیا میں امیری اور غریبی دونوں وقتی بھی ہیں اور اسی کے ساتھ اضافی بھی۔

حقیقت یہ ہے کہ اگر دنیا میں معاشی فرق نہ رہے تو تمام سرگرمیاں ٹھپ ہوجائیں گی۔ اس کے بعد معاشی اور اقتصادی ترقی رُک جائے گی۔ روحانی اور فکری ارتقا کا عمل جاری نہ رہے گا۔ انسانی دنیا زندہ انسانوں کے بجائے مردہ مجسموں کی ایک دنیا بن کر رہ جائے گی۔ ایسی حالت میں لوگ عروج وزوال اور ترقی وتنزل کے واقعات کا مشاہدہ نہ کرسکیں گے، جب کہ اسی مشاہدہ سے انسان کو وہ عظیم چیز حاصل ہوتی ہے جس کو تاریخ کے اسباق کہا جاتا ہے۔

بے خبر انسان

نومبر 2004ء میں بمبئی (ممبئی) کے لیے میرا ایک سفر ہوا۔ اس سفر میں ایک بڑا عبرت ناک واقعہ معلوم ہوا۔ ممبئی میں نیتو مانڈ کے نامی ایک ڈاکٹر تھے۔ 2003ء میں ان کا انتقال ہوگیا۔ وہ امراضِ قلب کے بہت بڑے ماہر سمجھے جاتے تھے۔ سرجری میں اُن کو کمال حاصل تھا۔ انھوں نے بہت سے دل کے مریضوں کی کامیاب سرجری کی تھی۔ آخر میں اُن کو اپنے فن پر بہت غرور آ گیا تھا۔ یہاں تک کہ وہ خدا کے منکر بن گئے۔

ایک صاحب نے بتایا کہ ڈاکٹر صاحب نے ایک بار ایک مسلم خاتون کے دل کا آپریشن کیا۔ آپریشن سے صحتیابی کے بعد مسلم خاتون نے ڈاکٹر صاحب سے ملاقات کی، اور بات کرتے ہوئے یہ کہا کہ خدا کا شکر ہے کہ آپریشن کامیاب رہا۔ ڈاکٹر صاحب نے کہا اس میں خدا کی کیا بات ہے۔ تم پیسہ دو اور میں تم کو صحت دوں گا:

Give me money and I will give you cure.

وہ ایک آپریشن کا معاوضہ تین لاکھ روپیے لیتے تھے۔ عجیب بات یہ ہے کہ خود اُن کا انتقال دل کے دورے میں ہوا۔ وہ اپنی قیمتی کار میں سفر کر رہے تھے، ہندوجا ہاسپٹل پہنچے کہ اچانک اُن پر دل کا دورہ پڑا۔ ان کو فوراً اسپتال لے جایا گیا، اتفاق سے وہاں اُس وقت جو عملہ تھا وہ ان کو پہچانتا نہ تھا۔ چنانچہ اسپتال میں ان کے ساتھ بے توجہی کا معاملہ ہوا۔ وہ بے بسی کے ساتھ چلّاتے رہے کہ میں ڈاکٹر مانڈکے ہوں۔ مگر عدم واقفیت کی بنا پر وہاں بَروقت ان کا صحیح علاج نہ ہوسکا اور اسپتال ہی میں ان کا خاتمہ ہوگیا۔

ممبئی کے ایک دوسرے سرجن، ڈاکٹر کامران سے ملاقات ہوئی۔ انھوں نے بتایا کہ انسان کے جسم میں ایک خاص عنصر ہوتا ہے۔ یہی آپریشن کے بعد اندمال (healing) کا سارا کام کرتا ہے۔ اگر یہ عنصر نہ ہوتو تمام سَرجن بے روزگار ہوجائیں۔ ڈاکٹر مانڈکے اگر اِس پوری حقیقت پر غور کرتے تو وہ ہر سرجری کے بعد اپنے عجز کو دریافت کرتے۔ لیکن غور و فکر نہ کرنے کی وجہ سے وہ برعکس طور پر سرجری کے واقعے میں اپنی مہارت دیکھتے رہے۔ اس لیے ایسا ہوا کہ جس واقعے میں انھیں عجز کی غذا مل رہی تھی، اُس سے وہ غلط طور پر کبر کی غذا لیتے رہے اور آخر کار اسی بے خبری کے ساتھ اُن کا خاتمہ ہوگیا۔

موجودہ زمانے میں یہ مزاج بہت زیادہ عام ہو چکا ہے — نعمتوں کا استعمال، لیکن مُنعم کا اعتراف نہیں۔ ہر انسان مکمل طور پر عاجز ہے مگر وہ اپنے آپ کو قادر سمجھ لیتا ہے۔ اس کا سبب یہ ہے کہ وہ غور و فکر سے کام نہیں لیتا۔ حقیقت یہ ہے کہ اس دنیا میں ہر کام خارجی اسباب کی رعایت کے ذریعہ انجام پاتا ہے۔ آپ کی زندگی میں 99 فی صد سے زیادہ حصہ خدا کا ہے اور ایک فی صد سے بھی کم حصہ آپ کی اپنی کوشش کا۔ ایسی حالت میں انسان کے اندر اعتراف (شکر) کا جذبہ خدا کے لیے ہونا چاہیے، نہ کہ اپنی ذات کے لیے۔ مگر عجیب بات ہے کہ اِس معاملے میں تمام دنیا کے لوگ بے خبری میں مبتلا ہیں۔

غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ موجودہ زمانے میں خدا نے انسان کو نہایت قیمتی چیزیں عطا کی ہیں، جو قدیم زمانے میں بادشاہوں کو بھی حاصل نہیں تھیں۔ مگر میرے تجربے کے مطابق، بیش تر لوگ ان کا صرف غلط استعمال کرتے ہیں۔ مثلاً جدید کمیونی کیشن خدا کی ایک عظیم نعمت ہے مگر غالباً اس نعمت کا تقریباً 95 فیصد حصہ صرف بے فائدہ یا غلط مقاصد کے لیے استعمال ہو رہا ہے۔ اور جہاں تک کہ اس نعمت پر شکر کا تعلق ہے وہ تو میں نے اپنے تجربے میں حقیقی طور پر کسی کے اندر پایا ہی نہیں، نہ مذہبی لوگوں میں اور نہ سیکولر لوگوں میں۔ اس معاملے میں دونوں کی حالت ایک ہے — اپنے دین کو جانچنے کا معیار یہ ہے کہ آپ دیکھیے کہ آپ کے اندر شکر کی نفسیات ہے یا نہیں۔

بولنے کی صلاحیت

ایک تعلیم یافتہ مسلمان سے ملاقات ہوئی، وہ دعوت کے کام کو اہم کام سمجھتے تھے۔ انھوں نے کہا کہ مجھے یہ دیکھ کر بہت افسوس ہوتا ہے کہ مدارس کے علما میں دعوت کا شوق نہیں۔ وہ بس مدرسے کے کام میں لگے رہتے ہیں، اور اسی کو سب کچھ سمجھتے ہیں۔

ان کی باتیں سن کر مجھے محسوس ہوا کہ ان کے اندر بہت اچھا اسپیکنگ پاور ہے۔ میں نے ان سے کہا کہ آپ مدارس کے لوگوں کو دیکھ کر منفی احساس میں مبتلا ہو رہے ہیں، آپ ایسا کیجیے کہ مدارس کے لوگوں کو لے کر مت سوچیے، بلکہ خود اپنے آپ کو لے کر سوچیے۔ اگر آپ خود اپنے آپ کو لے کر سوچیں تو آپ دریافت کریں گے کہ آپ کو اللہ تعالی نے بہت اچھا اسپیکنگ پاور دیا ہے۔ آپ اپنی اس صلاحیت کو دعوت کے کام میں استعمال کیجیے، اور مجھے یقین ہے کہ سارے شہر میں آپ سے اچھا اسپیکر نہ ہوگا۔

آپ کے اندر بولنے کی فطری صلاحیت بہت اعلیٰ درجے میں موجود ہے۔ اب آپ

صرف اتنا کیجیے کہ دعوت کے موضوع پر اپنا مطالعہ بڑھائیے۔ آپ دعوت کے اعتبار سے اپنے آپ کو مزید تیار کیجیے، اور پھر دعوت کے میدان میں کام کرنا شروع کر دیجیے۔ میں نے کہا کہ آپ اکیلے ہی، ان شاء اللہ، دعوتی کام کے لیے کافی ہیں۔ آپ اپنے آپ کو لے کر سوچیے، آپ دوسروں کو لے کر سوچنا بند کر دیجیے، اور پھر آپ کو کسی سے شکایت نہ ہوگی۔

لوگوں میں یہ غلطی بہت عام ہے۔ لوگوں کا حال یہ ہے کہ اپنے آپ کو لے کر نہیں سوچتے، بلکہ دوسروں کو لے کر سوچتے ہیں۔ اس طرزِ فکر کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ لوگوں کے اندر منفی نفسیات پیدا ہو جاتی ہے۔ اگر وہ مثبت نفسیات میں جینے والے بن جائیں تو خدا کے وعدہ کا مستحق بن سکتے ہیں، جو قرآن میں ان الفاظ میں بیان کیا گیا ہے: لَئِنۡ شَكَرۡتُمۡ لَأَزِيدَنَّكُمۡ (14:7)۔ یعنی، اگر تم شکر کرو گے تو میں تم کو زیادہ دوں گا۔ لیکن وہ غیر ضروری طور پر اپنے آپ کو اس نعمت سے محروم کر لیتے ہیں۔ شکر میں جینے والا انسان بننے کے لیے ضروری ہے کہ آدمی مثبت سوچ میں جینے والا انسان بنے۔

شکر، نہ کہ شکایت

5 ستمبر (2003ء) کو جمعہ کا دن تھا۔ میں نے نظام الدین کی کلاں (کالی) مسجد میں نماز ادا کی۔ امام صاحب نے خطبہ سے پہلے اپنی تقریر میں بتایا کہ 1947ء میں یہ مسجد کچھ ہندوؤں کے قبضہ میں چلی گئی تھی۔ ہم نے دوبارہ قبضہ کر کے اس کو آباد کرنا چاہا تو پولیس کیس بن گیا اور عدالتی کارروائی کی نوبت آ گئی۔ عدالت کے سامنے یہ سوال تھا کہ کیا 15 اگست 1947ء سے پہلے یہ عمارت ایک مسجد تھی اور وہ مسجد کے طور پر استعمال ہوتی تھی۔ ہندو جج نے تین آدمیوں کی گواہی پر مسجد کے حق میں اپنا فیصلہ دیا۔ یہ تینوں دہلی کے تین ہندو تھے۔ ان میں سے ایک برہمن تھا، دوسرا بنیا اور تیسرا ہریجن۔

کلاں (کالی) مسجد تقریباً 800 سال پہلے تغلق دور میں بنائی گئی تھی۔ میں 1983ء سے

اس مسجد میں نماز پڑھتا رہا ہوں۔ پہلے یہ مسجد تقریباً کھنڈر کی حالت میں تھی۔ اب یہاں مسجد کی شاندار عمارت کھڑی ہوئی ہے۔ یہ ایک علامت ہے جو بتاتی ہے کہ اس ملک میں ملت مسلمہ کا مستقبل دن بدن بہتر حالت کی طرف جارہا ہے۔

اسی طرح کا واقعہ ہے۔ اپریل 1996 کو میرٹھ اور اس کے اطراف کے لیے میرا سفر ہوا۔ 12 اپریل کو جمعہ کا دن تھا۔ سردھنہ کی جامع مسجد میں میں نے اپنے مقامی ساتھیوں کے ساتھ جمعہ کی نماز پڑھی۔ کافی بڑی مسجد ہے، اندر سے باہر تک نمازیوں سے بھری ہوئی تھی۔ میں نے سوچا کہ موجودہ مسلمانوں سے جو سب سے بڑی چیز اٹھ گئی ہے وہ شکرِ خداوندی کا جذبہ ہے۔ چنانچہ ایک مسجد کے ساتھ کسی وجہ سے کوئی ناخوش گوار واقعہ پیش آجائے تو ہر زبان اور ہر قلم اس کے پرجوش تذکرہ میں مصروف ہو جاتا ہے۔ مگر اس ملک میں لاکھوں مسجدیں شاندار طور پر آباد ہیں اور اس کے تذکرہ میں کوئی رطب اللسان نہیں۔

مجھے یاد آتا ہے کہ 40 سال پہلے میں یوپی میں اپنے آبائی گاؤں، بڈھریا، ضلع اعظم گڑھ، میں رہتا تھا۔ میرے گھر کے قریب ایک مسجد تھی۔ اس میں اکثر ایسا ہوتا تھا کہ میں ہی مؤذن ہوتا تھا اور میں ہی امام اور مقتدی۔ خاص طور پر عشاء کی نماز مجھے اس طرح پڑھنا ہوتا تھا کہ میں لالٹین لے کر مسجد جاتا، جو گاؤں کے باہر کھیتوں کے کنارے واقع تھی۔ رات کے سنسان ماحول میں عشاء کی نماز پڑھنا بڑا عجیب تجربہ تھا۔ اس وقت وہاں میرے ساتھ کوئی اور نمازی نہیں ہوتا تھا۔ میں خود ہی اذان دیتا اور خود ہی تکبیر کہہ کر جماعت کے طور پر نماز ادا کرتا اور پھر لالٹین لے کر واپس اپنے گھر آجاتا۔

مگر اب 40 سال کے بعد مسجد سمیت یہ پوری جگہ نہایت بارونق ہوگئی ہے۔ اب وہاں مسجد سے متصل سڑک گزر رہی ہے۔ بجلی اور ٹیلی فون آچکا ہے۔ مسجد کے بالکل سامنے ایک معیاری اسکول قائم ہوگیا ہے۔ اب یہاں رات دن چہل پہل رہتی ہے۔

اس قسم کے واقعات ہر جگہ پیش آرہے ہیں۔ان واقعات میں نہایت امید افزا پیغام چھپا ہوا ہے۔مگر عجیب بات ہے کہ موجودہ زمانہ میں تمام مسلمان، مذہبی اور غیر مذہبی دونوں، شکایت کی بولی بولتے ہیں۔ مجھے اپنے تجربہ میں پوری مسلم دنیا میں کوئی شخص نہیں ملا جو شکایت سے خالی ہو، اور حقیقی طور پر شکر کے جذبہ سے سرشار ہو کر حمد کلچر یا مثبت سوچ میں جیتا ہو۔

فخر اور شکر

ایک تعلیم یافتہ مسلمان نے پُر اعتماد لہجے میں کہا: میں پورے فخر اور شکر کے ساتھ کہتا ہوں کہ اللہ تعالی نے مجھے فلاں دینی ماحول میں پیدا کیا، اور اس نے مجھے فلاں ادارے میں تعلیم وتربیت حاصل کرنے کا موقع عطا فرمایا، وغیرہ۔

یہ کسی ایک شخص کی بات نہیں۔ اِس قسم کی بات بہت سے لوگ اپنے اپنے انداز میں کہتے ہیں۔ یہ الفاظ بظاہر خوب صورت معلوم ہوتے ہیں، لیکن وہ انتہائی بے معنیٰ ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ فخر اور شکر دونوں دو مختلف جذبات ہیں۔ جہاں فخر ہوگا، وہاں شکر نہیں ہوگا اور جہاں شکر ہوگا، وہاں فخر نہیں ہوگا۔ جو لوگ ایسے الفاظ بولیں، ان کے اندر فخر تو ہوسکتا ہے، لیکن حقیقی شکر کا جذبہ ان کے اندر ہرگز موجود نہیں ہوسکتا۔

شکر کیا ہے۔ شکر دراصل، خداوندِ ذوالجلال کی نعمتوں کا اعتراف ہے۔ خداوندِ ذوالجلال کی نعمت کا احساس فوراً ہی آدمی کے اندر اپنی بے مائگی کا احساس پیدا کردیتا ہے اور اپنی بے مائگی کے احساس کے بعد کوئی شخص کبھی فخر کا تحمل نہیں کرسکتا۔ اِس قسم کے احساس کے بعد آدمی اپنے آپ کو "بے کچھ" کے مقام پر پاتا ہے اور خداوند ذوالجلال کو "سب کچھ" کے مقام پر۔ جو آدمی اس قسم کی نفسیات کا حامل ہو، اس کے لیے فخر ایک مضحکہ خیز لفظ بن جائے گا۔ ایسا آدمی سب کچھ بھول کر شکرِ خداوندی کے جذبے سے سرشار ہوجائے گا۔ اس کے اندر فخر جیسی چیز کے لیے کوئی جگہ نہ ہوگی۔ شکر کی توفیق ہمیشہ عجز کامل کی سطح پر ہوتی ہے

جس آدمی کے اندر عجز کامل کی اعلیٰ ربانی صفت نہ ہو، وہ شکر کا تجربہ بھی نہیں کرسکتا۔

فخر کے ساتھ شکر کا لفظ بولنا، بتاتا ہے کہ ایسا آدمی، امتحان کی اصطلاح میں، مائنس مارکنگ (minus marking) کا مستحق ہے۔ ایسا کہنے والا شخص اِس بات کا ثبوت دے رہا ہے کہ وہ فخر اور شکر دونوں کی اصل حقیقت سے بے خبر ہے۔ وہ نہ فخر کی نفسیات کو جانتا ہے اور نہ شکر کی نفسیات کو۔ اگر وہ دونوں کی حقیقت سے باخبر ہوتا تو وہ اِس طرح، فخر اور شکر کے متضاد الفاظ کو ایک ساتھ نہ بولتا۔ حقیقت یہ ہے کہ شکر ہمیشہ نفیِ فخر کی زمین پر پیدا ہوتا ہے، نہ کہ اثباتِ فخر کی زمین پر۔

ڈس ایڈوانٹج میں ایڈوانٹج

5 نومبر 2001ء کو میں بھوپال میں تھا۔ اس دوران وہاں ایک ادارہ کو دیکھنے کا اتفاق ہوا۔ اس کا نام ''شُوبھم وکلانگ سماج سیوا سمیتی'' ہے۔ یہ ادارہ معذور بچوں کے لیے قائم کیا گیا ہے۔ اس وقت یہاں مختلف مذاہب کے 75 بچے اور بچیاں موجود ہیں۔ یہاں ان کو تعلیم دلائی جاتی ہے اور انھیں مختلف قسم کے ہنر سکھائے جاتے ہیں تا کہ وہ خود کفیل ہو کر سماج میں معمول کی زندگی گزار سکیں۔ یہ ادارہ 1980 سے قائم ہے۔ وہ پہلے کرایہ کی عمارت میں تھا۔ اب وہ ایک خوبصورت ذاتی بلڈنگ میں قائم ہے۔ اب تک بہت سے بچے اور بچیاں اس ادارہ میں تعلیم وتربیت پا کر کامیابی کے ساتھ خود کفیل زندگی گذار رہے ہیں۔

بچوں اور اساتذہ کے سامنے میری ایک تقریر ہوئی۔ اس کا خلاصہ یہ تھا کہ معذور بچوں کے لیے قرآن میں 'محروم' (51:19; 70:25) کا لفظ آیا ہے۔ یہ معذور بچے اللہ کے خاص بندے ہیں۔ وہ گویا دنیا میں اللہ کے سفیر ہیں۔ وہ واقعہ کی زبان میں کہہ رہے ہیں کہ اے لوگو، میری طرح تم بھی معذور ہو سکتے ہو۔ تم کو اللہ کا شکر ادا کرنا چاہیے کہ اس نے تم کو معذور نہیں بنایا۔ اس شکر کی ایک عملی صورت یہ ہے کہ تم ان معذور بچوں کی مدد کرکے ان کی

معذوری کی تلافی کرو۔ دوسری بات میں نے یہ کہی کہ معذوری سادہ طور پر صرف محرومی نہیں بلکہ وہ ایک ایڈوانٹج ہے۔ معذوری آدمی کو یہ موقع دیتی ہے کہ وہ بے فائدہ مشغولیتوں سے بچ کر اپنے آپ کو صرف کارآمد قسم کی مشغولیت میں لگائے۔

مزید یہ کہ موجودہ زمانے میں یہ بات ریسرچ سے ثابت ہوگئی ہے کہ کوئی شخص مطلق معنوں میں قوی یا ضعیف نہیں ہوتا۔ چنانچہ پہلے معذور کے لیے ڈس ایبلڈ (disabled) کا لفظ بولا جاتا تھا۔ مگر اب یہ لفظ متروک ہوگیا ہے۔ اب ایسے افراد کو ڈفرینٹلی ایبلڈ (differently abled) کہا جاتا ہے۔ یعنی ایک اعتبار سے معذور اور دوسرے اعتبار سے طاقت ور۔ موجودہ زمانے میں اس قسم کے لوگوں کے لیے ایسے طریقے دریافت کیے گئے ہیں جن کو اختیار کرکے ناقص الاعضا شخص بھی نارمل زندگی گزار سکتا ہے۔ گویا یہ ایک بظاہر معذور انسان کو یہ موقع فراہم کرتا ہے کہ وہ اپنے اندر محرومی کی نفسیات پیدا کرنے کے بجائے شکر اور مثبت سوچ کی نفسیات پیدا کرے۔

کامیابی کا فارمولا

ایک مرتبہ کا واقعہ ہے۔ ایک ہندو جو سرکاری افسر تھے، انہوں نے کہا کہ اسلام کی کوئی ایسی تعلیم بتائیے جس میں ہمارے جیسے لوگوں کو بھی کچھ ملتا ہو۔ میں نے کہا کہ حال میں میری ملاقات ایک صاحب سے ہوئی۔ وہ ایک بڑی کمپنی میں ڈپٹی جنرل مینیجر ہیں۔

اُنھوں نے بتایا کہ حال میں ہمارے یہاں پرموشن ہوا۔ میری سطح کے تین آدمی تھے۔ میرے سوا ان دونوں کو پرموشن دے دیا گیا۔ یہ ایک کھلا ہوا تعصب تھا۔ مجھ کو بہت جھٹکا لگا۔ عجیب قسم کی مایوسی اور جھنجلاہٹ دل میں آ گئی۔

میں نے اُن سے کہا کہ میں آپ کو قرآن کی ایک آیت بتاتا ہوں، آپ اس پر عمل کریں۔ وہ آیت یہ ہے: لَئِنۡ شَكَرۡتُمۡ لَأَزِيدَنَّكُمۡ (14:7) یعنی، اگر تم شکر کروگے تو میں تم کو زیادہ

دوں گا۔ دوسرے الفاظ میں، اگر آپ شکر کی نفسیات کو باقی رکھیں تو آپ کو اور زیادہ دیا جائے گا۔ یعنی آپ ڈپٹی جنرل مینیجر ہونے پر شکر کیجیے تو آپ کو جنرل مینیجر کا عہدہ بھی مل جائے گا۔ گویا اللہ کے قانون میں نہ ملے ہوئے کو پانے کا راز یہ ہے کہ ملے ہوئے پر شکر ادا کیا جائے۔

اس تعلیم کے دو فائدے ہیں۔ ایک تو یہ کہ آپ کے دل کا بوجھ اتر جاتا ہے۔ اور دوسرے یہ کہ اس نصیحت کو ماننے کے نتیجہ میں یہ ہوتا ہے کہ فطرت کے قوانین کو بلا روک اپنا کام کرنے کا موقع مل جاتا ہے جس کا نتیجہ آخر کار آپ کے حق میں نکلتا ہے۔

واقعاتِ شکر

ستمبر 2003ء کو میرٹھ کے لیے میرا سفر ہوا۔ سفر کرتے ہوئے ہم لوگ وہاں پہنچے جس کو میرٹھ – ہاپوڑ بائی پاس کہا جاتا ہے۔ یہاں الرسالہ کے قارئین کی ایک جماعت ہمارے انتظار میں کھڑی ہوئی تھی۔ مثلاً مولانا محمد عرفان قاسمی صاحب، ساجد خاں صاحب، ڈاکٹر شہزاد علی صاحب (وفات 2009ء)، وغیرہ۔ عام طور پر سیاسی لیڈروں کا حال یہ ہے کہ جب وہ اس طرح کسی مقام پر پہنچیں اور وہاں لوگ ان کے استقبال کے لیے کھڑے ہوں تو اس منظر کو دیکھ کر وہ فخر کے جذبات سے بھر جاتے ہیں۔ مگر میرا حال برعکس، طور پر یہ ہوا کہ میری آنکھوں میں آنسو آگئے۔ یہ شکر کے آنسو تھے۔ میں نے سوچا کہ پچھلے زمانہ میں کبھی ایسا نہیں ہوسکتا تھا۔ موجودہ زمانہ میں موبائل ٹیلیفون نے اس کو ممکن بنا دیا ہے۔ موبائل ٹیلیفون اللہ تعالیٰ کی عجیب نعمت ہے۔ آپ کسی بھی مقام سے کسی بھی مقام کے لوگوں کو اپنا پیغام پہنچا سکتے ہیں، حتیٰ کہ آپ سفر میں ہوں تب بھی۔ چنانچہ سفر کے دوران موبائل ٹیلیفون کے ذریعہ ہمارا رابطہ قارئین الرسالہ کے مذکورہ افراد سے جاری رہا۔ دوران سفر اس ٹیلیفونی رابطہ کا نتیجہ تھا کہ جب ہماری گاڑی مذکورہ بائی پاس پر پہنچی تو وہاں الرسالہ کے قارئین پیشگی طور پر ہماری رہنمائی کے لیے موجود تھے۔

*****

ایک مرتبہ میرے پاس ایک مسلمان ملاقات کے لیے اپنی نئی کار پر بیٹھ کر آئے۔ ان کے ہاتھ پر ایک شاندار گھڑی بندھی ہوئی تھی اور جیب میں خوبصورت قلم لگا ہوا تھا۔ ان کے چہرے پر لگی ہوئی خوبصورت عینک دیکھی جوان کے شخصی وقار میں اضافہ کررہی تھی۔ وہ بیٹھتے ہی مسلمانوں کی زبوں حالی کی داستان سنانے لگے۔ اتنے میں ان کی جیب میں رکھے ہوئے

موبائل ٹیلی فون کی گھنٹی بجی۔ اس کو کان پر رکھ کر وہ دور کے کسی صاحب سے بات کرنے لگے۔ جب وہ بات کر چکے تو میں نے ان سے پوچھا کہ جس عثمانی دور اور مغل دور کو آپ لوگ اپنے لیے بڑی چیز سمجھتے ہیں کیا اس زمانہ میں کوئی ایک بھی مسلمان ایسا تھا جس کے پاس موبائل یا ٹیلی فون ہو یا اس کے پاس موٹر کار ہو یا اس کے پاس ایسی گھڑی ہو جو آپ اس وقت پہنے ہوئے ہیں، یا وہ آپ جیسی عینک پہن سکتا ہو جو آپ کی شخصیت کو دوبالا کر رہی ہے۔ انہوں نے کہا کہ نہیں۔ میں نے کہا کہ پھر اس کا مطلب یہ ہے کہ آج کا ایک مسلمان قدیم زمانہ کے نوابوں اور بادشاہوں سے بھی زیادہ بہتر زندگی گزار رہا ہے۔ ایسی حالت میں آپ لوگوں کو یہ کرنا چاہیے کہ پہلے سے بھی زیادہ آپ لوگ خدا کا شکر ادا کریں، نہ یہ کہ شکایت اور مایوسی کی بات کر کے اپنے سینہ کو ناشکری کا قبرستان بنا لیں۔

*****

دسمبر 1993ء کے اردو اخبار میں دہلی کے ایک مسلم لیڈر نے مسلمانوں سے یہ اپیل کی تھی کہ وہ 23 دسمبر کو بابری مسجد پر غیر قانونی قبضہ کی یادگار منائیں۔ عملاً یہ اپیل ان سنی ہو کر رہ گئی۔ تاہم میں نے سوچا کہ یہ نام نہاد مسلم لیڈر اگر ہوش مند ہوتے تو وہ مسلمانوں سے کہتے کہ اب تم یوم احتجاج منانا چھوڑ دو، اب تم یوم تشکر مناؤ۔ کیوں کہ ملک کی انتہا پسند طاقتوں نے 44 سال کے اندر اپنی تمام تخریبی طاقت استعمال کر ڈالی۔ اس کے باوجود ملت اسلامی کا قافلہ انڈیا میں اور ساری دنیا میں آگے بڑھ رہا ہے۔ اس قسم کے واقعات ہماری گاڑی کے لیے گویا راستہ کی وہ رکاوٹیں (frictions) ہیں جو گاڑی کو بحفاظت منزل تک پہنچانے میں مددگار ثابت ہوتی ہیں۔

*****

فروری 1994ء میں مراکو کے لیے میرا ایک سفر ہوا۔ مراکو کی راجدھانی رباط پہنچنے کے بعد کل شام کو میں نے اپنے دہلی کے دفتر کو ایک فیکس روانہ کیا تھا۔ آج وہاں سے اس کا

جواب آ گیا۔ اس کو دیکھ کر میری زبان سے شکر کا کلمہ نکلا۔ میں نے کہا کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو کیسے کیسے وسائل دے دیے ہیں۔ یہ سن کر ایک عرب نوجوان نے کہا کہ آپ ان چیزوں پر شکر ادا کر رہے ہیں، حالاں کہ میں نے ایک بڑے شیخ کو ان ذرائع کی مذمت کرتے ہوئے سنا۔ انھوں نے کہا کہ موجودہ زمانہ میں ان ذرائع مواصلات کے ذریعہ شیطانی باتیں ہر جگہ تیزی سے پہنچائی جا رہی ہیں۔ یہ جدید آلات سب شیطان کے کام ہیں اور ہمیں ان سے جنگ کرنا چاہیے:

"الکلمات الشیطانیة في هذه الایام ترسل عن طریق الاتصالات المدینة ر ومنها الفاکس الی کل مکان بسرعة، فهذه الاجهزة المنظورة کلها عمل شیطانی یجب علینا محاربتها"۔

میں نے کہا کہ شیخ نے بڑی عجیب بات کہی۔ یہ جدید ذرائع تو امکانات فطرت کا استعمال ہیں۔ جو چیز بری ہے وہ استعمال ہے، نہ کہ خود ذرائع۔ اور برا استعمال تو لوگ مذہب تک کا کرتے ہیں۔ اس لیے ان کے غلط استعمال کی مذمت کرنی چاہیے، نہ کہ خود ان اشیاء کی۔

اگر تاریخی تبدیلیاں مساعدت کے لیے موجود نہ ہوں تو ایسی ہر تحریک فساد اور خوں ریزی پر منتج ہوتی ہے۔ اہل اسلام کو چاہیے کہ وہ اپنے عمل کو صرف پر امن دعوتی جدو جہد تک محدود رکھیں۔ یہاں تک کہ وہ ضروری تاریخی امکانات پیدا ہو جائیں جن کو استعمال کر کے سیاسی انقلاب کے مرحلہ تک پہنچنا ممکن ہو جائے۔

*****

ستمبر 1993ء میں میں برطانیہ میں تھا۔ وہاں قیام کے زمانہ میں مجھے ایک کتاب ملی۔ اس کا نام تھا: مسلمو بورما حملات اباده۔ اس میں برما کے مسلمانوں پر مظالم کی داستان بتائی گئی تھی۔

اس رپورٹ میں بتایا گیا تھا کہ برما کی حکومت وہاں کے مسلمانوں کو فنا کرنے کی کوشش کررہی ہے، مگر یہ واقعہ کا نصف ثانی ہے۔ اصل یہ ہے کہ برما کے ایک حصہ میں مسلمانوں نے علیحدگی کی تحریک چلائی۔ اس کے نتیجے میں وہ وہاں معتوب ہو گئے۔ اس سے پہلے وہ برما میں امن کے ساتھ رہ رہے تھے۔

اس سفر میں ایک عرب نوجوان نے ایک رپورٹ پڑھنے کے لیے دی۔ اس کا عنوان تھا:

بريطانيا – مشكلات المسلمين

اس کے مطابق برطانیہ کا کیس مسلمانوں کے لیے گویا مشکلات کا کیس تھا۔ اس میں برطانی مسلمانوں کی مشکلات کے ذیل میں بغض، سیکولر تعلیمی نظام، نسل پرستی اور تشدد کو شمار کیا گیا تھا۔ اس کے بعد کہا گیا تھا کہ برطانیہ کے مسلمان اگر ان مشکلات کو حل کرلیں تو یہاں اسلام کے لیے عظیم مستقبل ہے (ان الإسلام في بريطانيا سيكون له مستقبل عظيم اذا تمكنوا من حل المشكلات السابقة، ص492)۔

اس کو پڑھنے کے بعد میں نے کہا کہ ان الفاظ میں موجودہ زمانہ کے مسلم دانشوروں کی سب سے بڑی غلطی کا راز چھپا ہوا ہے۔ وہ سمجھتے ہیں کہ مستقبل کی تعمیر کا آغاز مشکلات کو ختم کرنے سے ہوتا ہے۔ حالاں کہ مستقبل کی تعمیر کا صحیح آغاز یہ ہے کہ مشکلات کو نظرانداز کر کے مواقع کو استعمال کیا جائے (زعماء المسلمين يعتقدون أن بناء المستقبل يبدأ من حل المشاكل۔ والصحيح ان بناء المستقبل يبدأ من الاعراض عن المشاكل واستغلال الفرص)۔

*****

29 ستمبر 1993ء کو فجر کی نماز برمنگھم کی سنٹرل مسجد (مرکزی مسجد) میں پڑھی۔ اس میں بیک وقت تین ہزار آدمی نماز پڑھ سکتے ہیں۔ اب ایک اور مسجد بنائی جارہی ہے جس

میں پانچ ہزار آدمیوں کے لیے گنجائش ہوگی۔نماز کے بعد ایک مجلس میں میں نے کہا کہ فجر کی نماز کے بارے میں ایک بڑی عجیب حدیث ہے۔اس کے الفاظ یہ ہیں کہ— مَنْ صَلَّى الصُّبْحَ فَهُوَ فِي ذِمَّةِ اللّٰهِ(صحیح مسلم، حدیث نمبر657)۔یعنی، جس نے صبح کی نماز پڑھ لی وہ خدا کی ذمہ داری میں آ گیا۔گویا فجر کی نماز اللہ کی طرف سے حفاظت کی گارنٹی ہے۔

پھر میں نے کہا کہ یہ کوئی پر اسرار بات نہیں، بلکہ ایک ایسی بات ہے جو غور وفکر سے سمجھ میں آتی ہے۔اس کا مطلب یہ ہے کہ نماز آدمی کے اندر وہ صفات پیدا کرتی ہے جس کے بعد آدمی لوگوں کی دست برد سے محفوظ ہو جائے۔مثلاً نماز کی چند باتوں کو لیجیے۔آپ بستر سے اٹھ کر سب سے پہلے وضو کرتے ہیں۔وضو گویا ایک علامتی فعل کے ذریعہ اس بات کا عزم ہے کہ آپ اخلاقی اور روحانی اعتبار سے پاک رہیں گے۔پھر نماز میں بار بار اللہ اکبر کہتے ہیں۔یہ اس بات کا اظہار ہے کہ آپ اللہ کی بڑائی کے احساس میں جئیں گے اور تواضع کی روش اختیار کریں گے۔پھر آپ ہر رکعت میں الحمد للہ رب العالمین کہتے ہیں۔اس کا مطلب یہ ہے کہ آپ ہر حال میں اللہ کا شکر کریں گے۔جو بھی اللہ نے دیا ہے اس پر قانع رہیں گے۔آخر میں آپ دونوں طرف رخ کر کے کہتے ہیں کہ السلام علیکم ورحمۃ اللہ۔گویا کہ آپ اہل عالم کو بتا رہے ہیں کہ ان کے لیے آپ کے دل میں صرف رحمت اور سلامتی کا جذبہ ہوگا۔

صبح کی نماز میں جو لوگ اس قسم کے اخلاق کی تربیت پا کر نکلیں ان کا یہ اعلیٰ انسانی اخلاق خود ہی ان کی محبوبیت اور حفاظت کی ضمانت بن جائے گا۔

*****

اسپین کا سفر ہوا۔11 دسمبر کی رات کو دہلی سے روانگی ہوئی اور 19 دسمبر 2003ء کو سفر سے واپسی ہوئی۔12 دسمبر کی صبح کو میں اسپین کی راجدھانی میڈرڈ کے ائر پورٹ پر پہنچ چکا تھا۔میڈرڈ ائر پورٹ نہایت وسیع اور شاندار ہے۔یہاں مسافروں کی سہولت کے لیے ہر قسم

کا اعلیٰ انتظام تھا۔ جب میں میڈرڈ کے شاندار ائر پورٹ پر چل رہا تھا تو بے اختیار میری آنکھوں میں آنسو آگئے۔ میں نے روتے ہوئے کہا کہ موجودہ زمانہ کے مسلمانوں میں سب سے زیادہ جو چیز کھوئی گئی وہ اعتراف اور انسانیت کی خیر خواہی ہے۔ اگر ان کے اندر یہ صفت موجود ہوتی تو وہ اس واقعہ پر تڑپ اٹھتے۔ وہ یہاں آکر ان لوگوں سے کہتے کہ ہم آپ کے کارناموں کا اعتراف کرتے ہیں۔ ہم نے انسانی قافلہ کو روایتی ترقی کے دور تک پہنچایا تھا، آپ نے اپنی محنت سے انسانیت کو سائنسی ترقی کے دور تک پہنچا دیا اور تاریخ میں پہلی بار ایک خوبصورت دنیا تعمیر کرنے میں کامیابی حاصل کی۔ آئیے ہم دونوں مل کر خالق کا شکریہ ادا کریں۔ تاکہ ہم دونوں خدا کی زیادہ بہتر دنیا میں داخلہ کے مستحق قرار پائیں۔ وہ معیاری دنیا جس کی صرف ایک جھلک خدا نے آج کی دنیا میں رکھی ہے تاکہ ہم بعد کی زیادہ بہتر دنیا کا پیشگی تعارف حاصل کرسکیں، یعنی وہ دنیا جس کا نام جنت ہے۔

*****

12 دسمبر 2003ء کو نئی دہلی سے اسپین کے لیے سفر ہوا۔ اسپین پہنچنے کے بعد اشبیلیہ ائرپورٹ سے شہر کی طرف روانگی ہوئی۔ سڑک کافی چوڑی اور ہموار تھی۔ سڑک کے دونوں طرف جدید طرز کے کھلے ہوئے مکان اور دکانیں نظر آئیں۔ پورا راستہ شاداب اور پر رونق تھا۔ یہ وہی شہر ہے جو مسلم دور میں اشبیلیہ کے نام سے مشہور تھا۔

میں نے سوچا کہ اگر قدیم اشبیلیہ اور جدید اشبیلیہ کو سامنے رکھ کر تقابل کیا جائے تو ایسا معلوم ہوگا کہ پہلے یہ ایک ٹاؤن تھا اور اب وہ ایک ماڈرن شہر ہے۔ مسلمانوں کے لکھنے اور بولنے والے لوگوں کا حال یہ ہے کہ جب اسپین کا حوالہ آتا ہے تو وہ صرف ”آسماں نے دولت غرناطہ جب برباد کی“ جیسی زبان بولنا جانتے ہیں۔

میں نے سوچا کہ ایسا کیوں ہے۔ جب کہ اسپین مسلم عہد کے مقابلہ میں آج زیادہ ترقی

یافتہ ملک بن چکا ہے تو اس قسم کی منفی باتیں کیوں۔ میری سمجھ میں آیا کہ موجودہ مسلمان اپنے مزاجی بگاڑ کی بنا پر خود اپنی عظمت پر فخر کرنا تو جانتے ہیں مگر وسیع تر معنیٰ میں انسانی ترقی سے وہ اپنے آپ کو وابستہ نہ کر سکے۔

یہ ایک حقیقت ہے کہ آج کا ایک مسلمان مغل دور اور عثمانی دور اور اندلسی دور سے سو گنا زیادہ بہتر حالت میں رہتا ہے۔ مگر اپنے اس بگڑے ہوئے مزاج کی بنا پر وہ شکایت اور مایوسی کے سوا کوئی اور زبان بولنا نہیں جانتا۔ ورنہ اس کی زبان مثبت باتوں سے سرشار رہتی۔ وہ سمجھتا کہ اب وقت آگیا ہے کہ ہم پہلے سے بھی زیادہ خدا کے شکر میں جینے والے بن جائیں۔

*****

بمبئی کے سفر (نومبر 2004ء) میں ایک صاحب سے ملاقات ہوئی۔ انھوں نے کہا کہ پہلے زمانہ میں آدمی ناہموار راستوں پر اونٹ اور خچر سے سفر کرتا تھا۔ اس لیے پہلے زمانہ میں شکر کی کیفیت پیدا ہوتی تھی۔ اب لوگ موٹر کار اور ہوائی جہاز کے ذریعہ سفر کرتے ہیں اس لیے اب شکر کی کیفیت پیدا نہیں ہوتی۔ میں نے کہا کہ یہ ناواقفیت کی بات ہے۔ شکر بالفاظِ دیگر ربانی کیفیت کا نام ہے۔ یہ خداوندِ برتر کے مقابلہ میں اپنی عاجزانہ عبدیت کو دریافت کرنا ہے۔ جو لوگ اس احساسِ عبدیت سے خالی ہوں اُن کو نہ پچھلے زمانہ میں ربّانی کیفیت کا تجربہ ہوسکتا تھا اور نہ وہ موجودہ زمانہ میں اس اعلیٰ کیفیت کا تجربہ کر سکتے تھے، جس کو شکر کہا جاتا ہے۔

ایک اور صاحب نے کہا کہ دنیا کی نعمتوں کو کیوں نہ استعمال کیا جائے۔ اس سے تو خدا کے مُنعم ہونے کا تصوّر پیدا ہوتا ہے اور آدمی خدا کا شاکر بن جاتا ہے۔ میں نے کہا کہ نعمتوں پر شکر کا یہ بہت ناقص تصور ہے۔ شکر کا اعلیٰ تصور یہ ہے کہ آپ سورج اور چاند کو دیکھ کر شکر گزار بندے بنیں۔ دریا کی روانی اور ہوا کے جھونکوں میں آپ کو شکرِ خداوندی کا پیغام پہنچ رہا ہو۔ درخت کی ہریالی اور زمین کی گردش آپ کے اندر شکر کا طوفان برپا کردے۔ حقیقی شکر کا ماخذ ذاتی آرام نہیں، بلکہ قدرت خداوندی کی پھیلی ہوئی نشانیاں ہیں۔ یہ بات قرآن کے ہر صفحے پر موجود ہے۔

*****

ایک اسلامی کانفرنس میں شرکت کرنے کے لیے نومبر 1988ء میں میرا صنعاء (یمن) کا سفر ہوا۔ اس درمیان مہمانوں کو سد مارب (Marib dam) لے جایا گیا۔ یہ ایک تاریخی بند ہے جسے سد العرم بھی کہا جاتا ہے۔ اس کا ذکر قرآن کی سورہ سبا آیت 16-15 میں آیا ہے۔ اس ڈیم کو دوبارہ تعمیر کیا گیا ہے تاکہ اس ڈیم کی وجہ سے یہ تاریخی علاقہ یاد رکھا جائے (يحيي ذكرى هذه المنطقة)۔ یہ ڈیم گویا انسان کے لیے اس بات کا نشان ہے کہ خدا کے شکر گزار بنو تو تمہارے لیے سب کچھ ہے اور ناشکری کرو گے تو اس کا نتیجہ دوبارہ وہی ہوگا جو قوم سبا کے ساتھ پیش آیا۔

*****

اکتوبر 1988ء کو کابل میں ایک کانفرنس ہوئی۔ اس میں میری ملاقات ڈاکٹر میاں محمد سعید (حال مقیم واشنگٹن) ہوئی۔ انھوں نے 1962ء کا ایک واقعہ بتایا۔ اس وقت وہ لندن میں تھے۔ لندن یونیورسٹی میں ان کی ملاقات ڈاکٹر پدما مسرا سے ہوئی۔ وہ ایک ہندستانی خاتون تھیں، جو اس لندن یونیورسٹی میں تھیں۔ گفتگو کے دوران ڈاکٹر پدما مسرا نے ایک واقعہ بتایا۔

انھوں نے کہا کہ وہ بنارس اور لکھنؤ کے درمیان سفر کر رہی تھیں۔ ان کے ڈبہ میں لکھنؤ کی ایک مسلمان عورت بھی تھی جو ایک سیٹ پر اپنی گٹھری رکھے ہوئے بیٹھی تھی۔ اس کے میلے کپڑے بتا رہے تھے کہ وہ کسی معمولی گھر کی ہے۔ غالباً وہ سبزی فروش گھرانے سے تعلق رکھتی تھی۔ اس دوران میں وہ ایک بار باتھ روم گئی۔

اس کی غیر موجودگی میں ایک کھڑے ہوئے مسافر نے اس کی گٹھری ہٹادی اور جگہ بنا کر وہاں بیٹھ گیا۔ مذکورہ عورت جب باہر واپس آئی تو اس نے دیکھا کہ اس کی گٹھری ہٹی ہوئی ہے اور وہاں ایک آدمی بیٹھا ہوا ہے۔ یہ دیکھ کر وہ سخت برہم ہوگئی۔ اس نے غصہ میں کہا:

نہ رہی نوابی، ورنہ تم کو زندہ دیوار میں چنوا دیتی

یہ واقعہ بتاتے ہوئے ڈاکٹر سعید صاحب نے کہا کہ مسلمانوں سے حکومت چلی گئی، مگر ان کا حاکمانہ مزاج اب تک ان سے نہیں گیا۔ میں نے ان سے کہا کہ یہی موجودہ زمانہ کے مسلمانواں کا اصل مسئلہ ہے۔آج جو کچھ مسلمانوں کے ساتھ پیش آرہا ہے، وہ سب ان کے اسی مزاج کی قیمت ہے۔ کوئی نعمت آدمی کو ملے تو آدمی کو اس پر شکر کرنا چاہیے، اور جب وہ چھن جائے تو صبر۔ مگر مسلمانوں نے نہ پہلے شکر کیا اور نہ اب وہ صبر کرنے پر راضی ہیں۔

*****

دسمبر 1988ء میں امریکا میں منعقد ہونے والی ایک انٹرنیشنل سیرت کانفرنس میں شرکت کرنے کے لیے میرا ایک سفر ہوا۔ یہ کانفرنس اسلامک سوسائٹی کیلی فورنیا نے منعقد کیا تھا۔ سفر کی تیاری کے آخری دنوں میں ایک مسئلہ پیش آیا۔ میرے رفیقِ سفر کو نئی دہلی کے امریکی سفارت خانہ سے ویزا حاصل کرنے کے لیے ایک تحریر درکار تھی جس میں بتایا گیا ہو کہ امریکہ کے متعلقہ اسلامی ادارہ نے ان کو بھی میرے ساتھ کانفرنس میں شرکت کے لیے مدعو کیا ہے، مگر وقت اتنا کم تھا کہ ڈاک کے ذریعہ سے امریکہ کا خط ہندستان نہیں پہنچ سکتا تھا۔ تاہم اللہ تعالیٰ کے پیدا کیے ہوئے امکانات کو استعمال کر کے جدید انسان نے اس مسئلہ کو حل کر لیا ہے۔ چنانچہ امریکہ کے دفتر کو بذریعہ ٹیلی فون ضرورت بتائی گئی اور ایک گھنٹہ کے اندر ان کا دستخط شدہ خط دہلی میں موجود تھا۔

یہ تیز رفتار ترسیل اس آلہ کے ذریعہ ممکن ہوئی ہے جس کو موجودہ زمانہ میں تصویری مشین (Facsimile machine) کہا جاتا ہے اور جس کا مختصر نام فیکس (Fax) ہے۔ آپ ایک تحریر یا ایک خط تیار کر کے مشین میں ڈالیں، اور ایک سکنڈ کے اندر وہ مطلوبہ مقام پر پہنچ کر و یسا ہی چھپا ہوا نکل آئے گا۔

ابتدائی انسانی دور میں صرف پیدل پیغام رسانی کا طریقہ رائج تھا۔ پھر گھوڑوں کا استعمال ہونے لگا۔ اس کے بعد ٹیلی گرام، ٹیلی فون اور ٹیلکس (Telex) کے طریقے دریافت

ہوئے۔ اب فیکس کے طریقہ نے سب پر برتری حاصل کرلی ہے (موجودہ دور میں موبائل اور کمپیوٹر اور انٹرنیٹ نے اس معاملے کو اور بھی آسان کردیا ہے)۔ اللہ تعالیٰ نے کتنی زیادہ نعمتیں انسان کو دے رکھی ہیں، مگر کتنے کم لوگ ہیں جو اس کا واقعی شکر ادا کرتے ہوں۔

*****

مارچ 1990ء میں ایک بین اقوامی کانفرنس میں شرکت کے لیے طرابلس کا میرا ایک سفر ہوا۔ جہاز کا بیشتر سفر خشکی کے اوپر ہوا۔ بالائی فضا میں پرواز کرتا ہوا ہمارا جہاز ہندستانی وقت کے لحاظ سے پانچ بجے بحر روم کے اوپر پہنچ گیا۔ اس جہاز کو نہ خشکی کی پستی یا بلندی نے روکا، اور نہ سمندر اس کی راہ میں حائل ہوا۔ وہ شہری آبادیوں کے اوپر سے بھی اسی طرح تیزی سے گزر گیا جس طرح کھلے میدانوں کے اوپر سے۔

بے شمار لوگ روزانہ ہوائی جہاز سے سفر کرتے ہیں، اگر مسافروں کے چہرے اور ان کی گفتگوئیں بتاتی ہیں کہ اس قدرتی معجزہ کو سوچ کر کسی کے اندر تموج کی کیفیت پیدا نہیں ہوتی۔ مذہبی انسان ہو یا سیکولر انسان، دونوں قسم کے لوگ ہوائی جہاز کا سفر تو کر رہے ہیں، مگر ہوائی جہاز کے سفر کے دوران ان کا شعور ربانی مسافت طے نہیں کرتا۔ ان کا حال تقریباً اس چوپایہ کا سا ہے جس کو ایک مقام پر جہاز میں بیٹھا یا جائے اور لے جا کر اس کو دوسرے مقام پر اتار دیا جائے۔

لارڈ کرزن ایک بے حد مالدار خاندان سے تعلق رکھتا تھا۔ وہ انیسویں صدی کے آخر میں ہندستان کا بڑے جاہ وجلال کا وائسرائے بنا۔ مگر 1898ء میں جب وہ ہندستان کا وائسرائے ہو کر روانہ ہوا تو لندن سے کلکتہ تک کا سفر طے کرنے میں اس کو سترہ دن لگ گئے۔ اس وقت ملک میں ہوائی جہاز کا سفر رائج نہیں ہوا تھا۔ آج ایک عام آدمی ہوائی جہاز میں بیٹھ کر چند گھنٹوں میں ایک ملک سے دوسرے ملک اور ایک براعظم سے دوسرے براعظم میں پہنچ جاتا ہے۔

*****

17 مارچ کو میں نے فجر کی نماز دہلی کے ہوائی اڈہ پر پڑھی تھی، اس دن میں عصر کی نماز کے وقت طرابلس کے ہوائی اڈہ پر اتر گیا۔ موجودہ زمانہ میں تیز رفتار سواریوں نے سفر کے معاملہ کو کتنا زیادہ آسان بنا دیا ہے۔ ہوائی جہاز اپنے اندر سیکڑوں مسافروں کو بیٹھا کر ہوا میں اڑتا ہے اور خشکی اور پہاڑ اور سمندر کی ہر رکاوٹ کو عبور کرتے ہوئے نہایت تیز رفتاری کے ساتھ لوگوں کو ان کی منزل پر پہنچا دیتا ہے۔ یہ کتنا حیرت ناک واقعہ ہے۔ آج بے شمار لوگ اس سفری سہولت سے فائدہ اٹھا رہے ہیں مگر ان میں شاید ہی کوئی ہو جس کا حال یہ ہو کہ خدا کی اس عظیم نعمت کو سوچ کر اس کے جسم کے رونگٹے کھڑے ہو جائیں اور وہ استعجاب (awe) کے سمندر میں غرق ہو کر کہہ اٹھے: فَبِأَيِّ ءَالَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبَانِ (55:13)۔ یعنی، پھر تم اپنے رب کی کن کن نعمتوں کو جھٹلاؤ گے۔

اسی سفر کا واقعہ ہے۔ ایک دن ہوٹل کے طعام گاہ میں ایک میز پر ہم تین آدمی دن کا کھانا کھا رہے تھے۔ میرے سوا ایک شارجہ کے تھے اور دوسرے مصر کے۔ کچھ دیر بعد ایک اور مصری دکتور آئے۔ وہ ہماری قریب والی کرسی پر بیٹھ گئے۔ انھوں نے ایک منٹ انتظار کے بعد ہوٹل کے آدمی کو مخاطب کرتے ہوئے مزاحیہ انداز میں کہا: هل المتأخرون يأكلون ام لا يأكلون (بعد کو آنے والے کھائیں گے یا نہیں)۔ تھوڑی ہی دیر میں آدمی نے کھانے کی پلیٹ لا کر ان کے سامنے رکھ دی۔ حالانکہ عام حالت میں انھیں دیر میں کھانا پہنچنا چاہیے تھا۔ انھوں نے کہا کہ مزاح اکثر حالات میں بہت مفید ثابت ہوتا ہے۔ وہ کھانے کے پورے وقت میں مزاحیہ انداز میں باتیں کرتے رہے۔

اکثر لوگوں کا انداز یہی ہوتا ہے۔ مگر مجھے ذاتی طور پر یہ انداز بالکل پسند نہیں۔ جس وقت کھانا سامنے رکھا ہوا ہو، وہ انتہائی سنجیدگی کا وقت ہوتا ہے۔ کھانا اللہ تعالیٰ کی عظیم الشان نعمت ہے۔ یہ وقت وہ ہوتا ہے جب کہ آدمی پر سب سے زیادہ شکر کا جذبہ طاری ہونا

چاہیے۔ ایسے موقع پر مزاحیہ کلام شکر کے احساسات کا قاتل ہے۔ دستر خوان کے اوپر سب سے بڑا کلام یہ ہے کہ آدمی خاموش رہے اور اللہ کو یاد کرتے ہوئے کھانا کھائے۔

*****

ایک سفر کے دوران 4 مئی 1990ء کو میں جرمنی کے فرینکفرٹ ایر پورٹ پر ٹرانزٹ پیسنجر کی حیثیت سے اگلی فلائٹ کا انتظار کر رہا تھا۔ اس درمیان فجر کی نماز کا وقت ہو گیا۔ تو میں نے ایر پورٹ پر ہی فجر کی نماز پڑھی۔ ایک جرمن خاتون میری نماز کو غور سے دیکھتی رہی۔ جب میں فارغ ہو کر اٹھا تو اس نے معذرت کے ساتھ پوچھا " کیا آپ یوگا کا عمل کر رہے تھے "۔ میں نے کہا: نہیں، میں صلاۃ کا عمل کر رہا تھا۔ وہ یوگا کو جانتی تھی، مگر وہ صلاۃ کو نہیں جانتی تھی۔ اس نے پوچھا کہ صلاۃ کیا چیز ہے۔ میں نے کہا: کیا آپ خدا کو مانتی ہیں۔ اس نے کہا: ہاں۔ میں نے کہا: کیا آپ مانتی ہیں کہ خدا ہمارا خالق اور رب ہے۔ اس نے کہا: ہاں۔ میں نے کہا: پھر نماز اسی خالق اور مالک کی عظمت اور اس کے احسان کا اعتراف ہے۔

خدا صبح لاتا ہے تو ہم جھک کر کہتے ہیں کہ خدایا تیرا شکر ہے کہ تو نے میرے لیے دن کو روشن کیا تا کہ میں کام کروں۔ خدا شام لاتا ہے تو ہم جھک کر کہتے ہیں کہ خدایا تیرا شکر ہے کہ تو میرے لیے رات لایا تا کہ میں آرام کروں۔ اس طرح ہم رات اور دن میں پانچ بار خدا کی عظمت اور اس کے انعامات کا اعتراف کرتے ہیں۔ جرمن لیڈی بہت غور سے میری بات کو سنتی رہی۔ اس کے بعد تھینک یو، تھینک یو کہتی ہوئی چلی گئی۔

اسی ایر پورٹ پر ایک جرمن پروفیسر سے ملاقات ہوئی۔ وہ پروفیسر کارل ٹرال (Carl Troll) کے شاگرد تھے۔ انھوں نے بتایا کہ کارل ٹرال یونیورسٹی آف بون میں جغرافیہ کے پروفیسر تھے۔ وہ 1899 میں پیدا ہوئے اور 1975 میں وفات پائی۔ وہ اپنے فن میں ممتاز

درجہ رکھتے تھے۔ چنانچہ ان کو جغرافیہ دانوں کی عالمی یونین کا پریسیڈنٹ بنایا گیا:

International Union of Geographers

انھوں نے بتایا کہ 1964 میں وکٹوریہ البرٹ ہال (لندن) میں پروفیسر کارل ٹرال کی تقریر تھی۔ اس میں مختلف ملکوں کے ممتاز سائنس داں جمع تھے۔ اس موقع پر تقریر کرتے ہوئے پروفیسر ٹرال نے کہا کہ سائنس داں کی حیثیت سے ان کی زندگی کا بنیادی تجربہ یہ ہے کہ وہ خالق کے زیادہ سے زیادہ احسان مند ہوتے چلے گئے اور تخلیقی عمل میں خدا کی عظمت کو دیکھ کر وہ حیران کن احساس سے بھر گئے:

"The basic experience of his life as a scientist has been that he became more and more grateful to the Creator and full of wonders at God's greatness in His works of creation".

انھوں نے بتایا کہ پروفیسر کارل ٹرال کے الفاظ پر حاضرین میں سے کسی نے اعتراض نہیں کیا۔ بلکہ اکثر سائنس داں اٹھ کر ان کے پاس آئے اور اظہار مسرت میں ان سے ہاتھ ملایا۔

یہ احساس ان تمام اہل علم کا ہے کہ جو نیچر کا مطالعہ کرتے ہیں۔ کوئی جرأت منداس کا اعلان کر دیتا ہے۔ اور کچھ لوگ اس کو اپنے دل میں لیے ہوئے اس دنیا سے چلے جاتے ہیں۔

*****

مئی 1990ء میں لفتھانزا کی فلائٹ کے ذریعہ میرا ایک سفر ہوا۔ دورانِ سفر لفتھانزا کی فلائٹ میگزین کے شمارہ مئی 1990 کو میں نے مطالعہ کے لیے کھولا۔ میگزین میں ”اکسپرس کارڈ“ کا اشتہار ان لفظوں میں ایک پورے صفحہ پر چھپا ہوا تھا:

"Whatever your destination, all you need to get into 880 of Europe's best hotels is the American Express Card".

یعنی آپ کی جو بھی منزل ہو، یورپ کے 880 بہترین ہوٹلوں میں سے کسی ہوٹل میں جگہ حاصل کرنے کے لیے آپ کو صرف ایک چیز کی ضرورت ہے اور وہ امریکی بینک کا امریکن اکسپرس کارڈ ہے۔

موجودہ زمانہ میں ہوٹلوں اور بینکوں کی عالمی تنظیم نے اس کو ممکن بنا دیا ہے کہ آدمی دنیا کے کسی بھی حصہ میں اپنے لیے ہر قسم کی آسودگی اور مواقع اطمینان بخش طور پر پا سکے۔

اشتہار کو میں نے پڑھا تو قرآن کی وہ آیت یاد آ گئی جس میں اہل جنت کی زبان سے جنت کے بارے میں کہلایا گیا ہے کہ — شکر ہے اس اللہ کا جس نے ہمارے ساتھ اپنا وعدہ پورا کیا اور ہم کو اس زمین کا وارث بنا دیا۔ ہم جنت میں جہاں چاہیں مقام کریں (39:74)۔

*****

11 مئی 1990ء کو ایک کانفرنس میں شرکت کرنے کے لیے میں سینیگال میں تھا۔ اس دوران وہاں کے ایک جزیرہ گوری (Goree) جانے کا اتفاق ہوا۔ یہ چھوٹا سا جزیرہ دکار سے پانچ کیلومیٹر کے فاصلہ پر واقع ہے۔ جدید طرز کی مشینی کشتی جب ہم لوگوں کو لے کر سمندر کی موجوں کے اوپر تیزی سے چلنے لگی تو بے اختیار میری زبان پر یہ آیت آ گئی: وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِي آدَمَ وَحَمَلْنَاهُمْ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ وَرَزَقْنَاهُمْ مِنَ الطَّيِّبَاتِ وَفَضَّلْنَاهُمْ عَلَى كَثِيرٍ مِمَّنْ خَلَقْنَا تَفْضِيلًا (17:70)۔ یعنی، اور ہم نے آدم کی اولاد کو عزت دی اور ہم نے ان کو خشکی اور تری میں سوار کیا اور ان کو پاکیزہ چیزوں کا رزق دیا اور ہم نے ان کو اپنی بہت سی مخلوقات پر فوقیت دی۔

جانور اپنے پیروں کے ذریعہ زمین پر چلتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے انسان کو گھوڑے کی پیٹھ پر سوار کر کے خشکی کا سفر کرایا۔ مچھلیاں اپنی جسمانی محنت سے سمندر میں تیرتی ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے انسان کو کشتیوں پر بٹھا کر سمندر کی سطح پر رواں دواں کیا۔ چڑیاں اپنے بازوؤں کے ذریعہ فضا میں اڑتی ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے انسان کے لیے ہوائی جہاز پر بیٹھ کر فضا میں اڑنے کا انتظام کیا۔ یہ کیسا عجیب "كَرَّمْنَا" کا معاملہ ہے جو انسان کے ساتھ کیا گیا ہے۔ مگر انسانوں میں سب سے کم وہ لوگ ہیں جو ان چیزوں کے لیے حقیقی طور پر اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرتے ہوں۔

محض "ش ک ر" کو دہرانے کا نام شکر نہیں۔ شکر یہ ہے کہ آلاء اللہ (اللہ کی کائناتی نشانیوں) کو سوچ کر آدمی کے جسم کے رونگٹے کھڑے ہو جائیں اور آنکھوں سے آنسو جاری ہو جائیں اور پھر زبان سے نکلے کہ خدایا تیرا شکر ہے۔

*****

24-28 ستمبر 1990ء میں ایک انٹرنیشنل کانفرنس طرابلس (لیبیا) میں منعقد ہوئی۔ اس کانفرنس کی دعوت کے مطابق میں طرابلس میں تھا۔ 25 ستمبر کی شام کا وقت تھا۔ میں اپنے کمرہ کی بالکنی پر کھڑا ہوا سامنے حد نظر تک پھیلے ہوئے بحیرۂ روم (Mediterranean Sea) کو دیکھ رہا تھا۔ اس وقت سمندر میں کچھ تفریحی کشتیاں نظر آئیں، جو اپنے مسافروں کے ساتھ سمندر میں تیز رفتاری کے ساتھ دوڑ رہی تھیں۔ فضا میں کچھ سمندری چڑیاں منڈلا رہی تھیں جو بار بار مچھلی پکڑنے کے لیے پانی میں گرتی تھیں۔ ساحل سے ملی ہوئی سڑک پر دوڑتی ہوئی کاروں کا منظر تھا جو اپنے مسافروں کو لیے ہوئے مسلسل چلی جا رہی تھیں۔

ان چیزوں کو دیکھ کر میری سمجھ میں آیا کہ قرآن کی اِس آیت کا مطلب کیا ہے: (ترجمہ) "ہم نے آدم کی اولاد کی تکریم کی اور ہم نے ان کو سوار کیا (حَمَلۡنَا) خشکی اور تری میں" (17:70)۔ اور اس آیت میں انسان کے لیے جس "تکریم" کا ذکر ہے، اس سے کیا مراد ہے۔ وہ یہ کہ انسان کے ساتھ "حَمَلۡنَا" کا معاملہ کیا گیا ہے، جب کہ حیوانات کے ساتھ "حَمَلۡنَا" کا معاملہ نہیں کیا گیا۔ پاؤں والے جانور اپنے پیروں پر چلتے ہیں۔ مچھلیاں اپنی طاقت سے تیرتی ہیں۔ چڑیاں اپنے بازوؤں کے ذریعہ اڑتی ہیں، مگر انسان سواری پر بیٹھ کر اپنا راستہ طے کرتا ہے۔ خشکی میں اس کے لیے گاڑی ہے۔ سمندروں میں اس کے لیے کشتی ہے اور فضاؤں میں اس کے لیے ہوائی جہاز ہے۔ گویا انسان کے لیے اللہ تعالیٰ نے شاہانہ معاملہ فرمایا ہے۔ جو لوگ اس عطیہ الٰہی کا حقیقی احساس کر کے اس چیز کا ثبوت دے سکیں جس

کوحمد اور شکر کہا گیا ہے، ایسے لوگوں کے ساتھ آخرت میں بھی شاہانہ معاملہ کیا جائے گا۔ جیسا کہ قرآن میں ارشاد ہوا ہے: وَإِذَا رَأَيْتَ ثَمَّ رَأَيْتَ نَعِيمًا وَمُلْكًا كَبِيرًا (76:20)۔ یعنی، اور تم جہاں دیکھو گے، وہیں عظیم نعمت اور عظیم بادشاہی دیکھو گے۔

*****

مئی 1990ء میں سینیگال سے نئی دہلی کے لیے بذریعہ جنیوا میری واپسی ہوئی۔ جنیوا سے فرینکفرٹ کے لیے میں نے سوئس ایر 544 سے اپنا سفر طے کیا۔ راستہ میں سوئس ایر کا میگزین (Swissair Gazette) مئی 1990ء کا شمارہ دیکھا۔ اس شمارہ میں مصر اور دریائے نیل کے بارے میں ایک مفصل مضمون شامل تھا۔ قدیم مصر میں بتوں کی پرستش ہوتی تھی، ان میں سے کچھ بتوں کی تصویریں اس میں دی گئی تھیں۔ ان تصویروں سے اندازہ ہورہا تھا کہ قدیم مصر کے لوگوں نے بت تراشی میں غیر معمولی کمال حاصل کیا تھا۔

ایک بت کی تصویر کے نیچے بامعنی طور پر یہ الفاظ لکھے ہوئے تھے — فرعون کے زمانہ میں وہ پوجے جاتے تھے۔ آج وہ ثقافتی ورثہ کا ایک حصہ ہیں:

"In pharaonic times they were worshipped, today they are part of a cultural patrimony".

ان الفاظ کی پوری معنویت اس وقت تک واضح نہیں ہوسکتی جب تک اس میں یہ اضافہ نہ کیا جائے کہ قدیم زمانہ میں شرک ساری دنیا میں تہذیبی طاقت بن کر چھایا ہوا تھا۔ توحید کی بنیاد پر ہونے والے اسلامی انقلاب نے اس مشرکانہ غلبہ کو ختم کردیا۔ اگر یہ مشرکانہ غلبہ ختم نہ کیا جاتا تو دنیا میں وہ دور کبھی نہیں آسکتا تھا جس کو آج سائنسی ترقی کا دور کہا جاتا ہے۔ (تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو: اسلام دور جدید کا خالق)

فرینکفرٹ ایرپورٹ پر حفاظتی ہدایت (security advice) کے عنوان کے تحت

دیواروں پر لکھا ہوا تھا کہ اپنے سامان کو رکھوالی کے بغیر نہ چھوڑیں:

Do not leave your baggage unattended

اس کو دیکھ کر خیال آیا کہ یہی معاملہ آدمی کو خود اپنے نفس کے ساتھ کرنا ہے۔ ہر آدمی کے لیے ضروری ہے کہ وہ اپنے نفس کا نگراں بنا رہے۔ ورنہ اس کا نفس اس کو تباہی کے راستہ پر ڈال دے گا اور پھر کوئی چیز اس کو خدا کی پکڑ سے بچانے والی نہ بن سکے گی۔

12 مئی کی شام کو فرینکفرٹ پہنچا۔ یہاں مغرب اور عشا کی نماز پڑھی اور اللہ کا شکر ادا کیا کہ اس نے میرے جیسے عاجز انسان کے ساتھ نصرت کا خصوصی معاملہ فرمایا۔

*****

جولائی 1990ء میں روس (سویت یونین) کے لیے میرا ایک سفر ہوا۔ اس سفر پر جانے سے پہلے میں نے چاہا کہ اس مضمون کو دیکھوں، جو مولانا امین احسن اصلاحی نے میری طالب علمی کے زمانہ میں علامہ موسیٰ جار اللہ روسی (1949-1878ء) کی بابت لکھا تھا۔ یہ مضمون مولانا امین احسن اصلاحی نے اپنے ماہنامہ الاصلاح میں "شذرات" کے تحت لکھا تھا۔ میں نے مولانا عبد الرحمن ناصر اصلاحی کو خط لکھا کہ الاصلاح کے مذکورہ مضمون کی فوٹو کاپی روانہ کر دیں۔ خط لکھنے کے چند دن بعد پانچ صفحہ کے اس مضمون کی فوٹو کاپی مجھے بذریعہ ڈاک دہلی میں مل گئی۔ واضح ہو کہ دہلی اور سرائے میر (اعظم گڑھ) کے درمیان 800 کیلومیٹر کا فاصلہ ہے۔

یہ بظاہر ایک سادہ سی بات ہے۔ مگر اس میں شکر کا عظیم الشان سرمایہ موجود ہے۔ یہ انسانی ذہن کی کیسی عجیب خصوصیت ہے کہ 50 سال پہلے کا واقعہ ایک سکنڈ میں اس کو یاد آجائے۔ حالانکہ مجھے یاد نہیں آتا کہ زمانہ طالب علمی کے بعد دوبارہ کبھی اس کا ذکر آیا ہو۔ پھر ڈاک کا یہ نظام انسان کے لیے کتنی بڑی سہولت ہے۔ اگر موجودہ وسائل نہ ہوں تو مذکورہ مضمون کو

حاصل کرنے کے لیے مجھے سولہ سو کلو میٹر کا سفر طے کرنے کی ضرورت پیش آتی۔ اس میں غالباً دو ماہ لگ جاتے۔ پھر فوٹو کاپی کی مشینیں کتنی بڑی نعمت ہیں جن کی وجہ سے یہ ممکن ہو گیا ہے کہ چند لمحے میں کسی چیز کا کسی تبدیلی یا فرق کے بغیر عکس حاصل کر لیا جائے۔

یہ باتیں بظاہر بالکل معمولی ہیں، مگر معمولی چیز کو غیر معمولی چیز کے روپ میں دیکھنے ہی کا نام شکر ہے۔ اگر آدمی جذبۂ شکر کے ابلنے کے لیے انوکھے معجزہ کا انتظار کرے تو وہ کبھی بھی خدا کا سچا شکر گزار نہیں ہو سکتا۔ کیوں کہ موجودہ دنیا میں ایسے اسباب شکر کسی کے لیے ظاہر ہونے والے ہی نہیں۔

*****

نومبر 1990ء کو جاپان کے راستے امریکا کے لیے میرا ایک سفر ہوا۔ ٹوکیو سے لاس اینجلز کے لیے جاپان ایر لائنز کی فلائٹ نمبر 62 کے ذریعہ روانگی ہوئی۔ یہ دس گھنٹے کی مسلسل پرواز تھی جو پوری کی پوری بحرالکاہل کے اوپر طے ہوئی۔ کرۂ ارض کا تقریباً 71 فی صد حصہ سمندروں سے گھرا ہوا ہے۔ ان میں سب سے بڑا سمندر بحرالکاہل (Pacific Ocean) ہے۔ متصل سمندروں کو چھوڑتے ہوئے صرف بحرالکاہل تمام سمندروں کا 45 فیصد حصہ ہے۔ اس کی اوسط گہرائی 12925 فٹ ہے۔ ایک ساحل سے دوسرے ساحل تک اس کا فاصلہ تقریباً گیارہ ہزار میل ہے۔

اس عظیم سمندر کے مقابلے میں تمام انسانوں کی مجموعی تعداد ایک چیونٹی سے زیادہ حقیقت نہیں رکھتی۔ مگر یہی انسان اس کے اوپر فاتحانہ پرواز کرتے ہوئے ایک مقام سے دوسرے مقام تک پہنچتا ہے۔ انسان کے اوپر اللہ تعالیٰ کا یہ کیسا عجیب احسان ہے۔ میں نے نیچے سمندر کی لہروں کو دیکھا تو ایسا محسوس ہوا جیسے یہ لہریں کہہ رہی ہوں کہ اے انسان! ان احسانات کو سوچ کر تیرے اندر شکر خداوندی کا سیلاب امنڈ پڑنا چاہیے۔ مگر دنیا میں شاید

ہی کوئی انسان ہو جس نے سمندر کی ان بیتاب لہروں میں اس کے ربانی پیغام کو سنا ہو۔

*****

2 دسمبر 1990ء کو میں امریکا میں تھا۔ وہاں ایک صاحب سے ملاقات ہوئی۔ انھوں نے خلیج کے مسئلہ کے بارے میں سوال کیا۔ میں نے کہا کہ اس مسئلہ میں میری وہی رائے ہے جو عام طور پر علماء کی رائے ہے۔ علماء کی رائے نہایت تفصیل کے ساتھ آچکی ہے۔ زیادہ بہتر یہ ہے کہ ہم لوگ تذکیری باتوں پر گفتگو کریں جن کے بارے میں بہت کم گفتگو کی جاتی ہے۔

پھر میں نے کہا کہ ابھی ہم لوگوں نے ایک کھانا ختم کیا ہے۔ کھانے کے بعد کے لیے ہمیں یہ دعا سکھائی گئی ہے کہ: الْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِي أَطْعَمَنِي، وَسَقَانِي وَاجْعَلْنِي مِنْ الْمُسْلِمِين (اس اللہ کا شکر اور تعریف ہے جس نے مجھے کھانا کھلایا اور جس نے مجھے پانی پلایا اور جس نے مجھے مسلمانوں میں سے بنایا)۔

اس دعا کا مطلب یہ نہیں ہے کہ آدمی اس کے الفاظ کو یاد کرلے اور کھانے کے بعد اسے اپنی زبان سے دہرا دے۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ دعا اپنے مفہوم کے اعتبار سے مطلوب ہے، نہ کہ محض اپنے الفاظ کے اعتبار سے۔ آپ اگر کسی سے کہیں کہ میرا فلاں ٹیلی فون نمبر ہے، تم اس نمبر پر مجھے کال کرلینا، تو اس کا مطلب یہ نہیں ہوگا کہ وہ اس گنتی کو یاد کرکے اسے اپنی زبان سے دہراتا رہے۔ اس کا مطلب یہ ہوگا کہ وہ ٹیلی فون سٹ کے اوپر اس نمبر کو ڈائل کر کے آپ سے ربط قائم کرے۔

یہی دعا کا معاملہ ہے۔ آپ کو چاہیے کہ جب آپ دعا کے یہ الفاظ پڑھیں تو آپ کا ذہن ان کے معانی کی طرف چلا جائے۔ آپ سوچیں کہ خدا نے کس طرح وہ کھانا اور پانی بنایا جو میری بھوک اور پیاس کو مٹائے اور میری زندگی کی طاقت بنے۔ جب آپ اس طرح

سوچیں گے تو آپ کو معلوم ہوگا کہ یہ ایک عظیم تخلیق کا معاملہ ہے۔ خدا نے کائناتی انتظام کے تحت نان فوڈ (non-food) کو فوڈ (food) میں تبدیل کیا، اس نے نان واٹر (non-water) کو واٹر (water) میں تبدیل کیا، اس کے بعد یہ ممکن ہوا کہ آپ اس کو کھائیں اور پئیں اور وہ آپ کے جسم میں داخل ہو کر آپ کا گوشت اور خون بنے۔

اسی طرح خدا نے آپ کو یہ توفیق دی کہ آپ اپنے نان اسلام کو اسلام میں کنورٹ کریں، اس کے بعد ہی یہ واقعہ پیش آیا کہ آپ کے اندر ایک اسلامی شخصیت ایمرج کرے۔ ان عظیم انعامات کا احساس جب لفظوں میں ڈھلتا ہے تو وہ مذکورہ کلمہ کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے۔

*****

6 دسمبر 1990ء کو میں کیلی فورنیا (امریکا) میں جناب صغیر اسلم صاحب کے یہاں ٹھہرا ہوا تھا۔ مجھے دہلی اپنے آفس میں بات کرنے کی ضرورت پیش آئی۔ یہ کیلی فورنیا میں صبح کا وقت تھا اور دہلی میں شام کا۔ میں نے صغیر اسلم صاحب سے کہا۔ انھوں نے اپنے ٹیلیفون پر نمبروں کے بٹن دبائے۔ اس کے فوراً بعد دہلی میں ہمارے دفتر میں گھنٹی بجنے لگی۔ میں نے سوچا کہ جس دنیا میں یہ ممکن ہے کہ کیلی فورنیا کا ایک انسان دہلی کے ایک انسان سے ایک منٹ سے بھی کم وقت میں رابطہ قائم کرلے، اس دنیا میں کیا یہ ممکن نہیں کہ انسان اپنے خالق سے رابطہ قائم کرسکے۔ دل نے کہا کہ یقینی طور پر ممکن ہے۔ مگر اس کے لیے اسی طرح صحیح تدبیر اختیار کرنی ہوگی جو کیلی فورنیا اور دہلی کے درمیان رابط قائم کرنے کے لیے اختیار کی گئی۔ اس رابطہ کی ایک شکل یہ بھی تھی کہ ہم مذکورہ نمبروں کا اہتمام نہ کرتے بلکہ دوسرے غیر متعلق نمبروں پر اپنی انگلیاں مارنے لگتے۔ ایسی حالت میں ہماری کوشش بے فائدہ ہو جاتی۔ اس کے بجائے ہم نے یہ کیا کہ صحیح ترین نمبر معلوم کرکے عین اسی نمبر کے ذریعہ ربط قائم کرنے کی کوشش کی۔ ایسا کرتے ہی فوراً ربط قائم ہوگیا۔

اسی طرح خدا سے ربط قائم کرنے کا بھی ایک "صحیح نمبر" ہے اور ایک "غلط نمبر" جو شخص خدا سے ربط قائم کرنے کی سنجیدہ خواہش رکھتا ہو، اس کو چاہیے کہ پہلے اس کا "صحیح نمبر" معلوم کرے۔ ایسا کرنے کے بعد خدا سے اس کا ربط قائم ہونا اتنا ہی ممکن ہو جائے گا جتنا کیلی فورنیا اور دہلی کے درمیان ربط قائم ہونا۔ یہ صحیح نمبر اپنی ذات کو حذف کرنا ہے۔

*****

امریکا کے سفر (1990ء) میں جناب صفی قریشی صاحب سے ملاقات ہوئی۔ انھوں نے ایک مجلس میں بہت اچھی مثال دی۔ انھوں نے کہا کہ آج کل مصنوعی سٹلائٹ خلا میں بھیجے جاتے ہیں۔ یہ سٹلائٹ اوپر جا کر 200 میل یا اس سے کم وبیش کی دوری پر زمین کے گرد گھومنے لگتے ہیں۔ مگر ان کی عمر کی ایک مدت ہے۔ ایک مدت گزرنے کے بعد وہ زمین کی کشش کے دائرہ میں آکر زمین کی طرف کھنچنے لگتے ہیں۔ یہاں تک کہ نیچے آتے آتے ایک روز زمین پر گر پڑتے ہیں۔ اسی طرح انسان ایک مقررہ مدت کے لیے اس دنیا میں آتا ہے۔ اس کے بعد اس کا واپسی کا سفر شروع ہو جاتا ہے۔ یہاں تک کہ آخر کار وہ دوبارہ خدا کی طرف چلا جاتا ہے۔

6 دسمبر کو ظہر کی نماز کے بعد آخری بار میں یہاں کے پارک میں گیا۔ پارک کے پاس پہنچا تو دیکھا کہ ملی ہوئی سڑک سے ایک بہت بوڑھا امریکن جوڑا خاص طرح کی کھلی ہوئی چھوٹی گاڑی کو آہستہ چلاتا ہوا گزر رہا ہے۔ میری نظر ان لوگوں کی طرف گئی تو مرد نے ہاتھ اٹھا کر ہائے (ہیلو) کہا۔ میں پارک کے اندر داخل ہو رہا تھا اور وہ سڑک پر چلتے ہوئے دوسری طرف جا رہے تھے۔

اس واقعہ میں مجھے خود اپنا وداعی سفر دکھائی دینے لگا۔ میں نے کہا: کل مجھے یہاں سے جانا ہے، اسی طرح ایک اور کل آئے گا جب کہ میں اس دنیا کو چھوڑ کر چلا جاؤں گا۔ پہلے سفر کی

منزل معلوم ہے، مگر دوسرے سفر کی منزل معلوم نہیں۔ اللہ کے سوا کوئی نہیں جانتا کہ دوسرے سفر میں میرے اوپر کیا بیتنے والا ہے۔ کچھ دیر تک میں پارک میں بیٹھا، خوبصورت پارک، سرسبز درختوں سے ڈھکے ہوئے مکانات، ہوا کے خوش گوار جھونکے، سڑک پر پھسلتی ہوئی کاریں، سورج کی سنہری روشنی میں اڑتے ہوئے ہوائی جہاز، اس طرح کے مختلف مناظر کے درمیان میں نے سوچا کہ خدا نے کتنی زیادہ نعمتیں انسان کو دے رکھی ہیں۔ لوگ ان نعمتوں سے فائدہ اٹھانے میں ایک دوسرے سے آگے بڑھ جانا چاہتے ہیں۔ مگر کوئی نہیں جوان بے پایاں نعمتوں پر اللہ کا شکر ادا کرے۔ میری زبان سے بے ساختہ نکلا: خدایا! میں ساری انسانیت کی طرف سے تیرا شکر ادا کرتا ہوں تاکہ ان کے اوپر تیرا غضب نازل نہ ہو جائے۔

*****

اکتوبر 1991ء میں مجھے روم اور مالٹا کا ایک لمبا سفر کرنا پڑا۔ مالٹا میں میرا قیام ہوٹل "ہالی ڈے اِن" میں تھا۔ تاریخی اعتبار سے مالٹا جیسے چھوٹے اور دور دراز مقامات تاریخ کے اس دور کی یاد دلاتے ہیں جب کہ دنیا میں عام طور پر مذہبی جبر کا دور دورہ تھا۔ لوگ حکومتوں کے مذہبی تشدد سے بچنے کے لیے اس طرح کے مقالات پر پناہ لیتے تھے۔ کہا جاتا ہے کہ ایک مسیحی بزرگ نے رومی پکڑ دھکڑ سے بچنے کے لیے مالٹا میں پناہ لی تھی۔ مالٹا کے بارے میں ایک تعارفی پمفلٹ میں یہ الفاظ درج ہیں کہ یہ چرچ ابتداءً 1417ء میں تعمیر کیا گیا تھا۔ اس کے بعد 1694ء میں وہ دوبارہ بنایا گیا۔ یہ چرچ سینٹ اگاتھا سے منسوب ہے۔ کہا جاتا ہے کہ وہ رومی شہنشاہ ڈیسیس کی تعذیب سے بھاگ کر مالٹا آئے تھے:

"CHAPEL OF ST. AGATHA: This church was originally built in 1417, and redesigned by Lorenzo Gafa, in 1694. The church is dedicated to St. Agatha who, it is said, found shelter in Malta from the persecution of the Roman Emperor Decius (249 AD)"

مذہبی جبر کے اس دور کو اسلام نے ختم کیا۔ مگر کیسی عجیب بات ہے کہ لوگ عطیہ سے فائدہ اٹھا رہے ہیں، مگر معطی کا اعتراف کرنے والا کوئی نہیں۔ حتیٰ کہ خود مسلمانوں میں بہت سے لوگ اس خدائی واقعہ کو اپنے قومی فخر کے خانہ میں ڈالے ہوئے ہیں۔ حالاں کہ صحیح یہ تھا کہ اس کو وہ شکر خداوندی کے خانہ میں ڈالیں۔

*****

ایک کانفرنس میں شرکت کرنے کے لیے برسیلز (بیلجیم) کا میرا ایک سفر ہوا۔ 16 ستمبر 1992ء کو فجر کی نماز برسیلز کی آخری نماز تھی۔ ناشتہ سے فراغت کے بعد اپنے ایک میزبان ڈاکٹر لیونارڈو کے ہمراہ ایر پورٹ کے لیے روانگی ہوئی۔ ضروری کارروائی کے بعد اندر داخل ہوئے تو ایر پورٹ پر موجود چرچ کے فادر مل گئے۔ انھوں نے ہم کو پہچان لیا۔ کیوں کہ انھوں نے کانفرنس میں ہمیں دیکھا تھا۔ انھوں نے بتایا کہ یہاں ایر پورٹ کے احاطہ میں ایک مسجد بھی ہے۔ یہ سن کر بہت خوشی ہوئی۔ انھوں نے ہمارا شوق دیکھ کر ہم کو مسجد تک پہنچایا۔ ہم نے کچھ وقت اس مسجد میں گزارا۔ یہ ایک چھوٹی سی خوبصورت مسجد ہے۔ لمبائی میں وہ دس قدم ہے اور چوڑائی میں سات قدم۔ میں نے یہاں دو رکعت تحیۃ المسجد پڑھی اور اللہ کا شکر ادا کیا کہ اس نے میرے جیسے کمزور آدمی کو ایسے زمانہ میں پیدا کیا جب کہ مذہبی تشدد دنیا سے ختم ہو گیا ہے۔ حتیٰ کہ غیر مسلم حکومتیں اپنے ہوائی اڈہ کے اندر اپنے مسافروں کی سہولت کے لیے مسجدوں کی تعمیر کر رہی ہیں۔

*****

لندن کے ایک سفر (ستمبر 1992ء) میں ایک صاحب سے ملاقات ہوئی۔ انھوں نے کہا کہ ہندستان میں اسلام اور مسلمانوں کو مٹانے کی سازشیں ہو رہی ہیں، اس کے لیے آپ کیا کر رہے ہیں۔ یہ گفتگو رات کے وقت ہو رہی تھی۔ میں نے کہا کہ یہ ایسی ہی بات ہے

جیسے کوئی کہے کہ دنیا میں اندھیرا چھا رہا ہے، اس کو دور کرنے کے لیے آپ کیا کر رہے ہیں۔ بظاہر اس وقت اندھیرا ہے، مگر دوسرا اس سے بڑا واقعہ یہ ہے کہ پورا کائناتی نظام اس اندھیرے کو ختم کر کے دوبارہ صبح طلوع کرنے کی طرف متحرک ہے۔ پھر آپ اندھیرے کے خلاف احتجاج کیوں کریں۔ آپ آنے والی صبح کو سوچ کر اللہ کا شکر کیوں نہ کریں۔

میں نے کہا کہ اس دین کے ساتھ اللہ نے محفوظیت (الحجر، 15:9) کا معاملہ کیا ہے۔ اس معاملہ کی نشانیاں آپ ساری تاریخ میں دیکھ سکتے ہیں۔ تیرھویں صدی عیسوی میں تاتاریوں نے اسلام اور مسلمانوں کو مٹانا چاہا۔ مگر نتیجہ یہ ہوا کہ خود تاتاری دین کے خادم بن گئے۔ بیسویں صدی میں اتاترک اور عصمت انونو نے ترکی سے اسلام کو ختم کرنا چاہا۔ مگر دو نسلوں تک حکومت کی دین کو مٹانے کے لیے ساری طاقت لگانے کے بعد نتیجہ یہ نکلا کہ عصمت انونو (1884-1973ء) نے انتقال کے وقت کہا کہ میں نے اپنی زندگی میں یہ عجیب چیز دیکھی کہ ہم نے ترکی میں سیکولرزم کا پودا بویا، مگر جب پھل نکلا تو وہ اسلام تھا۔

یہی معاملہ ہندستان میں ہو رہا ہے۔ لوگوں کے بیان کے مطابق 1947ء سے پہلے ہندوؤں نے انڈیا سے مسلمانوں کے وجود کو ختم کرنے کا منصوبہ بنایا۔ مگر ساری کوششوں کے بعد یہ حال ہوا کہ 1947ء میں غیر منقسم ہندستان میں مسلمانوں کی تعداد چھ کروڑ تھی۔ آج اسی ہندستان میں مسلمانوں کی تعداد تقریباً چوگنا ہو چکی ہے۔ میوات میں کچھ جاہل مسلمان تھے جو چوٹیاں رکھتے تھے اور ہندو رسوم مناتے تھے۔ ہندوؤں نے ان کو شدھی کر کے انھیں دوبارہ ہندو بنانے کی تحریک چلائی۔ اس کے جواب میں مولانا الیاس صاحب نے میواتیوں کی دینی اصلاح کی کوشش شروع کی۔ آج یہ حال ہے کہ نہ صرف میواتیوں کی دینی اصلاح ہوئی بلکہ مولانا الیاس صاحب کی اٹھائی ہوئی تحریک ایک عالمی اصلاحی تحریک بن گئی۔ بابری مسجد کا مسئلہ پیدا ہونے کے بعد مسلمانوں میں یہ ذہن پیدا ہوا

کہ اجودھیا کی مسجدیں ہندوؤں کو داخلہ کا موقع اس لیے ملا کہ وہ غیر آباد تھی۔ کیوں کہ ”خانۂ خالی را دیومی گیرد“ یعنی گھر خالی ہو تو اس میں جن بسیرا کر لیتے ہیں۔ اس احساس نے دوسری مسجدوں کی آبادی کا ذہن پیدا کیا۔ آج ہندستان کی تین لاکھ سے زیادہ مسجدیں مزید بہت زیادہ آباد اور پررونق ہو چکی ہیں۔

پھر جب حالت یہ ہے کہ اسلام اور مسلمانوں کے خلاف ہر سازش برعکس طور پر خود اسلام اور مسلمانوں کی ترقی کا باعث ہوتی ہے تو ہم کو لوگوں کی سازش پر پریشان ہونے کی کیا ضرورت۔

*****

ستمبر 1992ء کو ایک سفر سے نئی دہلی کے لیے واپسی کے موقع پر میں دبئی میں ٹرانزٹ پسنجر کی حیثیت سے کچھ دیر کے لیے ٹھہرا تھا۔ دبئی کے ہوائی اڈہ پر ایک چھوٹی سی خوبصورت مسجد ہے۔ وہاں پہنچ کر نماز پڑھی اور اللہ کا شکر ادا کیا۔ مسجد کے باہر عربی میں اماکن الصلاۃ اور انگریزی میں (Prayer Room) لکھا ہوا تھا۔ مسجد اللہ کے بندوں کے لیے مامن ہے۔ اس کے اندر داخل ہو کر ایک خاص طرح کا سکون حاصل ہوتا ہے۔ مسجد نہ صرف عبادت گاہ ہے بلکہ وہ اہل ایمان کے لیے روحانی پناہ گاہ بھی ہے۔ میں نے سوچا کہ دنیا کے ہر ملک میں اور ہر شہر میں کثرت سے مساجد کی موجودگی مسلمانوں کے لیے ایک غیر معمولی ایڈوانٹج کی حیثیت رکھتی ہے۔ وہ یہ کہ وہ پرامن اسلامی تحریک کو مساجد کی بنیاد پر اٹھائیں، اور پھر دنیا کے ہر گوشہ میں اپنے لیے بنا بنایا مرکز عمل پالیں۔

*****

جمہوریہ مالدیپ بحر ہند میں واقع جزائر پر مشتمل ایک ملک ہے۔ دسمبر 1987ء میں مالدیپ کے لیے میرا ایک سفر ہوا۔ یہ سفر ایک انٹرنیشنل اسلامک کانفرنس میں شرکت

کے لیے تھا جس کا اہتمام حکومت مالدیپ کے تعاون سے کیا گیا تھا۔ 5 دسمبر 1987ء کی صبح کو فجر سے پہلے گھر سے روانہ ہونا تھا۔ 4 دسمبر کی شام کو مختلف کاموں میں دیر ہوگئی اور میں ساڑھے بارہ بجے سے پہلے بستر پر نہ جا سکا۔ سوتے وقت دل سے دعا نکلی کہ خدایا مجھے تین بجے جگا دیجیے۔ تاخیر کی وجہ سے نیند بھی کسی قدر دیر میں آئی، اور میں سو گیا۔ میں بالکل گہری نیند سو رہا تھا کہ خلاف معمول اچانک نیند کھل گئی۔ دیکھا تو گھڑی کی ایک سوئی تین پر تھی اور دوسری سوئی بارہ پر۔ میں نے اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کیا۔ دل نے کہا کہ اللہ کی مدد ٹھیک اپنے وقت پر آتی ہے، اگرچہ انسان اپنی عجلت پسندی کی وجہ سے گھبرا اٹھتا ہے اور سمجھتا ہے کہ شاید خدا کی مدد آنے والی نہیں۔

*****

اردو کے ایک مرثیہ گو نے قدیم زمانہ میں حضرت حسین اور ان کے خاندان کے لوگوں کے سفر کا نقشہ کھینچتے ہوئے کہا تھا کہ خدا نے فرشتوں کو حکم دیا کہ زمین کو مختصر کر کے ان کا راستہ آسان بنا دو:

طنابیں کھینچ کر کم کر زمیں کو کہ ہووے راہ کم ان مہ جبیں کو

آج اللہ تعالیٰ نے ہر آدمی کے لیے ''زمین کی طنابیں کھینچ کر'' سفر کو مختصر بنا دیا ہے، یعنی جدید وسائل کے ذریعہ فاصلوں کو کم کر دیا ہے۔ مثلاً ہوائی جہاز کی سواری آج بہت زیادہ عام ہو چکی ہے۔ اس لیے لوگوں کو اس کے غیر معمولی پن کا احساس نہیں ہوتا۔ حقیقت یہ ہے کہ ہوائی جہاز اللہ تعالیٰ کی ایک عظیم نعمت ہے۔ ہوائی جہاز نے آج لمبے سفروں کو ہر آدمی کے لیے ممکن بنا دیا ہے۔ ورنہ قدیم زمانے میں بہت ہی کم افراد لمبے سفر کا حوصلہ کر سکتے تھے۔ مگر قرآن کے مطابق، انسانوں میں سب سے کم وہ لوگ ہیں جو قابل شکر باتوں کو شدت کے ساتھ محسوس کریں اور شکر کے جذبات سے سرشار ہو جائیں (34:13)۔

*****

جولائی 2001ء میں میرا ایک سفر سوئٹزرلینڈ کے لیے ہوا۔ ہمارا جہاز 25 جولائی کی صبح کو ٹھیک وقت پر زیورک، سوئٹزرلینڈ پہنچ گیا۔ جہاز جب ایرپورٹ کے قریب پہنچ کر نیچے اترا تو چاروں طرف سرسبز مناظر دکھائی دے رہے تھے۔ یہ ایک خوبصورت دنیا تھی جو گویا فطرت کے سبزہ زار ماحول میں بنائی گئی تھی۔ اس کو دیکھ کر میری زبان سے نکلا:

"It is like seeing paradise from a distance".

مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اللہ نے ایک نہایت حسین اور معیاری دنیا بنائی جہاں انسان ابدی طور پر پرمسرت زندگی گزار سکے۔ یہ جنت ہے۔ پھر اس نے ایک اور دنیا موجودہ زمین کی صورت میں بنائی۔ ہماری زمین ساری کائنات میں ایک انتہائی انوکھا استثنا ہے۔ جیسا کہ قرآن میں بتایا گیا ہے، یعنی اس دنیا میں جنت کے مشابہ تمام چیزیں رکھ دی گئی ہیں (البقرہ، 2:25)۔ گویا موجودہ دنیا آخرت کی کامل جنت کا ایک ناقص تعارف ہے۔ یہ دنیا انسان کو اس لیے دی گئی ہے تاکہ وہ اس کے اندر جنت کی ابتدائی جھلک دیکھے اور پھر اس کا شکر ادا کر کے ابدی جنت کا مستحق بنے۔ اس حقیقت کی طرف قرآن میں ان الفاظ میں اشارہ کیا گیا ہے: لَئِنۡ شَكَرۡتُمۡ لَأَزِيدَنَّكُمۡ (14:7)۔ یعنی، اگر تم شکر کرو گے تو میں تم کو (جنت کی صورت میں) زیادہ دوں گا۔

ایک خط

برادر محترم عبدالسلام اکبانی صاحب السلام علیکم ورحمۃ اللہ

مہاراشٹر کے سفر کے دوران 27 نومبر 2003 کو میں ناگپور پہنچا تھا۔ 29 نومبر کو واپسی ہوئی۔ اس دوران کئی قیمتی قسم کے سبق آموز تجربے ہوئے۔ آپ ان تجربات کا ذریعہ بنے۔ اللہ تعالیٰ آپ کو جزائے خیر عطا فرمائے۔

ا۔ آپ نے ناگپور شہر دکھایا۔ چار سال پہلے میں ناگپور آیا تھا۔ اب اس سفر میں اندازہ

ہوا کہ اس مدت میں ناگپور شہر کے اندر بہت سی ترقیاں ہوئی ہیں۔ وہاں کی سڑکیں چوڑی کی گئی ہیں۔ صفائی کا خصوصی اہتمام ہے۔ ہر طرف ہریالی نظر آتی ہے۔ اس ترقیاتی کام سے ہر فرقہ کو غیر معمولی فائدہ حاصل ہوا ہے۔ میرا تجربہ ہے کہ ترقی کے سلسلہ میں اصل اہمیت اچھے انفراسٹرکچر کی ہوتی ہے اور ناگپور کے لوگوں کو یہی چیز حاصل ہوئی۔

معلوم ہوا کہ یہ سارا کام ایک کمشنر نے انجام دیا ہے۔ اس نے نہایت حکمت کے ساتھ متعلقہ ذمہ داروں کو اپنے ساتھ لیا اور عوام کی تائید حاصل کی۔ اس کام کے لیے ورلڈ بینک سے مالیاتی امداد ملی تھی۔ اس طرح تین سال کی قلیل مدت میں ناگپور کا نقشہ بدل گیا۔ ضرورت ہے کہ ہندستان کے ہر شہر میں اسی طرح انفراسٹرکچر کو بہتر بنایا جائے۔ یہی قومی ترقی کا سب سے بڑا راز ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ہر انسان خود اپنی فطرت کے زور پر ترقی کی طرف دوڑنا چاہتا ہے۔ ضرورت صرف یہ ہے کہ اُس کو کھلا راستہ فراہم کر دیا جائے۔

2۔ میں اس سے پہلے کئی بار ناگپور گیا ہوں۔ مگر ایک بات کا مجھے اب تک اندازہ نہ ہو سکا تھا۔ آپ نے اس بار اسے دکھایا۔ وہ یہ کہ ناگپور میں وہاں کے مسلمانوں کا ایک ایجوکیشنل ایمپائر موجود ہے۔ انجمن حامیٔ اسلام کے تحت قائم شدہ بڑے بڑے تعلیمی ادارے اسی کا حصہ ہیں جس کے موجودہ صدر جناب جسٹس ایم ایم قاضی ہیں۔ یہ سب چیزیں بلا شبہ خوشی کا باعث تھیں۔

3۔ ایک اور قابل ذکر چیز جو میں نے اس سفر میں پائی وہ خود آپ کی فیملی تھی۔ میں نے پایا کہ آپ کی فیملی میں ساس اور بہو جیسے جھگڑے نہیں ہیں۔ آپ کی فیملی ایک پرسکون فیملی ہے۔ آپ کی اہلیہ سے میں نے پوچھا تھا کہ کامیاب خاندانی زندگی کا راز کیا ہے۔ انہوں نے کہا کہ: صبر و برداشت۔ میں سمجھتا ہوں کہ کامیاب خاندانی زندگی گزارنے کے لیے یہی واحد کارگر فارمولا ہے۔

4۔ چوتھی چیز وہ ہے جو آپ کے صاحب زادہ زبیر احمد اکبانی کے ذریعہ معلوم ہوئی۔ انہوں نے کہا کہ ہم نے یہ فیصلہ کیا ہے کہ ہم اپنے کاروبار کو مینجیبل لمٹ (Manageable limit) کے اندر رکھیں۔ انہوں نے بتایا کہ جب سے ہم نے یہ فیصلہ لیا ہے ہم کو ذہنی سکون بھی ملا ہے اور کاروباری ترقی بھی۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہ فارمولا ہر کاروباری آدمی کے لیے یکساں طور پر مفید ہے۔

5۔ آپ کے گھر کی دیوار پر ایک قرآنی آیت لکھی ہوئی نظر آئی: هَٰذَا مِنْ فَضْلِ رَبِّي لِيَبْلُوَنِي أَأَشْكُرُ أَمْ أَكْفُرُ (27:40) میں نے دیکھا ہے کہ عام طور پر لوگ جب گھر بناتے ہیں تو وہ اپنے گھر پر اس آیت کا صرف ایک حصہ (هَٰذَا مِنْ فَضْلِ رَبِّي) لکھتے ہیں۔ آپ نے اس کے برعکس پوری آیت لکھی ہے۔ آیت کا صرف ایک حصہ لکھنا قرآن کے اصل مفہوم کو واضح نہیں کرتا۔ قرآن کے مطابق، گھر یا مادّی نفع جو اس دنیا میں کسی کو ملتا ہے وہ نوازش کے طور پر نہیں ہوتا بلکہ جانچ کے طور پر ہوتا ہے۔ اس دنیا میں ہر مادی چیز امتحان کا ایک پرچہ ہے۔ اُس کے ذریعہ خدا یہ دیکھنا چاہتا ہے کہ آدمی اُس کو پا کر خدا کا شکر گزار بنا یا وہ سرکش ہو گیا۔

حقیقت یہ ہے کہ ہر انسان پر خدا کا یہ سب سے بڑا حق ہے کہ وہ ہر ملی ہوئی چیز کو خدا کا عطیہ سمجھے اور اُس پر اس کا شکر ادا کرے۔ جو آدمی دل سے خدا کا شکر ادا کرے وہ امتحان میں کامیاب ہوا اور جس کے دل میں شکر کا جذبہ نہیں اُمنڈا وہ اپنے امتحان میں ناکام ہو گیا۔ میرے تجربہ کے مطابق، آپ کا گھر وہ گھر تھا جہاں میں نے لوگوں کی زبان پر شکر کا چرچا پایا۔ جہاں افرادِ خانہ کے اندر یہ زندہ شعور موجود تھا کہ اگر نہ ملے ہوئے کو پانا چاہتے ہو تو پہلے ملے ہوئے پر دینے والے کا شکر ادا کرو۔ شکر دراصل مزید عطیہ کے لیے استحقاق کی حیثیت رکھتا ہے۔

9 دسمبر 2003، نئی دہلی — دعا گو: وحید الدین

صبر

دین کا خلاصہ

صبر کیا ہے

دنیا کے خالق نے اس دنیا کا نظام اس طرح بنایا ہے کہ یہاں صبر کے بغیر کوئی بڑا کام نہیں کیا جاسکتا (الفرقان، 25:20)۔ صبر کیا ہے؟ صبر عمل کا الٹا نہیں ہے، بلکہ صبر عاجلانہ کارروائی کا الٹا ہے۔ صبر کے لفظی معنیٰ ہیں رکنا۔ عربی میں کہتے ہیں: صبرتُ الدابّة (میں نے جانور کو چارے سے روک دیا)۔ صبر انسان کے اندر اعتدال پیدا کرتا ہے۔ صبر انسان کو اس سے بچاتا ہے کہ وہ غیر ضروری طور پر اپنی طاقت کو ضائع کرے۔ صبر انسان کو اس قابل بناتا ہے کہ وہ اختلاف کو ٹکراؤ تک نہ جانے دے۔ صبر متحدہ جدوجہد کی لازمی ضرورت ہے۔ صبر مایوسی کو اُمید میں تبدیل کرتا ہے۔ صبر آدمی کے اندر یہ پختگی (maturity) پیدا کرتا ہے کہ جو چیزیں بدلنے کے قابل ہیں، اُن کو وہ بدلے اور ان چیزوں کے ساتھ وہ ایڈجسٹمنٹ کا معاملہ کرے جن کو وہ بدل نہیں سکتا۔

شریعت میں جس صبر کا حکم دیا گیا ہے، اس کی حقیقت اسی سے سمجھی جاسکتی ہے۔ قرآن میں مومن کی صفات میں سے ایک صفت یہ بتائی گئی ہے: وَالَّذِيْنَ صَبَرُوا ابْتِغَآءَ وَجْهِ رَبِّهِمْ (13:22)۔ اور جو لوگ صبر کرتے ہیں اللہ کی رضا چاہنے کے لیے۔ دوسرے لفظوں میں اِس کا مطلب یہ ہے کہ وہ لوگ اصولی بنیاد پر صبر کرتے ہیں۔ جب آدمی کو ٹھیس لگے اور وہ اللہ کی رضا کی خاطر صبر کرلے تو گویا اُس نے اصولی بنیاد پر صبر کیا۔ مجبوری کے تحت تو ہر آدمی صبر کرلیتا ہے، مگر مومن کا طریقہ یہ ہے کہ وہ سوچے سمجھے فیصلہ کے تحت اِس لیے صبر کرتا ہے کہ یہی اُس کے اصول کا تقاضا ہے۔ حدیث میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: الصَّبْرُ عِنْدَ الصَّدْمَةِ الْأُولَى (صحیح البخاری، حدیث نمبر 1283)۔ صبر وہ ہے جو ابتدائے صدمہ کے وقت کیا جائے۔

صبر کا فلسفہ

پیغمبرِ اسلام کی تعلیمات میں صبر (patience) کو بہت زیادہ اہمیت دی گئی ہے۔ قرآن میں تقریباً ایک سو دس آیتیں ہیں جن میں صبر کے الفاظ کو استعمال کیا گیا ہے۔ یہاں تک کے صبر ہی پر کامیابی کا مدار رکھا گیا ہے۔ چنانچہ ارشاد ہوا ہے کہ اے لوگو صبر کرو تا کہ تم فلاح پاؤ (3:200)۔ اِسی طرح فرمایا کہ امامت یا لیڈر شپ میں کامیابی کا راز صبر ہے۔(السجدہ،32:24)

اِسی حقیقت کو پیغمبرِ اسلام نے اپنی ایک لمبی حدیث میں اِن الفاظ میں بیان کیا: اعْلَمْ أَنَّ النَّصْرَ مَعَ الصَّبْرِ (مسند احمد، حدیث نمبر 2803)۔ یعنی، جان لو کہ کامیابی صبر کے ساتھ جُڑی ہوئی ہے۔ صبر نہیں تو کامیابی نہیں۔ کامیابی کا درخت ہمیشہ صبر کی زمین پر اُگتا ہے۔ تاریخ بتاتی ہے کہ دنیا کے تمام پیسفسٹ (pacifist) یا پیس فل ایکٹیوسٹ (peaceful activist) اپنے نشانے کو حاصل کرنے میں ناکام رہے۔ اِس کا مشترک سبب یہ ہے کہ انھوں نے امن کو دریافت کیا مگر وہ صبر کو دریافت نہ کر سکے۔ حالاں کہ صابرانہ روش کے بغیر پُرامن تحریک کو چلانا ممکن نہیں۔

عام طور پر یہ ہوتا ہے کہ لوگ کسی کو اپنا دشمن قرار دیتے ہیں اور اس کے بعد پیس فُل ایکٹوزم کے اصول پر اس کے خلاف تحریک چلاتے ہیں۔ کسی گروہ کے مقابلے میں پیس فل ایکٹوزم کے اصول پر تحریک چلانے کے لیے ضروری ہے کہ آپ کے دل میں اس کے خلاف منفی جذبات نہ ہوں، اس کے مقابلے میں آپ مکمل طور پر مثبت نفسیات کے حامل ہوں۔ یہی واحد بنیاد ہے جس کے اوپر پیس فل ایکٹوزم کی سرگرمیاں جاری ہو سکتی ہیں۔ مدِّ مقابل گروہ کے لیے آپ کے دل میں اگر مثبت جذبات نہ ہوں تو آپ کبھی اپنے پُرامن مشن میں کامیاب نہیں ہو سکتے۔

عملاً یہ ہوتا ہے کہ ایک گروہ دوسرے گروہ کے مقابلے میں پُرامن طریقِ کار کی بنیاد پر ایک تحریک اُٹھاتا ہے۔ لیکن فریقِ ثانی کی مفروضہ یا غیر مفروضہ زیادتیوں کا احساس فریقِ اوّل کے خلاف اس کے دل میں نفرت ڈال دیتا ہے۔ یہ نفرت دھیرے دھیرے تشدّد کی صورت اختیار کرلیتی ہے، اور اگر تشدد کے ذریعے مطلوب کامیابی نہ مل رہی ہو تو فریقِ اوّل کے دل میں فریقِ ثانی کے خلاف نفرت کا طوفان اس کو اِس حد تک لے جاتا ہے کہ اس کے خلاف ہر ممکن تخریبی کارروائی شروع کردے، یہاں تک کہ اس کو مٹانے کے لیے اُس قسم کی بھیانک کارروائی کرنے لگے جس کو موجودہ زمانے میں خودکش بمباری (suicide bombing) کہا جاتا ہے۔

پیس فل ایکٹوزم کے سلسلے میں یہ بات غالباً پوری تاریخ میں صرف پیغمبرِ اسلام کی زندگی میں ملتی ہے۔ دوسرے مصلحین کی طرح ان کو بھی فریقِ ثانی کی طرف سے سخت قسم کی زیادتیوں کا سامنا کرنا پڑا۔ مگر آپ نے کبھی اُن کے خلاف نفرت کی زبان استعمال نہیں کی۔ اپنے ساتھیوں کو بھی آپ ہمیشہ نفرت کے احساس سے بچانے کی کوشش کرتے رہے۔ آپ کی زندگی میں اِس طرح کی مثالیں کثرت سے موجود ہیں۔ مثال کے طور پر مکّہ میں پیغمبرِ اسلام کے ساتھیوں کا ایک خاندان تھا، جس کو آلِ یاسر کہا جاتا تھا۔ یہ ایک کمزور خاندان تھا۔ چنانچہ آپ کے طاقت ور مخالفین نے اُنھیں مارنا پیٹنا شروع کیا اور کہا کہ پیغمبر کا ساتھ چھوڑ دو۔ پیغمبرِ اسلام نے اِس منظر کو دیکھا تو آپ نے زیادتی کرنے والوں کے خلاف کوئی نفرت کا کلمہ نہیں کہا بلکہ آپ نے ان سے صرف یہ فرمایا: صَبْرًا یَا آلَ یَاسِرٍ، فَإِنَّ مَوْعِدَکُمُ الْجَنَّةُ (مستدرک الحاکم، حدیث نمبر 5646)۔ یعنی، اے آلِ یاسر صبر کرو، کیوں کہ تمہارے لیے جنت کا وعدہ ہے۔

جنّت کو صبر کا انعام بتا کر آپ نے اپنے ساتھیوں کو اس کے لیے آمادہ کیا کہ وہ کسی بھی

زیادتی پر مشتعل نہ ہوں۔ وہ کسی بھی حال میں فریقِ ثانی کے خلاف اپنے دل میں منفی جذبات کی پرورش نہ کریں۔

یہ پیغمبر اسلام کی پالیسی کا نہایت اہم پہلو تھا جس کو آپ نے خدا کی رہنمائی کے مطابق اختیار کیا۔ یعنی مخالفین کی ہر زیادتی پَر صبر کرنا۔ قرآن میں اِس سلسلے میں واضح ہدایات دی گئی ہیں۔ مثلاً قرآن میں پیغمبر کی زبان میں فرمایا: وَلَنَصۡبِرَنَّ عَلٰى مَاۤ اٰذَيۡتُمُوۡنَا (14:12)۔ یعنی، ہم تمہاری ایذاؤں پر صرف صبر ہی کریں گے۔ یہ صبر کوئی سادہ بات نہ تھی۔ اِس کا مطلب یہ تھا کہ فریقِ ثانی کی ظالمانہ کارروائی کے باوجود مثبت سوچ پر قائم رہنا، اپنے آپ کو اِس سے بچانا کہ اپنے ذہن میں فریقِ ثانی کی منفی تصویر بن جائے۔ کیوں کے فریقِ اوّل کے دل میں اگر فریقِ ثانی کی منفی تصویر بن جائے تو فریقِ اوّل کبھی فریقِ ثانی کے درمیان پُرامن طریقِ کار کے اصول پر قائم نہیں رہ سکتا۔ صبر کا اصول فریقِ اوّل کو اِس سے بچاتا ہے کہ اس کا ذہن فریقِ ثانی کے بارے میں غیر معتدل ہو جائے۔ پُرامن طریقِ کار (peaceful activism) معتدل ذہن کا اظہار ہے۔ غیر معتدل یا منفی ذہن کبھی پُر امن طریقِ کار کو کامیابی کے ساتھ جاری نہیں رکھ سکتا۔ صبر کا اصول دراصل اِسی اعتدال یا مثبت مزاج کی برقراری کی ایک یقینی گارنٹی ہے۔

پیغمبرِ اسلام کی زندگی کا مطالعہ بتاتا ہے کہ آپ کے ساتھ مخاطب گروہ کی طرف سے مسلسل زیادتیاں کی گئیں، لیکن آپ ہمیشہ سختی کے ساتھ صبر کے اصول پر قائم رہے۔ اور اپنے ساتھیوں کو اِسی کی تلقین کی۔ آپ کی مجلسوں میں کبھی ایسا نہیں ہوتا تھا کہ مخالفین کے ظلم کا چرچا کیا جائے۔ آپ نے کبھی ایسا نہیں کیا کہ مخالفین کے ظلم کے حوالے سے ان کے خلاف بددعائیں کریں۔ اِس کے برعکس، آپ ہمیشہ ظلم کرنے والوں کے خلاف اچھی دعا کرتے تھے۔ آپ نے اپنے مخالفوں کو کبھی کافر یا دشمن نہیں کہا، بلکہ ہمیشہ ان کے بارے میں انسان

کا لفظ بولتے رہے۔ اِس معاملے کی ایک انتہائی مثال یہ ہے کہ ایک بار آپ کے مخالفوں نے پتھر مار کر آپ کو زخمی کر دیا، اُس وقت آپ کی زبان سے یہ الفاظ نکلے: اللھُمَّ اھْدِ قَوْمِي فَإِنَّھُمْ لَا یَعْلَمُونَ (شعب الایمان للبیہقی، حدیث نمبر 1375)۔ یعنی، خدایا! میری قوم کو ہدایت دے، کیوں کہ وہ جانتے نہیں۔

یک طرفہ صبر اور خیر خواہی کا طریقہ جو آپ نے عرب میں اختیار فرمایا، وہ اِسی لیے تھا کہ فریقِ ثانی کے بارے میں آپ، یا آپ کے ساتھیوں کے دل میں شکایت اور نفرت کی نفسیات پیدا نہ ہونے پائے۔ کیوں کہ جو ذہن شکایت اور نفرت لیے ہوئے ہو، وہ اصلاح کا کام درست طور پر نہیں کرسکتا۔

سنتِ صبر

صبر کیا ہے، صبر یہ ہے کہ جذبات یا اشتعال کے موقع پر اپنے آپ کو تھاما جائے۔ جوابی کارروائی کرنے سے پہلے اپنے جذبات کو روک کر یہ سوچا جائے کہ میرے لیے اس موقع پر صحیح ردِّ عمل کیا ہے اور زیادہ نتیجہ خیز کارروائی کیا ہوسکتی ہے۔

کبھی جذبات کو روک لینے کا نام صبر ہے، کبھی صبر اس کا نام ہوتا ہے کہ اپنے آپ کو جوابی اقدام سے باز رکھا جائے اور کبھی صبر یہ ہوتا ہے کہ اقدام تو کیا جائے مگر وہ منصوبہ بند اقدام ہو نہ کہ محض جذباتی اقدام۔

سوال کیا جاسکتا ہے کہ ایک مخالف اگر کسی کو نقصان پہنچائے تو وہ اس پر صبر کر لے یا وہ اس کا توڑ کرنے کی کوشش کرے۔

جواب یہ ہے کہ صبر کا مطلب خواہ مخواہ نقصان اٹھانا نہیں ہے۔ صبر کا مطلب یہ ہے کہ غیر موافق صورتِ حال پیش آنے کے بعد ٹھنڈے ذہن سے آپ یہ سوچیں کہ آپ کا جوابی اقدام آپ کے حق میں کوئی مثبت نتیجہ پیدا کرے گا یا آپ کے نقصان میں مزید اضافہ کا سبب بن

جائے گا۔ صبر کا مطلب اپنے آپ کو مزید نقصان سے بچانا ہے، نہ کہ غیر ضروری طور پر اپنے آپ کو ہلاکت میں ڈالنا۔ صبر کبھی عمل کا نام ہوتا ہے اور کبھی اپنے آپ کو عمل سے روک لینے کا، یہ دراصل حالات ہیں جو فیصلہ کرتے ہیں کہ کسی موقع پر کون سا صبر مطلوب ہے۔

صبر اور بے صبری میں یہ فرق ہے کہ بے صبر آدمی نتیجہ پر غور کیے بغیر حالات کے طوفان میں کود پڑتا ہے۔ اور صبر والا آدمی صورتِ حال پیش آجانے کے بعد پہلے سنجیدگی کے ساتھ غور کرتا ہے، لوگوں سے مشورہ کرتا ہے، اور سوچے سمجھے فیصلہ کے تحت وہ کارروائی کرتا ہے جو زیادہ سے زیادہ نتیجہ خیز ہو سکے۔ صبر حکمتِ عملی کا نام ہے اور بے صبری یہ ہے کہ آدمی وقتی کیفیت سے متاثر ہو کر ایسا اقدام کر بیٹھے جس کا حکمت اور دور اندیشی سے کوئی تعلق نہ ہو۔

صبر کی تعلیم

ایک مغربی مبصّر ولیم پیٹن (William Paton) نے لکھا ہے کہ اسلام کا ایک پھل انسانیت کے لیے یہ رہا ہے کہ اس نے لوگوں میں شدید اور مستقل صبر پیدا کیا۔ صبر کی یہ کیفیت ان میں اللہ کی کامل اطاعت سے پیدا ہوئی:

> One of the fruits of Islam has been that stubborn, durable patience which comes of the submission to the absolute will of Allah.

یہ تبصرہ نہایت درست ہے۔ اسلام میں صبر کی بے حد اہمیت ہے۔ قرآن کی بیشتر آیتیں، براہِ راست یا بالواسطہ طور پر، صبر ہی سے متعلق ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ صبر کی صفت ایک ایسی صفت ہے جس کے بغیر ایمان و اسلام کا تصور ہی نہیں کیا جا سکتا۔

موجودہ دنیا اس ڈھنگ پر بنی ہے کہ یہاں بار بار آدمی کو ناخوشگوار تجربات سے سابقہ پیش آتا ہے، گھر کے اندر بھی اور گھر کے باہر بھی۔ اب اگر آدمی ہر ایسے موقع پر لوگوں سے اُلجھ جائے تو وہ انسانی ترقی کی طرف زیادہ آگے نہیں بڑھ سکتا۔ اس لیے اسلام میں صبر کی

بہت زیادہ تاکید کی گئی ہے۔ تاکہ آدمی ناخوش گواریوں کو نظر انداز کرتے ہوئے مقصدِ اعلیٰ کی طرف اپنے سفر کو جاری رکھ سکے۔

قرآن میں بار بار صبر کی تاکید کی گئی ہے۔ مثلاً فرمایا کہ جو مصیبتیں تمھارے اُوپر پڑیں ان پر صبر کرو (31:17) صبر کرو، اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے (8:46)۔ فرمایا کہ گھاٹے سے محفوظ رہنے والے لوگ وہ ہیں جو ایک دوسرے کو حق کی نصیحت کریں اور ایک دوسرے کو صبر کی نصیحت کریں (103:3)۔

اسی طرح حدیث میں کثرت سے صبر کی اہمیت بتائی گئی ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اسْمَعُوا وَأَطِيعُوا وَاصْبِرُوا (مسند احمد، حدیث نمبر 10008)۔ یعنی، سنو اور مانو اور صبر کرو۔ آپ نے فرمایا: فَأَمَرَ اللّٰهُ عَزَّ وَجَلَّ نَبِيَّهُ بِالصَّبْرِ وَالْعَفْوِ (سنن ابی داؤد، حدیث نمبر 3000)۔ یعنی، اللہ نے صبر اور عفو و درگزر کا حکم دیا ہے۔ ایک صحابی کہتے ہیں: وَكَانَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَأَصْحَابُهُ يَعْفُونَ عَنِ الْمُشْرِكِينَ، وَأَهْلِ الْكِتَابِ، كَمَا أَمَرَهُمُ اللّٰهُ، وَيَصْبِرُونَ عَلَى الْأَذَى (صحیح البخاری، حدیث نمبر 4566)۔ یعنی، رسول اور اصحابِ رسول مشرکین اور اہل کتاب سے درگزر کرتے تھے، جیسا کہ اللہ نے ان کو حکم دیا تھا۔ اور ان کی ایذاؤں پر ہمیشہ صبر کرتے تھے۔ حقیقت یہ ہے کہ صبر اسلامی عمل کی بنیاد ہے۔ فتنوں اور آزمائشوں کی اس دنیا میں صبر کے بغیر کوئی آدمی اسلامی کردار پر قائم نہیں رہ سکتا۔

صبر

صبر کا مطلب ہے رکنا، اپنے آپ کو تھامنا۔ انسان کا مقصد یہ ہے کہ وہ اونچے آدرشوں کے مطابق دنیا میں زندگی گزارے۔ مگر دنیا میں قدم قدم پر ایسی ناپسندیدہ باتیں سامنے آتی ہیں جو آدمی کو بھڑکا دیں جو آدمی کے نشانہ کو اصل مقصد سے ہٹا کر دوسری طرف کر دیں۔

ایسی حالت میں آدمی اگر ایسا کرے کہ وہ ہر بھڑکنے والی بات پر بھڑک اٹھے، وہ ہر ناموافق چیز سے الجھ جائے تو وہ اپنے مقصد کی طرف اپنا سفر جاری رکھنے میں کامیاب نہیں ہوگا۔ وہ غیر متعلق چیزوں میں الجھ کر رہ جائے گا۔

اس مسئلہ کا واحد حل صبر ہے۔ صبر کا مطلب یہ ہے کہ آدمی کو جب کسی کڑوے تجربہ سے سابقہ پیش آئے تو وہ بھڑک اٹھنے کے بجائے برداشت کا طریقہ اختیار کرے۔ وہ جھٹکے کو سہتے ہوئے سچائی کے راستہ پر آگے بڑھ جائے۔

یہ صبر ایک طرف باہر کی دنیا میں پیش آنے والے مسائل کا عملی حل ہے۔ دوسری طرف وہ آدمی کے لیے اپنی شخصیت کی تعمیر کا ذریعہ ہے۔ صبر نہ کرنے والے کی شخصیت منفی رجحانات کے درمیان پرورش پاتی ہے، اور جو آدمی صبر کرلے اس کی شخصیت مثبت رجحانات کے درمیان پرورش پانے لگتی ہے۔

صبر پسپائی نہیں ہے۔ صبر کا مطلب جوش والے راستہ کو چھوڑ کر ہوش والے راستہ کی طرف اقدام کرنا ہے۔ صبر یہ ہے کہ آدمی نازک مواقع پر اپنے جذبات کو تھامے۔ وہ اپنی عقل کو استعمال کرکے زیادہ مفید سمت میں اپنے عمل کا میدان تلاش کرلے۔

موجودہ دنیا اس ڈھنگ پر بنی ہے کہ یہاں ہر شخص کو لازماً ناخوش گوار باتوں سے سابقہ پیش آتا ہے۔ ناقابل مشاہدہ مناظر اس کے سامنے آتے ہیں۔ اس کو ناقابل سماعت آوازیں سننی پڑتی ہیں۔ ایسی حالت میں الجھاؤ کا طریقہ اختیار کرنے کا نام بے صبری ہے اور اعراض کا طریقہ اختیار کرنے کا نام صبر۔ موجودہ دنیا میں کامیابی صرف ان لوگوں کے لیے مقدر ہے جو ناخوش گوار مواقع پر صبر کا طریقہ اختیار کریں۔

صبر خدا کے لیے

قرآن میں بار بار صبر کی تلقین کی گئی ہے۔ ایک جگہ پیغمبر کو خطاب کرتے ہوئے ارشاد ہوا ہے کہ: وَاصْبِرْ وَمَا صَبْرُكَ إِلَّا بِاللَّهِ (16:127)۔ یعنی، تم صبر کرو اور تمہارا صبر صرف خدا کے لیے ہے۔ تم جو صبر کررہے ہو وہ بظاہر انسان کے مقابلہ میں صبر کرنا ہے۔ مگر اپنی حقیقت کے اعتبار سے تمہارا صبر صرف اللہ کے لیے ہے۔

خدا کے لیے صبر کرنے کا مطلب اس دینی اور دعوتی مقصد کے لیے صبر کرنا ہے جس کا حکم اللہ نے دیا ہے۔ جب بھی حق کی دعوت اٹھتی ہے تو اس میں ایک طرف داعی ہوتا ہے اور دوسری طرف مدعو۔ دعوت کے نتیجہ میں مدعو کی طرف سے منفی ردّعمل پیش آتا ہے۔ اس بنا پر داعی اور مدعو کے درمیان طرح طرح کے مسائل ابھر آتے ہیں۔ ایسے موقع پر داعی اگر جوابی ردعمل کا طریقہ اختیار کرے تو داعی اور مدعو کے درمیان تعلقات بگڑ جائیں گے اور دعوتی عمل کو جاری رکھنے کے لیے ضروری معتدل حالت قائم نہیں رہے گی۔

خدا کے لیے صبر کا مطلب یہ ہے کہ یک طرفہ برداشت کے ذریعہ یہ کوشش کی جائے کہ معتدل حالات قائم رہیں۔ تا کہ خدا کی یاد اور خدا کی عبادت کا ماحول برقرار رہے، تا کہ دعوت کا عمل بلا روک ٹوک جاری رہے، تا کہ مدعو کے اندر ضد اور نفرت کی نفسیات پیدا نہ ہو سکے، تا کہ تعلیم اور تعمیر کا کام کسی رکاوٹ کے بغیر جاری رہے۔

صبر فطرت کا ایک قانون ہے۔ ہر منصوبہ بند تعمیری عمل کے لیے صبر ضروری ہے۔ صبر کوئی منفعل روش نہیں، صبر خدائی تعلیمات کا مرکزی اصول ہے۔ خدا کا ایک سچا بندہ اس کا تحمل نہیں کرسکتا کہ وہ صبر کی روش کو چھوڑ دے۔ کیوں کہ صبر کی روش سے ہٹنے کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اس سے تواضع کی صفت چھن جاتی ہے۔ وہ نفرت اور انتقام کی نفسیات میں جینے لگتا

ہے۔ وہ انسانی مجموعہ کو اپنے اور غیر میں بانٹ دیتا ہے۔ اس کے اندر سے انسانی ہمدردی کا وہ جذبہ نکل جاتا ہے جو دعوتی عمل کے لیے ضروری ہے۔ وہ ماحول ختم ہوجاتا ہے جس میں شکر خداوندی کے جذبات پرورش پائیں۔

صبر دین کا خلاصہ

صبر دین کا خلاصہ ہے۔ صبر ہر قسم کی نیکیوں کی بنیاد ہے۔ صبر دنیا میں کامیابی کا زینہ ہے اور آخرت میں وہ جنت کی کنجی ہے۔ قرآن میں صبر کے بارے میں ایک ایسی آیت ہے جو کسی بھی دوسرے عمل کے بارے میں نہیں۔ فرمایا کہ بے شک صبر کرنے والوں کو ان کا اجر بے حساب دیا جائے گا: إِنَّمَا يُوَفَّى الصَّابِرُونَ أَجْرَهُمْ بِغَيْرِ حِسَابٍ (39:10)۔

ایک روایت میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: وَمَا أُعْطِيَ أَحَدٌ عَطَاءً خَيْرًا وَأَوْسَعَ مِنَ الصَّبْرِ (صحیح البخاری، حدیث نمبر 1469؛ صحیح مسلم، حدیث نمبر 1053)۔ یعنی، صبر سے بہتر اور صبر سے بڑا کوئی عطیہ انسان کو نہیں دیا گیا۔ ابن حجر العسقلانی نے اس حدیث کی تشریح کرتے ہوئے لکھا ہے کہ: الصَّبْرُ جَامع لمكارم الْأَخْلَاق (فتح الباری لابن حجر، جلد 11، صفحہ 305)۔ یعنی، صبر تمام اعلیٰ اخلاقیات کا جامع ہے۔

احادیث وآثار میں کثرت سے صبر کی اہمیت بتائی گئی ہے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کا قول ہے کہ صبر کی حیثیت ایمان میں وہی ہے جو حیثیت انسانی جسم میں سر کی ہے: الصَّبْرُ مِنَ الْإِيمَانِ بِمَنْزِلَةِ الرَّأْسِ مِنَ الْجَسَدِ (الزہد لوکیع بن الجراح، حدیث نمبر 199)۔ ابن جوزی نے لکھا ہے کہ: عَاقِبَةِ الصَّبْرِ الْجَمِيل جَمِيلَة (صید الخاطر، جلد 1، صفحہ 402)۔ یعنی، صبر جمیل کا انجام بھی جمیل ہے۔

ابن منظور نے لکھا ہے کہ: أَصل الصَّبْر الحَبْس، والصَّبْرُ نقِيض الجَزَع (لسان العرب،

جلد 4، صفحہ 438)۔ یعنی، صبر کی اصل رُکنا ہے، صبر بے چین اور بے برداشت ہونے کا الٹا ہے۔ راغب الاصفہانی نے لکھا ہے کہ: الصبر الإمساك والصبر حبس النفس على ما يقتضيه العقل والشرع (المفردات الراغب الاصفہانی، جلد 1، صفحہ 273)۔ یعنی، صبر کی حقیقت امساک (پوری قوت سے کنٹرول کرنا) ہے۔ صبر یہ ہے کہ آدمی عقل اور شریعت کے تقاضے کے مطابق اپنے آپ کو روکے۔

صبر کی اتنی زیادہ اہمیت کیوں ہے۔ اس کی وجہ موجودہ دنیا کی صورت حال ہے۔ یہ دنیا دار الامتحان ہے۔ اسی امتحان یا آزمائش کی مصلحت کی بنا پر یہاں ہر شخص کو پوری آزادی دی گئی ہے۔ یہ انسانی آزادی خود خدا کے منصوبہ کے تحت ہے، اس لیے کوئی بھی اس کو بدلنے پر قادر نہیں۔

صبر بے عملی نہیں

قرآن میں صبر کی غیر معمولی عظمت بیان ہوئی ہے۔ مثلاً صبر کو اولوالعزم پیغمبروں کا طریقہ بتایا گیا ہے (46:35)۔ صبر پر اعلیٰ ترین کامیابیوں کی بشارت ہے (7:137)۔ صبر قیادتِ عالم کا زینہ ہے (32:24)۔ صبر حفاظت کا یقینی ذریعہ ہے (12:90)۔ حتیٰ کہ صبر وہ چیز ہے جو آدمی کو بے حساب اجر کا مستحق بناتا ہے (39:10)۔

حدیث میں آیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جب تم کسی معاملہ میں دیکھو کہ تم اس کو بدلنے کی استطاعت نہیں رکھتے ہو تو صبر کرو یہاں تک کہ اللہ خود اس کو بدل دے: إِذَا رَأَيْتُمْ أَمْرًا لَا تَسْتَطِيعُونَ تَغْيِيرَهُ، فَاصْبِرُوا حَتَّى يَكُونَ اللَّهُ هُوَ الَّذِي يُغَيِّرُهُ (المعجم الکبیر للطبرانی، حدیث نمبر 7685)۔ عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ ہم نے اپنی زندگی کا خیر صبر ہی کے ذریعہ حاصل کیا ہے: وَجَدْنَا خَيْرَ عَيْشِنَا بِالصَّبْرِ (الزھد لوکیع بن الجراح، جلد 1، صفحہ 449)۔ ابن حجر العسقلانی نے صبر کی حدیث کی تشریح کرتے ہوئے

لکھا ہے کہ صبر تمام اچھے اخلاق کا جامع ہے: فالصبر جَامع لمکارم الْأَخلَاق (فتح الباری، جلد 11، صفحہ 305)۔

صبر نہ بزدلی ہے اور نہ وہ بے عملی ہے۔ صبر ایک مثبت قدر ہے۔ صبر بلند ترین ذہنی حالت ہے۔ صبر سب سے بڑا عمل ہے۔ صبر انسانیت کا تکمیلی درجہ ہے۔

آپ سڑک کے کنارے کھڑے ہوئے ہیں، کچھ لوگ آتے ہیں اور آپ کے خلاف اشتعال انگیز نعرہ لگا دیتے ہیں۔ اب آپ کے لیے ردعمل کے دو مختلف طریقے ہیں۔ ایک یہ کہ آپ نعرہ کو سن کر بھڑک اٹھیں۔ آنے والوں کے ساتھ جھگڑنے لگیں۔ یہ بے صبری کا طریقہ ہے۔ دوسرا طریقہ یہ ہے کہ اشتعال انگیز نعرہ کو سنیں، مگر آپ اس پر مشتعل نہ ہوں، آپ کا ذہن بدستور اعتدال کی حالت پر باقی رہے۔ آپ اپنے جذبات کو تھام کر یہ سوچیں کہ ایسے موقع پر آپ کو کیا کرنا چاہیے۔ یہ دوسرا طریقہ صبر کا طریقہ ہے۔

بے صبری بھی عمل ہے، اور صبر بھی عمل ہے۔ دونوں میں سے کوئی بھی بے عملی نہیں۔ فرق صرف یہ ہے کہ بے صبر آدمی فوری جذبات کے تحت اقدام کر بیٹھتا ہے، خواہ اس کا نتیجہ کچھ بھی نکلے۔ اس کے برعکس، صبر والا آدمی سوچ سمجھ کر اور مشورہ کر کے اپنے اقدام کا فیصلہ کرتا ہے — بے صبری کی روش تباہی کی طرف لے جاتی ہے اور صبر کی روش کامیابی کی طرف۔

قرآنی طریقہ

موجودہ دنیا میں آدمی امتحان کی حالت میں ہے۔ اور جب وہ امتحان کی حالت میں ہے تو اس کو آزادی بھی دی گئی ہے۔ اب کچھ لوگ آزادی کا صحیح استعمال کرتے ہیں اور کچھ لوگ آزادی کا غلط استعمال کرتے ہیں۔ آزادی کے غلط استعمال ہی کا یہ نتیجہ ہے کہ دنیا میں فساد ہوتا ہے۔ باہمی مقابلے پیش آتے ہیں۔ ایک دوسرے کے خلاف عداوتیں جاگتی ہیں۔

اجتماعی زندگی میں تلخی اور شکایت کے لمحات پیش آتے ہیں۔ یہ سب عین قانون قدرت کے تحت ہوتا ہے۔ اور جو چیز خود قدرت کے منصوبہ کے تحت پیش آئے اس کو ختم کرنا کسی کے لیے ممکن نہیں۔

اب اس کا حل کیا ہے۔ قرآن میں واضح طور پر اس کا حل بتایا گیا ہے۔ اور وہ یہ کہ لوگ ردعمل کا طریقہ نہ اختیار کریں، بلکہ اپنے آپ کو سنبھالتے ہوئے حکمت اور تدبیر کے ساتھ معاملہ کریں:

جہالت کے مقابلہ میں اعراض کرنا (7:199)۔
عمل سوء کے مقابلہ میں عمل حسن (41:34)۔
ایذارسانی کے مقابلہ میں صبر (14:12)۔
حمیت جاہلیہ کے مقابلہ میں سکینہ (48:26)۔

قرآن کی ان ہدایات سے معلوم ہوتا ہے کہ جب انسان اپنی آزادی کا غلط استعمال کر کے دوسرے شخص کو اذیت پہنچائے تو دوسرے شخص کو جوابی طریقہ نہیں اختیار کرنا ہے، بلکہ برداشت کا طریقہ اختیار کرنا ہے۔ اس کو اشتعال انگیزی کے باوجود مشتعل نہیں ہونا ہے۔ اس کو نفرت کے جواب میں محبت کا تحفہ پیش کرنا ہے۔ اگر وہ ایسا کرے تو قدرت کا قانون حرکت میں آجائے گا اور وہ زیادہ بہتر طور پر اس کے مسئلہ کو حل کردے گا۔

صبر واعراض انسان کا معاملہ نہیں، وہ حقیقتاً خدا کا معاملہ ہے۔ یہ خود خدا کی مرضی ہے کہ لوگ صبر کریں۔ کیونکہ اس کے بغیر خدا کا منصوبۂ امتحان مکمل نہیں ہوسکتا۔ یہی وجہ ہے کہ اس کا ثواب بہت ہے۔ بلکہ اس کا ثواب تمام دوسرے اعمال سے زیادہ ہے۔ قرآن میں خصوصی طور پر وعدہ کیا گیا ہے کہ جو لوگ اللہ کے لیے صبر کریں، ان کو ان کا اجر بے حساب مقدار میں دیا جائے گا۔

حکمت اور صبر

موجودہ دنیا میں کامیابی کی منزل تک پہنچنے کے لیے حکمت اور صبر لازمی طور پر ضروری ہیں۔حکمت اور صبر کے بغیر نہ دین کا کوئی مقصد حاصل کیا جا سکتا اور نہ دنیا کا۔

حکمت کی جڑ یہ ہے کہ آدمی ایک چیز اور دوسری چیز کے فرق کو جانے۔رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مکہ میں ہر قسم کے ظلم کے باوجود ظالموں سے نہیں لڑے۔مگر مدینہ میں حسب ضرورت آپ نے ظالموں کا مقابلہ کیا۔غزوۂ حمراء الاسد کا سفر بآواز بلند کیا گیا۔مگر فتحِ مکہ کے سفر میں آپ نے بلند آوازی سے منع فرمادیا۔معاہدۂ حدیبیہ کے وقت آپ نے مکہ والوں کی یک طرفہ شرائط پر صلح کر لی۔مگر بنوبکر اور بنوخزاعہ کا واقعہ پیش آنے کے بعد آپ نے مکہ کے سردار (ابوسفیان) کی تجدید صلح کی پیش کش کو قبول نہیں فرمایا، وغیرہ۔

حقیقت یہ ہے کہ اس دنیا میں کبھی بولنا ضروری ہوتا ہے اور کبھی یہ ضروری ہوتا ہے کہ آدمی اپنے منہ میں زبان رکھتے ہوئے چپ ہو جائے۔کبھی حالات اقدام کرنے کا تقاضا کرتے ہیں اور کبھی اقدام نہ کرنے کا۔کبھی آگے بڑھنا افضل ہوتا ہے اور کبھی یہ افضل ہوتا ہے کہ آدمی پیچھے کی سیٹ پر بیٹھنے کے لیے اپنے آپ کو راضی کر لے۔اسی فرق کو جاننے کا نام حکمت ہے۔

صبر کی حقیقت یہ ہے کہ آدمی ردعمل سے رکے اور غیر متاثر ذہن کے تحت سوچ سمجھ کر اپنے عمل کی منصوبہ بندی کرے۔آپ سڑک پر اپنی گاڑی دوڑا رہے ہیں اور سامنے اچانک دوسری گاڑی آ گئی۔اب گاڑی کو روک کر اپنے لیے راستہ نکالنے کا نام صبر ہے، اور رو کے بغیر گاڑی دوڑانے کا نام بے صبری۔

صبر کا طریقہ موجودہ دنیا میں کوئی حقیقی کامیابی حاصل کرنے کے لیے انتہائی حد تک ضروری ہے۔جو ڈرائیور بے صبری کے ساتھ سڑک پر گاڑی چلائے، وہ خود بھی تباہ ہوگا اور اپنی گاڑی کو

بھی تباہ کرے گا۔ اسی طرح جو لوگ صبر کی شرط کو پورا کیے بغیر زندگی میں کامیاب ہونا چاہیں، وہ صرف بربادی کی تاریخ بنائیں گے، ترقی اور کامیابی کی تاریخ بنانا ان کے لیے مقدر نہیں۔

صبر منسوخ نہیں

ایک فلسطینی نوجوان سے ملاقات ہوئی۔ گفتگو کے دوران میں نے دین میں صبر کی اہمیت کا ذکر کیا اور صبر سے متعلق قرآن کی آیتیں ان کے سامنے پیش کیں۔ انھوں نے فوراً کہا: صبر کی آیتیں تو مکی دور میں اتری تھیں۔ ہجرت کے بعد صبر کا حکم منسوخ کر دیا گیا اور جہاد و قتال کی آیتیں اتاری گئیں۔ اب ہم دورِ صبر میں نہیں ہیں، اب ہم دورِ جہاد میں ہیں۔ اب ہمارے تمام معاملات جہاد کے ذریعہ درست ہوں گے اور یہی کام ہمیں کرنا ہے۔

یہ ایک بہت بڑا مغالطہ ہے، جس میں بے شمار لوگ مبتلا ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ صبر ایک ابدی حکم ہے۔ اس کا تعلق ہر دور اور ہر زمانہ سے ہے۔ صبر تمام دینی اعمال کا خلاصہ ہے۔ آدمی کوئی دینی عمل صحیح طور پر اسی وقت کرسکتا ہے جب کہ اس کے اندر صبر کا مادہ ہو۔ جس آدمی سے صبر رخصت ہو جائے، وہ کوئی بھی دینی کام صحیح ڈھنگ سے انجام نہیں دے سکتا، خواہ وہ کلمۂ توحید پر استقامت کا معاملہ ہو یا میدان مقابلہ میں شجاعت کا معاملہ، یا اور کوئی معاملہ۔

یہی وجہ ہے کہ قرآن و حدیث میں بار بار صبر کی تاکید کی گئی ہے، اور علی الاطلاق طور پر اس کی اہمیت پر زور دیا گیا ہے۔ قرآن میں صبر کا مادہ ایک سو سے زیادہ بار استعمال کیا گیا ہے۔ سورہ البقرہ ایک مدنی سورت ہے، اس میں کہا گیا ہے کہ تم لوگ صبر اور نماز سے مدد لو، اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے: اسْتَعِينُوا بِالصَّبْرِ وَالصَّلَاةِ إِنَّ اللهَ مَعَ الصَّابِرِينَ (2:153)۔

حدیث میں صبر کی بہت زیادہ فضیلت آئی ہے اور مختلف پہلوؤں سے اس کی اہمیت بتائی گئی ہے۔ ایک روایت کے مطابق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ نے صبر سے زیادہ اچھا اور بڑا عطیہ کسی شخص کو نہیں دیا: وَمَا أُعْطِيَ أَحَدٌ مِنْ عَطَاءٍ أَوْسَعَ مِنَ الصَّبْرِ

(سنن ابی داؤد، حدیث نمبر 1644)۔ ایک اور حدیث میں ہے کہ صبر مومن کا بھروسہ ہے: الصَّبْرُ مِعْوَلُ الْمُسْلِمِ (الترغیب والترغیب، حدیث نمبر 6)۔

صبر کے لغوی معنیٰ رکنے کے ہیں۔ امام راغب نے صبر کی حقیقت ان لفظوں میں بیان کی ہے: الصَّبْرُ حَبْسُ النَّفْسِ عَلَى مَا يَقْتَضِيهِ الْعَقْلُ (المفردات للراغب الاصفہانی، صفحہ 474)۔ یعنی، صبر اس چیز سے نفس کو روکنے کا نام ہے جس کا عقل تقاضا کرے۔ عربی میں کہا جاتا ہے: صَبَرْتُ نَفْسِي عَلَى ذَلِكَ الْأَمْرِ، أَيْ حَبَسْتُهَا (مقاییس اللغۃ، جلد 3، صفحہ 329)۔ یعنی، میں نے اپنے نفس کو فلاں چیز سے روک دیا۔

موجودہ دنیا ایک ایسی دنیا ہے جہاں موافق پہلوؤں کے ساتھ ناموافق پہلو بھی موجود ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ یہاں کسی کام کو کامیابی کے ساتھ انجام دینے کے لیے صبر لازمی طور پر ضروری ہے۔ یہاں اپنی خواہش کو دبا کر اپنی عقل کو رہنما بنانا پڑتا ہے۔ یہاں ایک چیز کو لینے کے لیے دوسری چیز کو چھوڑنا پڑتا ہے۔ یہاں آج پر توجہ دینے کے لیے کل کو مستقبل کے خانہ میں ڈالنا پڑتا ہے۔ یہاں خلاف مزاج باتوں کو برداشت کرتے ہوئے اپنا سفر جاری رکھنا پڑتا ہے۔ یہاں ردعمل کی نفسیات سے آزاد رہ کر مثبت سوچ کے تحت اپنا منصوبہ بنانا پڑتا ہے۔ ان تمام چیزوں کا تعلق صبر سے ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس دنیا میں صبر کے بغیر کبھی کوئی کامیابی حاصل نہیں ہوتی۔

دنیوی کاموں کی طرح، دینی کام کے لیے بھی صبر لازمی طور پر ضروری ہے۔ جس زمین پر اور جس انسانی ماحول میں ایک دنیا دار کام کرتا ہے، اسی زمین پر اور اسی انسانی ماحول میں دیندار بھی اپنا عمل کرتا ہے۔ اس لیے یہاں دینی مقصد کو پانے کے لیے بھی صبر کا طریقہ اختیار کرنا ضروری ہے۔ صبر کے بغیر کوئی بھی دینی کام نتیجہ خیز طور پر انجام نہیں دیا جا سکتا۔

نتیجہ خیز عمل

ایک تعلیم یافتہ مسلمان نے سوال کیا کہ ہندستانی مسلمانوں کے مسائل کا حل کیا ہے۔ میں نے کہا کہ صبر۔ انھوں نے کہا کہ صبر کا کیا مطلب ہے۔ میں نے کہا کہ صبر کا مطلب ہے — مسائل کو نظر انداز کر کے مواقع کو استعمال کرنا۔

انھوں نے کہا کہ میں مانتا ہوں کہ صبر کا حکم قرآن میں ہے۔ مگر صبر کوئی مطلق چیز نہیں۔ جب کھلم کھلا اشتعال انگیزی کی جائے۔ جب ہم صاف طور پر دیکھیں کہ مسلمانوں کے اوپر زیادتی کی جا رہی ہے تو اس وقت صبر کیسے کیا جائے گا۔ ایسی حالت میں صبر کرنا تو بزدلی اور شکست خوردگی کے ہم معنی ہوگا۔

میں نے کہا کہ آپ نے صبر کا معیار غلط قائم کیا ہے۔ صبر کے اختیار یا ترک کا معیار یہ نہیں ہے کہ صبر کرنے میں آپ کو بزدلی یا شکست خوردگی نظر نہ آئے تو آپ صبر کریں اور جب صبر کا طریقہ آپ کو بزدلی اور شکست خوردگی دکھائی دے تو آپ صبر کو چھوڑ دیں۔ یہ جذباتیت ہے، جب کہ معیار ہمیشہ اصولی بنیاد پر طے کیا جاتا ہے۔ صبر کا حقیقی معیار صرف ایک ہے، اور وہ رزلٹ (نتیجہ) ہے۔ صبر کا اصول صرف اس وقت توڑا جا سکتا ہے جب کہ اس میں کوئی مثبت نتیجہ ملنے والا نہ ہو، بصورت دیگر، صبر کی روش پر قائم رہنا ضروری ہوگا۔ خواہ بظاہر وہ بزدلی اور شکست خوردگی کیوں نہ دکھائی دیتا ہو۔

قدیم مکہ میں مسلمانوں کے خلاف ہر طرح کی اشتعال انگیزی جاری تھی۔ ہر قسم کا ظلم ان پر کیا جا رہا تھا۔ حضرت عمر نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا کہ ان ظالموں کے خلاف جہاد کیا جائے۔ آپ نے فرمایا کہ اے عمر، ابھی ہم تھوڑے ہیں (يَا عُمَرُ، إِنَّا قَلِيلٌ)۔ البدایۃ و النہایۃ لابن کثیر، جلد 3، صفحہ 230۔

اس سے معلوم ہوا کہ مسلمان جب قلیل ہوں اور فریقِ مخالف کثیر ہو تو ظلم کے باوجود ٹکراؤ

کا طریقہ اختیار نہیں کیا جائے گا۔ کیوں کہ ایسے اقدام کا کوئی فائدہ نہیں۔ اسلام میں صرف اسی اقدام کی اجازت ہے جو نتیجہ خیز ہو۔ جو اقدام بے نتیجہ ہو کر رہ جائے یا جس اقدام کا الٹا انجام نکلنے والا ہو، وہ سنتِ رسول کے خلاف ہے۔ اور جو عمل سنتِ رسول کے خلاف ہو وہ بلاشبہ اللہ کے یہاں غیر مقبول قرار پائے گا۔ نتیجہ کو سامنے رکھ کر اپنا رویہ مقرر کرنا اسلام ہے، اور نتیجہ سے بے پروا ہو کر جوش وجذبہ کے تحت اقدام کرنا نادانی۔

اسٹیٹس کو اِزم

ایک حدیث رسول ان الفاظ میں آئی ہے: عَنْ أُسَيْدِ بْنِ حُضَيْرٍ: أَنَّ رَجُلًا مِنَ الأَنْصَارِ قَالَ: يَا رَسُولَ اللّٰهِ، أَلاَ تَسْتَعْمِلُنِي كَمَا اسْتَعْمَلْتَ فُلاَنًا؟ قَالَ: سَتَلْقَوْنَ بَعْدِي أَثَرَةً، فَاصْبِرُوا حَتَّى تَلْقَوْنِي عَلَى الحَوْضِ (صحیح البخاری، حدیث نمبر 3792)۔ یعنی، اسید بن حُضَیر روایت کرتے ہیں کہ (مدینہ میں) انصار کا ایک آدمی نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا، اور اس نے کہا: آپ نے مجھے عامل نہیں بنایا، جیسا کہ فلاں کو عامل بنایا۔ آپ نے کہا: تم میرے بعد ترجیح دیکھو گے، تو تم لوگ صبر کرو، یہاں تک کہ مجھ سے حوض پر ملاقات کرو۔

صبر کا لفظ یہاں جامع معنی میں ہے۔ یعنی اسٹیٹس کو (status quo) کو مان لینا۔ جو ہے اس کو مان لینا، اور اس کا سبب نہ ڈھونڈنا۔ یہی کامیابی کا واحد طریقہ ہے۔ اختلاف کے وقت اگر سبب پوچھا جائے تو وہ صرف اختلاف کو بڑھائے گا، وہ اختلاف کو ختم کرنے والا نہیں۔ ایسے حالات میں صبر کا مطلب ہے سبب کو نہ ڈھونڈا جائے۔

ترجیح کا مطلب ہے ایک کے مقابلے میں دوسرے کو فیور (favour) دینا۔ بظاہر یہ ایک مسئلہ ہے۔ مگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مسئلہ کو حل کرنے کے بجائے صبر کرنے کی تلقین کی۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ زندگی کے مسائل اتنے ہوتے ہیں کہ وہ کبھی حل نہیں

ہوتے، وہ ہمیشہ باقی رہتے ہیں۔ اگر آدمی ان سے ٹکرائے یا ان کو اپنے حق میں کرنے کی کوشش کرے تو عملاً ایسا کبھی ہوگا نہیں۔ ایسی حالت میں قابلِ عمل بات یہ ہے کہ آدمی کے لیے جو ممکن ہے، وہ اس پر راضی ہوجائے۔ وہ اسٹیٹس کو (status quo) کو مان کر اپنی زندگی کا سفر جاری رکھے۔

انسان کے لیے ٹکراؤ کرنے سے زیادہ مفید بات یہ ہے کہ وہ اسٹیٹس کو کو مان کر ممکن پر راضی ہوجائے۔ تاکہ اس کو اپنی منصوبہ بندی کا موقع مل سکے۔ کبھی اقدام نہ کرنا بھی عمل کی صورت ہوتی ہے۔ کیوں کہ ایسی روش آدمی کو مزید نقصان سے بچاتی ہے۔

صبر کیوں

قرآن وحدیث میں صبر (patience) پر بہت زیادہ زور دیا گیا ہے۔ یہاں تک کہ قرآن میں صبر کو سب سے زیادہ قابل انعام (most rewardable) عمل بتایا گیا ہے (10:39)۔ صبر کیا ہے۔ صبر یہ ہے کہ آدمی اجتماعی زندگی میں ردعمل (reaction) سے بچے، اور ہر حال میں مثبت رویہ (positive behaviour) پر قائم رہے۔ اجتماعی زندگی میں اس کا رسپانس ہمیشہ مثبت رسپانس ہو، نہ کہ جوابی انداز کا رسپانس۔

صبر کی اتنی زیادہ اہمیت کیوں۔ اس کا سبب یہ ہے کہ انسانی سماج میں صبر واحد قابل عمل فارمولا (only workable formula) ہے۔ یعنی انسان کے خالق نے اس کو کامل آزادی کے ساتھ پیدا کیا ہے۔ انسان آزاد ہے کہ وہ اپنی آزادی کو درست طور پر استعمال کرے یا غلط طور پر۔ وہ اپنے عمل کی پلاننگ دوسروں کے ساتھ رعایت کرتے ہوئے کرے یا دوسروں کی رعایت کیے بغیر۔ ایسی حالت میں اجتماعی زندگی میں ضروری ہے کہ آپ دوسروں کے ساتھ ایڈجسٹ کرتے ہوئے اپنے عمل کا منصوبہ بنائیں۔ ایسا ہی

منصوبہ اس دنیا میں قابل عمل منصوبہ ہے۔ اس کے برعکس، جس منصوبہ میں دوسروں کی رعایت شامل نہ ہو، وہ کبھی اس دنیا میں تکمیل تک پہنچنے والا نہیں۔

صبر بظاہر دوسروں کے لیے اختیار کیا جاتا ہے۔ لیکن اس کا فائدہ خود صبر کرنے والے کو ملتا ہے۔ اس اعتبار سے دیکھیے تو صبر واحد نتیجہ خیز عمل ہے۔ اس کے برعکس، بے صبری (impatience) مثبت نتیجہ پیدا کرنے والا عمل نہیں۔ صبر کو دوسرے الفاظ میں نتیجہ خیز منصوبہ بندی (result oriented planning) کہا جا سکتا ہے۔ صبر کسی کے لیے دانش مندانہ عمل کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس کے برعکس، بے صبری ایک بے دانشی کا عمل ہے۔ حیوان کے لیے بے صبری کا جواز ہوسکتا ہے۔ کیوں کہ حیوان کے پاس عقل نہیں۔ مگر انسان کے لیے بے صبری کا کوئی جواز نہیں۔ کیوں کہ انسان کو عقل دی گئی ہے، جس کے ذریعہ وہ صبر کی اہمیت کو پیشگی طور پر سمجھ سکتا ہے۔

صبر کی اہمیت

قرآن و حدیث میں صبر کی بہت زیادہ اہمیت بتائی گئی ہے۔ یہاں تک کہ قرآن کی ایک آیت میں بتایا گیا ہے کہ صبر کرنے والوں کو بے حساب اجر دیا جائے گا: إِنَّمَا يُوَفَّى الصَّابِرُونَ أَجْرَهُمْ بِغَيْرِ حِسَابٍ (39:10)۔ صبر کی یہ اہمیت کیوں ہے۔ صبر کا سب سے بڑا فائدہ یہ ہے کہ صبر آدمی کو حقیقت پسند بنانے والا ہے۔ صبر آدمی کو منفی سوچ سے بچاتی ہے، اور مثبت سوچ والا انسان بناتی ہے۔ مثبت سوچ والا آدمی ہمیشہ کامیاب ہوتا ہے، اور منفی سوچ والا آدمی ہمیشہ ناکامیاب۔ کیوں کہ منفی سوچ والا آدمی قدرت کے قانون کی پیروی نہیں کرتا۔ اس کے برعکس، مثبت سوچ والا انسان ہمیشہ فطرت کے قانون کی پیروی کرکے ہمیشہ اپنے مقصد کو حاصل کرنے کی کوشش کرتا ہے۔

جس آدمی کے اندر بے صبری کا مادہ ہے، وہ اپنے جذبات پر کنٹرول نہیں کرے گا۔ اس کا مزاج یہ ہوگا کہ جب وہ چاہے، اسی وقت اس کی مطلوب چیز مل جائے۔ اس کے برعکس، صبر والا آدمی اپنے کو دوسرے تقاضوں کے مطابق بنانے کی کوشش کرے گا۔ وہ چاہے گا کہ اس وقت تک انتظار کرے جب کہ اصول کے مطابق، اس کا مقرر وقت آجائے۔ وہ جانے گا کہ وہ اپنی بنائی ہوئی دنیا میں نہیں ہے۔ اس کا بنانے والا اللہ رب العالمین ہے۔ اس طرح وہ اپنی خواہش کو کنٹرول کرے گا، اور وہ اللہ کے مقرر قانون کی پیروی کرے گا۔ کیوں کہ وہ جانے گا کہ اللہ کے مقرر قانون کی تعمیل کیے بغیر پورا کام بننے والا نہیں۔

صبر کا اصول فریقِ اوّل کو اِس سے بچاتا ہے کہ اس کا ذہن فریقِ ثانی کے بارے میں غیر معتدل ہوجائے۔ پُر امن طریقِ کار (peaceful activism) معتدل ذہن کا اظہار ہے۔ غیر معتدل یا منفی ذہن کبھی پُر امن طریقِ کار کو کامیابی کے ساتھ جاری نہیں رکھ سکتا۔ صبر کا اصول دراصل اِسی اعتدال یا مثبت مزاج کی برقراری کی ایک یقینی گارنٹی ہے۔ جو لوگ ناموافق حالات سامنے آنے کے باوجود نہ بدلیں، اور قانونِ فطرت کے ساتھ اپنے کو باندھے رہیں، وہی وہ لوگ ہیں جو سنت الٰہی کے مطابق کامیابی کی منزل تک پہنچیں گے۔

حکمتِ صبر

ایمانی زندگی بااصول زندگی کا نام ہے۔ مومن انسان ایک بامقصد انسان ہوتا ہے۔ ایسا آدمی جذباتی ردعمل کے تحت کوئی اقدام نہیں کرسکتا۔ اس کے سامنے جب کوئی صورت حال آئے گی تو وہ رک کر سوچے گا کہ اس معاملے میں کون سا ردّ عمل میرے اصول اور مقصد کے مطابق ہے اور کون سا ردعمل میرے اصول اور مقصد کے خلاف ہے۔ دوسرے لفظوں میں یہ کہہ سکتے ہیں کہ پیش آمدہ معاملات میں عاجلانہ جواب (hasty response) کا نام بے صبری ہے، اور سوچے سمجھے جواب (considered response) کا نام صبر۔

اس صبر کا تعلق زندگی کے تمام معاملات سے ہے۔ آپ پر ایک خواہش کا غلبہ ہوتا ہے، مگر آپ ایسا نہیں کرتے کہ خواہش پیدا ہوتے ہی اس کو کر گزریں بلکہ آپ اپنے کو تھام کر سوچتے ہیں اور وہی کرتے ہیں جو شریعت خداوندی کا تقاضا ہے تو یہ صبر ہے۔ کسی شخص سے آپ کو تکلیف پہنچتی ہے۔ آپ کے اندر انتقام کا جذبہ بھڑک اٹھتا ہے۔ مگر آپ اپنے کو روکتے ہیں اور پھر وہ کرتے ہیں جو ایمان کا تقاضا ہے، تو یہ صبر ہے۔ آپ اسلامی دعوت لے کر اٹھتے ہیں، آپ کے راستے میں رکاوٹیں پیش آتی ہیں، اب آپ اندھا دھند اقدام نہیں کرتے، بلکہ سارے پہلوؤں کو شریعت کی روشنی میں جانچتے ہیں اور اس کے بعد وہی کرتے ہیں جو شریعت کے مطابق کرنا چاہیے تو یہ صبر ہے۔ آپ ایسے حالات میں گھِر جاتے ہیں جو آپ کی مرضی کے خلاف ہیں۔ اب آپ فوری جذبے کے تحت اٹھ کر حالات سے لڑنے نہیں لگتے، بلکہ قرآن اور سنت کی روشنی میں پورے معاملے کو جانچتے ہیں اور اس کے بعد وہ کرتے ہیں جو قرآن اور سنت کی منشا ہے، نہ کہ وہ جو آپ کی ذاتی منشا ہے، تو اس کا نام صبر ہے۔ صبر مومن کا دستور ہے، صبر مومن کا اصولِ حیات ہے۔ صبر وہ حکیمانہ طریقِ عمل ہے جو مومن اس دنیا میں اختیار کرتا ہے۔ جس آدمی کے اندر صبر کی صفت نہ ہو، اس کے متعلق یہ امر مشتبہ ہے کہ اس کو ایمان کی معرفت ملی ہے، یا ابھی تک اس کو ایمان کی معرفت نہیں ملی۔

بااصول زندگی

دنیا کا نظام اِس طرح بنا ہے کہ یہاں ہمیشہ ایک کو دوسرے سے اختلاف پیش آتا ہے۔ یہ اختلاف مبنی بر فطرت ہے۔ اِس لیے اُس کو کبھی ختم نہیں کیا جا سکتا۔ ایسی حالت میں، کامیاب زندگی کا اصول صرف ایک ہے، اور وہ یہ ہے کہ لوگوں کے ساتھ ایڈجسٹ (adjust) کرکے زندگی گزاری جائے۔ اختلاف کو نظر انداز کرکے باہمی مفاد

(mutual interest) کی بنیاد پر زندگی کا نظام قائم کیا جائے۔ اِس دنیا میں اِس کے سوا، کوئی انتخاب (option) کسی کے لیے ممکن نہیں۔

اِس معاملے میں، مسلمانوں کا معاملہ دوسروں سے الگ نہیں ہے۔ البتہ مسلمان کو اِس معاملے میں ایک امتیازی خصوصیت حاصل ہے۔ دوسروں کے لیے ایڈجسٹ مینٹ (adjustment) صرف مفاد (interest) کا ایک معاملہ ہے، مگر مسلمان کے لیے یہ معاملہ ایک اعلیٰ عبادت کا معاملہ بن جاتا ہے۔

اِس فرق کا سبب یہ ہے کہ مسلمان کا ایڈجسٹ مینٹ ایک اصول کے تحت ہوتا ہے، جب کہ دوسروں کا ایڈجسٹ مینٹ صرف دنیوی مفاد کے تحت پیش آتا ہے۔ مسلمان اپنی حیثیت کے اعتبار سے، ایک خدائی مشن کے حامل ہیں، یعنی خدا کے ابدی پیغام کو دوسرے تمام انسانوں تک پہنچانا۔ پیغام رسانی کا یہ کام صرف اُس وقت درست طور پر انجام پاسکتا ہے، جب کہ مسلمانوں اور غیر مسلم قوموں کے درمیان خوش گوار تعلقات قائم ہوں۔ مسلمان جب دوسری قوموں کے ساتھ ایڈجسٹ مینٹ کا معاملہ کرتا ہے تو اُس کا محرّک (incentive) اُس کا یہی دعوتی ذہن ہوتا ہے۔ وہ ذاتی مفاد کے لیے ایڈجسٹ مینٹ نہیں کرتا، بلکہ وہ صرف اِس لیے ایڈجسٹ مینٹ کرتا ہے، تاکہ اُس کا دعوتی مشن کسی رکاوٹ کے بغیر پُرامن انداز میں جاری رہے۔ محرک کا یہ فرق بہت اہم ہے۔

اِسی فرق کی بنا پر ایسا ہوتا ہے کہ مسلمان کا ایڈجسٹ مینٹ ایک ایسا عبادتی عمل بن جاتا ہے جو اُس کو آخرت میں اجرِ عظیم کا مستحق بنادے۔ اِس کے برعکس، دوسروں کا ایڈجسٹ مینٹ صرف ذاتی مفاد کی بنیاد پر ہوتا ہے، اِس سے زیادہ اُس کی کوئی اور حیثیت نہیں۔

مذکورہ قسم کا ایڈجسٹ مینٹ موجودہ دنیا کا ایک لازمی قانون ہے۔ اِس معاملے میں کسی

بھی شخص یا گروہ کا کوئی استثنا (exception) نہیں۔ اِس کا مطلب یہ ہے کہ مسلمان اگر اصولی بنیاد پر اڈجسٹ مینٹ نہ کریں تو اُن کو مفاد کی بنیاد پر اڈجسٹ مینٹ کا معاملہ کرنا ہوگا۔ مگر ایسی صورت میں ان کا اڈجسٹ مینٹ عبادت کا عمل نہ ہوگا، بلکہ وہ صرف موقع پرستی (expediency) کا ایک معاملہ ہوگا، یعنی وہی چیز جس کو شریعت کی زبان میں منافقت (hypocrisy) کہا جاتا ہے۔ اصول پسندی، ایک اعلیٰ اخلاقی صفت ہے، اِس کے مقابلے میں، موقع پرستی ایک انتہائی بُری صفت۔

اِس دنیا میں کسی آدمی کے لیے صرف دو میں سے ایک کا انتخاب (option) ہے— اخلاص، یا منافقت۔ مخلصانہ زندگی میں منافقت کا کوئی مقام نہیں۔ اِسی طرح منافقانہ زندگی میں اخلاص کا کوئی درجہ نہیں۔ دعوتی مشن واحد مشن ہے جو آدمی کو اِس معاملے میں منافقانہ روش سے بچاتا ہے۔ دعوتی مشن آدمی کے اندر یہ مزاج پیدا کرتا ہے کہ وہ اپنے اعلیٰ ربانی مشن کی خاطر دوسروں کے ساتھ اڈجسٹ مینٹ کا طریقہ اختیار کرے۔ بظاہر اگرچہ داعی بھی اڈجسٹ مینٹ کا معاملہ کرتا ہے، مگر اُس کا اڈجسٹ مینٹ، اصول کی بنیاد پر ہوتا ہے، نہ کہ مفاد کی بنیاد پر۔

یہ کوئی سادہ معاملہ نہیں۔ اِس کا مطلب یہ ہے کہ مسلمان اگر دعوتی مصلحت کی بنا پر دوسروں کے ساتھ اڈجسٹ مینٹ نہ کریں تو اُنھیں ذاتی مصلحت کی بنا پر دوسروں کے ساتھ اڈجسٹ مینٹ کرنا پڑے گا۔ گویا کہ اگر وہ دوسروں کے درمیان مخلص بن کر نہ رہیں تو اُنھیں دوسروں کے درمیان منافق بن کر رہنا ہوگا، اور بلاشبہ منافقانہ زندگی سے زیادہ بُری کوئی چیز اِس دنیا میں نہیں۔

ڈی لنکنگ—ایک سنتِ رسول

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک سنت وہ ہے، جس کو پالیسی آف ڈی لنکنگ (policy of delinking) کہا جاسکتا ہے۔ مثال کے طور پر مکہ میں آپ نے اپنا مشن شروع کیا۔ اس وقت مکہ اہل شرک کے قبضے میں تھا۔ انھوں نے کعبہ کو 360 بتوں کا مرکز بنا دیا تھا۔ رسول اللہ نے یہ کیا کہ کعبہ میں آنے والے زائرین اور اس میں موجود بتوں کو ایک دوسرے سے الگ کرکے دیکھا۔ یعنی بت پرستی اور کعبہ کے قریب بت پرستوں کے اجتماع میں فرق کرنا۔ اس طرح ڈی لنکنگ پالیسی اختیار کرنے کی بنا پر آپ کے لیے یہ ممکن ہوا کہ آپ مکمل طور پر مثبت ذہن کے ساتھ اپنا مشن، دعوت الی اللہ کا عمل انجام دے سکیں۔ اگر آپ ڈی لنکنگ پالیسی اختیار نہ کرتے تو یہ فائدہ کبھی حاصل نہ ہوتا۔

ایسا کیوں ہے۔ اس کو صحابی رسول عمرو بن العاص (وفات 43ھ) کے قول سے سمجھا جاسکتا ہے۔ ان کا قول یہ ہے: لَيْسَ الْعَاقِلُ الَّذِی يَعْرِفُ الْخَيْرَ مِنَ الشَّرِّ، وَلَكِنِ الْعَاقِلُ الَّذِی يَعْرِفُ خَيْرَ الشَّرَّيْنِ (المجالسة وجواہر العلم، اثر نمبر 670)۔ یعنی عقل مند وہ نہیں ہے، جو خیر کے مقابلے میں شر کو پہچانے۔ بلکہ عقل مند وہ ہے، جو یہ جانے کہ دو شر کے درمیان خیر کیا ہے۔

اس کا مطلب یہی ہے کہ شر کے مختلف پہلوؤں کو ڈی لنک کرکے دیکھا جائے تو شر کے اندر بھی خیر کا پہلو مل جائے گا۔ آپ نے کعبہ میں بت اور بت پرستوں کے معاملے میں جو طریقہ اختیار کیا، وہ کیا تھا۔ ان بتوں کا ظاہری پہلو یہ تھا کہ وہ شرک کا ذریعہ تھا۔ اس کا دوسرا پہلو یہ تھا کہ انھی بتوں کی وجہ سے وہاں لوگ جمع ہوتے تھے، اور اس کی وجہ سے وہاں ایک آڈینس بنتا تھا۔ رسول اللہ نے یہ کیا کہ بتوں کے مشرکانہ پہلو کو الگ کردیا، اور بتوں کی وجہ سے وہاں آنے والے لوگوں کو اپنے لیے بطورِ آڈینس استعمال کیا۔ اس دنیا کا

قانون یہ ہے کہ یہاں ہر عسر کے ساتھ یسر کا پہلو موجود ہوتا ہے۔ انسان اگر مثبت ذہن کے ساتھ معاملے میں غور کرے تو ہر عسر میں اس کو یسر کا پہلو مل جائے گا۔

انیسویں صدی میں انگریز جب انڈیا میں آئے تو انھوں نے مسلمانوں کو بہت سی چیزیں دیں۔ مثلاً انگریزی ایجوکیشن، جس کی وجہ سے مسلمان اس قابل ہوئے کہ وہ انڈیا کے باہر کی دنیا کو دیکھ سکیں۔ لیکن سارے مسلمانوں نے انڈیا میں اینٹی برٹش تحریک چلا دی۔ اسی طرح آزادی کے بعد جو حکومت آئی اس نے بھی مسلمانوں کو بہت کچھ دیا۔ لیکن دوبارہ مسلمانوں کو حکومت سے شکایت پیدا ہوگئی، وغیرہ۔

اس کا سبب یہ ہے کہ مسلم قائدین زندگی کے ایک اصول کو نہیں جانتے ہیں۔ وہ اس فطری قانون کو نہیں جانتے کہ ہر عسر کے ساتھ یسر موجود ہوتا ہے (الانشراح، 94:5-6)۔ عسر کا مطلب ہے مسئلہ (problem)، اور یسر کا مطلب ہے موقع (opportunity)۔ یعنی پرابلم کے درمیان موجود مواقع کو جاننا، اور منصوبہ بند انداز میں ان کو اویل (avail) کرنا، یہی زندگی کا اصول ہے۔ لیکن مسلم لیڈروں نے اس اصول کو نہ پہلے جانا، اور نہ وہ اب اس کو جانتے ہیں۔ انھوں نے ہمیشہ ایک کام کیا ہے۔ وہ ہے موجود مواقع کو نظر انداز کرنا، اور جو چیز موجود نہیں ہے، اس کے اوپر تحریک چلانا۔ یہی غیر حقیقی طریقِ کار ہر دور میں مسلمانوں پر غالب رہا ہے۔ اس لیے مسلمانوں نے ہر دور میں صرف کھویا، کسی بھی دور میں وہ پانے والی چیز کو پانے میں کامیاب نہیں ہوئے۔

قرآن کی سورہ البقرہ میں زندگی کی ایک حقیقت کو اس طرح بیان کیا گیا ہے: اور ہم ضرور تم کو آزمائیں گے کچھ ڈر اور بھوک سے اور مالوں اور جانوں اور پھلوں کی کمی سے، اور ثابت قدم رہنے والوں کو خوش خبری دے دو (2:155)۔ توسیعی اعتبار سے حکومت کا ملنا، اور اس کا ہاتھ سے نکلنا، وغیرہ بھی اس میں شامل ہے۔ اور صبر کا مطلب ہے پرابلم کو اگنور کرنا، مواقع کو اویل (avail) کرنا۔

انسان پر زندگی کے جو مختلف مرحلے پیش آتے ہیں، وہ ایک موقع کے طور پر پیش آتے ہیں۔ زندگی کو جاننے والا شخص وہ ہے، جو زندگی کو ایک موقع کی صورت میں دریافت کرے، اور پھر منصوبہ بند انداز میں اس موقع کو استعمال کرے۔ مشکل حالات منفی چیز نہیں۔ مشکل حالات یا چیلنج کسی انسانی گروہ کو تخلیقی گروہ بناتا ہے۔ جب کسی گروہ کے اندر ایسی حالت پیدا ہو، تو انسان اس کو فطرت کا تحفہ سمجھے، اور ڈی لنکنگ کا طریقہ اختیار کرکے وہ اس کو بطور موقع اویل کرے۔ اس طرح نان کریٹو گروہ کریٹیو (creative) گروہ بن جائے گا۔

صبر کی نصیحت

قرآن کی سورہ العصر میں اہلِ ایمان کی صفت بتاتے ہوئے یہ الفاظ آئے ہیں: وَتَوَاصَوْا بِالْحَقِّ وَتَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ (103:3)۔ یعنی، وہ ایک دوسرے کو حق کی نصیحت کرنے والے ہوتے ہیں اور وہ ایک دوسرے کو صبر کی نصیحت کرنے والے ہوتے ہیں۔

قرآن کی اِس آیت میں حق سے مراد اہلِ ایمان کی داخلی صفت ہے اور صبر سے مراد اہلِ ایمان کی وہ صفت ہے جس کا تعلق خارجی حالات سے ہے۔ ایمان کے معاملے میں اصل مطلوب چیز حق کا اتباع ہے۔ مومن وہ ہے جو حق کو شعوری طور پر دریافت کرے اور پھر عملاً اُس پر قائم ہوجائے۔

مگر یہ فیصلہ کوئی سادہ فیصلہ نہیں۔ جب ایک شخص اتباعِ حق کا فیصلہ کرتا ہے تو یہ فیصلہ ایک ایسی دنیا میں ہوتا ہے جہاں طرح طرح کے مسائل ہیں۔ کبھی کوئی خارجی چیز اس کی خواہش (desire) یا اس کی انا (ego) کو بھڑکاتی ہے اور اس کا اندیشہ پیدا ہوجاتا ہے کہ وہ اپنی خواہش سے متاثر ہو کر حق کے راستے سے ہٹ جائے۔ اِسی طرح کبھی خارجی مشکلات سے اس کے ارادے میں کمزوری پیدا ہوجاتی ہے اور ضرورت ہوتی ہے کہ اس کو دوبارہ ثابت قدمی پر آمادہ کیا جائے۔

یہی وہ مواقع ہیں جو تواصی کی ضرورت پیدا کرتے ہیں۔ ایسے مواقع پر اہلِ ایمان سے یہ مطلوب ہے کہ وہ ایک دوسرے کے سچے مددگار بن جائیں۔ وہ خیر خواہانہ نصیحت کے ذریعے ایک دوسرے کو سنبھالیں۔ ایسے مواقع پر وہ ایک دوسرے کو درست مشورہ دے کر یہ کوشش کریں کہ اُن کا ساتھی حق سے منحرف نہ ہونے پائے، وہ صبر کے تقاضوں کو پورا کرتے ہوئے بدستور حق پر قائم رہے۔ تواصی کا مطلب باہمی نصیحت یا باہمی مشورہ ہے۔

مشورہ کی کچھ لازمی شرطیں ہیں — ایک یہ کہ وہ مبنی بر خیر خواہی مشورہ ہو اور دوسرے یہ کہ وہ عملی طور پر ایک ممکن العمل مشورہ ہو۔ حقیقی تواصی وہی ہے جس میں یہ شرطیں پائی جائیں۔ تواصی بالحق سے مراد نظری معاملے میں تواصی ہے اور تواصی بالصبر سے مراد عملی معاملے میں تواصی۔

سیلف ڈسپلن

مارکسی لیڈر جوزف اسٹالن (Joseph Stalin) نے اشتراکی انقلاب (1917ء) سے پہلے اپنی ایک تقریر میں کہا تھا کہ ہم کو انقلاب کے لیے تین چیزوں کی ضرورت ہے: اول ہتھیار، دوم ہتھیار، سوم ہتھیار، آخر میں پھر ہتھیار۔ یہ جھوٹے انقلاب کا فارمولا تھا۔ سچے انقلاب کا فارمولا یہ ہے — اول صبر، دوم صبر، سوم صبر، آخر میں پھر صبر۔

صبر کیا ہے، صبر دراصل امن پر مبنی دانش مندانہ منصوبہ بندی (planning) کا نام ہے۔ صبر یہ ہے کہ وقت اور طاقت کا کوئی معمولی حصہ بھی بے فائدہ ٹکراؤ میں ضائع نہ کیا جائے، بلکہ ساری حاصل شدہ توانائی کو صرف ایک مقصد کے لیے استعمال کیا جائے، یعنی ٹکراؤ کو نظر انداز کرنا اور دستیاب مواقع کو بھر پور طور پر استعمال کرنا۔

صبر دراصل یہ ہے کہ آدمی ردعمل (reaction) سے اپنے آپ کو بچائے، وہ دانش مندانہ تدبیر کے ذریعے اپنے عمل کی منصوبہ بندی کرے۔ صابرانہ منصوبہ بندی صرف وہ شخص کرسکتا ہے جو حالات سے اوپر اٹھ کر سوچے، جو حالات کا عامل بن جائے، نہ کہ حالات کا معمول۔

تاریخ کے تمام تجربات بتاتے ہیں کہ ہتھیار یا جنگ صرف تخریب کاری کا سبب ہے۔ جب بھی کسی نے حقیقی معنوں میں کوئی کامیابی حاصل کی ہے تو وہ پر امن جدوجہد کے ذریعے حاصل کی ہے۔ اگر نتیجے کی بنیاد پر منصوبہ بنایا جائے تو کوئی بھی شخص مسلح عمل کا منصوبہ نہیں بنا سکتا۔ ہر شخص لازمی طور پر پر امن عمل کی بنیاد پر اپنا منصوبہ بنائے گا۔

صبر کا طریقہ ثابت شدہ طور پر بہتر طریقہ ہے۔ پھر کیوں ایسا ہے کہ لوگ صبر کا طریقہ اختیار نہیں کرتے۔ اِس کا واحد سبب یہ ہے کہ صبر اپنے آپ پر سیلف کنٹرول کا تقاضا کرتا ہے۔ صبر کا طریقہ اختیار کرنے کے لیے اپنے جذبات پر قابو رکھنا ضروری ہوتا ہے۔ صبر دراصل سیلف ڈسپلن کا نام ہے، اور بلاشبہ سیلف ڈسپلن سے زیادہ مشکل کوئی کام انسان کے لیے نہیں۔

ایڈجسٹمنٹ کا فارمولا

مرد کا مسئلہ یہ ہے کہ وہ ایگوئسٹ (egoist) ہوتا ہے۔ عورت کا مسئلہ یہ ہے کہ وہ اموشنل (emotional) ہوتی ہے۔ یہ دونوں صفتیں پیدائشی صفتیں ہیں۔ اِن کو بدلنا کسی بھی حال میں ممکن نہیں۔ اگر آپ اِس حقیقت کو جان لیں تو آپ کے لیے عورت اور مرد دونوں کے ساتھ معاملہ (deal) کرنا آسان ہو جائے گا۔ اس کا مختصر فارمولا یہ ہے کہ مرد کے ایگو کو ٹچ (touch) نہ کیجیے، اور عورت کے اموشن (emotion) سے نہ ٹکرائیے۔ یہی فارمولا خاندانی زندگی میں بھی کارآمد ہے اور سماجی زندگی میں بھی۔

حقیقت یہ ہے کہ اس دنیا میں معاملات ہمیشہ ٹکراؤ کی بنا پر بگڑتے ہیں۔ ٹکراؤ سے اعراض کرنا ہی پُرعافیت زندگی کا واحد کامیاب فارمولا ہے۔ اِس کے سوا کوئی اور فارمولا عملی طور پر اِس دنیا میں ممکن نہیں۔ اِس فارمولے کو ایک لفظ میں ٹکراؤ مینج مینٹ (conflict management) کہا جا سکتا ہے۔

ٹکراؤ سے اعراض کرنا، صرف ایک اخلاقی معاملہ نہیں، بلکہ یہ خود اپنی تعمیر (self development) کا سب سے بڑا ذریعہ ہے۔ جب آپ ٹکراؤ سے بچتے ہیں تو نتیجے کے اعتبار سے اِس کا دوسرا مطلب یہ ہوتا ہے کہ آپ نے اپنا وقت بچایا، آپ نے اپنی توانائی بچائی، آپ نے اپنا مال بچایا، آپ نے اپنے آپ کو اِس قابل بنایا کہ کسی وقفے کے بغیر اپنی زندگی کا سفر جاری رکھیں۔ آپ غیر ضروری طور پر ذہنی تناؤ (tension) کا شکار نہیں ہوئے، آپ نے اپنے ذہن کو کامل طور پر مثبت سوچ کے لیے فارغ رکھا، وغیرہ۔

کامیاب زندگی پچاس فی صد خود اپنے استعمال کا نام ہے، اور پچاس فی صد دوسروں سے موافقت (adjustment) کرنے کا نام ہے۔ یہ ایک اٹل فطری قانون ہے، اِس میں کسی کا کوئی استثناء نہیں۔ کامیابی کے لیے دونوں ہی چیزیں یکساں طور پر ضروری ہیں۔ جو انسان اِس تقسیم پر راضی نہ ہو، اس کو اپنے لیے ایک اور دنیا کی تخلیق کرنا چاہیے۔ کیوں کہ موجودہ دنیا میں اِس کے سوا زندگی کی کوئی اور صورت ممکن نہیں۔

صبر کا مہینہ

حضرت سلمان فارسی کی ایک روایت حدیث کی کتابوں میں آئی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ — شعبان کے مہینے کے آخری دن، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہم کو خطاب فرمایا۔ یہ ایک تفصیلی حدیث ہے۔ اس کے کچھ حصے یہ ہیں:

يا أَيُّهَا النَّاسُ قَدْ أَظَلَّكُمْ شَهْرٌ عَظِيمٌ، شَهْرٌ مُبَارَك، شَهْرٌ فِيهِ لَيْلَةٌ خَيْرٌ مِنْ أَلْفِ شَهْرٍ، جَعَلَ اللّٰهُ صِيَامَهُ فَرِيضَةً، وَ قِيَامَ لَيْلِهِ تَطَوُّعًا، مَنْ تَقَرَّبَ فِيهِ بِخَصْلَةٍ مِنَ الْخَيْرِ كَانَ كَمَنْ أَدَّى فَرِيضَةً فِيمَا سِوَاهُ، وَمَنْ أَدَّى فَرِيضَةً فِيهِ كَانَ كَمَنْ أَدَّى سَبْعِينَ فَرِيضَةً فِيمَا سِوَاهُ، وَهُوَ شَهْرُ الصَّبْرِ، وَالصَّبْرُ ثَوَابُهُ الْجَنَّةُ

(شعب الایمان للبیہقی، حدیث نمبر 3336)۔ یعنی اے لوگو، ایک عظیم مہینہ تمہارے لیے آرہا ہے۔ یہ ایک بابرکت مہینہ ہے۔ اللہ نے اِس مہینے کے روزے کو فرض قرار دیا ہے اور اِس مہینے کی رات میں قیام کو تطوع قرار دیا ہے۔ رمضان کا مہینہ صبر کا مہینہ ہے۔ اور صبر کا بدلہ جنت ہے۔

"صبر کا مہینہ" کا مطلب ہے— مشقت کا مہینہ۔ رمضان کے مہینے میں آدمی کو اپنے معمولات کو توڑنا پڑتا ہے۔ اس کو یہ کرنا پڑتا ہے کہ وہ پیاس کے باوجود پانی نہ پیئے، اور بھوک کے باوجود کھانا نہ کھائے، وہ اپنی خواہشات (desires) کو کنٹرول میں رکھے۔ رمضان کو اگر درست طور پر گزارا جائے تو پورا کا پورا مہینہ مشقتوں کا مہینہ بن جائے گا۔ سچے روزہ دار کے لیے رمضان کا مہینہ مسلسل صبر کا مہینہ ہے، دن کے اوقات میں بھی اور رات کے اوقات میں بھی۔

جو عمل صبر کی قیمت پر کیا جائے، وہ اللہ کے نزدیک سب سے زیادہ قیمتی عمل ہوتا ہے۔ عام حالات میں انسان جو عمل کرتا ہے، اُس میں اُس کی شخصیت کا صرف جزئی حصہ شامل ہوتا ہے۔ لیکن جس عمل کو انجام دینے کے لیے صبر کرنا پڑے، اُس میں آدمی کی پوری شخصیت فعّال (active) طور پر شامل ہوجاتی ہے۔ یہی فرق ہے جس کی بنا پر ایسا ہوتا ہے کہ عام عمل کے مقابلے میں، صابرانہ عمل کی اہمیت بہت زیادہ بڑھ جاتی ہے اور اس بنا پر اُس کی جزا بھی۔ رمضان کو پانے والا وہ ہے جس کے لیے رمضان کا مہینہ حقیقی معنوں میں صابرانہ زندگی کی تیاری کا مہینہ بن جائے، ایسی صابرانہ زندگی جو پورے سال کے لیے آدمی کو صبر کے راستے پر قائم رکھنے والی بن جائے۔

تواصی بالحق، تواصی بالصبر

27 اگست 2007ء کو میں نے رات میں ایک خواب دیکھا۔ میں نے دیکھا کہ ایک آواز

آئی۔ اُس نے کہا کہ اٹھو۔ میں نے کہا کہ میں تو اٹھا ہوا ہوں۔ اُس نے کہا ’تواصی بالحق‘ کو جانو، ’تواصی بالحق‘ کو جانو، ’تواصی بالحق‘ کو جانو، میں نے کہا کہ مجھے نہیں معلوم کہ یہ کیا ہے۔ اُس نے کہا، ’تواصی بالحق‘ کو جانو، میں نے کہا کہ آپ مجھے بتائیے۔ اُس نے کچھ دیر تک مجھے سمجھایا۔ میں نے کہا کہ آپ نے جو کہا، میں اس کو سمجھ نہیں پایا۔ اُس نے کہا کہ اِسی لیے تو میں کہتا ہوں کہ تواصی بالحق کو سمجھو۔ اِس کے بعد میری آنکھ کُھل گئی۔ یہ بڑی عجیب بات ہے کہ یہ لفظ نہ میرے مطالعے میں تھا اور نہ مجھے اُس کا مفہوم معلوم تھا۔ میں جاننا چاہتا ہوں کہ میں ’تواصی بالحق‘ کو کیسے سمجھوں۔ اِس میں آپ میری مدد فرمائیں (حبیب محمد، حیدرآباد)۔

’تواصی‘ کا لفظ قرآن کی سورہ نمبر 103 میں آیا ہے۔ اِس سورہ کا ترجمہ یہ ہے: زمانہ گواہ ہے کہ بے شک، انسان گھاٹے میں ہے۔ سوا اُن لوگوں کے جو ایمان لائے اور نیک عمل کیا، اور ایک دوسرے کو حق کی نصیحت کی، اور ایک دوسرے کو صبر کی نصیحت کی:

History is a witness that man is in loss. Except those who believe and do good, and exhort on each other truth, and exhort on each other patience.

قرآن کی اِس سورہ کی اہمیت اتنی زیادہ ہے کہ ایک روایت میں آتا ہے کہ دو صحابی جب ایک دوسرے سے ملتے تھے تو وہ یاد دہانی کے لیے آپس میں اِس سورہ کا تذکرہ کرتے تھے:

عَنْ أَبِي مَدِينَةَ الدَّارِمِيِّ، وَكَانَتْ لَهُ صُحْبَةٌ قَالَ: كَانَ الرَّجُلَانِ مِنْ أَصْحَابِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ إِذَا الْتَقَيَا لَمْ يَفْتَرِقَا حَتَّى يَقْرَأَ أَحَدُهُمَا عَلَى الْآخَرِ: وَالْعَصْرِ إِنَّ الْإِنْسَانَ لَفِي خُسْرٍ [العصر:2] ، ثُمَّ يُسَلِّمَ أَحَدُهُمَا عَلَى الْآخَرِ (المعجم الاوسط للطبرانی، حدیث نمبر 5124)۔

قرآن کی اِس سورہ میں مومنانہ زندگی کا کورس بتایا گیا ہے۔ یہ کورس بنیادی طور پر تین اجزا پر مشتمل ہے — ایمان اور عمل اور تواصی۔ ایمان یہ ہے کہ آدمی کو شعور کی سطح پر خدا کی

معرفت حاصل ہو۔ یہ معرفت ایک انسان کے لیے ذہنی انقلاب کے ہم معنیٰ ہوتی ہے۔ اِس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ آدمی نے اپنی تلاش کا جواب پالیا۔ آدمی کو اپنی فکری سرگرمیوں کے لیے صحیح فریم ورک مل گیا۔ آدمی کو ظاہری بصارت کے ساتھ، داخلی بصیرت کی روشنی حاصل ہوگئی۔ آدمی کو اپنی ذہنی تگ ودَو کا مرکز حاصل ہوگیا۔ آدمی کے اندر اُس ہستی کا شعور پیدا ہوگیا، جس سے وہ سب سے زیادہ ڈرے اور جس سے وہ سب سے زیادہ محبت کرے۔

اِس کورس کا دوسرا جُزءعملِ صالح ہے۔ عملِ صالح سے مراد وہ عمل ہے جو عین حقیقتِ واقعہ کے مطابق ہو۔ عملِ صالح کی اِس فہرست میں ذکر ودعا، عبادات، اخلاق اور معاملات، وغیرہ سب شامل ہیں۔ ہر وہ کام جس میں انسان کا جسمانی وجود شامل ہوتا ہے، وہ سب اُس کا عمل ہے اور یہ مطلوب ہے کہ اِن تمام اعمال کو صالحیت کی بنیاد پر قائم کیا جائے۔ حقیقت یہ ہے کہ انسانی عمل کی دو قسمیں ہیں: ایک، خود رُخی (self-oriented) عمل اور دوسرا، خدا رُخی (God-oriented) عمل۔ اسلامی شریعت میں خودرخی عمل کا دوسرا نام غیر صالح عمل ہے اور خدارخی عمل کا دوسرا نام صالح عمل۔

اِس کورس کا تیسرا جُزوتواصی ہے۔ تواصی میں مشارکت پائی جاتی ہے۔ اِس کا مطلب ہے ایک دوسرے کو نصیحت کرنا۔ دو آدمی ایک دوسرے کی خیر خواہی کے جذبے کے تحت، سنجیدہ موضوعات پر ایک دوسرے کے ساتھ جو گفتگو کریں، اُس کا نام تواصی ہے۔ دوسرے لفظوں میں یہ کہہ سکتے ہیں کہ تواصی نام ہے باہمی تبادلۂ خیال (mutual discussion) کا۔ دینی موضوعات پر باہمی ڈسکشن کسی مومن کی زندگی کا اُسی طرح ایک ناگزیر حصہ ہے، جس طرح ایمان اور عملِ صالح۔

یہ باہمی تبادلۂ خیال، یا انٹلکچول ایکسچینج (intellectual exchange) ذہنی ترقی کے لیے بے حد ضروری ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ انٹلکچول ایکسچینج کے بغیر ذہنی ترقی بالکل ممکن

نہیں۔ جب دو آدمی سنجیدگی کے ساتھ ایک موضوع پر تبادلۂ خیال کریں تو دو آدمیوں کی گفتگو کے دوران ایک تیسرا تصور ایمرج (emerge) کرتا ہے، جس طرح دو پتھروں کے ٹکرانے سے ایک تیسری چیز نکلتی ہے، یعنی چنگاری۔ اِسی طرح باہمی تبادلۂ خیال دونوں کے لیے ذہنی ارتقا کا ذریعہ بنتا ہے۔

اہلِ ایمان کے لیے تواصی کے اِس عمل کا موضوع صرف دو ہے، اور وہ ہے — حق اور صبر۔حق میں تمام مثبت موضوعات شامل ہیں۔مثلاً قرآن اور حدیث کے گہرے معانی کو سمجھنے کے لیے باہمی تبادلۂ خیال کرنا۔ یہ مقصد صرف قرآن کی تلاوت سے حاصل نہیں ہوتا۔ اُس کے لیے ضروری ہے کہ قرآن اور حدیث کو چرچا اور تبادلۂ خیال کا موضوع بنا دیا جائے۔ یہ مقصد صرف سنجیدہ ڈسکشن کے ذریعے حاصل ہوسکتا ہے۔مثلاً ہر گھر میں یہ واقعہ پیش آتا ہے کہ کبھی کسی نقصان کا تجربہ ہوتا ہے اور کبھی کسی فائدے کا تجربہ۔ عام طور پر یہ ہوتا ہے کہ گھروں میں نقصان کے واقعے کو لے کر لوگ منفی انداز میں بولنے لگتے ہیں۔ اِسی طرح فائدے کے واقعے کو لے کر خوشی اور فخر کا اظہار کرنے لگتے ہیں۔ یہ دونوں طریقے غلط ہیں۔

اصل یہ ہے کہ ایسے موقع پر قرآن کی آیت: لِكَيْلَا تَأْسَوْا عَلَىٰ مَا فَاتَكُمْ وَلَا تَفْرَحُوا بِمَا آتَاكُمْ (57:23) کو چرچا کا موضوع بنایا جائے۔یعنی، تاکہ تم غم نہ کرو اس پر جو تم سے کھویا گیا۔اور نہ اس چیز پر فخر کرو جو اس نے تم کو دیا۔

دوسرے الفاظ میں، اگر نقصان کا تجربہ ہو تو اُس پر اِس انداز سے آپس میں بات کی جائے کہ مایوسی کا احساس لوگوں کے اندر سے ختم ہوجائے۔اور اگر فائدے کا تجربہ ہو، تب بھی اُس پر اِس انداز سے باہم گفتگو کی جائے کہ لوگوں کے اندر فخر کے بجائے شکر کا جذبہ پیدا ہو۔

اِسی طرح نئے واقعات بھی اِس تواصی کا موضوع بن سکتے ہیں۔مثلاً حال میں چھپی ہوئی ایک کتاب کے اندر یہ انکشاف کیا گیا ہے کہ مدر ٹریسا (وفات 1997ء) جو تقریباً ستّر سال

تک خدا کے نام پر سوشل سروس کرتی رہیں، مگر اُنھیں اپنے اِس عمل کے دوران کبھی سچائی کا تجربہ نہیں ہوا۔ وہ مسلسل طور پر مذہبی اور روحانی اعتبار سے سوہانِ روح (agony) میں مبتلا رہیں (ٹائم میگزین، 3 ستمبر 2007ء)۔ اب اِس خبر پر آپ باہم ہمدردانہ تبادلۂ خیال کریں کہ مدر ٹریسا کے ساتھ یہ ٹریجڈی کیوں پیش آئی۔

تواصی کے عمل کا دوسرا موضوع صبر ہے۔ صبر کوئی انفعالی چیز نہیں۔ وہ اعلیٰ درجے کا مثبت عمل ہے۔ اِس دنیا میں آدمی کو مسلسل طور پر ناموافق حالات سے سابقہ پیش آتا ہے۔ ایسی حالت میں تواصی بالصبر یہ ہے کہ دو آدمی یا چند آدمی اِس پر گفتگو کریں کہ ناموافق حالات کے باوجود، کس طرح ایمان اور عملِ صالح کی زندگی کی منصوبہ بندی کی جائے۔

میرے تجربے کے مطابق، اِس تواصی کا پہلا میدان آدمی کا اپنا خاندان ہے، خاندان، عورت اور مرد کے اُس مجموعے کا نام ہے جن کے درمیان خونی رشتہ (blood relationship) ہوتا ہے۔ اِس دنیا میں سماجی تعلقات کے درمیان سب سے زیادہ طاقت ور رشتہ خونی رشتہ ہوتا ہے۔ یہ خونی رشتہ انٹلکچول ایکسچینج کے لیے بے حد مفید ہے۔ اِس کی وجہ یہ ہے کہ باہمی تبادلۂ خیال کے لیے دونوں فریق کے درمیان باہمی موانست بے حد ضروری ہے۔ اور خاندانی افراد کے درمیان یہ موانست کامل درجے میں پائی جاتی ہے۔

صحت مند تبادلۂ خیال کے لیے ایک لازمی شرط ہے، اور وہ یہ ہے کہ ساری گفتگو 'حق' اور 'صبر' کے موضوع پر کی جائے۔ دیگر موضوعات سے مکمل طور پر پرہیز کیا جائے۔ دیگر موضوعات مثلاً نفرت اور شکایت کا چرچا، دنیوی اہمیت کی چیزیں اور سطحی موضوعات پر تفریحی باتیں، وغیرہ۔ یہ سب اِس معاملے میں ڈسٹریکشن ہیں۔ اور ڈسٹریکشن اتنی زیادہ تباہ کُن چیز ہے جس کا تحمل ایک حق پرست آدمی کبھی نہیں کرسکتا۔

قرآن میں اہلِ بیتِ رسول کے بارے میں ایک آیت آئی ہے۔ وہ آیت یہ ہے: یُرِیدُ

اللّٰہُ لِیُذْہِبَ عَنْکُمُ الرِّجْسَ أَہْلَ الْبَیْتِ وَیُطَہِّرَکُمْ تَطْہِیرًا (33:33)۔یعنی، اللہ تو چاہتا ہے کہ تم اہلِ بیت سے آلودگی کو دور کرے اور تم کو پوری طرح پاک کردے۔ اِس آیت میں بظاہر اہلِ بیتِ رسول کا ذکر ہے، مگر یہاں مخصوص ریفرنس (particular reference) میں ایک جنرل تعلیم دی گئی ہے۔ اِس اعتبار سے یہاں ہر صاحبِ ایمان کے اہلِ بیت مراد ہیں۔ اِس آیت میں دو چیزوں کا ذکر ہے — رِجس کو دور کرنا اور تطہیر کرنا۔ بظاہر اِن دونوں عمل کو خدا کی طرف منسوب کیا گیا ہے، لیکن حقیقت کے اعتبار سے یہ وہی چیز ہے جس کو تواصی کہا گیا ہے۔ تواصی کا یہ عمل رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے اہلِ بیت کے لیے کیا۔ اِسی طرح ہر اہلِ ایمان عورت اور مرد کو اپنے اہلِ بیت پر تواصی کا فریضہ انجام دینا چاہیے۔

اہلِ بیت کی تواصی سے مراد سادہ طور پر خاندان کی اصلاح نہیں ہے، بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ ہر مومن خاندان کے اندر یہ ماحول ہونا چاہیے کہ افرادِ خاندان ایک دوسرے کے ساتھ تواصی میں شریک ہوجائیں۔ ہر گھر میں ایسا ہونا چاہیے کہ لوگوں کے درمیان چرچا یا تبادلۂ خیال صرف دو موضوعات پر ہو، یعنی حق کے موضوع پر اور صبر کے موضوع پر۔ ہر خاندان میں یہ ماحول ہو کہ دُنیوی چیزیں ضرورت کے خانے میں ڈال دی جائیں، دُنیوی چیزیں اہلِ خاندان کے درمیان چرچا کا موضوع نہ ہوں، بلکہ چرچا کا موضوع صرف وہ چیزیں ہوں جن کا تعلق دین اور آخرت سے ہو۔

مزید غور کیجیے تو معلوم ہوگا کہ ہر انسان کے لیے خدا نے اُس کے اہلِ بیت کی صورت میں ایک فطری گروپ فراہم کردیا ہے، جس کے ذریعے وہ تواصی بالحق اور تواصی بالصبر کی عبادت کرسکے۔ حقیقت یہ ہے کہ ایمان اور عملِ صالح کے بعد ہر مومن کی ایک اور ضرورت ہے اور وہ ہے اس کا ذہنی ارتقا۔ اِس ذہنی ارتقا میں مطالعہ اور مشاہدہ کے علاوہ انٹلکچول ایکسچینج بہت زیادہ اہم ہے۔

کسی خاندان کے افراد کا سب سے بڑا رول یہ ہے کہ وہ ایک دوسرے کے لیے انٹلکچول پارٹنز (intellectual partners) بن جائیں، جس طرح کسی اکیڈمی میں کچھ اسکالر ہوں تو وہاں وہ شاپنگ اور آؤٹنگ کی بات نہیں کرتے، بلکہ وہاں وہ سنجیدہ علمی موضوعات پر بات کرتے ہیں۔ یہی معاملہ ہر مومن خاندان کا ہونا چاہیے۔ مومن خاندان کے ہر عورت اور مرد کو یہ کرنا چاہیے کہ وہ ایک دوسرے سے جب بھی بات کریں تو وہ صرف علمی اور دینی موضوعات پر بات کریں۔ دوسرے موضوعات کو قصداً وہ اپنے لیے چرچا کا موضوع نہ بنائیں۔ ہر مومن فیملی کو چاہیے کہ وہ باہمی تبادلۂ خیال کے ذریعے یہ کوشش کرے کہ کسی فردِ خاندان کے اندر منفی جذبات پرورش نہ پائیں۔ ہر ایک مثبت ذہن کے ساتھ جینے والا انسان بن جائے۔

بچوں کی اصلاح کا بھی یہی سب سے زیادہ کارگر ذریعہ ہے۔ عام طور پر ماں باپ صرف یہ جانتے ہیں کہ وہ اپنے بچوں کی خوشی پوری کرتے رہیں، مگر یہ بچوں کے ساتھ محبت نہیں بلکہ وہ بچوں کے ساتھ دشمنی ہے۔ اِس معاملے میں ایک حدیثِ رسول، والدین کے لیے رہ نما اصول کی حیثیت رکھتی ہے:

> مَا نَحَلَ وَالِدٌ وَلَدًا مِنْ نَحْلٍ أَفْضَلَ مِنْ أَدَبٍ حَسَنٍ (الترمذی، حدیث نمبر 1952)۔ یعنی، کسی والد کی طرف سے اُس کی اولاد کے لیے سب سے اچھا عطیہ یہ ہے کہ وہ اُس کو اچھے اخلاق اور آدابِ حیات کی تعلیم دے۔

بچوں کی تعلیم وتربیت کا یہ مقصد اِس طرح حاصل نہیں ہوسکتا کہ والدین اپنے بچوں کو یہ کرو اور وہ نہ کرو (ts's and don'do) کی زبان میں کچھ ہدایات دیتے رہیں، بلکہ یہ مقصد صرف اِس طرح حاصل ہوسکتا ہے کہ پورے گھر کے اندر تواصی بالحق اور تواصی بالصبر کا ماحول قائم ہوجائے۔ گھر کے اندر چرچا کا موضوع صرف ایک ہو اور وہ حق اور صبر ہو۔

ڈسپلن کی اہمیت

ڈسپلن (discipline) کا مطلب انضباط ہے۔ ڈسپلن کو ایک لفظ میں انضباطی کردار (controlled behaviour) کہہ سکتے ہیں۔ اِس کا تعلق دراصل اجتماعی زندگی سے ہے۔ سادہ طور پر کہہ سکتے ہیں کہ ڈسپلن کا مطلب ہے عملی زندگی میں دوسروں کی رعایت کرنا۔

زندگی کی دو صورتیں ہیں۔ ایک یہ کہ آدمی صرف اپنے آپ کو جانے۔ وہ اپنی خواہش کے مطابق، زندگی گزارے۔ اُس کے اندر دوسروں کی پروا کرنے کا مزاج نہ ہو۔ ایسی زندگی ڈسپلن کے خلاف زندگی ہے۔ اِس کے برعکس، دوسرا انسان وہ ہے جو دوسروں کی رعایت کرنا جانتا ہو، جو اپنی گفتگو اور اپنے سلوک میں ہمیشہ یہ دھیان رکھے کہ دوسروں کے اوپر اس کا کیا اثر پڑے گا۔ اس کی کسی بات پر دوسرا شخص ناگواری کا اظہار کرے تو وہ فوراً اپنی غلطی کو مانتے ہوئے اپنی اصلاح کرے — یہ ڈسپلن کے ساتھ زندگی گزارنا ہے۔

ڈسپلن کوئی سادہ چیز نہیں۔ ڈسپلن دراصل کائناتی اخلاق کا دوسرا نام ہے۔ وسیع خلا میں سیارے اور ستارے مسلسل طور پر حرکت کرتے ہیں، لیکن اُن میں کبھی ٹکراؤ نہیں ہوتا، جنگل میں مختلف قسم کے جانور رہتے ہیں، لیکن ہر ایک اپنی جبلّت (instinct) کی کامل طور پر پابندی کرتا ہے۔ یہی وہ پابند کردار ہے جس کو انسانی زندگی کے اعتبار سے ڈسپلن کہا جاتا ہے۔

یہ ڈسپلن بے حد ضروری ہے۔ یہ آدمی کی شرافت کی پہچان ہے۔ یہ کسی آدمی کی بلند اخلاقی کو بتاتا ہے۔ ڈسپلن کے ساتھ جینے والا انسان ہی دراصل کامل معنوں میں انسان ہے۔ جو شخص ڈسپلن سے خالی ہو، وہ گویا کہ اعلیٰ انسانی اخلاق سے خالی ہے۔ یہ ڈسپلن کسی کے اندر خارجی ضوابط سے نہیں پیدا ہوتا، وہ آدمی کے داخلی احساس سے پیدا ہوتا ہے۔

ڈسپلن کا اعلیٰ درجہ یہ ہے کہ آدمی دوسروں کے لیے معاون بنے، اور ڈسپلن کا کم سے کم درجہ یہ

ہے کہ آدمی دوسرے کے لیے زحمت (nuisance) پیدا کرنے کا باعث نہ بنے۔

صبر واعراض کا اصول

موجودہ زمانے میں مسلمان عام طور پر شکایت کی نفسیات میں جی رہے ہیں، وہ دوسری قوموں کو غیر بلکہ اپنا دشمن سمجھتے ہیں۔ ان کے مقررین ومحررین ہمیشہ دوسروں کے خلاف شکایت کی زبان استعمال کرتے ہیں۔ اگر ان سے کہا جائے کہ آپ ایسا کیوں کرتے ہیں تو ان کا جواب ہوگا:

Should you ignore Gujarat 2002, Assam, Muzaffarnagar, etc., or the umpteen fake terror cases/encounters or the daily conspiracies of the Sangh Parivar in so many ways that make life difficult for the Muslim community.

مگر اس معاملے میں قرآن کا جواب مختلف ہوگا، اور وہ یہ کہ آپ کو اِس قسم کے منفی واقعات کو نظر انداز ہی کرنا ہے۔ آپ کو اپنے مفروضہ دشمن کی نام نہاد سازشوں کو بھلا کر اپنی زندگی کو مثبت بنیاد پر تعمیر کرنا ہے۔ قرآن میں اس طریقے کو صبر واعراض کہا گیا ہے، اور صبر واعراض کے بغیر کوئی قوم اس دنیا میں ہرگز ترقی نہیں کرسکتی۔

اس سلسلہ میں قرآن کی ایک آیت یہ ہے: وَلَنَصۡبِرَنَّ عَلَىٰ مَآ ءَاذَيۡتُمُونَاۚ (14:12)۔ یعنی، اور جو تکلیف تم ہمیں دوگے ہم اس پر صبر ہی کریں گے۔

اس کا مطلب یہ ہے کہ اس دنیا کو بنانے والے نے اس کو آزادی اور مقابلہ (competition) کے اصول پر بنایا ہے۔ یہاں کوئی بھی نظام ہو، اور کسی کی بھی حکومت ہو، ہمیشہ ایک کو دوسرے سے کچھ نہ کچھ ایذاء (harm) کا تجربہ ہوگا۔ آدمی کو چاہیے کہ وہ اس قسم کے واقعات کو شکایت کا موضوع نہ بنائے بلکہ وہ اس کو مینیج (manage) کرنے کی تدبیر کرے۔

اسی طرح قرآن کی ایک آیت یہ ہے: وَإِن تَصْبِرُوا وَتَتَّقُوا لَا يَضُرُّكُمْ كَيْدُهُمْ شَيْئًا (3:120)۔ یعنی، اگر تم صبر کرو اور اللہ سے ڈرو تو ان کی کوئی سازش تم کو نقصان نہ پہنچائے گی۔

اس کا مطلب ہے کہ فطرت کے نظام کے مطابق اس دنیا میں اصل مسئلہ سازش (conspiracy) کی موجودگی نہیں ہے، بلکہ اصل مسئلہ یہ ہے کہ لوگوں کے اندر صبر اور تقویٰ کی صفت نہ پائی جائے۔ اس لیے سازش کے خلاف شکایت کرنا مکمل طور پر ایک بے فائدہ کام ہے۔ کرنے کا اصل کام یہ ہے کہ لوگوں کے اندر صبر اور تقویٰ کی صفت پیدا کی جائے تاکہ سازش کرنے والوں کی سازش عملاً موثر نہ ہو سکے۔

قرآن کی تعلیمات کا ایک پہلو یہ ہے کہ وہ انسان کو یہ بتاتا ہے کہ انسان کے بارے میں خالق کا تخلیقی منصوبہ (creation plan) کیا ہے۔ انسان کو چاہیے کہ وہ اس تخلیقی منصوبہ کو جانے، اور اس کے مطابق اپنی سرگرمیوں کا نقشہ بنائے۔ کوئی فرد یا کوئی قوم اگر اس تخلیقی منصوبے کو نظر انداز کرے اور خود اپنے ذہن کے مطابق اپنے عمل کا منصوبہ بنائے تو یقینی طور پر اس دنیا میں اس کا منصوبہ ناکام ہو جائے گا۔ یہی حقیقت پسندی ہے، اور اس دنیا میں حقیقت پسندی ہی سب سے بڑا اصول ہے۔

قرآن میں انسان کی پیدائش کی حکمت کو ان الفاظ میں بیان کیا گیا ہے: الَّذِي خَلَقَ الْمَوْتَ وَالْحَيَاةَ لِيَبْلُوَكُمْ أَيُّكُمْ أَحْسَنُ عَمَلًا (67:2)۔ یعنی، اللہ نے موت اور زندگی کو پیدا کیا تاکہ وہ تم کو جانچے کہ تم میں سے کون اچھے عمل والا ہے۔

اس حکمت ابتلا کی بنا پر، ہر انسان کو کامل آزادی دی گئی ہے۔ جب انسان اپنی آزادی کو اپنی مرضی کے مطابق استعمال کرتا ہے تو اس سے فطری طور پر دنیا میں چیلنج اور مسابقت (competition) کا ماحول پیدا ہوتا ہے۔

چیلنج اور مسابقت کا یہ ماحول لازماً دنیا میں رہے گا۔ اس بنا پر یہاں لازماً ایسا ہوگا کہ

ایک کو دوسرے کی طرف سے غیر مطلوب صورت حال (unwanted situation) کا سامنا پیش آئے گا۔ اس صورت حال کے خلاف شکایت کرنا بھی بے فائدہ ہے، اور اس سے لڑنا بھی بے فائدہ۔ کامیابی کا طریقہ یہ ہے کہ آدمی حکیمانہ تدبیر کے ساتھ اس کا سامنا کرے۔ خالق کے قائم کردہ نظام کے مطابق اس دنیا میں کامیابی کا یہی واحد اصول ہے۔

اسی حکیمانہ روش کا نام صبر و اعراض ہے۔ صبر و اعراض دانش مندانہ طریقِ زندگی کا دوسرا نام ہے۔ صبر و اعراض اپنی حقیقت کے اعتبار سے اقدام ہے، اگرچہ نادان لوگ اس کو پسپائی سمجھ لیتے ہیں۔ صبر و اعراض اعلیٰ انسانی اخلاق کا دوسرا نام ہے۔

صبر — ایک عظیم عمل

اگر آدمی ایک چیز کے کھونے پر صبر کرلے تو اس کے بعد وہ اس سے زیادہ بڑی چیز پالیتا ہے جس کے کھونے پر اس نے صبر کیا تھا — یہ فطرت کا ایک قانون ہے۔ آدمی جب صبر کرتا ہے تو اس کا صبر ایک ایسی چیز پر ہوتا ہے جو فطرت کے قانون کے مطابق پیش آئی تھی، جس میں آدمی کو کوئی اختیار نہیں۔ اس طرح صبر کا مطلب یہ ہے کہ نہ ملنے والی چیز پر محرومی کو بطور واقعہ تسلیم کرنا، اور ملنے والی چیز کے حصول کے لیے اپنی کوشش کو جاری رکھنا۔

صبر (patience) کوئی بے عملی کا واقعہ نہیں۔ بلکہ صبر ایک عظیم عمل ہے۔ صبر اپنی حقیقت کے اعتبار سے یہ ہے کہ آدمی کی زندگی میں کوئی ناخوشگوار واقعہ پیش آئے تو وہ اس پر افسوس کرکے اپنا وقت ضائع نہ کرے، بلکہ وہ اس کو بھلا دے۔ یہی صابرانہ روش ہے۔ اس صابرانہ روش کا یہ فائدہ ہے کہ آدمی بقیہ وقت کو اس مقصد کے لیے استعمال کرتا ہے کہ نئے عزم کے ساتھ اپنے عمل کی نئی منصوبہ بندی کرے۔ وہ نئے مواقع (opportunities) کو دریافت کرکے ان کو استعمال کرے۔ کھونے کے بعد بھی اس کے پاس جو کچھ بچا ہے اس کو منظم انداز میں کام میں لانے کی کوشش کرے۔ وہ گزرے ہوئے ناخوشگوار واقعے کو اپنے لیے

ایک تجربہ بنا لے۔ وہ اس سے سبق سیکھے اور آئندہ زیادہ بہتر انداز میں اپنے عمل کا نقشہ بنائے۔

پرانا مقولہ ہے کہ صبر تلخ است ولیکن بر شیریں دارد (صبر کڑوا ہے، لیکن اس کا پھل میٹھا ہوتا ہے)۔ دنیا کا قانون یہ ہے کہ بے صبری ہمیشہ آدمی کے لیے نقصان دہ ہوتا ہے۔ اور صبر آدمی کو اس قابل بناتا ہے کہ وہ ایک چانس کو کھونے کے بعد دوسرے چانس کو نہ کھوئے، وہ دوسرے چانس کو استعمال کرتے ہوئے اپنے اس نقصان کی تلافی کر لے۔ اس دنیا کے بنانے والے نے اس کو اس طرح بنایا ہے کہ وہ مواقع سے بھری ہوئی ہے۔ ایک موقع کو کھونا، کبھی خاتمہ کے ہم معنی نہیں ہوتا، بلکہ وہ نئے موقع کو دریافت کر کے اس کو استعمال کرنے کے ہم معنی ہوتا ہے۔

صبر پر بے حساب اجر

قرآن میں صبر کو بہت زیادہ اہمیت دی گئی ہے۔ ایک آیت کے الفاظ یہ ہیں: إِنَّمَا يُوَفَّى ٱلصَّٰبِرُونَ أَجۡرَهُم بِغَيۡرِ حِسَابٍ (39:10)۔ یعنی، بے شک صبر کرنے والوں کو ان کا اجر بے حساب دیا جائے گا۔ صبر کی اتنی زیادہ اہمیت اس لیے ہے کہ صبر (patience) آدمی کو اس قابل بناتا ہے کہ وہ مثبت اعمال کر سکے، جو غیر معمولی اجر کا باعث بنتے ہیں۔

اصل یہ ہے کہ اسلام میں ساری اہمیت تعمیر شخصیت کی ہے، جس کو قرآن میں تزکیہ (20:76) کہا گیا ہے۔ موجودہ دنیا امتحان (test) کی دنیا ہے۔ یہاں مسلسل طور پر دوسروں کی طرف سے ایسے حالات پیش آتے رہتے ہیں، جو آدمی کو گوارا نہیں ہوتے، جو آدمی کے اندر نفرت، غصہ، اشتعال اور منفی سوچ جیسی کیفیات پیدا کر دیتے ہیں۔ اس قسم کی منفی کیفیات آدمی کو مسلسل طور پر ڈسٹریکٹ (distract) کرتی رہتی ہیں۔ وہ آدمی کی توجہ کو صحیح رخ سے ہٹا کر غلط رخ کی طرف کر دیتی ہیں۔

یہ ایک تباہ کن صورت حال ہے۔ مگر یہ ناموافق صورتِ حال فطرت کے نظام کا ایک لازمی حصہ ہے۔ کوئی آدمی اس ناخوش گوار صورت حال کا خاتمہ کرنے پر قادر نہیں۔ ایسی

حالت میں اس کے مضر انجام سے اپنے کو بچانے کی صورت صرف یہ ہے کہ آدمی ہر ایسے ناخوش گوار موقعے پر صبر کا طریقہ اختیار کرے۔

صبر کی یہ اہمیت تدبیر کے اعتبار سے ہے۔ صبر کی یہ اہمیت اس لیے ہے کہ وہ آدمی کو ردعمل سے بچاتا ہے، اور ردعمل (reaction) ہر قسم کی برائیوں کی جڑ ہے۔ ہر برائی ابتداءً کسی ناخوشگوار واقعہ کے خلاف ردعمل سے پیدا ہوتی ہے، اور پھر بڑھ کر وہ بگاڑ (breakdown) کی آخری حد تک پہنچ جاتی ہے۔ صبر آدمی کو ردعمل سے بچاتا ہے، اور جو شخص اپنے آپ کو ردعمل سے بچالے، وہ گویا تمام برائیوں سے محفوظ ہو گیا۔

صبر کا فائدہ

قرآن کی ایک آیت یہ ہے: وَجَعَلْنَا بَعْضَكُمْ لِبَعْضٍ فِتْنَةً أَتَصْبِرُونَ (25:20)۔ یعنی، اور ہم نے تم کو ایک دوسرے کے لیے آزمائش بنایا ہے۔ کیا تم صبر کرتے ہو۔ دوسرے الفاظ میں، اس آیت کا مطلب یہ ہے کہ ناپسندیدہ صورتِ حال پیش آنے پر اپنے جذبات پر کنٹرول رکھو تاکہ تمھارے لیے مواقع کو اویل کرنا ممکن ہو۔ جذبات سے مغلوب ہو کر عمل کرنے کا نتیجہ ہمیشہ ناکامی ہوتا ہے، اور جذبات کو قابو میں رکھ کر عمل کرنے کا نتیجہ ہمیشہ کامیابی۔ ابن عباس نے اس آیت کی تفسیر اس طرح کی ہے:

> میں نے تم سب کو ایک دوسرے کے لیے آزمائش بنایا ہے تاکہ تم جو بھی ناپسندیدہ بات سنو، یا اختلاف دیکھو تو صبر کرو: لِتَصْبِرُوا عَلَى مَا تَسْمَعُونَ مِنْهُمْ وَتَرَوْنَ مِنْ خِلَافِهِم (تفسیر البغوی، جلد 6، صفحہ 77)۔ یعنی، اور درست راستہ اختیار کرو۔

اصل یہ ہے کہ منصوبۂ تخلیق کے مطابق، موجودہ دنیا میں ہر انسان کو کامل آزادی حاصل ہے۔ اِس بنا پر ہمیشہ ایسا ہوتا ہے کہ ہر انسان اپنے مصالح کے تحت اقدامات کرتا ہے۔ یہ اقدام مکمل معنوں میں دوسروں کے مطابق نہیں رہتا۔ بظاہر اس کا کچھ حصہ آپ خلاف ہوگا تو

کچھ آپ کے موافق ہوگا۔ اِس دنیا کے لیے فطرت کا قانون یہی ہے کہ یہاں کسی شخص یا گروہ کو جزئی مواقع (partial opportunities) ملیں، کسی کو بھی یہاں کلّی مواقع حاصل نہیں ہوتے۔ اِس لیے دانش مندی یہ ہے کہ ناموافق پہلوؤں کو نظر انداز کیا جائے اور موافق پہلوؤں کو دریافت کرکے اُنھیں استعمال کیا جائے۔

یہ حقیقت ایک حدیثِ رسول سے مزید واضح ہوتی ہے:

إِنَّ اللّٰهَ عَزَّ وَجَلَّ لَيُؤَيِّدُ الْإِسْلَامَ بِرِجَالٍ مَا هُمْ مِنْ أَهْلِهِ (المعجم الکبیر للطبرانی، حدیث نمبر 14640)۔ یعنی اللہ اسلام کی تائید ایسے لوگوں سے کرے گا، جو اہل اسلام میں سے نہ ہوں گے۔

اِس حدیث میں بتایا گیا ہے کہ ایک انسان، جس کا اسلام سے کوئی تعلق نہیں ہے، وہ اپنے ذاتی انٹرسٹ کے لیے اقدام کرتا ہے۔ اِس اقدام کا مقصد اپنے ذاتی مفاد کو حاصل کرنا ہوتا ہے۔ لیکن اِسی کے ساتھ ایسا ہوتا ہے کہ ایک نئی صورت حال پیدا ہوتی ہے۔ یہ نئی صورت حال نئے مواقع کھولتی ہے۔ اگر اہل اسلام مذکورہ انسان کے مذہب اور فکر کو نظر انداز کریں تو وہ نئے مواقع کو استعمال کرکے اپنے دین اور دنیا دونوں کی تائید کا کام لے سکتے ہیں۔

دانش مندانہ طریقہ

صحابی رسول عمیر بن حبیب بن خماشہ نے اپنے بیٹے کو نصیحت کرتے ہوئے کہا:

وَمَنْ لَا يَرْضَى بِالْقَلِيلِ مِمَّا يَأْتِي بِهِ السَّفِيهُ يَرْضَى بِالْكَثِيرِ (المعجم الاوسط للطبرانی، حدیث نمبر 2258)۔ یعنی، جو شخص نادان کی طرف سے پیش آنے والے چھوٹے شر پر راضی نہ ہوگا، اس کو نادان کے بڑے شر پر راضی ہونا پڑے گا۔

اس قولِ صحابی میں اجتماعی زندگی کی ایک حکمت کو بتایا گیا ہے۔ اجتماعی زندگی کبھی یکساں نہیں ہوتی۔ اجتماعی زندگی میں ہمیشہ مختلف قسم کے مسائل پیش آتے ہیں۔ اس بنا پر بار بار ایسا

ہوتا ہے کہ ایک شخص کو دوسرے کی طرف سے ایسا تجربہ پیش آئے گا جو اس کی مرضی کے خلاف ہوگا، ایسے موقع پر صحیح طریقہ یہ ہے کہ اعراض کیا جائے، نہ کہ ٹکراؤ شروع کر دیا جائے۔

اگر آپ ایسے موقع پر ٹکراؤ کا طریقہ اختیار کریں تو وہ ہمیشہ چین ری ایکشن (chain reaction) کا سبب بنے گا۔ نتیجہ یہ ہوگا کہ آپ ہمیشہ خارجی مسائل میں الجھے رہیں گے، اور کبھی اپنے منصوبے کے مطابق موثر عمل شروع نہ کرسکیں گے۔ دوسروں کے خلاف کارروائی کرنے کا مطلب یہ ہے کہ آدمی نے اپنے آپ کو خود اپنے کام میں استعمال نہیں کیا، بلکہ اس کو دوسروں کی مخالفت میں ضائع کر دیا۔

اس مسئلے کا واحد حل یہ ہے کہ صبر واعراض کا طریقہ اختیار کیا جائے۔ دوسرے الفاظ میں اوائڈنس (avoidance) کا طریقہ۔ اس طرح کے معاملے میں یہی واحد طریقہ قابل عمل ہے، کوئی دوسرا طریقہ اس معاملہ میں ورک (work) کرنے والا نہیں۔ جب آدمی دوسرے کی طرف سے پیش آنے والے ناخوش گوار تجربے پر اعراض کا طریقہ اختیار کرتا ہے تو وہ اس کے لیے ایک پروسیلف (pro-self) طریقہ ہوتا ہے۔ اس طرح وہ خود اپنے وقت اور اپنی انرجی (energy) کو بچاتا ہے، تا کہ اس کو وہ خود اپنے فائدے کے لیے استعمال کرے۔

صبر کی عظمت

ایک حدیث رسول صحیح البخاری اور صحیح مسلم میں آئی ہے۔ صحیح البخاری کے الفاظ یہ ہیں:

عَنْ أَبِي سَعِيدٍ الخُدْرِيِّ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ: إِنَّ نَاسًا مِنَ الأَنْصَارِ سَأَلُوا رَسُولَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ، فَأَعْطَاهُمْ، ثُمَّ سَأَلُوهُ، فَأَعْطَاهُمْ، ثُمَّ سَأَلُوهُ، فَأَعْطَاهُمْ حَتَّى نَفِدَ مَا عِنْدَهُ، فَقَالَ: مَا يَكُونُ عِنْدِي مِنْ خَيْرٍ فَلَنْ أَدَّخِرَهُ عَنْكُمْ، وَمَنْ يَسْتَعْفِفْ يُعِفَّهُ اللّٰهُ، وَمَنْ يَسْتَغْنِ: يُغْنِهِ اللّٰهُ وَمَنْ يَتَصَبَّرْ يُصَبِّرْهُ اللّٰهُ، وَمَا أُعْطِيَ أَحَدٌ عَطَاءً خَيْرًا وَأَوْسَعَ مِنَ الصَّبْرِ (**صحیح البخاری، حدیث**

نمبر1469) ۔یعنی، انصار کے کچھ لوگوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کچھ مانگا۔آپ نے ان کو دے دیا، انھوں نے پھر مانگا، آپ نے پھر دے دیا، انھوں نے پھر مانگا، آپ نے پھر دے دیا۔ یہاں تک کہ جو کچھ تھا آپ کے پاس وہ ختم ہوگیا۔تو آپ نے فرمایا میرے پاس جو کچھ بھی مال ہوگا، میں تم سے بچا نہیں رکھوں گا اور جو شخص سوال سے بچنا چاہے تو اللہ اسے بچا لیتا ہے جو شخص غنا کا طریقہ اختیار کرے تو اللہ تعالیٰ اس کے غنا میں اضافہ کرے گا اور جو شخص صبر کرے گا اللہ تعالیٰ اسے صبر عطا کرے گا اور کسی شخص کو صبر سے بہتر اور کشادہ نعمت نہیں ملی۔

اس کا مطلب یہ ہے کہ پانے کا ایک طریقہ یہ ہے کہ آدمی دوسرے سے مانگ کر حاصل کرلے۔لیکن اس سے زیادہ اعلیٰ طریقہ یہ ہے کہ آدمی محنت کرے، اور خود اپنی محنت کے ذریعہ حاصل کرے۔اس دنیا میں محنت کے ذریعہ پانے کے مواقع ہر ایک کے لیے کھلے ہوئے ہیں۔ ہر آدمی کے لیے یہ ممکن ہے کہ وہ جو کچھ چاہتا ہے، اس کو وہ اپنی محنت کے ذریعہ حاصل کرے۔

محنت کے ذریعہ حاصل کرنا، کوئی سادہ بات نہیں۔ یہ بہت سے مزید فوائد کا ذریعہ ہے۔آدمی جب ذاتی محنت سے حاصل کرنا چاہتا ہے، تو وہ اپنی سوچ میں اضافہ کرتا ہے۔وہ منصوبہ بندی کا طریقہ دریافت کرتا ہے، وہ اپنے آپ کو زیادہ سنجیدہ بناتا ہے۔ وہ اپنے شکر کے جذبات میں اضافہ کرتا ہے۔وہ اپنے اندر ذہنی ارتقا کے عمل کو جاری کرتا ہے، وغیرہ۔

اجتماعی صبر

ایک حدیث رسول ان الفاظ میں آئی ہے:

الْمُؤْمِنُ الَّذِي يُخَالِطُ النَّاسَ وَيَصْبِرُ عَلَى أَذَاهُمْ، أَعْظَمُ أَجْرًا مِنْ الْمُؤْمِنِ الَّذِي لَا يُخَالِطُ النَّاسَ وَلَا يَصْبِرُ عَلَى أَذَاهُمْ (ابن ماجہ، حدیث نمبر 4032)۔ یعنی وہ مومن جو لوگوں کے درمیان رہتا ہے، اور ان کی اذیتوں پر صبر کرتا ہے، وہ زیادہ اجر پاتا ہے اس مومن سے جو لوگوں کے درمیان نہیں رہتا، اور لوگوں کی اذیتوں پر صبر نہیں کرتا۔

اس حدیث میں انفرادی زندگی اور اجتماعی زندگی کے فرق کو بتایا گیا ہے۔ ایک مومن وہ ہے جو نماز و روزہ جیسے ذاتی اعمال کرتا ہے۔ لیکن اجتماعی زندگی میں جب تک وہ لوگوں کے ساتھ شامل نہ ہو تو اس کو ایسے واقعات پیش نہیں آئیں گے جو اجتماعی زندگی میں کسی کو پیش آتے ہیں۔ مثلاً اس کی انا (ego) پر ضرب لگنا۔ اس کو کسی سے ایسی بات سننے کا تجربہ ہونا، جو اس کو افنڈ (offend) کرنے والا ہو۔ اس کو کبھی ایسا سابقہ پیش نہیں آئے گا، جب اس کو یہ محسوس ہو کہ اس کی خدمات کا اعتراف نہیں کیا گیا۔ اس لیے اس کو لوگوں کی طرف سے کسی اذیت کا تجربہ پیش نہیں آئے گا۔ وہ ایک معتدل زندگی گزارے گا۔ اس کو کبھی کسی سے شکایت نہ ہوگی۔ مگر اس قسم کی زندگی کا درجہ اللہ کے یہاں کم ہے۔

اس کے برعکس معاملہ اس مومن کا ہے جو لوگوں کے ساتھ مل کر کام کرتا ہے۔ اس کے ساتھ فطری طور پر ایسا ہوگا کہ کبھی اس کو محسوس ہوگا کہ مجھ کو نظر انداز کیا جارہا ہے، کبھی اس کو محسوس ہوگا کہ اس کی خدمات کا اعتراف نہیں کیا جارہا ہے، کبھی وہ کسی کی بات پر افنڈ ہو جائے گا، کبھی کوئی ایسا واقعہ پیش آئے گا جو اس کو اپنی عزت نفس کے اعتبار سے بظاہر ناقابل برداشت محسوس ہوگا، کبھی اس کو کسی سے انا کا مسئلہ (ego clash) پیش آجائے گا، وغیرہ۔ اس

کے باوجود وہ اللہ کی خاطر اعلیٰ ایمانی روش پر قائم رہے گا۔ گویا کہ وہ اذیتوں کے باوجود ایک بے شکایت (complaint-free) انسان بنا رہے گا۔

ان دونوں قسم کے انسانوں میں سے دوسرے انسان کا درجہ اللہ کے یہاں بہت بڑا ہے۔ کیوں کہ وہ لوگوں کی طرف سے پیش آنے والی اذیت کے باوجود نارمل طریقے سے ایمان واسلام پر قائم رہا۔ دوسروں کی طرف سے اذیت پیش آنے کے باوجود اعتدال پر قائم رہنا، سادہ بات نہیں۔ ایسا انسان بننے کے لیے ضروری ہے کہ وہ ایمان واسلام کے اعتبار سے ایک تیار ذہن (prepared mind) ہو۔ وہ شعوری طور اس حقیقت کو جانتا ہو کہ اجتماعی زندگی میں لازماً خلافِ مزاج باتیں پیش آتی ہیں۔ مگر اپنے ایمان کی حفاظت کے لیے یہ ضروری ہے کہ آدمی مکمل طور پر بے شکایت انسان بن جائے۔

یہ اعلیٰ انسان وہ ہے جو آرٹ آف مینجمنٹ (art of management) کو جانتا ہے۔ جو یہ جانتا ہے کہ کس طرح غیر معتدل واقعہ کو مینج کرکے معتدل واقعہ بنایا جائے۔ جو یہ جانتا ہے کہ کس طرح منفی تجربہ کو مثبت تجربہ میں کنورٹ (convert) کیا جائے۔ جو اس راز سے واقف ہے کہ بہت سی باتیں ایسی ہوتی ہیں جو صرف اس لیے ہوتی ہیں کہ ان کے پیش آنے پر آدمی فوراً ہی ان کو بھلا دے، وہ ان سے کوئی اثر قبول نہ کرے۔

ایسا انسان وہ ہے جو یہ جانے کہ ایمانی زندگی میں یہ کرنا پڑتا ہے کہ جب کوئی خلاف مزاج بات پیش آئے تو اس کو اپنے اوپر نہ لیا جائے، بلکہ اسی وقت اس کو اللہ کے خانے میں ڈال دیا جائے۔ خلاف مزاج تجربہ پیش آنے کی صورت میں وہ یہ کہہ سکے — یہ اللہ کا معاملہ ہے، یہ میرا معاملہ نہیں۔ جب آپ کے ساتھ کوئی خلاف مزاج بات پیش آئے تو اس کو منفی معنی (negative sense) میں نہ لیجیے، بلکہ اس کو ایک موقع (opportunity) کے طور پر دیکھیے۔ یہ موقع کہ فرشتوں (کراماً کاتبین) نے آپ کے ریکارڈ میں لکھا کہ یہ وہ انسان تھا جو اللہ کی خاطر ہر حال میں صبر ورضا کے اصول پر قائم رہا۔

ایسے انسان کو اللہ کے یہاں النفس المطمئنۃ (الفجر، 27 :89) کا درجہ دیا جائے گا۔ یعنی عقد نفسی سے پاک انسان (complex-free soul) کا درجہ۔ یہی وہ انسان ہے کہ جب وہ آخرت میں پہنچے گا تو اس کے لیے جنت کے دروازے اپنے آپ کھلتے چلے جائیں گے، حتیٰ کہ کوئی دروازہ اس کے لیے بند نہ رہے گا۔

صبر پسپائی نہیں

قرآن کی ایک آیت ان الفاظ میں آئی ہے:

وَكَأَيِّنْ مِنْ نَبِيٍّ قَاتَلَ مَعَهُ رِبِّيُّونَ كَثِيرٌ فَمَا وَهَنُوا لِمَا أَصَابَهُمْ فِي سَبِيلِ اللهِ وَمَا ضَعُفُوا وَمَا اسْتَكَانُوا وَاللهُ يُحِبُّ الصَّابِرِينَ (3:146) ۔ یعنی، اور کتنے نبی ہیں جن کے ساتھ ہو کر بہت سے خدا پرستوں نے جنگ کی۔ اللہ کی راہ میں جو مصیبتیں ان پر پڑیں، ان سے نہ وہ پست ہمت ہوئے، نہ انھوں نے کمزوری دکھائی۔ اور نہ وہ دبے۔ اور اللہ صبر کرنے والوں کو دوست رکھتا ہے۔

قرآن کی اس آیت میں سبیل اللہ کے حوالے سے جو بات کہی گئی ہے۔ اس کا تعلق مخصوص طور پر حالت قتال سے نہیں ہے۔ بلکہ یہ حکم عام ہے۔ یعنی دینی زندگی اختیار کرنے کے بعد دنیا میں جو مصائب وشدائد پیدا ہوتے ہیں، اس پر انھوں نے استقامت کا طریقہ اختیار کیا۔

صبر کا لفظی مطلب برداشت کرنا ہے۔ دانش مند انسان کے لیے یہ برداشت برائے برداشت نہیں ہوتی، بلکہ وہ ایک اسٹراٹیجی (strategy) ہوتی ہے۔ یعنی وقتی صورت حال کو نظر انداز کرتے ہوئے مستقبل کا نقشہ بنانا، وقتی حالات سے اوپر اٹھ کر غیر متاثر ذہن کے ساتھ دوبارہ سوچنا، اور یہ معلوم کرنا کہ پیش آمدہ حالات میں زیادہ موثر عمل کیا ہوسکتا ہے۔ صبر کا مطلب پسپائی نہیں ہے، بلکہ زیادہ بہتر اقدام ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ جب

ایک طریق عمل کارگر ثابت نہیں ہوا تو اس کے بعد یہ دریافت کرنا کہ دوسرا زیادہ موثر طریقِ عمل کیا ہوسکتا ہے۔

صبر کی حقیقت یہ ہے کہ آدمی حالات کا شکار (victim) نہ بنے، وہ حالات سے غیر متاثر رہ کر سوچے، وہ ردعمل (reaction) سے اوپر اٹھ کر مثبت ذہن کے ساتھ منصوبہ بندی کرے۔ انسان کی زندگی میں ایسی صورتِ حال بار بار پیش آتی ہے۔ انفرادی زندگی میں بھی اور اجتماعی زندگی میں بھی۔ اس طرح کی صورتِ حال میں جو شخص مذکورہ معنوں میں صبر کا ثبوت دے، وہی اس دنیا میں کامیاب ہوتا ہے۔

اذیت پر صبر

ایک روایت حدیث کی مختلف کتابوں میں آئی ہے۔ مسند احمد کے الفاظ یہ ہیں:

عَنِ ابْنَ عُمَرعَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَ سَلَّمَ أَنَّهُ قَالَ: الْمُؤْمِنُ الَّذِي يُخَالِطُ النَّاسَ، وَيَصْبِرُ عَلَى أَذَاهُمْ، أَعْظَمُ أَجْرًا مِنَ الَّذِي لَا يُخَالِطُهُمْ، وَلَا يَصْبِرُ عَلَى أَذَاهُمْ قَالَ: حَجَّاجٌ: خَيْرٌ مِنَ الَّذِي لَا يُخَالِطُهُمْ (حدیث نمبر 5022)۔

یعنی عبد اللہ ابن عمر کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، وہ مومن جو لوگوں سے مخالطت کرتا ہے، اور ان کی اذیت پر صبر کرتا ہے، وہ اجر میں اس سے زیادہ ہے جو مخالطت نہیں کرتا، اور لوگوں کی اذیت پر صبر نہیں کرتا۔ ایک اور روایت میں یہ الفاظ ہیں، وہ بہتر ہے ان سے جو لوگوں سے مخالطت نہ کرے۔

مخالطت کا مطلب ملنا جلنا (social intercourse) ہے۔ جو شخص اپنے آپ میں جینے والا ہو، اس کو لوگوں کی طرف سے کوئی اذیت نہیں پیش آئے گی۔ لیکن جو شخص لوگوں کے درمیان رہے، لوگوں کے ساتھ اس کا انٹرایکشن ہوتا ہو، لوگوں کے ساتھ اس کے

معاملات پیش آئیں، ایسے آدمی کو فطری طور پر دوسروں کی طرف سے چھوٹی یا بڑی اذیت پیش آئے گی۔

تنہائی کی زندگی گزارنے والے کے مقابلے میں مخالطت کی زندگی گزارنے والا افضل کیوں ہوتا ہے۔اس کا سبب فطرت کا ایک اصول ہے۔فطری نظام کے تحت ہر آدمی بے پناہ صلاحیتوں کے ساتھ پیدا ہوتا ہے۔لیکن یہ صلاحیتیں اس کے اندر بالقوۃ (potential) کے طور پر ہوتی ہیں۔اس بالقوۃ کو بالفعل (actual) بنانے کا طریقہ یہ ہے کہ انسان کو شاک کا تجربہ پیش آئے۔فطرت کا نظام شاکنگ ٹریٹمنٹ (shocking treatment) کے اصول پر قائم ہے۔ جو آدمی شاک کو سہے، اس کے فطری امکانات اَن فولڈ (unfold) ہوتے رہتے ہیں، اس کا ذہنی ارتقا (intellectual development) ہوتا رہے گا۔ اس کے برعکس، جو شخص صدمہ (shock) کو برداشت کرنے کے لیے تیار نہ ہو تو اس کے اندر ذہنی ارتقا کا عمل جاری نہیں ہوگا۔وہ جیسا پیدا ہوا تھا، ویسے ہی مر جائے گا۔

صبر کا وقت عبادت کا وقت ہے

مسجد سے اذان کی آواز بلند ہو تو لوگ جان لیتے ہیں کہ خدا کی عبادت کا وقت آ گیا۔ وہ تیزی سے چل کر مسجد پہنچتے ہیں تا کہ خدا کی عبادت کرکے اُس کا انعام حاصل کرسکیں۔ اسی طرح جب رمضان کے مہینے کا نیا چاند افق پر دکھائی دیتا ہے تو لوگ فوراً سمجھ لیتے ہیں کہ اب روزے کا مہینہ آ گیا۔ وہ ضروری تیاریاں شروع کردیتے ہیں تا کہ رمضان کے روزے رکھ کر وہ ثواب حاصل کرسکیں جو خدا نے روزے کی عبادت میں رکھ دیا ہے۔

اسی طرح صبر بھی ایک عبادت ہے۔ جب بھی وہ وقت آجائے جب کہ خدا کی مرضی پر قائم رہنے کے لیے صبر کی قیمت دینا ضروری ہو گیا ہو تو اس کا مطلب یہ ہے کہ صبر والی عبادت کی ادائیگی کا وقت آ گیا، وہ عبادت جس پر اللہ نے بے حساب اجر کا فیصلہ فرمایا ہے:

إِنَّمَا يُوَفَّى الصَّابِرُونَ أَجْرَهُمْ بِغَيْرِ حِسَابٍ (39:10)۔ یعنی، بیشک صبر کرنے والوں کو ان کا اجر بے حساب دیا جائے گا۔

ایک آدمی آپ کے ساتھ اشتعال انگیزی کرے اور آپ کے اندر غصے کی آگ بھڑک اٹھے تو ایسی حالت میں اللہ کا حکم ہے کہ تم جوابی غصے کی کارروائی نہ کرو بلکہ اِس پر صبر کی روش اختیار کرتے ہوئے اُس آدمی کو معاف کر دو (الشوریٰ، 42:37)۔ گویا کسی کے دل میں غصے کا آنا اُس کے لیے صبر کی عبادت ادا کرنے کے وقت کا آنا ہے۔ یہ عبادت بلا شبہ اُسی طرح مطلوب ہے جس طرح دوسری معروف عبادتیں۔ اللہ تعالی نے اس قسم کے لوگوں کی قدردانی اس طرح فرمائی ہے کہ قرآن میں ان کو اہل ہمت اور اولوالعزم کے خطاب سے نوازا ہے (الشوریٰ، 42:43)۔

یہی معاملہ دوسرے تمام منفی جذبات کا ہے۔ جب بھی ایک آدمی کے اندر کسی کے بُرے سلوک کے نتیجے میں نفرت، انتقام اور حسد جیسے منفی جذبات بھڑکیں تو یہ اس بات کا خاموش اعلان ہوتا ہے کہ اُس آدمی کے لیے صبر کی اعلیٰ عبادت ادا کرنے کا وقت آ گیا۔ وہ فریقِ ثانی کی طرف سے بدسلوکی پر صبر کر کے یک طرفہ طور پر حسن اخلاق کا ثبوت دے اور اس کا مستحق بن جائے کہ اعلیٰ ترین عبادت پر اُس کو اعلیٰ ترین انعام کا مستحق قرار دیا جائے۔

دعوت اور صبر

اسلامی مشن کا پروگرام بنیادی طور پر دو نکات پر مشتمل ہے — دعوت اور صبر۔ دعوت کا مطلب ہے، قرآن کے خدائی پیغام کو تمام انسانوں تک پہنچانا، اور صبر کا مطلب یہ ہے کہ بقیہ تمام امور میں حالتِ موجودہ پر رضامندی کا طریقہ اختیار کرنا۔ جس کو اسٹیٹس کو ازم کہا جاتا ہے۔

یہ صبر بے حد ضروری ہے۔ اس لیے کہ موجودہ دنیا میں خود فطری قانون کے تحت، ہمیشہ ناخوشگوار واقعات پیش آتے ہیں اگر ایسا ہو کہ آدمی ہر ناپسندیدہ صورتِ حال پر لوگوں سے ٹکرانے لگے تو اس کے پاس دعوت کے کام کے لیے وقت ہی نہیں رہے گا۔ دوسری طرف داعی اور مدعو کے درمیان وہ معتدل فضا ختم ہو جائے گی جو دعوت الی اللہ کے کام کے لیے ضروری ہے۔

دعوت کا کام ہمیشہ قربانی پر ہوتا ہے۔ اس قربانی کا تعلق جان و مال کی قربانی سے زیادہ جذبات کی قربانی پر ہے۔ دوسرے انسانوں کی طرف سے بار بار ایسے ناموافق تجربے ہوتے ہیں جو داعی کے اندر منفی نفسیات پیدا کرنے والے ہیں، جو داعی کو نفرت اور انتقام کی طرف لے جانے والے ہیں۔ اگر داعی اس منفی نفسیات سے مغلوب ہو جائے تو دعوت کے کام کی مطلوب فضا ہی ختم ہو جائے گی۔

اس لیے ہر داعی کو جذبات کی قربانی دے کر اپنے آپ کو مثبت نفسیات پر قائم رکھنا پڑتا ہے۔ یہ دعوت کی لازمی شرط ہے۔ اس کے بغیر دعوت کا کام نہیں ہوسکتا۔ اسی کو اسٹیٹس کو ازم کہا جاتا ہے اور شریعت میں اسی کا نام صبر ہے۔ صبر کی اسی قربانی پر دعوت کا کام ہمیشہ انجام پاتا ہے۔ صبر نہیں تو دعوت بھی نہیں۔

صبر دراصل دعوت کی قیمت ہے۔ صبر کی یہ قیمت ادا کرنے کے بعد ہی وہ چیز ظہور میں آتی ہے جس کو دعوت کہا جاتا ہے۔ صبر دوسرے لفظوں میں وہی چیز ہے جس کو تجارت کی اصطلاح میں کسٹمر فرینڈلی بہیویر (customer friendly behaviour) کہا جاتا ہے۔ تاجر اپنے کسٹمر کے ساتھ یک طرفہ طور پر تحمل کا طریقہ اختیار کرتا ہے۔ اسی طرح داعی اپنے مدعو کے معاملے میں یک طرفہ طور پر تحمل کا طریقہ اختیار کرتا ہے۔ اسی مدعو فرینڈلی سلوک کا نام صبر ہے۔

صبر ذہنی ارتقاء کا ذریعہ

اجتماعی زندگی میں بار بار ایسا ہوتا ہے کہ ایک کو دوسرے سے شکایت ہوجاتی ہے۔ ایک کی کسی بات سے دوسرے کے اندر غصہ اور نفرت کے جذبات پیدا ہوجاتے ہیں۔ ایک کا کوئی رویہ دوسرے کے اندر انتقامی جذبات بھڑکا دیتا ہے۔ ایسے موقع پر اکثر لوگ بدلہ کے ذہن سے سوچنے لگتے ہیں۔ وہ سمجھتے ہیں کہ اگر ہم اپنی بے عزتی پر چپ ہوجائیں تو یہ ہماری غیرت کے خلاف ہوگا۔ یہ حمیت اور غیرت سے سودا کرنے کے ہم معنیٰ ہوگا۔

مگر یہ سوچ درست نہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ ایسا موقع ذلت کا موقع نہیں بلکہ وہ فکری اور روحانی ترقی حاصل کرنے کا موقع ہے۔ غصہ کے موقع پر صبر کرنا کوئی سادہ بات نہیں۔ یہ دراصل خود اپنی تربیت کا موقع ہے۔ وہ اپنے اندر یہ صلاحیت پیدا کرنے کا موقع ہے کہ آدمی اپنی داخلی شخصیت کو اتنا مضبوط بنائے کہ وہ خارجی حالات سے اثر لیے بغیر زندہ رہ سکے۔

جو آدمی غصہ اور نفرت اور اشتعال میں مبتلا ہوجائے وہ اپنی اس روش سے اس بات کا ثبوت دے رہا ہے کہ وہ خارجی اشتعال انگیزی کے وقت غیر متاثر نہ رہ سکا۔ ایسے آدمی کا ذہنی اور روحانی سفر رک جائے گا۔ اس کی شخصیت میں فکری ارتقاء کا عمل جاری نہ ہوسکے گا۔

اس دنیا میں پانے کی سب سے بڑی چیز یہ ہے کہ آدمی کا فکر مسلسل ترقی کررہا ہو۔ اسی فکری ترقی سے روحانی ترقی بھی جڑی ہوئی ہے۔ جہاں فکری ارتقاء ہوگا وہاں روحانی ترقی بھی ضرور پائی جائے گی۔ اور یہ فکری ارتقاء اسی وقت ممکن ہے جب کہ آدمی اپنے آپ کو اتنا طاقتور بنائے کہ وہ منفی سوچ کو اپنے اندر داخل ہونے سے روک دے۔

صبر دراصل خود اپنے فکری اور روحانی ترقی کی قیمت ہے۔ اس دنیا میں کوئی بھی چیز ضروری قیمت کے بغیر نہیں ملتی۔ اسی طرح فکری اور روحانی ترقی بھی اس خوش قسمت انسان کا حصہ ہے جو صبر کی صورت میں اس کی قیمت دے سکے۔

صبر وتقویٰ

قرآن میں ارشاد ہوا ہے کہ اس دنیا کی ہر چیز ہم نے جوڑا جوڑا پیدا کی ہے (51:49)۔ یہ فطرت کا ایک آفاقی اصول ہے۔ یہاں جب بھی کوئی واقعہ رونما ہوتا ہے وہ دو چیزوں کے تعامل سے رونما ہوتا ہے۔ کوئی بھی چیز تنہا اس دنیا میں کوئی واقعہ یا نتیجہ ظاہر نہیں کرسکتی۔

اس اصول کا تعلق اجتماعی زندگی سے بھی ہے۔ اسی کو ایک پرانی مثل میں اس طرح بیان کیا گیا ہے کہ تالی ایک ہاتھ سے نہیں بجتی۔ ایک آدمی اپنا ہاتھ فضا میں ہلا تا رہے تو اس سے تالی نہیں بجے گی۔ تالی بجنے کے لیے ضروری ہے کہ دوسرا ہاتھ اس سے ٹکرائے۔ جب تک دوسرا ہاتھ نہ اٹھے تالی کا بجنا بھی رکا رہے گا۔

قرآن سے معلوم ہوتا ہے کہ مخالف کی ضرر رسانی کا معاملہ بھی یہی ہے۔ مخالف کی ضرر رسانی کا ارادہ اس وقت کامیاب ہوتا ہے جب کہ فریقِ ثانی بھی اپنی نادانی یا سادہ لوحی سے اس کے ساتھ تعاون کا معاملہ کر بیٹھے۔ فریقِ ثانی اگر ''دوسرا ہاتھ'' بننے سے رک جائے تو دشمن کی مخالفانہ تالی بھی بجنے والی نہیں۔ قرآن میں بتایا گیا ہے کہ کچھ لوگ اہلِ اسلام کو نقصان پہنچانے پر تلے ہوئے ہیں۔ ان کو اہلِ اسلام سے سخت بغض اور عداوت ہے۔ اس کے بعد فرمایا کہ: وَإِنْ تَصْبِرُوا وَتَتَّقُوا لَا يَضُرُّكُمْ كَيْدُهُمْ شَيْئًا إِنَّ اللَّهَ بِمَا يَعْمَلُونَ مُحِيطٌ (3:120)۔ یعنی، اور اگر تم صبر کرو اور تقویٰ کی روش اختیار کرو تو ان کی کوئی تدبیر تم کو کچھ بھی نقصان نہ پہنچائے گی۔ جو کچھ وہ کر رہے ہیں، اللہ نے ان سب کا احاطہ کر رکھا ہے۔

اس آیت کی تشریح اس طرح کی جاسکتی ہے کہ دشمن کی سازش صرف 50 فی صد کی حد تک کارگر ہے۔ وہ اپنی تکمیل تک صرف اس وقت پہنچتی ہے جب کہ فریقِ ثانی اپنی کسی غلطی سے اس کے منصوبہ کا بقیہ 50 فی صد حصہ پورا کردے۔ صبر وتقویٰ اس بات کی ضمانت ہے کہ

اس کے منصوبہ کا یہ بقیہ نصف حصہ دشمن کو حاصل نہ ہو۔ جب ایسا ہوگا تو اس کی مخالفانہ تدبیر لازمی طور پر بے نتیجہ ہو کر رہ جائے گی۔

اس قانون کے تحت اللہ تعالیٰ نے آپ کے معاملہ کو خود آپ کے ہاتھ میں دے دیا ہے۔

صبر، عجلت

قرآن میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم دیا گیا کہ — پس تم صبر کرو جس طرح ہمت والے پیغمبروں نے صبر کیا، اور ان کے لیے عجلت نہ کرو (46:35)۔ اس سے معلوم ہوا کہ ایک ہے صابرانہ عزیمت، اور دوسری چیز ہے بے صبری اور عجلت۔ ان دونوں میں کیا فرق ہے، اس کو سمجھنے کے لیے قرآن کی ان آیتوں کا مطالعہ کیجیے جو نبوت کے ابتدائی دور میں مکہ میں اُتاری گئیں:

اے کپڑے میں لپٹنے والے، اٹھ اور لوگوں کو ڈرا، اور اپنے رب کی بڑائی بیان کر۔ اور اپنے کپڑے کو پاک رکھ۔ اور گندگی کو چھوڑ دے۔ اور ایسا نہ ہو کہ احسان کرو اور زیادہ بدلہ چاہو۔ اور اپنے رب کے لیے صبر کرو (74:1-7)۔

سورۂ مدثر کی ان آیات کی روشنی میں مذکورہ فرق کو متعین کیا جائے تو وہ یہ ہوگا کہ موجودہ حالات میں صرف انہی چند احکام پر عمل کرو، اور بقیہ تمام معاملات کو صبر کے خانہ میں ڈال دو۔

یعنی انذار و تبشیر کے انداز میں لوگوں کو آخرت کے مسئلہ سے آگاہ کرو۔ اللہ کی عظمت و کبریائی تمہارا موضوعِ کلام بن جائے۔ اچھے اخلاق اور اعلیٰ کردار میں اپنے آپ کو ڈھال لو۔ ہر قسم کی اعتقادی اور عملی برائیوں سے آخری حد تک دور ہو جاؤ۔ لوگوں کے ساتھ بہتر سلوک کرو، مگر ان سے بدلہ پانے کے لیے نہیں بلکہ صرف اللہ کی رضا کے لیے۔

یہ گویا پانچ نکاتی پروگرام تھا جو اس وقت دیا گیا۔ اگرچہ اس وقت مکہ میں اس کے سوا بہت سے مسائل تھے۔ مثلاً کعبہ میں 360 بتوں کا ہونا، سماج میں طرح طرح کے جرائم، مکہ کی پارلی منٹ (دار الندوہ) پر مشرکین کا قبضہ، عرب میں رومی ایمپائر اور ساسانی ایمپائر کا

سیاسی نفوذ، وغیرہ۔ مگر ان سب پر صبر کا حکم دیا گیا۔ دوسرے لفظوں میں یہ کہ اس وقت جن کاموں کے لیے نتیجہ خیز جدوجہد ممکن ہے، ان پر محنت کرو، اور جن کاموں میں بروقت نتیجہ خیز عمل ممکن نہیں ہے ان سب کو مستقبل کے حالات پر چھوڑ دو۔

صبر ایک عظیم نیکی

پروگرام کی دو قسمیں ہیں۔ ایک وہ جس کی حیثیت مثبت پروگرام کی ہو۔ اور دوسری وہ جو اتفاقی ضرورت کے تحت اختیار کی جائے۔ مثلاً صحت بخش غذا ہمارے جسم کی مستقل ضرورت ہے۔ اسی کے ساتھ کبھی جسم کو دوا کی بھی ضرورت ہوتی ہے۔ مگر دوا کی حیثیت صرف وقتی مطلوب کی ہے۔ غذا ہمارے جسم کی مستقل ضرورت ہے اور دوا ہمارے جسم کی صرف اتفاقی ضرورت۔

یہی معاملہ دین کا بھی ہے۔ دین میں صبر کی حیثیت مثبت تعلیم کی ہے۔ صبر ہماری مستقل دینی ضرورت ہے۔ اس کے مقابلہ میں جنگ کی حیثیت صرف وقتی ضرورت کی ہے۔ صبر ایک عظیم نیکی ہے جو ہر وقت اور ہر حال میں مطلوب ہے۔ جب کہ جنگ صرف اس وقت مطلوب ہوتی ہے جبکہ انتہائی ناگزیر حالات میں بطور دفاع اس کی ضرورت پیش آ گئی ہو۔

صبر وہ اہم ترین اصول ہے جو موجودہ امتحان کی دنیا میں ہر وقت اور ہر شخص کو درکار ہے۔ صبر کے بغیر کوئی شخص اس امتحان کے مرحلہ سے کامیابی کے ساتھ گزر نہیں سکتا۔

اس دنیا میں آدمی کو اپنے نفس کے مقابلہ میں صبر کرنا ہے۔ شیطان کی ترغیبات کے مقابلہ میں صبر کرنا ہے۔ دوسرے انسانوں کی طرف سے پیش آنے والی ناخوش گواریوں پر صبر کرنا ہے۔

صبر کی ضرورت ہر لمحہ اور ہر موقع کے لیے ہے۔ نقصان کے موقع پر صبر یہ ہے کہ آپ اپنے کو مایوسی سے بچائیں۔ فائدہ کے موقع پر صبر یہ ہے کہ آپ اپنے اندر اٹھنے والے برتری کے احساس کو کچل کر ختم کر دیں۔ بیماری کے موقع پر صبر یہ ہے کہ آپ آہ و فغاں نہ کریں۔ صحت کے موقع پر صبر یہ ہے کہ آپ اپنے اندر فخر و ناز کے جذبات کو نہ اٹھنے دیں۔ اشتعال انگیزی کے موقع پر صبر یہ

ہے کہ آپ اپنے کو مشتعل ہونے سے بچائیں۔ اور جب کوئی شخص آپ کی تعریف کرے تو اس وقت صبر یہ ہوگا کہ آپ اس سے کبر کی غذا لینے کے بجائے سراپا تواضع بن جائیں۔

صبر کوئی انسانی قانون نہیں، وہ خود فطرت کا ایک قانون ہے۔ اس کا تعلق زندگی کے ہر معاملہ سے ہے، خواہ وہ معاملہ انفرادی ہو یا اجتماعی۔

صبر بہادری ہے

صبر بہادری ہے، اور بے صبری بزدلی۔ جو لوگ صبر کرنے پر تیار نہ ہوں انھیں آخر کار بزدل بن کر اس دنیا میں رہنا پڑے گا۔ اور بزدلی کا دوسرا نام منافقت ہے جس سے زیادہ بری اخلاقی صفت اور کوئی نہیں۔

موجودہ دنیا میں خود فطری نظام کے تحت بار بار ایسا ہوتا ہے کہ ایک انسان کو دوسرے انسان سے شکایت پیدا ہوتی ہے۔ ایک انسان کو دوسرے انسان سے کوئی ذہنی یا جسمانی تکلیف پہنچتی ہے یہ ایک لازمی صورت حال ہے۔ یہ معاملہ انسانی زندگی کے آغاز ہی میں ہابیل اور قابیل کے ٹکراؤ کی صورت میں پیدا ہوا۔ اس کے بعد وہ تاریخ کے ہر دور میں، حتیٰ کہ پیغمبروں کے زمانہ میں بھی جاری رہا، وہ اسی طرح جاری رہے گا یہاں تک کہ قیامت آجائے اور خود اس دنیا ہی کا خاتمہ ہو جائے۔

ایسی حالت میں کسی بھی انسان کے بس میں نہیں کہ وہ اپنی پسند کے عین مطابق ایسی زندگی حاصل کرلے جہاں اس کو نہ کسی سے شکایت ہو اور نہ کسی سے اختلاف۔ ایسا انتخاب موجودہ دنیا میں کسی کے لیے ممکن ہی نہیں، نہ صالحین کے لیے اور نہ غیر صالحین کے لیے۔

موجودہ دنیا میں حقیقی انتخاب صرف دو روش کے درمیان ہے۔ آپ یا تو گھر سے باہر تک ہر ایک سے مسلسل لڑتے رہیں یا شکایت و اختلاف کو نظر انداز کرتے ہوئے اپنی زندگی کی تعمیر کریں۔ پہلی روش اگر پھول کے درخت میں اس کے کانٹوں سے الجھنے کا نام ہے تو اس

کے مقابلہ میں دوسری روش یہ ہے کہ کانٹے کو نظر انداز کرتے ہوئے اس کے پھول کو لے لیا جائے۔

مگر پہلی روش کسی کے لیے بھی مستقل طور پر ممکن نہیں کیوں کہ وہ اپنی اور اپنے گھر کی تباہی کے ہم معنی ہے۔ اور کوئی بھی اتنا نادان نہیں کہ وہ مستقل طور پر اپنے آپ کو اور اپنے گھر والوں کو تباہی کے گڑھے میں ڈال دے۔ اس لیے عملاً یہ ہوتا ہے کہ بے صبری کی روش اختیار کرنے والے وقتی طور پر دوسروں سے لڑتے ہیں اور آخر کار اس کا تباہ کن نتیجہ دیکھ کر خاموشی اختیار کر لیتے ہیں مگر ایسی خاموشی کا مطلب منافقت ہوتا ہے۔

موجودہ دنیا میں آپ کو بہر حال صبر کرنا ہے۔ اگر آپ اصول کی بنیاد پر صبر نہ کریں تو آپ کو مفاد کی بنیاد پر صبر کرنا پڑے گا اور اسی دوسری روش کا نام منافقت ہے۔

صبر کی جیت

ایک امریکی مثل ہے کہ صبر کی جیت ہوتی ہے (patience conquers)۔ صبر کی فاتحانہ صفت کے بارے میں یہ ایک عالمی تجربہ ہے جو مختلف الفاظ میں ہر زبان میں پایا جاتا ہے۔ دنیا میں جس شخص نے بھی کوئی بڑی کامیابی حاصل کی ہے، اس نے بلاشبہ صبر و تحمل کے ذریعہ اس کو حاصل کیا ہے۔

دنیا میں کامیابی حاصل کرنے کے لیے صبر کی ضرورت کیوں پڑتی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ دنیا بے شمار ناموافق اسباب سے بھری ہوئی ہے۔ یہاں کا ہر آدمی دوسرے آدمی کے لیے ایک رکاوٹ ہے۔ دنیا کی مثال ایک ایسے باغ کی ہے جہاں نہایت خوش نما پھول ہیں۔ مگر ان پھولوں کا راستہ بے شمار کانٹوں سے ہو کر گزرتا ہے۔ کانٹوں کو برداشت کیے بغیر پھولوں تک پہنچنا ممکن نہیں۔

زندگی کا یہی وہ پہلو ہے جو ہر آدمی کے لیے صبر و تحمل کو ضروری قرار دے دیتا ہے۔

اس دنیا میں جو آدمی صبر کرنے پر راضی نہ ہو وہ خود اپنا ہی نقصان کرے گا۔ کیوں کہ اپنی بے صبری کی بنا پر جگہ جگہ وہ دوسرے انسانوں سے الجھتا رہے گا۔ اور پھر اپنی منزل مقصود تک پہنچنا اس کے لیے ممکن نہ ہو سکے گا۔

کوئی بھی انسان اتنا طاقت ورنہیں کہ وہ اپنے مزاج کے خلاف چیزوں کا بالکل خاتمہ کر دے، یا اپنے مخالف انسانوں پر بلڈوزر چلا دے۔ ایسی حالت میں ہر شخص کے لیے کامیابی کا ایک ہی راستہ ہے — وہ ناموافق چیزوں پر صبر کرے، اور حکمت کا طریقہ اختیار کرکے اپنے مقصد کو حاصل کرنے کی کوشش کرے۔

مشکلات کو ہم صبر ہی کے ذریعہ حل کر سکتے ہیں۔ ناپسندیدہ اشخاص سے ہم درگزر کرکے ہی نپٹ سکتے ہیں۔ مخالفین کی سازشوں کو ہم تحمل کرکے ہی ناکام بنا سکتے ہیں۔ جو لوگ ہمارے سفر میں رکاوٹ بنیں، ان سے اعراض کرکے ہی ہم اپنا سفر کامیابی کے ساتھ جاری رکھ سکتے ہیں۔ ہمیں ہر حال میں صبر ہی کرنا ہے۔ کیوں کہ اس دنیا کے سوا کوئی اور دنیا بنانے پر ہم قادر نہیں۔

صبر بے عملی یا بزدلی نہیں، صبر زندگی کا ایک اعلیٰ اصول ہے۔ وہ آدمی جو پختہ عقل کا مالک ہو، وہ صبر کی روش اختیار کرنے والا بھی ضرور ہوگا۔

غیر صابرانہ عمل

صبر دراصل پرکٹکل وزڈم (practicle wisdom) کی بنیاد پر منصوبہ بندی کا دوسرا نام ہے۔ اصل یہ ہے کہ جب بھی آپ کوئی بڑا کام کرنا چاہیں گے تو فرد کی سطح پر ہو، یا اجتماع کی شکل میں، ہمیشہ ایسا ہوگا کہ کچھ اجتماعی حالات موجود ہوں گے۔ ان حالات کی موجودگی یہ سوچنا ہوگا کہ آپ اپنا کارگر لائحہ عمل کیسے بنائیں۔ اس قسم کا لائحہ عمل ہمیشہ اس کا طالب ہوتا ہے کہ آپ پرکٹکل وزڈم کا طریقہ اختیار کریں۔ ٹکراؤ کو اوائڈ (avoid) کرتے ہوئے پیس فل بنیاد پر اپنا منصوبہ بنانا۔

حقیقت یہ ہے کہ وقت کے موجود حالات (existing situation) کی رعایت کے ساتھ ہی کوئی فرد یا گروہ اپنے لیے نتیجہ خیز منصوبہ بندی کرسکتا ہے۔ اسی کا نام ہے پرکٹکل وزڈم۔ مثلاً مکہ کے لیڈروں نے جب رسول اور اصحاب رسول سے عملاً یہ مطالبہ کیا کہ آپ لوگ مکہ چھوڑ کر باہر چلے جائیں تو آپ نے بغیر مزاحمت کے اس کو مان لیا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ اس وقت کے حالات کے لحاظ سے پرکٹکل وزڈم کا تقاضا یہی تھا۔

جوابی اقدام صبر نہیں ہے۔ صبر یہ ہے کہ آپ صورت حال کے خلاف جوابی اقدام نہ کریں، بلکہ جوابی اقدام سے بچتے ہوئے اعراض (avoidance) کی بنیاد پر اپنا منصوبہ بنائیں۔ موجودہ دور کے مسلمانوں کا جائزہ لیا جائے تو ایک عام بات جو سامنے آتی ہے، وہ یہ ہے کہ مسلمانوں کی ڈکشنری میں ظلم کا لفظ تو بتکرار ہے، لیکن ری ٹیلیشن کا لفظ نہیں ہے۔ ری ٹیلیشن (retaliation) کیا ہے۔ اس کا مطلب ہے کسی کو نقصان پہنچانے کا کام کرنا، اس سبب سے کہ اس نے پہلے نقصان پہنچانے کا کام کیا ہے، یعنی انتقام:

> the action of harming someone because they have harmed oneself; revenge.

موجودہ زمانے کا تجربہ بتاتا ہے کہ جس چیز کو مسلمان ظلم کہتے ہیں، وہ عام طور پر ردعمل ہوتا ہے۔ یعنی خود مسلمانوں کے کسی غیر صابرانہ عمل (جذباتی عمل) کے بعد فریقِ ثانی کی طرف سے جوابی کارروائی۔ اس طرح کے کیس میں مسلمان اگر فریقِ ثانی کے ردعمل کو ظلم خیال کریں، اور اس کے لیے بددعائیں کریں تو اس کی بنا پر وہ ظلم نہیں بن جائے گا، وہ غیر صابرانہ عمل کا ریٹیلیشن ہی رہے گا۔

حقیقت پسندی

اگر آپ میدان میں ہوں اور بارش آجائے تو آپ بھاگ کر سایہ کے نیچے چلے جاتے ہیں۔ یہ پسپائی نہیں ہے بلکہ حقیقت پسندی ہے۔ اسی طرح اگر زلزلہ آجائے تو آپ گھر سے نکل کر کھلے میدان میں آجاتے ہیں۔ یہ بھی پسپائی نہیں ہے بلکہ ایک فطری حقیقت کا اعتراف ہے۔ جہاں انسان کا اور فطرت کا معاملہ ہو وہاں مسئلہ کا حل صرف اعتراف ہوتا ہے، نہ کہ ٹکراؤ۔

بارش اور زلزلہ کا نظام جو خالق فطرت نے دنیا میں رکھ دیا ہے۔ انسان اس کو بدلنے پر قادر نہیں۔ انسان صرف یہ کرسکتا ہے کہ اپنے آپ کو اس کے نقصان سے بچانے کی تدبیر کرے۔ اور اس کے نقصان سے بچنے کی واحد تدبیر یہ ہے کہ اعراض کا اصول اختیار کرتے ہوئے اپنے آپ کو اس کی زد سے ہٹا دیا جائے۔ اسی لیے آپ بارش کے وقت سایہ میں آجاتے ہیں اور زلزلہ کے وقت میدان میں۔

ٹھیک یہی معاملہ صبر اور اعراض کے اصول کا بھی ہے۔ صبر اور اعراض کا رویہ کسی قسم کی بزدلی یا پسپائی نہیں ہے۔ وہ سادہ طور پر صرف حقیقت پسندی ہے۔ اس کی ضرورت اس لیے ہے کہ خالقِ فطرت نے انسان کو امتحان کی غرض سے آزادی عطا کی ہے۔ انسان اپنی آزادی کا استعمال کبھی صحیح کرتا ہے اور کبھی غلط۔ اب آپ کیا کریں۔ اگر آپ ہر انسان سے لڑنے لگیں تو لوگوں سے آپ ان کی آزادی چھین نہیں سکتے۔ کیوں کہ یہ آزادی ان کو خود مالکِ کائنات نے دے رکھی ہے، لوگوں کی آزادی چھیننے کی بے فائدہ کوشش کا نتیجہ صرف یہ ہوگا کہ آپ اپنے نقصان میں اضافہ کرلیں گے۔

ایسی حالت میں صرف ایک ہی ممکن رویہ ہے۔ اور وہ وہی ہے جس کو صبر

(patience) کہا جاتا ہے۔ یعنی لوگوں کی طرف سے اگر کبھی تلخی اور ناگواری پیش آجائے تو اس سے اعراض کرتے ہوئے اپنا سفرِ حیات جاری رکھا جائے۔

صبر واعراض دوسروں کا مسئلہ نہیں، وہ خود اپنا مسئلہ ہے۔ بے صبری آدمی کے سفر کو روک دیتی ہے۔ اور صبر اس بات کو ممکن بناتا ہے کہ آدمی کی زندگی کا سفر کامیابی کے ساتھ جاری رہے، یہاں تک کہ وہ اپنی منزلِ مقصود پر پہنچ جائے۔

نظامِ فطرت

ایک شاعر کا قطعہ ہے۔ اپنے ان دو شعروں میں اس نے نہایت سادہ طور پر زندگی کی حقیقت بتادی ہے۔ وہ قطعہ یہ ہے:

کہا: کیا اونٹ پر بیٹھوں — کہا: ہاں اونٹ پر بیٹھو
کہا: کوہان کا ڈر ہے — کہا: کوہان تو ہوگا
کہا: دریا میں کیا اتروں — کہا: دریا میں ہاں اترو
کہا: طوفان کا ڈر ہے — کہا: طوفان تو ہوگا
کہا: کیا پھول کو توڑوں — کہا: ہاں پھول کو توڑو
کہا: پُرخار کا ڈر ہے — کہا: پُرخار تو ہوگا

یہی موجودہ دنیا میں زندگی کی حقیقت ہے۔ یہاں اونٹ ہے تو کوہان بھی ہے۔ یہاں ہموار پیٹھ والا کوئی اونٹ موجود نہیں۔ یہاں دریا میں طوفان کا مسئلہ بھی ہے، یہاں کوئی ایسا دریا نہیں پایا جاتا جس میں سکون ہی سکون ہو، تموج (waves) نام کی کوئی چیز وہاں موجود نہ ہو۔ اسی طرح یہاں خدا کے اگائے ہوئے باغ میں اگر خوب صورت پھول ہیں تو اسی کے ساتھ خار (نوک دار کانٹے) بھی۔

اس کا مطلب یہ ہے کہ اس دنیا میں جو آدمی کوئی چیز حاصل کرنے کا خواہش مند ہو اس کو پیشگی طور پر یہ جان لینا چاہیے کہ یہاں ترقی کا سفر کبھی ہموار راستوں سے طے نہیں ہوتا۔ یہاں مسائل پر قابو پانے کے بعد ہی کسی آدمی کے لیے کامیابی کے دروازے کھلتے ہیں۔ جو آدمی مسائل ومشکلات کو عبور کرنے کا حوصلہ نہ رکھتا ہو، اس کو خدا کی اس دنیا میں کسی قسم کی کامیابی کی امید بھی نہ رکھنا چاہیے۔

خدا کی دنیا ویسی ہی رہے گی جیسا کہ اس کو بنایا گیا ہے۔ اس کو بدلنا یقینی طور پر ہمارے لیے ممکن نہیں۔ ایسی حالت میں کسی انسان کے لیے یہاں زندگی اور کامیابی کی صرف ایک صورت ہے — دنیا میں قائم شدہ نظامِ فطرت سے وہ اپنے آپ کو ہم آہنگ کرلے۔ اس کے سوا ہر دوسری صورت آدمی کی ناکامی میں اضافہ کرنے والی ہے، نہ کہ اس کو کامیابی کی منزل تک پہنچانے والی۔

صبر کا انعام

قرآن میں بتایا گیا ہے کہ صبر کرنے والوں کو بے حساب انعام دیا جائے گا: إِنَّمَا يُوَفَّى الصَّابِرُونَ أَجْرَهُمْ بِغَيْرِ حِسَابٍ (39:10)۔ یعنی، بیشک صبر کرنے والوں کو ان کا اجر بے حساب دیا جائے گا۔ قرآن کی اس آیت میں جو بات بیان کی گئی ہے، وہ کوئی پر اسرار بات نہیں ہے، وہ ایک معلوم حقیقت کا بیان ہے۔ وہ میدانِ جنگ میں صابرانہ لڑائی سے متعلق نہیں ہے، بلکہ وہ ایمانی زندگی میں صابرانہ روش سے متعلق ہے۔

اس آیت میں انعام سے مراد مومن کے شخصی ارتقا (personality development) میں اضافہ ہونا ہے۔ اس کو ایک مثال سے سمجھا جاسکتا ہے۔ قدیم زمانے میں سیب سے رس (juice) نکالنے کے لیے سادہ طریقہ استعمال ہوتا تھا۔ اس لیے رس کی مقدار کم ہوا کرتی تھی۔ موجودہ زمانے میں سیب سے رس نکالنے کے لیے مشینی دباؤ (mecahnical

pressure) استعمال کیا جاتا ہے۔ اسی وجہ سے موجودہ زمانے میں سیب کی اسی مقدار سے بہت زیادہ جوس نکالا جاتا ہے، جتنا کہ پہلے نکلتا تھا۔

اصل یہ ہے کہ انسان کے اندر پوٹنشل کی مقدار بہت زیادہ ہوتی ہے۔ کم پریشر میں وہ کم نکلتا ہے، لیکن جب پریشر بڑھ جائے، تو اس کی مقدار بھی بہت زیادہ ہوجاتی ہے۔ جب مشکل حالات زیادہ ہوں، اس کے باوجود اہل ایمان سچائی کی روش پر صبر کرکے قائم رہیں، تو اس کشاکش کے دوران انسان کے اندر ایک نئی شخصیت ایمرج کرتی ہے۔

ایسی حالت میں زیادہ مشکلات کے باوجود ایمان کی روش پر جمے رہنا بہت زیادہ اہمیت رکھتا ہے۔ اس سے انسان کے اندر تخلیقی صلاحیت (creativity) میں اضافہ ہوتا ہے۔ اس سے انسان کے اندر محبتِ الٰہی اور خوفِ خدا میں اضافہ ہوتا ہے۔ اس سے معرفت میں اضافہ ہوتا ہے۔ اس سے متقیانہ سوچ بہت زیادہ بڑھ جاتی ہے، وغیرہ۔

ردعمل نہیں

صبر ابتدائی طور پر اس بات کا نام ہے کہ کوئی ناخوشگوار صورت حال پیش آئے تو آدمی برداشت کرلے۔ آہ واویلا کرنے کے بجائے وہ تحمل کا طریقہ اختیار کرے۔ صبر یہ ہے کہ آدمی اپنے آپ کو ری ایکشن (reaction) سے بچائے۔ اور ناخوشگوار صورتِ حال کو اندر ہی اندر سہہ لے۔ صبر اپنے وسیع تر مفہوم کے اعتبار سے پیس فل پلاننگ کا نام ہے۔ بے صبری یہ ہے کہ آدمی ری ایکشن کا طریقہ اختیار کرے، اور صبر یہ ہے کہ آدمی اپنے آپ کو آخری حد تک ری ایکشن سے بچائے۔ بلکہ خاموش انداز سے پرامن تدبیر کے ذریعے مسئلے کو حل کرنے کی کوشش کرے۔

صبر کا معاملہ اجتماعی زندگی میں جب بھی پیش آئے، اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ ٹکراؤ کو

اوائڈ کیا جائے، اور وقتی طور پر کوئی تکلیف پیش آئے تو برداشت کا طریقہ اختیار کرتے ہوئے آدمی اس معاملے پر غور وفکر کرے۔ پھر غیر جذباتی انداز میں خاموش پلاننگ کے ذریعے معاملے کوحل کرنے کی کوشش کی جائے۔

پیغمبر اسلام کی پوری زندگی اس طریقِ کار کی عملی مثال ہے۔ آپ کا زمانہ قبائلی دور (tribal age) تھا۔ اس زمانے میں لوگوں کو مسائل کا ایک ہی حل معلوم تھا۔ وہ تھا ٹکراؤ اور جنگ و جدال کے ذریعے مسئلے کوحل کرنے کی کوشش کرنا۔ پیغمبر اسلام نے ہمیشہ اختلافی معاملات میں تحمل کا طریقہ اختیار کیا، اور پیس فل پلاننگ (خاموش منصوبہ بندی) کے ذریعے مسئلے کوحل کرنے کی کوشش کی۔ آپ کی پوری زندگی، خواہ مکی دور ہو یا مدنی دور، اسی دانش مندانہ طریقِ کار کی کامیاب مثال ہے۔

مثلاً صلح حدیبیہ کے موقع پر اہل مکہ نے آپ کو پرووک (provoke) کرنے کا ہر ممکن طریقہ اختیار کیا تھا۔ مگر رسول اللہ نے ہمیشہ اعراض کا طریقہ اختیار کیا۔ اس کا ذکر قرآن میں ان الفاظ میں آیا ہے:

إِذْ جَعَلَ الَّذِينَ كَفَرُوا فِي قُلُوبِهِمُ الْحَمِيَّةَ حَمِيَّةَ الْجَاهِلِيَّةِ فَأَنْزَلَ اللَّهُ سَكِينَتَهُ عَلَى رَسُولِهِ وَعَلَى الْمُؤْمِنِينَ وَأَلْزَمَهُمْ كَلِمَةَ التَّقْوَى وَكَانُوا أَحَقَّ بِهَا وَأَهْلَهَا (48:26)۔ یعنی، جب انکار کرنے والوں نے اپنے دلوں میں حمیت پیدا کی، جاہلیت کی حمیت، پھر اللہ نے اپنی طرف سے سکینت نازل فرمائی اپنے رسول پر اور ایمان والوں پر، اور اللہ نے ان کو تقویٰ کی بات پر جمائے رکھا اور وہ اس کے زیادہ حق دار اور اس کے اہل تھے۔

حدیبیہ کے موقع پر آپ نے مکمل طور پر یک طرفہ صبر کا طریقہ اختیار کیا۔ چنانچہ اس کا نتیجہ فتح مبین کی شکل میں آیا (الفتح، 48:1)۔

غلط منصوبہ بندی

موجودہ دنیا ایک ایسی دنیا ہے، جہاں خود خالق نے ہر ایک کو آزادی دی ہے۔ اس بنا پر ہر آدمی اپنی دوڑ میں مصروف ہے۔ ہر آدمی اپنی منزل کو پانے کے لیے جدو جہد کررہا ہے۔ اس بنا پر موجودہ دنیا میں انسان کی زندگی مسابقت (competition) کی زندگی بن گئی ہے۔ یہاں ہر انسان کو کہیں نہ کہیں دوسرے انسان سے چیلنج کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ ہر جگہ خاموش زبان میں یہ لکھا ہوا ہے کہ مقابلے میں اسٹینڈ کرو، یا مرجاؤ:

compete or perish

ایسی حالت میں جب آپ کے ساتھ کوئی خلاف مزاج بات پیش آئے، اور آپ لوگوں کے خلاف شکایت کرنے لگیں، یا ان کے خلاف لڑنے کے لیے تیار ہوجائیں، تو آپ کی یہ روش کسی انسان کے خلاف نہیں ہوتی ہے، بلکہ خود خالق کے خلاف ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آپ ہمیشہ شکایت میں خود اپنا نقصان کرتے ہیں۔ کیوں کہ کوئی بھی انسان خالق سے لڑ کر جیت نہیں سکتا۔

ایسی حالت میں آپ کے لیے صرف ایک آپشن ہے۔ وہ یہ کہ جس طرح دوسرا آدمی اپنی منصوبہ بندی کررہا ہے، آپ بھی اپنے عمل کی منصوبہ بندی کیجیے۔ یہ معاملہ کسی کے ظلم کا نہیں ہے، بلکہ خود اپنے عمل کا انجام پانے کا معاملہ ہے۔ آپ کا منصوبہ اگر زیادہ اچھا ہے، تو آپ جیتیں گے۔ اس کے برعکس، اگر دوسرے کا منصوبہ زیادہ کامیاب ہے، تو وہ جیتے گا۔ جب بھی آپ دیکھیں کہ آپ کو زندگی میں نقصان پیش آرہا ہو، تو پیشگی طور پہ یقین کرلیجیے کہ یہ آپ کے منصوبے کے ناقص ہونے کا نتیجہ ہے۔ آپ خود اپنی ناقص منصوبہ بندی کی قیمت ادا کررہے ہیں۔

اس دنیا میں کوئی بھی شخص کسی کے ظلم کو نہیں جھیلتا۔ ہر آدمی اپنی غلط منصوبہ بندی کی قیمت ادا کر رہا ہے۔ آدمی کو چاہیے کہ وہ خود اپنی غلطی کو دریافت کرے۔ وہ بے لاگ انداز میں مطالعہ کر کے خود اپنی کوتاہی کو دریافت کرے، اور پھر اس کے مطابق اپنی اصلاح کرے۔ یہ دنیا اپنی اصلاح آپ کرنے کا میدان ہے، نہ کہ دوسرے کی شکایت کرنے کا۔

صبر کا بدلہ

قرآن میں صبر کی بے حد تاکید کی گئی ہے۔ ارشاد ہوا ہے کہ اگر کوئی شخص تمہارے اوپر زیادتی کرے اور تم صبر نہ کرسکو تو اس کے ساتھ تم اتنا ہی کر سکتے ہو جتنا اس نے تمھارے ساتھ کیا ہے۔ مگر یہ صرف رخصت کی بات ہے۔ ورنہ اعلیٰ درجہ تو یہ ہے کہ تم معاف کر دو اور انتقام کے بجائے اصلاح کا انداز اختیار کرو۔ اگر تم ایسا کرو گے تو تمھارا اجر اللہ کے ذمہ ہو جائے گا اور تم کو کوئی نقصان نہ ہوگا: فَمَنْ عَفَا وَأَصْلَحَ فَأَجْرُهُ عَلَى اللهِ (42:40)۔

دنیا کی زندگی میں بار بار ایسا ہوتا ہے کہ ایک شخص کو دوسرے شخص سے تکلیف پہنچتی ہے۔ کبھی ایک آدمی دوسرے کو ایک قول دیتا ہے مگر بعد کو وہ اسے پورا نہیں کرتا۔ کبھی کوئی شخص اپنے کو مضبوط پوزیشن میں پا کر کمزور فریق کے ساتھ ناانصافی کرتا ہے۔ کبھی کوئی شکایت پیش آنے کی بنا پر ایک شخص دوسرے شخص کو مٹانے اور برباد کرنے پر تل جاتا ہے۔ کبھی کوئی شخص موقع سے فائدہ اٹھاتا ہے اور اپنے ساتھی کو اس کا ایک جائز حق دینے پر تیار نہیں ہوتا۔ کبھی کسی کی ترقی دیکھ کر آدمی کے اندر حسد پیدا ہوتا ہے اور وہ ناحق اپنے بھائی کی بربادی کے درپے ہو جاتا ہے۔

اب اکثر ایسا ہوتا ہے کہ جو شخص مظلوم ہے اس کے دل میں ظالم کے خلاف آگ بھڑک اٹھتی ہے۔ وہ اس کی زیادتیوں کو بھولنے اور اس کو معاف کرنے پر آمادہ نہیں ہوتا۔ اس میں

شک نہیں کہ ایسے مواقع پر دل کے زخم کو بھلا دینا انتہائی مشکل کام ہے۔ لیکن اگر آدمی ایسا کرے کہ معاملہ کو اللہ کے اوپر ڈال دے، وہ اللہ کی خاطر اس کو برداشت کرے تو اس کا یہ عمل کبھی رائگاں نہیں جائے گا۔ جو چیز وہ انسانوں سے نہ پاسکا اس کو وہ خدا سے پا کر رہے گا۔

ایک شخص جب کسی کو ایک قول دیتا ہے تو گویا وہ اس کو ایک بینک چیک دے رہا ہے جو عمل کے وقت کیش کیا جاسکے۔ مگر جب عمل کے وقت وہ اپنے قول سے پھر جاتا ہے تو گویا اس نے کاغذی چیک تو لکھ دیا مگر جب کھاتہ سے اس کی رقم لینے کا وقت آیا تو اس نے ادائیگی سے انکار کر دیا۔ ایسا تجربہ کسی انسان کے لیے تلخ ترین تجربہ ہے۔ لیکن اگر وہ صبر کرے تو خدا کا وعدہ ہے کہ وہ اپنی طرف سے اس کا بدلہ دے گا۔ جو چیک انسانی بینک میں کیش نہ ہوسکا وہ خدائی بینک میں کیش ہوگا، خواہ دنیا میں ہو یا آخرت میں۔

جنت صبر کے اُس پار ہے

صالح سماج بنانے کا سارا دار و مدار اس چھوٹی سی بات پر ہے کہ ایک انسان دوسرے انسان کے ساتھ اس طرح رہے کہ دونوں اپنے آپ کو قابو میں رکھے ہوئے ہوں۔

جس چیز کو اسلامی نظام کہا جاتا ہے، وہ کسی قسم کے سیاسی اکھیڑ پچھاڑ سے وجود میں نہیں آتا۔ اور نہ گولی اور پھانسی کی منطق سے اس کو برپا کیا جاسکتا ہے۔ جو لوگ اس قسم کی کارروائیوں سے اسلامی نظام قائم کرنے کا اعلان کرتے ہیں، وہ یقینی طور پر یا تو غیر سنجیدہ ہیں یا مجنون ہیں۔

اسلامی نظام یا اسلامی سماج اس وقت وجود میں آتا ہے، جب کسی انسانی مجموعہ کی قابل لحاظ تعداد میں یہ مزاج پیدا ہو جائے کہ وہ اپنے آپ کو قابو میں رکھ کر زندگی گزارنے لگے۔ یہ وہ لوگ ہیں جو شکایتوں اور تلخیوں سے اوپر اٹھ کر جینا جانتے ہوں۔ جو اپنے خلاف مزاج

باتوں کو نظر انداز کر دینے کی طاقت رکھتے ہوں۔ جو اپنی غلطی کو فوراً محسوس کرلیں اور اس کا اعتراف کرنے کے لیے تیار ہوجائیں۔ جو دوسروں کو الزام دینے کے بجائے خود ذمہ داری قبول کرلیں۔ جو غلط فہمی کے مواقع پر خوش فہمی سے کام لینے کا حوصلہ رکھتے ہوں۔ جو کسی انسان کو اس کے ''آج'' کے بجائے اس کے ''کل'' کے لحاظ سے دیکھ سکیں۔

یہ سب کچھ ٹھنڈے طریقہ سے نہیں ہوتا۔ اس کے لیے آدمی کو برداشت کی تلخیاں جھیلنی پڑتی ہیں۔ اس کے لیے ضرورت ہوتی ہے کہ الفاظ رکھتے ہوئے آدمی نہ بولے۔ وہ ہر وار کو اپنے اوپر سہے۔ وہ اپنے سینہ کو دبے ہوئے جذبات کا قبرستان بنادے۔ مختصر یہ کہ اپنے تمام حقوق کو وہ آخرت کے خانہ میں ڈال دے اور اپنی تمام ذمہ داریوں کو دنیا کے خانہ میں۔

حدیث میں ارشاد ہوا ہے کہ جہنم کو لذتوں سے ڈھانک دیا گیا ہے اور جنت کو ناخوش گواریوں سے ڈھانک دیا گیا ہے: حُجِبَتِ النَّارُ بِالشَّهَوَاتِ، وَحُجِبَتِ الجَنَّةُ بِالْمَكَارِهِ (صحیح البخاری، حدیث نمبر 6487)۔ جو آدمی اپنے جی کی راہ پر بے روک ٹوک چلے وہ سیدھا جہنم میں پہنچ جاتا ہے۔ اس کے برعکس، جو شخص جنت میں اپنی جگہ لینا چاہے اس کو اپنی خواہشات پر روک لگانا ہوگا۔ اپنے جی میں اٹھنے والے محرکات کو دبانا ہوگا۔ ناپسندیدہ باتوں کو برداشت کرنا ہوگا۔ اپنی ذمہ داریوں کو پورا کرنا ہوگا، خواہ ان کا پورا کرنا اس کے لیے کتنا ہی تلخ ہو۔ حقیقت یہ ہے کہ جنت صبر کے اُس پار ہے، اگرچہ لوگ اپنی نادانی سے اس کو بے صبری کے اُس پار سمجھ لیتے ہیں۔

صبر: نفسیاتی قربانی

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ کے یہودیوں اور عیسائیوں کی اکثریت نے آپ کا انکار کیا۔ تاہم ان کے کچھ لوگ آپ پر ایمان لائے۔ ان مومنین کے بارے میں قرآن میں ارشاد ہوا ہے: جن لوگوں کو ہم نے اس سے پہلے کتاب دی وہ قرآن پر ایمان لاتے ہیں۔

اور جب وہ ان کو سنایا جاتا ہے تو وہ کہتے ہیں کہ ہم اس پر ایمان لائے۔ بے شک یہ حق ہے ہمارے رب کی طرف سے۔ ہم تو پہلے ہی سے اس کو ماننے والے ہیں۔ یہ لوگ ہیں کہ ان کو ان کا اجر دُہرا دیا جائے گا اس پر کہ انھوں نے صبر کیا (28:52-54)۔

یہاں صبر سے مراد نفسیاتی صبر یا نفسیاتی قربانی ہے۔ مذکورہ اہل کتاب (عبداللہ بن سلّام، وغیرہ) نے جس ایمان کا ثبوت دیا، وہ نفسیات کی سطح پر صبر کی قربانی کے بغیر کسی کو حاصل نہیں ہوسکتا۔

ارشاد ہوا ہے کہ ان کو دُہرا اجر دیا جائے گا۔ ایک اس بات پر کہ انھوں نے اپنی کتاب پر ایمان رکھا۔ اور دوسرا اس بات پر کہ وہ قرآن پر ایمان لائے: مرة على إيمانهم بكتابهم، ومرةً على إيمانهم بالقرآن (صفوۃ التفاسیر، جلد 2، صفحہ 403)۔

پہلا ایمان ان کو اس "صبر" کی قیمت دینے پر ملا کہ انھوں نے اپنے آپ کو قومی دین سے اوپر اٹھایا اور پیغمبرانہ دین کا حامل بننے کا ثبوت دیا جو قومی روایات میں گم ہو چکا تھا۔ دوسرے، ایمان کے لیے ان کو اس "صبر" کی قیمت دینی پڑی کہ انھوں نے ایک "اجنبی دین" کو پہچانا اور تمام مصلحتوں کو نظر انداز کرکے اس کا ساتھ دیا۔ اس دوگونہ صبر پر وہ دُہرا اجر کے مستحق قرار پائے۔

حقیقی ایمان کسی آدمی کو اس وقت ملتا ہے، جب کہ وہ اپنے آپ کو حالات سے اوپر اٹھانے کے لیے تیار ہو۔ اس کے لیے آدمی کو اپنی قوم سے کٹنا پڑتا ہے۔ اکابر کی حمایت سے محرومی کا خطرہ مول لینا پڑتا ہے۔ ظواہر سے بلند ہو کر حقائق کو دیکھنا پڑتا ہے۔ مفادات کو نظر انداز کرکے اصول کو اپنا رہنما بنانا پڑتا ہے۔

یہ ایک بے حد سخت امتحان ہے۔ غیر معمولی نفسیاتی قربانی کے بغیر اس درجہ پر پہنچنا ممکن نہیں۔ اس نفسیاتی صبر کے بغیر کوئی شخص حق کو نہیں پا سکتا اور نہ اعلیٰ ایمانی ترقی حاصل کرسکتا۔

قدرت کا پیغام

مسلمانوں سے میں قدرت کی زبان میں کہوں گا کہ زمین و آسمان کے اشاروں کو سمجھو، اور کائنات میں نشر ہونے والے پیغام کو سنو۔ کیوں کہ یہ دنیا ہر آن تمہارے لیے امید کی خبریں نشر کر رہی ہے۔

یاد رکھو، تاریک رات کا آنا روشن صبح کے آنے کی تمہید ہے۔ خزاں کا موسم یہ خبر دیتا ہے کہ جلد ہی بہار کا موسم آنے والا ہے۔ یہ قدرت کا اٹل قانون ہے۔ یہ قانون جس طرح مادی دنیا کے لیے ہے، اسی طرح وہ انسانی دنیا کے لیے ہے، اور یقینی طور پر خود تمہارے لیے بھی۔

بظاہر اس وقت مسلمانوں کو صبر آزما حالات کا سامنا ہے۔ مگر یہ حالات عین خدا کی رحمت ہیں۔ جس طرح خام لوہا (ore) مختلف قسم کے شدید مراحل سے گزر کر ایک بامعنی مشین کی صورت اختیار کرتا ہے، اسی طرح انسان کی شخصیت بھی مختلف قسم کے شدید مراحل سے گزر کر ایک اعلیٰ شخصیت (super personality) کی صورت اختیار کرتی ہے۔

حدیث میں آیا ہے کہ صبر مومن کا ہتھیار ہے: الصَّبْرُ مِعْوَلُ الْمُسْلِمِ (الترغیب و الترہیب للمنذری، جلد 4، صفحہ 277)۔ صبر ایک قسم کا تربیتی کورس ہے، جو آدمی کی چھپی ہوئی صلاحیتوں کو جگاتا ہے۔ صبر آدمی کے اندر پختگی کی صلاحیت پیدا کرتا ہے۔ صبر آدمی کو بلند انسانی اوصاف کا حامل بناتا ہے۔ صبر آدمی کو یہ طاقت دیتا ہے کہ وہ اعلیٰ اسلامی اخلاقیات پر قائم ہو سکے۔ صبر آدمی کو معمولی انسان کے درجہ سے اٹھا کر غیر معمولی انسان کے درجہ میں پہنچا دیتا ہے۔ صبر کسی فرد یا قوم کا سب سے بڑا خزانہ ہے۔

صبر مایوسی کی بات نہیں، صبر خوش خبری کا لمحہ ہے۔ صبر اس بات کی علامت ہے کہ خدا کی مدد قریب آ گئی ہے۔ کیوں کہ قرآن میں اعلان کیا گیا ہے کہ اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے، اللہ صبر کا ثبوت دینے والوں کو دنیا کا امام بنا دیتا ہے۔

داعیانہ صبر

قرآن میں انذار وتبشیر اور دعوت الی اللہ کا حکم دیتے ہوئے فرمایا گیا ہے کہ: وَلِرَبِّكَ فَاصْبِرْ (74:7)۔یعنی، اور اللہ کے لیے صبر کرو۔

اس آیت میں جس صبر کا ذکر ہے اس سے مراد داعیانہ صبر ہے۔یعنی دعوت کی راہ میں مدعو کی طرف سے جو زیادتی یا اشتعال انگیزی کی جائے اس پر بے صبر نہ ہو جاؤ، بلکہ مدعو کی روش سے قطع نظر کرتے ہوئے یک طرفہ طور پر اپنے آپ کو صبر واعراض کے رویہ پر قائم رکھو۔

اس صبر کو اللہ کے لیے کیا جانے والا صبر اس لیے فرمایا کہ وہ تمام تر اللہ کے منصوبہ کی تکمیل کے لیے ہوتا ہے۔ وہ اس لیے کیا جاتا ہے کہ داعی کے غیر صابرانہ جواب سے مدعو بدک نہ جائے اور داعی کی بات پر دھیان دینے کے لیے تیار نہ ہو۔

اللہ تعالیٰ نے انسان کو موجودہ دنیا میں آزمائش کے لیے رکھا ہے۔یہاں کی محدود مدت میں انسان جیسا عمل کرے گا، اس کے مطابق اگلی لامحدود زندگی میں اس کے ساتھ انعام یا سزا کا معاملہ کیا جائے گا۔ یہ ایک بے حد نازک صورت حال ہے، کیونکہ انسان کو اگر زندگی کی اس امتحانی نوعیت سے پوری طرح باخبر نہ کیا جائے تو وہ قیامت کے دن کہہ سکتا ہے کہ ہمیں تو اس کی خبر ہی نہ تھی، ایسی حالت میں کیوں ہم کو پکڑا جاتا ہے اور ہمارا حساب لیا جاتا ہے۔

یہ ایک بے حد نازک معاملہ ہے۔ اگر لوگوں کو پوری طرح باخبر کر دیا جائے تو حجت لوگوں کے اوپر چلی جاتی ہے۔ اور اگر لوگوں کو خبردار نہ کیا جائے تو حجت اللہ کی طرف لوٹ جاتی ہے (النساء، 4:165)۔ چونکہ دعوت الی اللہ کا عمل اس حجت کو اللہ سے ہٹاتا ہے، اس لیے اللہ نے اس کو اپنا کام فرمایا ہے اور اس کے لیے صبر کرنے کو اللہ کے لیے صبر کرنا قرار دیا ہے۔

داعی گروہ اگر مدعو کی زیادتیوں پر صبر کر کے اپنا دعوتی عمل جاری رکھے تو اس کا یہ صبر اللہ کے لیے کیا جانے والا صبر ہوگا۔ اس کا اللہ کے یہاں بہت بڑا اجر ہے۔ اس کے برعکس، اگر داعی مدعو کی زیادتیوں پر مشتعل ہو جائے تو اس کے متعلق کہا جائے گا کہ اس کو اللہ کے لیے صبر کرنے کا حکم دیا گیا تھا، مگر وہ اللہ کے لیے صبر کرنے پر راضی نہ ہوا۔

صبر کا سفر

قرآن میں بتایا گیا ہے کہ صبر کرنے والوں کو بلا حساب اجر دیا جائے گا (39:10)۔ دوسری آیتوں اور حدیثوں کو ملا کر دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس لامحدود اجر کا تعلق دنیا سے بھی ہے اور آخرت سے بھی۔ دنیا میں جو لوگ اپنے معاملات کو صبر کے اصول پر چلائیں وہ یہاں غیر معمولی کامیابی حاصل کریں گے۔ اسی طرح جو لوگ صبر و برداشت کی قیمت دیتے ہوئے خدا کے دین کو اختیار کریں وہ آخرت میں خدا کے غیر معمولی انعامات کے مستحق قرار دیے جائیں گے۔

خدا کا محبوب بندہ وہ ہے جو اپنی خود پسندی کو خدا پسندی میں گم کر دے۔ جو اپنی بات کے مقابلہ میں حق کی بات کو اختیار کرے۔ جو دنیا کی عزت کے مقابلہ میں آخرت کی عزت کو اہمیت دینے لگے۔ لوگوں کی طرف سے خواہ کتنی ہی تلخیاں پیش آئیں، مگر وہ اپنی طرف سے جوابی کارروائی نہ کرے۔ اسی کا نام صبر ہے۔ اس میں شک نہیں کہ یہ بے حد مشکل راستہ ہے، مگر اس میں بھی شک نہیں کہ یہی وہ راستہ ہے جو کسی کو جنت کی طرف لے جانے والا ہے۔ جنت صبر کرنے والوں کو ملتی ہے اور صبر کرنے والا وہ ہے جو اللہ کی خاطر اپنے آپ کو ہر محرومی پر راضی کرے۔

امتحان کی اس دنیا میں تلخیوں اور ناخوش گواریوں کے بغیر چارہ نہیں۔ جو شخص جنت کا مسافر بننا چاہے، اس کو جان لینا چاہیے کہ وہ ایک ایسے راستہ پر چلنے کا ارادہ کر رہا ہے جس

یں لوگوں کی طرف سے کڑوی باتیں پیش آئیں گی۔ جس میں لمبے انتظار کی مشقت برداشت کرنی ہوگی۔ جس میں مخالفین کی طرف سے طرح طرح کی دل آزاریاں ہوں گی۔ ان مواقع پر حق کا مسافر اگر صبر کو کھودے، اگر وہ بے برداشت ہو جائے تو وہ درمیان ہی میں اپنے راستہ کو کھوٹا کرے گا، وہ جنت کی منزل تک نہ پہنچ سکے گا۔

جنت کا سفر تمام کا تمام صبر کا سفر ہے۔ جنت میں وہی شخص پہنچے گا جو صبر کی تلخیوں کو سہنے کے لیے تیار ہو، جو جذبات کی پامالی پر بھی بے ہمت ہونا نہ جانے، جو نفس کی ہر چوٹ کو اپنے سینہ کی ویرانیوں میں چھپا لے۔

آخرت کا راستہ صبر کا راستہ ہے

"وہ لوگ اپنے واجبات کو پورا کرتے ہیں اور اس دن سے ڈرتے ہیں جس کی سختی ہر طرف پھیلی ہوئی ہوگی۔ وہ اللہ کی محبت میں غریب اور یتیم اور قیدی کو کھانا کھلاتے ہیں۔ ہم تم کو صرف اللہ کی رضامندی کے لیے کھلا رہے ہیں۔ ہم تم سے کوئی بدلہ نہیں چاہتے ہیں اور نہ شکرگزاری چاہتے ہیں۔ ہم کو تو اپنے رب کی طرف سے ایک سخت اور تلخ دن کا اندیشہ ہے۔ پس اللہ ان کو اس دن کی سختی سے بچالے گا اور ان کو تازگی اور خوشی عطا کرے گا اور ان کے صبر کے بدلے ان کو جنت اور ریشمی لباس عطا کرے گا۔ وہ وہاں تختوں پر مسندیں لگائے ہوئے ہوں گے۔ وہاں نہ گرمی کی تکلیف ہوگی اور نہ سردی کی۔ جنت کے درخت ان پر جھکے ہوئے سایہ کر رہے ہوں گے۔ اس کے پھل ہر وقت ان کے بس میں ہوں گے۔ لوگ ان کے پاس چاندی کے برتن اور شیشے کے پیالے لیے پھر رہے ہوں گے۔ وہ شیشے بھی چاندی کے ہوں گے جن کو بھرنے والوں نے ٹھیک اندازہ کے مطابق بھرا ہوگا۔ ان کو وہاں ایسے پیالے پلائے جائیں گے جن میں سونٹھ کی آمیزش ہوگی۔ یہ جنت کا ایک چشمہ ہوگا جس کو

سلسبیل کہا جاتا ہے۔ ان کی خدمت کے لیے ایسے لڑکے دوڑتے پھر رہے ہوں گے جو ہمیشہ لڑکے رہیں گے۔ تم ان کو دیکھو تو سمجھو کہ موتی ہیں جو بکھیر دیے گئے ہیں۔ وہاں تم جدھر بھی نگاہ ڈالو گے ہر طرف نعمتیں اور بڑی بادشاہی دیکھو گے۔ ان کے اوپر باریک ریشم کے سبز لباس اور اطلس ودیبا کے کپڑے ہوں گے۔ ان کو چاندی کے کنگن پہنائے جائیں گے اور ان کا رب ان کو پاکیزہ شراب پلائے گا۔ یہ ہے تمھارا بدلہ اور تمھاری کوشش اللہ کے یہاں مقبول ہوئی" (76:7-22)۔

قرآن کا یہ ارشاد بتا رہا ہے کہ وہ کون لوگ ہیں جن کی کوششیں آخرت میں سعی مشکور (76:26) کا درجہ حاصل کریں گی۔ یہ وہ لوگ ہیں جو آخرت کی ہولناکیوں کا اتنا شدید احساس رکھتے ہوں کہ وہ ان کے اوپر ایک قسم کا آسمانی محاسب بن کر چھا جائے۔ ان کا حال یہ ہو جائے جیسے کہ وہ موت کی دوسری طرف جہنم کو بھڑکتا ہوا دیکھ رہے ہیں اور اسی کے زیر اثر سارا کام کر رہے ہیں۔ وہ جب کوئی عہد کریں، خواہ منت کا عہد ہو یا ایمان کا عہد یا قول و قرار کا عہد، تو وہ اس کو اس طرح پورا کریں جیسے وہ بے پناہ یقین کے ساتھ یہ محسوس کر رہے ہیں کہ اگر انھوں نے اس کو پورا نہ کیا تو جہنم کی آگ انھیں پکڑ لے گی۔ ان کا ایمان باللہ ان پر جن باتوں کو لازم کر رہا ہے اور ان کا عہد ان کو جن چیزوں کا پابند بنا رہا ہے، ان کو وہ اس طرح پورا کریں جیسے وہ ایک ایسی سرحد پر کھڑے ہوئے ہیں جہاں ان کے لیے دو میں سے صرف ایک چیز کے انتخاب کا سوال ہے۔ یا قول و قرار کے تقاضوں کو پورا کرنا یا جانتے بوجھتے اپنے آپ کو جہنم کے الاؤ میں گرا دینا۔

آخرت کے احساس ہی کے تحت ان کے اندر جو دوسری خصوصیت پیدا ہوتی ہے وہ بندوں کے ساتھ مہربانی ہے۔ وہ اپنے لیے اپنے رب سے مہربانی چاہتے ہیں، اس لیے وہ خود بھی دوسروں کے ساتھ مہربانی کرتے ہیں۔ وہ اپنی کمائی میں محتاجوں کا حق سمجھنے لگتے ہیں۔ وہ

ان لوگوں کا سہارا بنتے ہیں، جو حالات کے نتیجہ میں بے بس ہو گئے تھے یا بندشوں میں پھنسے ہوئے تھے۔ بندگان خدا کی خدمت کا یہ کام جو وہ کرتے ہیں، بدلہ اور شکرانہ وصول کرنے کے لیے نہیں کرتے۔اس کا محرک تمام تر یہ ہوتا ہے کہ آخرت کے دن جب وہ خدا کے سامنے تمام کمزوروں سے زیادہ کمزور حالت میں کھڑے ہوں، اس وقت ان کا خدا ان کو بے یارومددگار نہ چھوڑے، بلکہ ان کی مدد فرمائے۔ دنیا کی زندگی میں کسی کے ساتھ اچھا سلوک ان کے لیے دراصل ایک عملی دعا ہوتی ہے۔ وہ بھوکے کو کھلاتے ہیں، تاکہ خدا ان کو کھلائے۔ وہ کمزوروں کو سہارا دیتے ہیں، تاکہ خدا ان کو سہارا دے۔ وہ انسانوں کی طرف سے ڈالی ہوئی تکلیفوں کو معاف کرتے ہیں، تاکہ خدا ان کی غلطیوں کو معاف کردے۔

ان لوگوں کو یہ نعمتیں اس لیے ملیں گی کہ انھوں نے صبر کیا۔ حقیقت یہ ہے کہ آج کی دنیا میں کل کی دنیا کے لیے جینا، دکھائی دینے والے "جنت اور جہنم" کو نظر انداز کر کے، نہ دکھائی دینے والے جنت وجہنم کے لیے سرگرم ہونا، ایک بے حد مشکل کام ہے۔ اس میں ہر وقت آدمی کے صبر کا امتحان ہے۔ اس راہ میں کہیں ملتے ہوئے فائدوں سے محرومی کو گوارا کرنا پڑتا ہے۔ کبھی خارجی مجبوری کے بغیر خود سے اپنے آپ کو کسی چیز کا پابند کر لینا پڑتا ہے۔ کہیں اپنی بے عزتی کو برداشت کرنا پڑتا ہے۔ کہیں زیادہ کو چھوڑ کر کم پر قانع ہونا پڑتا ہے۔ کہیں قدرت رکھتے ہوئے اپنے ہاتھ پاؤں کو روک لینا پڑتا ہے۔ کہیں اپنی مقبولیت کو دفن کرنے پر راضی ہونا پڑتا ہے۔ کہیں شہرت اور استقبال کے راستے کو چھوڑ کر گم نامی کے طریقے کو اختیار کرنا پڑتا ہے۔ کہیں الفاظ کا ذخیرہ ہوتے ہوئے اپنی زبان کو بند کر لینا پڑتا ہے۔ کہیں جانتے بوجھتے دوسرے کا بوجھ اپنے سر پر لے لینا پڑتا ہے۔ کہیں اپنے آپ کو ایک ایسے کام میں شریک کرنا پڑتا ہے، جس میں کسی قسم کا کوئی کریڈٹ ملنے والا نہیں۔ غرض جنت کی طرف سفر کا سارا معاملہ صبر و برداشت کا معاملہ ہے۔ جو اپنے آپ کو دبانے

اور کچلنے کے لیے تیار نہ ہو، وہ کبھی اس راہ کو طے نہیں کرسکتا۔ قرآن میں ہے:

وَقَالَ الَّذِينَ أُوتُوا الْعِلْمَ وَيْلَكُمْ ثَوَابُ اللَّهِ خَيْرٌ لِمَنْ آمَنَ وَعَمِلَ صَالِحًا وَلَا يُلَقَّاهَا إِلَّا الصَّابِرُونَ (28:80)۔ یعنی، اور کہا ان لوگوں نے جن کو علم ملا تھا، خرابی ہو تمھاری۔ اللہ کا ثواب بہتر ہے اس شخص کے لیے جو ایمان لایا اور نیک عمل کیا۔ اور یہ بات انھیں کے دل میں پڑتی ہے جو صبر کرنے والے ہیں۔

دنیا کی زندگی دراصل صبر کا امتحان ہے۔ صبر کی ایک قسم وہ ہے جو باہر کی دنیا کے خلاف ظاہر ہوتی ہے۔ آدمی ماحول کی رکاوٹوں کا خاموش مقابلہ کرتے ہوئے اپنے دینی سفر کو جاری رکھتا ہے۔ مگر سب سے بڑا صبر وہ ہے جو خود اپنے خلاف پیش آتا ہے۔ زندگی میں بار بار ایسا ہوتا ہے کہ کوئی ناخوش گوار واقعہ پیش آنے کی وجہ سے اپنے کسی بھائی کے خلاف نفرت اور انتقام کی آگ بھڑک اٹھتی ہے، ایسے موقع پر منفی جذبات کی پرورش سے اپنے کو روکنا پڑتا ہے۔ کسی کی ترقی اور مقبولیت کو دیکھ کر اس کے خلاف حسد جاگ اٹھتا ہے۔ اس وقت دشمن جیسی بے رحمانہ نظر سے اپنے دل کو ٹٹولنا پڑتا ہے، تاکہ حسد اور رقابت کے بیج کو نکال پھینکا جائے۔ کبھی آدمی ایک شخص کو اچھا سمجھتا ہے، حالاں کہ اس کی وجہ صرف اس کا نیازمندانہ انداز ہوتا ہے اور کبھی ایک شخص کو برا سمجھتا ہے، حالاں کہ اس کی وجہ صرف اس کا تنقید واحتساب کا مزاج ہوتا ہے۔ ایسے مواقع پر اپنے آپ کو کھینچ کر ایسے مقام پر لے جانا پڑتا ہے، جہاں وہ تعریف وتنقید سے بلند ہو کر دوسروں کے بارے میں رائے قائم کرسکے۔ دوسروں کے ساتھ انصاف اور خیر خواہی کے بغیر کوئی شخص دین دار نہیں بنتا اور انصاف اور خیر خواہی پر قائم ہونا صبر کے بغیر ممکن نہیں۔

صبر، بے صبری

کسی آدمی کے ساتھ آپ کا مسئلہ پیدا ہو تو ایک صورت یہ ہے کہ آپ خود اس کے حل کی ذمہ داری قبول کریں۔ دوسری صورت یہ ہے کہ آپ مسئلہ کے حل کی ذمہ داری دوسرے آدمی کے اوپر ڈالیں۔ پہلا طریقہ صبر کا طریقہ ہے، اور دوسرا طریقہ بے صبری کا طریقہ۔

صبر کا مطلب خود ذمہ داری قبول کرنا ہے، اور بے صبری کا مطلب دوسرے کے اوپر ذمہ داری ڈالنا۔ یہی مختصر الفاظ میں صبر اور بے صبری کا خلاصہ ہے۔

صبر آدمی کے اندر مثبت نفسیات پیدا کرتی ہے۔ صبر والا آدمی پیش آمدہ صورت حال کو چیلنج سمجھتا ہے اور اس سے مقابلہ کر کے اس کو حل کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ وہ اپنی ساری طاقت کو محنت اور عمل کی طرف موڑ دیتا ہے۔ وہ اپنے وقت کا ہر لمحہ اور اپنے اثاثہ کا ہر ذرہ تعمیر کے راستوں میں لگاتا ہے۔ نئے حالات کا جھٹکا اس کو از سرِ نو بیدار کر دیتا ہے، بھرپور جدوجہد کے ذریعہ وہ مزید اضافہ کے ساتھ اپنی غلطیوں کی تلافی کر لیتا ہے۔

اس کے برعکس، بے صبر آدمی کا حال یہ ہوتا ہے کہ اس کی پوری سوچ منفی ہو جاتی ہے۔ اس کا ذہن احتجاج اور شکایت کے رخ پر چل پڑتا ہے۔ وہ اپنے اثاثہ کو تعمیر خویش کے بجائے تخریب غیر کے محاذ پر لگا دیتا ہے، وہ اپنی کمی کو دور کرنے کی کوشش نہیں کرتا، بلکہ دوسرے کو غلط ثابت کرنے کو کام سمجھ کر اس میں مصروف ہو جاتا ہے۔ پہلے اگر وہ اپنی بے عملی سے محروم ہوا تھا، تو اب وہ غلط عمل کی بنا پر اپنے کو مزید محروم کر لیتا ہے۔

صبر کا مطلب سوچ کر اقدام کرنا ہے اور بے صبری کا مطلب بے سوچے سمجھے اقدام کرنا۔ صبر منصوبہ بند عمل ہے اور بے صبری عجلت کی کارروائی۔ صبر حالات کا اندازہ کر کے حالات سے نپٹنا ہے اور بے صبری حالات کا اندازہ کیے بغیر حالات میں کود پڑنا۔ صبر دانش

مندانہ تدبیر ہے اور بے صبری جذباتی ہنگامہ آرائی۔ صبر انجام کار کو ملحوظ رکھتے ہوئے متحرک ہونا ہے اور بے صبری انجام کار سے بے پروا ہو کر حرکت میں آجانا۔

صبر گویا اپنے ساتھ دوسروں کو بھی جاننا ہے اور بے صبری گویا صرف اپنے آپ کو جاننا۔ پہلا آدمی ہمیشہ کامیاب ہوتا ہے اور دوسرا آدمی ہمیشہ ناکام۔

صبر اور دعوت

صبر داعی کا اخلاق ہے۔ صبر ہی کے ذریعہ وہ حالات پیدا ہوتے ہیں جب کہ کوئی شخص دعوتی مواقع کو استعمال کر سکے۔ جو آدمی ناخوش گوار باتوں پر صبر کرنے کے لیے تیار نہ ہو، وہ اس دنیا میں کبھی داعی کا مقام حاصل نہیں کرسکتا۔

سرجیمز جینز (1877-1946ء) مشہور انگریز سائنس داں ہے۔ اس نے طبیعیات اور فلسفہ (Physics & Philosophy) کے نام سے 1942ء میں ایک کتاب لکھی۔ اس کتاب کے دیباچہ میں اس نے اعتراف کیا کہ کائنات کے سائنسی مطالعہ نے ہم کو جہاں پہنچایا ہے، اس سے بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ حقیقت کا دروازہ کھولنا ممکن ہے۔ بشرطیکہ ہم اس کا ہینڈل حاصل کرسکیں:

> It almost seems to suggest that the door may be unlocked, if only we could find the handle.

انگریز سائنس داں نے جس وقت یہ سطریں لکھی ہیں، عین اس وقت ساری دنیا کے مسلمان انگریزوں کی سیاسی بالادستی پر بھڑک کر ان کے خلاف خون آشام لڑائی میں مصروف تھے۔ وہ انگریز کو صرف ایک قابل نفرت دشمن کے روپ میں دیکھ رہے تھے۔ اگر وہ انگریز کی سیاسی بالادستی پر وقتی طور پر صبر کر لیتے تو اچانک انہیں دکھائی دیتا کہ انگریز قوم حقیقت کے دروازے کھولنے کے لیے جس "ہینڈل" کی تلاش کر رہی ہے، وہ ہینڈل ان کے پاس قرآن کی صورت میں موجود ہے۔

اس واقفیت کی صورت میں انگریز کے بارے میں ان کی پوری نفسیات بدل جاتی۔ اب وہ انگریز کو اپنا مدعو سمجھتے، نہ کہ اپنا حریف۔ اس کے بعد وہ انگریز کی ہلاکت چاہنے کے بجائے، اس کی ہدایت چاہنے لگتے۔ وہ انگریز کی اصلاح کے لیے دعا کرتے اور اس کے خیر خواہ بن کر

اس سے یہ کہتے کہ حقیقت کی منزل تک پہنچنے کے لیے تم کو جس چیز کی ضرورت ہے، وہ تمہارے خدا نے پیشگی طور پر قرآن کی صورت میں تمہارے لیے بھیج دیا ہے۔

صبر دعوت کی لازمی شرط ہے۔ جہاں صبر نہ ہو، وہاں دعوت بھی یقینی طور پر نہیں ہوگی۔

صبر ایک مثبت عمل

عام طور پر یہ سمجھا جاتا ہے کہ صبر ایک منفی عمل ہے، مگر یہ سراسر غلط فہمی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ صبر ایک مثبت عمل ہے، بلکہ وہ مثبت عمل کی بنیاد ہے۔ کیوں کہ صبر کے بغیر اس دنیا میں کوئی مثبت عمل نہیں کیا جاسکتا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی زندگی کے آخری دور میں اطراف عرب کے رئیسوں اور بادشاہوں کے نام دعوتی خطوط روانہ کیے۔ آپ کا یہ عمل واضح طور پر ایک مثبت عمل تھا۔ مگر اس مثبت عمل کی قیمت صبر تھی۔ اس سے پہلے آپ کو صبر کرنا پڑا۔ اس کے بعد ہی یہ ممکن ہوا کہ وہ حالات پیدا ہوں، جن میں مذکورہ قسم کا مثبت عمل انجام دیا جاسکے۔

یہ ایک معلوم بات ہے کہ رئیسوں اور بادشاہوں کے نام یہ خطوط صلح حدیبیہ کے بعد روانہ کیے گئے۔ ظاہر ہے کہ یہ کام صلح حدیبیہ سے پہلے بھی ہوسکتا تھا۔ پھر آپ نے اس کو صلح حدیبیہ کے بعد کیوں انجام دیا۔ اس کی واحد وجہ یہ ہے کہ صلح حدیبیہ سے پہلے آپ جنگ وقتال کے حالات میں گھرے ہوئے تھے۔ صبح وشام دشمنوں کے حملہ کا خطرہ لگا رہتا تھا اور آپ کی اور آپ کے ساتھیوں کی ساری توجہ دفاعی کاموں میں خرچ ہو رہی تھی۔ ایسے غیر معتدل حالات میں حکمرانوں کے نام دعوتی مہم کا منصوبہ بنانا اور اس کی تعمیل کرنا عملاً سخت دشوار تھا۔

صلح حدیبیہ حقیقتاً مسلمانوں اور ان کے دشمنوں کے درمیان دس سال کا ناجنگ معاہدہ (no-war pact) تھا۔ چنانچہ صلح حدیبیہ کے بعد حالات بالکل معتدل ہوگئے۔ اس کے

بعد فوراً آپ نے حکمرانوں کے نام دعوت نامے بھیجنے کا منصوبہ بنایا اور اس کی تعمیل فرمائی۔ جس کی تفصیل سیرت کی کتابوں میں موجود ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ صبر کے بغیر کوئی مثبت عمل ممکن نہیں۔ اگر آپ کو داعی بننا ہے تو مدعو کے ساتھ تمام جھگڑوں کو یک طرفہ طور پر ختم کرنا ہوگا۔ اگر آپ کو متواضع اخلاق اختیار کرنا ہے تو اپنے سینہ کو تکبر کا قبرستان بنانا ہوگا۔ اگر آپ کو لوگوں کا خیر خواہ بننا ہے تو اپنے اندر اٹھنے والے حسد کے جذبات کو دبانا ہوگا۔ اگر آپ لوگوں کے ساتھ انصاف کرنا چاہتے ہیں تو اپنے اندر پیدا ہونے والے انتقامی جذبات کو ذبح کرنا ہوگا۔ اور یہ سب وہ چیزیں ہیں جو صبر سے تعلق رکھتی ہیں۔ صبر کے بغیر ان کا حصول ممکن نہیں۔

روزہ صبر کی تربیت

محدث بیہقی (وفات 1066ء) نے "شعب الایمان" میں سلمان الفارسی رضی اللہ عنہ کی ایک روایت رمضان سے متعلق نقل کی ہے۔ اس کے مطابق، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے شعبان کے آخر میں خطبہ دیا۔ اس میں آپ نے ماہ رمضان کا تذکرہ کیا اور فرمایا: وَهُوَ شَهْرُ الصَّبْرِ، وَالصَّبْرُ ثَوَابُهُ الْجَنَّةُ (شعب الایمان للبیہقی، حدیث نمبر 3608)۔ یعنی، وہ صبر کا مہینہ ہے اور صبر کا بدلہ جنت ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ روزہ صبر کی تربیت ہے اور صبر تمام کامیابیوں کا ذریعہ۔

دین میں سب سے پہلی چیز ایمان ہے۔ ایمان کیا ہے۔ ایمان غیبی حقیقت کی دریافت ہے۔ آدمی اپنے آپ کو ظاہری فائدوں اور مادی رونقوں سے اوپر اٹھاتا ہے، تب اس کو باطنی گہرائیوں کا ادراک ہوتا ہے۔ یہ ایک صابرانہ عمل ہے۔ اس صابرانہ عمل کے بغیر کسی کو ایمان کی اعلیٰ معرفت حاصل نہیں ہوتی۔ اس دنیا میں کوئی شخص ذہنی برداشت سے گزر کر ہی ذہنی یافت تک پہنچتا ہے۔

مومن سے یہ مطلوب ہے کہ وہ لوگوں کے درمیان اسلامی اخلاق کے ساتھ رہے۔ یہاں دوبارہ صبر کی ضرورت ہے۔ یہ دنیا ایسی دنیا ہے جہاں دوسروں کی طرف سے بار بار زیادتی کا تجربہ ہوتا ہے۔ ایسی حالت میں لوگوں کے ساتھ اسلامی اخلاق کا معاملہ وہی شخص کر سکتا ہے جو لوگوں کی زیادتیوں کو برداشت کرے۔ اسلامی اخلاق یک طرفہ حسن سلوک کا نام ہے، اور صبر کے بغیر یک طرفہ حسن سلوک کا ثبوت دینا کسی کے لیے ممکن نہیں۔

مومن ایک داعی انسان ہوتا ہے۔ مومن کی یہ ذمہ داری ہے کہ وہ دوسرے بندگانِ خدا تک خدا کے دین کا پیغام پہنچائے۔ دعوت کا یہ کام صبر کے بغیر نہیں ہوسکتا۔ دعوتی عمل کے لیے ضروری ہے کہ داعی اور مدعو کے درمیان معتدل فضا پائی جائے۔ مدعو سے یہ امید نہیں کی جاسکتی کہ وہ اس قسم کی معتدل فضا پیدا کرے گا۔ اس لیے داعی کو یہ ذمہ داری لینی پڑتی ہے کہ وہ مدعو کی طرف سے پیش آنے والی تلخیوں کو نظر انداز کرے، تاکہ دعوت کا ماحول بگڑنے نہ پائے۔ اور تلخیوں کو نظر انداز کرنے کا یہ معاملہ اسی وقت ممکن ہے جب کہ آدمی صبر کی سطح پر جینے کے لیے تیار ہو۔

روزہ کا مہینہ اسی صبر کی تربیت کا مہینہ ہے۔ اور صبر وہ اعلیٰ انسانی صفت ہے جس میں دنیا اور آخرت کی تمام کامیابیوں کا راز چھپا ہوا ہے۔

روزہ قربانی کا عمل ہے اور قربانی کا عمل سب سے زیادہ اعلیٰ عمل ہوتا ہے۔ ایک حدیث میں روزہ کی اس امتیازی خصوصیت کو اس طرح بیان کیا گیا ہے:

عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ، قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: كُلُّ عَمَلِ ابْنِ آدَمَ يُضَاعَفُ، الْحَسَنَةُ عَشْرُ أَمْثَالِهَا إِلَى سَبْعِمِائَة ضِعْفٍ، قَالَ اللَّهُ عَزَّ وَجَلَّ: إِلَّا الصَّوْمَ، فَإِنَّهُ لِي وَأَنَا أَجْزِي بِهِ، يَدَعُ شَهْوَتَهُ وَطَعَامَهُ مِنْ أَجْلِي لِلصَّائِمِ فَرْحَتَانِ: فَرْحَةٌ عِنْدَ فِطْرِهِ، وَفَرْحَةٌ عِنْدَ لِقَاءِ رَبِّهِ(**صحیح مسلم، حدیث**

نمبر 1151)۔ یعنی، حضرت ابوہریرہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ابن آدم کا ہر نیک عمل دس گنا سے سات سو گنا تک بڑھایا جاتا ہے۔ مگر اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ روزہ میرے لیے ہے اور میں ہی اس کا بدلہ دوں گا۔ بندہ اپنی شہوت کو اور اپنے کھانے کو میرے لیے چھوڑتا ہے۔ روزہ دار کے لیے دو خوشی ہے۔ ایک خوشی افطار کے وقت اور دوسری خوشی اس وقت جب وہ اپنے رب سے ملے گا۔

روزہ عام عبادات سے الگ ایک عبادت ہے۔ روزہ میں آدمی اپنی جائز خواہش کو اور اپنے جائز کھانے کو اللہ کی خاطر چھوڑ دیتا ہے۔ گویا روزہ دار روزہ رکھ کر اپنے اس عزم کا اظہار کرتا ہے کہ اللہ کی خاطر اگر اس کو انتہائی ضروری اور جائز چیزوں سے جدائی اختیار کرنا پڑے تو اس سے بھی وہ دریغ نہیں کرے گا۔ روزہ کی یہی وہ امتیازی خصوصیت ہے جس کی بنا پر اس کا امتیازی ثواب رکھا گیا ہے۔

موجودہ دنیا میں حق پرست بننے کے لیے صرف یہی کافی نہیں کہ آدمی غلط اور صحیح کے درمیان تمیز کرتا ہو۔ مختلف حالات کے اعتبار سے کبھی ایسا ہوتا ہے کہ ممنوعات کی فہرست مزید وسیع ہو جاتی ہے۔ کبھی ضروری ہو جاتا ہے کہ آدمی کھانا پینا بھول کر اپنی ڈیوٹی انجام دے۔ وہ عمل کے بجائے اعراض کا طریقہ اختیار کرے۔ وہ کرنے کا جذبہ رکھتے ہوئے بھی نہ کرے۔ الفاظ رکھتے ہوئے وہ نہ بولے اور پاؤں رکھتے ہوئے وہ نہ چلے۔ ایک کام کو بظاہر صحیح سمجھتے ہوئے بھی اس کی طرف اقدام کرنے سے باز رہے۔

روزہ اسی قربانی کا سبق ہے۔ اس دنیا میں کبھی ایسا ہوتا ہے کہ ایک جائز چیز بھی آدمی کے لیے ناجائز بن جاتی ہے۔ اور ایک مطلوب چیز بھی نامطلوب کی حیثیت اختیار کر لیتی ہے۔ یہ ایمان کا اعلیٰ درجہ ہے۔ جو لوگ اس اعلیٰ ایمانی درجہ پر پورے اتریں، ان کے لیے اللہ کے یہاں اتنا بڑا اجر ہے جس کا نہ کوئی شمار ہے اور نہ کوئی حساب۔

صبر کی عبادت

نماز کا وقت ہو اور مسجد سے اذان کی آواز آئے تو ایک مسلمان خوش ہوتا ہے کہ اس کے لیے وقت آ گیا کہ وہ نماز ادا کرے اور عبادت کا ثواب حاصل کرے۔ اسی طرح جب رمضان کا نیا چاند آسمان پر نظر آتا ہے تو مسلمان خوش ہوتے ہیں کہ رمضان کے مہینہ کی آمد نے ان کو موقع دیا کہ وہ روزہ رکھ کر اپنے آپ کو اس کے ثواب کا مستحق بنائیں۔

اسی طرح ایک اور عظیم عبادت ہے جس کو شریعت میں صبر کہا گیا ہے۔ قرآن میں ہے کہ صبر کرنے والوں کو بے حساب اجر دیا جائے گا (39:10)۔ حدیث میں ہے کہ صبر سے زیادہ بہتر عطیہ کبھی کسی کو نہیں دیا گیا: وَمَا أُعْطِيَ أَحَدٌ مِنْ عَطَاءٍ أَوْسَعَ مِنَ الصَّبْرِ (سنن ابی داؤد، حدیث نمبر 1644)۔ صبر ایک عبادت ہے، بلکہ تمام عبادتوں میں سب سے بڑی عبادت۔

عصر کی نماز کا ثواب بہت زیادہ ہے، مگر آپ عصر کی نماز دوپہر کے وقت نہیں پڑھ سکتے۔ اسی طرح رمضان کے روزہ کے لیے غیر معمولی ثواب کی خوش خبری دی گئی ہے۔ مگر یہ ثواب محرم کے مہینہ میں روزہ رکھ کر حاصل نہیں کیا جا سکتا۔ یہی معاملہ صبر کی عبادت کا بھی ہے۔ صبر کی عبادت صبر کے حالات میں انجام دی جا سکتی ہے، غیر صابرانہ حالات میں صبر کی عبادت کی انجام دہی ممکن نہیں۔

صبر کا موقع کب پیش آتا ہے۔ صبر کا موقع اس وقت پیش آتا ہے جب کہ آپ کے ساتھ اشتعال انگیزی کی جائے۔ آپ کے ساتھ برا برتاؤ کیا جائے۔ جب کوئی شخص ایسی بات کہے جس سے آپ کی انا پر چوٹ لگتی ہو۔ صبر پر عمل کرنے کا موقع ہمیشہ مخالفانہ حالات میں ہوتا ہے، نہ کہ موافقانہ حالات میں۔

صبر کے حالات پیش آنے پر اکثر لوگ بھڑک اٹھتے ہیں۔ وہ منفی نفسیات کا شکار ہو جاتے ہیں۔ حالانکہ اگر وہ شعوری طور پر جانیں کہ یہ تو ان کے لیے صبر کی عبادت کا موقع ہے تو وہ صبر کے وقت کا اسی طرح استقبال کریں جس طرح وہ نماز اور روزہ کے وقت کا استقبال کرتے ہیں۔

صبر کا موقع عبادت کا موقع ہے۔ ایسا موقع پیش آنے پر آدمی کو یقین کرنا چاہیے کہ وہ وقت آ گیا جب کہ عبادتِ عظیم کا ثبوت دے کر وہ ثوابِ عظیم کا مستحق بن جائے۔

صبر اور اعراض

مکہ کے زمانۂ قیام میں صحابہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا کہ ہم کو اجازت دیجیے کہ ہم اسلام کے دشمنوں کے خلاف اقدام کریں۔ آپ نے فرمایا کہ صبر کرو۔ غزوۂ احزاب میں آپ نے خندق کھود کر اپنے اور دشمنوں کے درمیان آڑ قائم کر دی، تاکہ دونوں فریقوں میں جنگ نہ ہونے پائے۔ مکہ کے سفر میں بعض مسلمانوں نے اللہ اکبر کا نعرہ لگایا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے منع فرمایا اور کہا تم کسی بہرے کو نہیں پکار رہے ہو۔

اس قسم کے واقعات بتاتے ہیں کہ عمل کسی اندھا دھند کارروائی کا نام نہیں۔ عمل کا تعلق تمام تر حالات سے ہے۔ حالات کے مطابق کبھی ایک چیز مفید ہوتی ہے اور کبھی وہی چیز غیر مفید بن جاتی ہے۔ اس دنیا میں کبھی ضروری ہوتا ہے کہ آدمی بولے اور کبھی ضروری ہوتا ہے کہ وہ چپ ہو جائے۔ کبھی یہ مطلوب ہوتا ہے کہ آدمی مقابلہ کرے اور کبھی یہ مطلوب ہو جاتا ہے کہ آدمی مقابلہ کے میدان سے اپنے آپ کو ہٹا دے۔

موجودہ حالات مسلمانوں کے لیے حد درجہ نازک حالات ہیں۔ یہ مسلمانوں کے لیے جہاد کا وقت نہیں، بلکہ صبر کا وقت ہے۔ آج انہیں مقابلہ نہیں کرنا ہے، بلکہ اعراض کرنا ہے۔ اس صبر اور اعراض کا مطلب بزدلی نہیں، بلکہ اس کا مقصد یہ ہے کہ وقفۂ تعمیر حاصل کیا جائے۔

موجودہ زمانہ کے مسلمانوں کا کیس ظلم اور تعصب کا کیس نہیں۔ وہ ایسے لوگوں کا کیس ہے جو زندگی کی دوڑ میں دوسرے لوگوں سے پچھڑ گئے ہوں۔ مسلمان آج جو کچھ بھگت رہے ہیں، وہ خود اپنے پچھڑے پن کی قیمت ہے۔ اب ہمیں ایک وقفۂ تعمیر درکار ہے، تاکہ ہم اپنے پچھڑے پن کی تلافی کر سکیں۔ اس وقفۂ تعمیر کو حاصل کرنا اس کے بغیر ممکن نہیں کہ صبر کا رویہ اختیار کیا جائے۔ دوسروں کی طرف سے پیش آنے والی ہر شکایت کو یک طرفہ طور پر برداشت کیا جائے۔ مواقع کو استعمال کرنے کی خاطر مسائل کو نظر انداز کیا جائے۔

یہی زندگی کا راستہ ہے۔ اس کے سوا جو راستے ہیں، وہ مسلمانوں کو تباہی کے سوا کسی اور منزل پر نہیں پہنچا سکتے۔

مسئلہ کا حل

1947ء کے بعد کے دور میں ہندستان کے مسلمانوں کے ذہن پر سب سے زیادہ جو مسئلہ چھایا رہا ہے، وہ فرقہ وارانہ فساد کا مسئلہ ہے۔ یہ مسئلہ مسلمانوں کو مستقل طور پر عدم تحفظ کے احساس میں مبتلا رکھتا ہے۔ مگر مذکورہ واقعہ علامتی طور پر بتاتا ہے کہ اس مسئلہ کا حل مسلمانوں کے اپنے اختیار میں ہے۔ مسلمان سادہ طور پر صرف یہ کریں کہ وہ کچھ نہ کریں، اور اس کے بعد یقینی طور پر وہ فساد کی مصیبت سے نجات پا جائیں گے۔

عمر بن عبد العزیز (وفات 101ھ) کا قول ہے کہ صبر مومن کے لیے بچاؤ کا ذریعہ ہے: الصَّبْرَ مِعْوَلُ الْمُؤْمِنِ (الزہد لاحمد بن حنبل، صفحہ 238)۔ مذکورہ واقعہ، اور اس طرح کے دوسرے واقعات، اس قول رسول کی عملی تصدیق ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے صبر واعراض کی صورت میں اہل ایمان کو ایک ایسی ڈھال دے دی ہے جو بے خطا اپنا عمل کرتی ہے۔ جب بھی آپ صبر کی تدبیر اختیار کریں، وہ آپ کے لیے یقینی بچاؤ کا ذریعہ بن جائے گا۔

انسان عین اپنی پیدائشی ساخت کے مطابق، اس طرح بنایا گیا ہے کہ وہ کسی کے خلاف زیادتی کرنے کے لیے جواز (justification) چاہتا ہے۔ جب آپ کسی کی اشتعال انگیزی پر مشتعل ہوں تو گویا آپ اس کو یہ جواز دے رہے ہیں کہ وہ آپ کے خلاف زیادتی کرے۔ لیکن جب آپ اشتعال انگیزی کے باوجود مشتعل نہ ہوں تو گویا آپ نے اس سے زیادتی کرنے کا جواز چھین لیا۔

یہ دوسرا رویہ مومن کے حق میں ڈھال کی حیثیت رکھتا ہے۔ جب آپ یہ دوسرا رویہ اختیار کریں تو اس کے بعد آپ اپنے حریف کی فطرت کو اپنا وکیل بنا لیتے ہیں۔ اس کے بعد آپ حریف کے اندر اپنا ایک حامی کھڑا کر دیتے ہیں۔ اس کے بعد آدمی خود اپنی اندرونی کیفیت کے اعتبار سے مجبور ہو جاتا ہے کہ وہ آپ کے خلاف زیادتی کرنے سے باز رہے۔ اور جو آدمی خود اپنے خلاف شکست کھا جائے، وہ کوئی ظالمانہ اقدام کرنے کے لیے اسی طرح نااہل ہو جاتا ہے، جس طرح ایک غبارہ ہوا نکلنے کے بعد اڑنے کے لیے۔

صبر وتقویٰ

قرآن میں ارشاد ہوا ہے کہ اس دنیا کی ہر چیز ہم نے جوڑا جوڑا پیدا کی ہے (51:49)۔ یہ فطرت کا ایک آفاقی اصول ہے۔ یہاں جب بھی کوئی واقعہ رونما ہوتا ہے، وہ دو چیزوں کے تعامل سے رونما ہوتا ہے۔ کوئی بھی چیز تنہا اس دنیا میں کوئی واقعہ یا نتیجہ ظاہر نہیں کرسکتی۔

اس اصول کا تعلق اجتماعی زندگی سے بھی ہے۔ اسی کو ایک پرانی مثل میں اس طرح بیان کیا گیا ہے کہ تالی ایک ہاتھ سے نہیں بجتی۔ ایک آدمی اپنا ہاتھ فضا میں ہلاتا رہے تو اس سے تالی نہیں بجے گی۔ تالی بجنے کے لیے ضروری ہے کہ دوسرا ہاتھ اس سے ٹکرائے۔ جب تک دوسرا ہاتھ نہ اٹھے تالی کا بجنا بھی رکا رہے گا۔

قرآن سے معلوم ہوتا ہے کہ مخالف کی ضرر رسانی کا معاملہ بھی یہی ہے۔ مخالف کی ضرر رسانی کا ارادہ اس وقت کامیاب ہوتا ہے، جب کہ فریق ثانی بھی اپنی نادانی یا سادہ لوحی سے اس کے ساتھ تعاون کا معاملہ کر بیٹھے۔ فریق ثانی اگر ''دوسرا ہاتھ'' بننے سے رک جائے تو دشمن کی مخالفانہ تالی بھی بجنے والی نہیں۔ قرآن میں بتایا گیا ہے کہ کچھ لوگ اہل اسلام کو نقصان پہنچانے پر تلے ہوئے ہیں۔ ان کو اہل اسلام سے سخت بغض اور عداوت ہے۔ اس کے بعد فرمایا کہ:

وَإِنْ تَصْبِرُوا وَتَتَّقُوا لَا يَضُرُّكُمْ كَيْدُهُمْ شَيْئًا إِنَّ اللَّهَ بِمَا يَعْمَلُونَ مُحِيطٌ (3:120)۔ یعنی، اور اگر تم صبر کرو اور تقویٰ کی روش اختیار کرو تو ان کی کوئی تدبیر تم کو کچھ بھی نقصان نہ پہنچائے گی۔ جو کچھ وہ کر رہے ہیں، اللہ نے ان سب کا احاطہ کر رکھا ہے۔

اس آیت کی تشریح اس طرح کی جاسکتی ہے کہ — دشمن کی سازش صرف 50 فی صد حد تک کارگر ہے۔ وہ اپنی تکمیل تک صرف اس وقت پہنچتی ہے جب کہ فریق ثانی اپنی کسی غلطی سے اس کے منصوبہ کا بقیہ 50 فی صد حصہ پورا کردے۔ صبر وتقویٰ اس بات کی ضمانت ہے کہ دشمن کو اس کے منصوبہ کا یہ بقیہ نصف حصہ حاصل نہ ہو۔ جب ایسا ہوگا تو اس کی مخالفانہ تدبیر لازمی طور پر بے نتیجہ ہو کر رہ جائے گی۔

اس قانون کے تحت اللہ تعالیٰ نے آپ کے معاملہ کو خود آپ کے ہاتھ میں دے دیا ہے۔

صبر وتوکل

وَالَّذِينَ هَاجَرُوا فِي اللَّهِ مِنْ بَعْدِ مَا ظُلِمُوا لَنُبَوِّئَنَّهُمْ فِي الدُّنْيَا حَسَنَةً وَلَأَجْرُ الْآخِرَةِ أَكْبَرُ لَوْ كَانُوا يَعْلَمُونَ الَّذِينَ صَبَرُوا وَعَلَى رَبِّهِمْ يَتَوَكَّلُونَ (16:41-42)۔ یعنی، اور جن لوگوں نے اللہ کے لیے اپنا وطن چھوڑا، بعد اس کے کہ ان پر ظلم کیا گیا، ہم ان کو دنیا میں ضرور اچھا ٹھکانہ دیں گے اور آخرت کا ثواب بہت بڑا ہے، کاش وہ

جانتے۔ وہ ایسے ہیں جو صبر کرتے ہیں اور اپنے رب پر بھروسہ رکھتے ہیں۔

قرآن کی اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ صبر کے ساتھ توکل کا نہایت گہرا تعلق ہے۔ صبر ایک عظیم دینی عمل ہے۔ مگر اس دنیا میں صبر کی روش پر وہی لوگ قائم رہ سکتے ہیں جو اللہ رب العالمین کی ذات پر بے پناہ بھروسہ رکھتے ہوں۔

اس آیت میں جن اہل ایمان کا ذکر ہے، یہ وہ لوگ تھے جن پر ان کے مخالفوں نے ظلم کیا ۔ مگر وہ منفی ردعمل میں مبتلا نہیں ہوئے۔ ان کے اندر یہ جذبہ نہیں بھڑکا کہ وہ ظالموں کو سبق سکھائیں، یا ان سے ان کے ظلم کا انتقام لیں۔ اس کے بجائے انھوں نے یہ کیا کہ خاموشی کے ساتھ اس مقام سے ہٹ گئے جہاں ان کے اوپر ظلم ہو رہا تھا۔ وہ انسانوں سے الجھنے کے بجائے، خدا کی طرف متوجہ ہو گئے۔

ان کے اس عملِ ہجرت کو قرآن میں صبر کہا گیا۔ اور پھر فرمایا کہ یہ وہ لوگ ہیں جو خدا پر توکل کرنے والے ہیں۔ صبر کے ساتھ توکل کا ذکر نہایت اہم ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ کوئی آدمی صبر کے طریقہ پر قائم نہیں ہوسکتا، جب تک کہ اس کے اندر توکل علی اللہ کی صفت نہ ہو۔

ناموافق صورتحال پیش آنے کے بعد جو آدمی بے برداشت ہوکر لڑنے لگے، وہ اپنی اس روش سے ثابت کرتا ہے کہ وہ صرف اپنی ذات کو جانتا تھا۔ وہ خدا کی برتر طاقتوں سے واقف نہ تھا۔ اگر وہ خدا کی خدائی کو اور اس کے وعدوں کو جانتا تو وہ صبر کرتا۔ کیوں کہ اس کو یقین ہوتا کہ صبر کر کے میں زیادہ بڑی طاقت کو اپنے مخالف کے مقابلہ میں کھڑا کر رہا ہوں۔ یہ طاقت خود مالک کائنات کی ہے، جس کی پکڑ سے بچنا کسی کے لیے بھی ممکن نہیں۔

عافیت کی زندگی

حاتم اصم (وفات 237ھ) جب امام احمد (وفات 241ھ) کے پاس آئے تو امام احمد

نے ان سے پوچھا: یَا حَاتِمُ فِيمَ التَّخَلُّصُ مِنَ النَّاسِ؟ قَالَ: يَا أَحْمَدُ فِي ثَلَاثِ خِصَالٍ: أَنْ تُعْطِيَهُمْ مَالَكَ وَلَا تَأْخُذَ مِنْ مَالِهِمْ شَيْئًا، وَتَقْضِيَ حُقُوقَهُمْ وَلَا تَسْتَقْضِيَ أَحَدًا مِنْهُمْ حَقًّا لَكَ، وَتَحْتَمِلَ مَكْرُوهَهُمْ وَلَا تُكْرِهَ أَحَدًا مِنْهُمْ عَلَى شَيْءٍ (تاریخ بغداد، جلد 8، صفحہ 237)۔ یعنی، امام احمد نے ان سے کہا کہ مجھے بتائیے کہ لوگوں سے محفوظ کیسے رہا جائے۔ حاتم اصم نے کہا کہ تین چیزوں کے ذریعہ سے: ان کو اپنا مال دیں، مگر خود ان کا مال نہ لیں۔ لوگوں کے حقوق ادا کریں، مگر اپنے حقوق ان سے نہ مانگیں۔ لوگوں کی ایذاؤں پر صبر کریں اور خود ان کو ایذا نہ پہنچائیں۔

ان تینوں باتوں کا خلاصہ یہ ہے کہ آپ یک طرفہ طور پر لوگوں کو یہ احساس دلا دیں کہ وہ آپ سے پوری طرح محفوظ ہیں۔ اس کے بعد آپ بھی ان سے پوری طرح محفوظ ہو جائیں گے۔ لوگوں کو یہ احساس تین تدبیروں کے ذریعہ دلایا جا سکتا ہے۔

لوگوں کے پاس جو کچھ ہے، اس سے اپنے آپ کو مستغنیٰ بنا لیں۔ مگر آپ کے پاس جو کچھ ہے، اس میں سے آپ لوگوں کو حسبِ توفیق ان کا حصہ پہنچاتے رہیں۔ آپ لوگوں سے لینے والے نہ بنیں، اس کے بجائے آپ لوگوں کو دینے والے بن جائیں۔

لوگوں کا جو حق آپ کے اوپر ہو اس کی ادائیگی میں آپ کوئی کوتاہی نہ کریں۔ مگر دوسروں کے اوپر آپ کا جو حق آتا ہو، اس کو دوسروں سے وصول کرنے کی کبھی کوئی مہم نہ چلائیں۔

معاشرتی زندگی میں بار بار ایسا ہوگا کہ دوسروں کی طرف سے آپ کو تکلیف پہنچے گی۔ اس طرح کے مواقع پر آپ یک طرفہ صبر و تحمل کی پالیسی کو اختیار کر لیں، آپ صرف اتنا ہی نہ کریں کہ دوسروں کو آپ ایذا نہ پہنچائیں، بلکہ اس سے بڑھ کر آپ کا رویہ یہ بن جائے کہ دوسروں کی ایذاؤں پر آپ صبر کر لیں، آپ لوگوں سے بدلہ لیے بغیر انہیں معاف کر دیں۔

دنیا میں عافیت کی زندگی حاصل کرنے کا یہی واحد یقینی نسخہ ہے۔ اس کے سوا جو تدبیر اختیار کی جائے گی، وہ امن و عافیت دینے والی نہیں بن سکتی۔

قرآن کی ہدایت

قرآن میں اللہ تعالیٰ نے اپنے مومن بندوں کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا ہے کہ اگر تم لوگ صبر کا طریقہ اختیار کرو اور اللہ سے ڈرو تو ان کی کوئی سازش تم کو کچھ بھی نقصان نہ پہنچا سکے گی۔ وہ جو کچھ کرتے ہیں اللہ ان سب کا احاطہ کیے ہوئے ہے: وَإِنْ تَصْبِرُوا وَتَتَّقُوا لَا يَضُرُّكُمْ كَيْدُهُمْ شَيْئًا إِنَّ اللَّهَ بِمَا يَعْمَلُونَ مُحِيطٌ (3:120)۔

ابن کثیر لکھتے ہیں کہ اس آیت کے ذریعہ اللہ تعالیٰ نے اہل ایمان کو یہ ہدایت فرمائی ہے کہ وہ صبر اور تقویٰ کے ذریعہ شر پسندوں کے شر سے اور فاجروں کی سازش سے اپنے آپ کو بچائیں: يُرْشِدُهُمْ تَعَالَى إِلَى السَّلَامَةِ مِنْ شَرِّ الْأَشْرَارِ وَكَيْدِ الْفُجَّارِ بِاسْتِعْمَالِ الصَّبْرِ وَالتَّقْوَى (تفسیر ابن کثیر، جلد2، صفحہ 94)۔

صفوۃ التفاسیر میں ہے کہ اگر تم نے ان کی ایذا پر صبر کیا اور اپنے اقوال اور اعمال میں تم اللہ سے ڈرے تو ان کی سازش اور ان کی تدبیر تم کو کچھ نقصان نہ پہنچائے گی۔ پس اللہ نے ان کے ضرر کو ختم کرنے کے لیے صبر اور تقویٰ کی شرط لگائی: أي إن صبرتم على أذاهم واتقيتم الله في أقوالكم وأعمالكم لا يضركم مكرهم وكيدهم، فشرط تعالى نفي ضررهم بالصبر والتقوى (صفوۃ التفاسیر، جلد1، صفحہ 205)۔

ہندستان میں فرقہ پرستوں کے جلوس اور ان کے دل آزار نعروں کے سلسلہ میں صبر اور تقویٰ کا انطباق کیا ہے۔ وہ یہ ہے کہ مسلمان ان کی اشتعال انگیزی کے باوجود مشتعل نہ ہوں۔ وہ ان کی دل آزاری کو یک طرفہ طور پر برداشت کرلیں۔ وہ ردعمل کا اظہار کرنے کے بجائے خاموشی کا رویہ اختیار کریں۔ وہ ہمیشہ صبر کے رویہ پر قائم رہیں۔

دوسرے یہ کہ وہ کسی حال میں بھی تقویٰ کی روش نہ چھوڑیں۔ ایسے مواقع پر دنیوی انجام

سے زیادہ اخروی انجام کو وہ اپنے سامنے رکھیں۔ وہ قوم پرستی کے بجائے اصول پسندی کا انداز اختیار کریں۔ فریق ثانی کی دشمنی کے باوجود وہ اس کے ساتھ بے انصافی نہ کریں۔ وہ جو کچھ کریں، یہ سمجھ کر کریں کہ ان کو اللہ کے یہاں اس کا جواب دینا ہے۔ وہ اللہ کے معاملہ میں حساس اور انسانوں کے معاملہ میں غیر حساس بن جائیں۔

مسلمان اگر اس طرح صبر وتقویٰ کا طریقہ اختیار کریں تو یقینی طور پر مخالفین کی ہر سازش بے اثر ہو جائے گی۔ ہر مخالفانہ تدبیر ان کے حق میں ناکام ثابت ہوگی۔

مذکورہ آیت میں ارشاد ہوا ہے کہ إِنَّ اللَّهَ بِمَا يَعْمَلُونَ مُحِيطٌ (3:120)۔ یعنی، اللہ ان کی سرگرمیوں کا احاطہ کیے ہوئے ہے۔ یہ فقرہ بہت بامعنیٰ ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ نے شرپسندوں کے شر سے بچاؤ کے لیے صبر وتقویٰ کے جس طریقہ کی تعلیم دی ہے، وہ ایک ایسا طریقہ ہے جو معاملہ کے اوپر پوری طرح حاوی ہے۔ وہ یقینی طور پر ایک بے خطا طریقہ ہے۔ وہ کبھی ناکام ہونے والا نہیں۔

اللہ نے انسان کو پیدا کیا ہے۔ وہ انسان کی سرشت اور اس کے مزاج سے پوری طرح باخبر ہے۔ اس نے جو اصلاحی اور دفاعی تدبیر بتائی ہے، وہ اپنے علم کلی کے تحت بتائی ہے۔ اللہ کے لیے یہ ایک پوری طرح معلوم مسئلہ کا پوری طرح معلوم جواب ہے۔ یہ حل تمام متعلق پہلوؤں کا مکمل احاطہ کیے ہوئے ہے۔ کوئی بھی صورت حال ایسی نہیں جو اس کے دائرۂ اثر سے خارج ہو۔

ان خصوصیات نے اس حل کو ایک بے خطا حل بنا دیا ہے۔ تم جب بھی اس کو استعمال کرو گے، اس کا نتیجہ تمہارے حق میں ہی نکلے گا۔ کوئی بھی انسانی گروہ اس کے دائرہ سے باہر نہیں۔ شر انگیزی کی کوئی بھی آگ ایسی نہیں جو اس طریقہ کو کام میں لا کر بجھائی نہ جاسکتی ہو۔ اس تدبیر کے اندر ہر بم کو ناکارہ بنا دینے کی طاقت ہے، خواہ بظاہر وہ کیسا ہی خطرناک بم کیوں نہ ہو۔

صبر وشکر

صحیح مسلم کی ایک روایت کے مطابق، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ مومن کا معاملہ بڑا عجیب ہے۔ اس کا ہر معاملہ اس کے لیے خیر ہے۔ اور ایسا مومن کے سوا کسی اور کے لیے نہیں۔ اگر اس کو آرام ملتا ہے تو وہ شکر کرتا ہے۔ پس وہ اس کے لیے خیر بن جاتا ہے۔ اور اگر اس پر مصیبت آتی ہے تو وہ صبر کرتا ہے۔ پس وہ اس کے لیے خیر بن جاتا ہے۔

عَنْ صُهَيْبٍ، قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: عَجَبًا لِأَمْرِ الْمُؤْمِنِ، إِنَّ أَمْرَهُ كُلَّهُ خَيْرٌ، وَلَيْسَ ذَاكَ لِأَحَدٍ إِلَّا لِلْمُؤْمِنِ، إِنْ أَصَابَتْهُ سَرَّاءُ شَكَرَ، فَكَانَ خَيْرًا لَهُ، وَإِنْ أَصَابَتْهُ ضَرَّاءُ، صَبَرَ فَكَانَ خَيْرًا لَهُ (صحیح مسلم، حدیث نمبر 2999)۔

The affair of the believer is truly strange. Every situation proves good for him and this is special to a believer alone. If he finds himself in a pleasant situation, he is thankful to God, and that is good for him. If he is faced with unpleasant situation he keeps patience and again that is good for him.

مومن کے ساتھ دوطرفہ خیر کا یہ معاملہ کسی پر اسرار سبب سے نہیں ہوتا، وہ مکمل طور پر ایک معلوم سبب کے تحت پیش آتا ہے۔ اصل یہ ہے کہ مومن اس انسان کا نام ہے جس کو دریافت کی سطح تک خدا کی معرفت حاصل ہوئی ہو۔ ایسے انسان کے اندر ایک ذہنی انقلاب آجاتا ہے۔ اس کے اندر شعوری بیداری کی صفت پیدا ہوجاتی ہے۔ وہ اس قابل ہوجاتا ہے کہ معاملات اور تجربات کو حقیقت کی نظر سے دیکھے۔ وہ وقتی جذبات سے بلند ہوکر معاملہ کی گہرائی کو سمجھ سکے۔

مومن اپنی اس حقیقت شناسی کی بنا پر اس قابل ہوجاتا ہے کہ وہ جس تجربہ سے بھی گزرے وہ اس کو مثبت نتیجہ میں تبدیل کر سکے۔ وہ ہر واقعہ میں خدا کی کارفرمائی کو دیکھے۔ وہ ذاتی تجربہ کو خدا کے تخلیقی نقشہ میں رکھ کر دیکھ سکے۔ مومن کی یہی وہ صفات ہیں جو اس کے اندر یہ بامعنٰی صلاحیت پیدا کر دیتی ہیں کہ اس کو جب خوشی اور راحت کا تجربہ ہو تو وہ سرکش نہ بن جائے۔ وہ اس کو خدا کا عطیہ سمجھ کر خدا کی خدائی کا اعتراف کرے۔ اسی اعتراف خداوندی کا نام شکر ہے۔ شکر بلاشبہ ایک عظیم عبادت ہے۔

تاہم دنیا کی زندگی میں آدمی کو ہمیشہ خوش گوار تجربے نہیں ہوتے۔ بار بار ایسا ہوتا ہے کہ آدمی کو ناخوش گوار تجربات سے گزرنا پڑتا ہے۔ اس وقت مومن کی شعوری بیداری اس کو اس سے بچا لیتی ہے کہ وہ اس پر شکایت یا فریاد کرنے لگے۔ وہ ناخوش گوار تجربہ کو خدا کے تخلیقی نقشہ کے مطابق سمجھتا ہے۔ وہ ناخوش گوار تجربہ کو ایک فطری عمل سمجھ کر اس سے یہ یقین حاصل کرتا ہے کہ یہ ایک وقتی چیز ہے۔ حالات یقیناً بدلیں گے اور وہ جلد ہی مجھ کو زیادہ بہتر زندگی عطا کریں گے، خواہ آج کی دنیا میں یا آج کے بعد بننے والی دوسری ابدی دنیا میں۔

حقیقت یہ ہے کہ صبر بھی شکر ہی کی ایک صورت ہے۔ ناخوش گوار صورت حال کو رضامندی کے ساتھ قبول کرنا اور اس کو خدا کی طرف سے آیا ہوا مان کر مثبت ذہن کے تحت اس کا استقبال کرنا یہی صبر ہے۔ اور یہ صبر ہمیشہ شاکرانہ قلب سے ظاہر ہوتا ہے۔ ناشکری سے بھرا ہوا دل کبھی صبر کا ثبوت نہیں دے سکتا۔

رات اور دن

قرآن کی سورہ الاسراء میں ارشاد ہوا ہے — اور انسان برائی مانگتا ہے، جس طرح اس کو بھلائی مانگنا چاہیے۔ اور انسان بڑا جلد باز ہے۔ اور ہم نے رات اور دن کو دو نشانیاں بنایا۔ پھر ہم نے رات کی نشانی کو مٹا دیا اور دن کی نشانی کو ہم نے روشن کر دیا۔ تاکہ تم اپنے رب کا فضل تلاش کرو اور تاکہ تم برسوں کی گنتی اور حساب معلوم کرو۔ اور ہم نے ہر چیز کو خوب کھول کر بیان کیا ہے (17:11-12)۔

رات اور دن کا نظام بتاتا ہے کہ خدا کا طریقہ یہ ہے کہ پہلے تاریکی ہو اور اس کے بعد روشنی آئے۔ خدائی نقشہ میں دونوں یکساں طور پر ضروری ہیں۔ جس طرح روشنی میں فائدے ہیں، اسی طرح تاریکی میں بھی فائدے ہیں۔ دنیا میں اگر رات اور دن کا فرق نہ ہو تو آدمی اپنے اوقات کی تقسیم کس طرح کرے۔ وہ اپنے کام اور آرام کا نظام کس طرح بنائے۔

آدمی کو ایسا نہیں کرنا چاہیے کہ وہ تاریکی سے گھبرائے اور صرف ''روشنی'' کا طالب بن جائے۔ کیوں کہ خدا کی دنیا میں ایسا ہونا ممکن نہیں۔ جو آدمی ایسا چاہتا ہو اس کو خدا کی دنیا چھوڑ کر اپنے لیے دوسری دنیا تلاش کرنی پڑے گی۔

مگر یہی انسان کی سب سے بڑی کمزوری ہے۔ وہ ہمیشہ یہ چاہتا ہے کہ اس کو تاریکی کا مرحلہ پیش نہ آئے اور فوراً ہی اس کو روشنی حاصل ہو جائے۔ اسی کمزوری کا نتیجہ وہ چیز ہے جس کو عجلت کہا جاتا ہے۔ عجلت دراصل خداوندی منصوبہ پر راضی نہ ہونے کا دوسرا نام ہے۔ اور خداوندی منصوبہ پر راضی نہ ہونا ہی تمام انسانی بربادیوں کا اصل سبب ہے۔

خدا چاہتا ہے کہ انسان دنیا کی فوری لذتوں پر صبر کرے، تاکہ وہ آخرت کی طرف اپنے سفر کو جاری رکھ سکے۔ مگر انسان اپنی عجلت کی وجہ سے دنیا کی وقتی لذتوں پر ٹوٹ پڑتا ہے۔

وہ آگے کی طرف اپنا سفر طے نہیں کر پاتا۔ آدمی کی عاجلہ پسندی اس کو آخرت کی نعمتوں سے محروم کرنے کا سب سے بڑا سبب ہے۔

یہی دنیا کا معاملہ بھی ہے۔ دنیا میں حقیقی کامیابی صبر سے ملتی ہے، نہ کہ جلد بازی ہے۔

صبر، محاسبہ، توسم

ایمان کے بعد مطلوب زندگی کی تعمیر کے لیے تین بنیادی چیزوں کی ضرورت ہے۔ اِن تینوں چیزوں کو اختیار کیے بغیر کوئی شخص سچا مومن نہیں بن سکتا۔ وہ تین چیزیں یہ ہیں: صبر، محاسبہ، توسم۔

ایمان لانے کے بعد ہر مومن کے لیے سب سے پہلا مرحلہ یہ پیش آتا ہے کہ اپنے ماحول کے اندر وہ کس طرح مومنانہ زندگی گزارے۔ قانونِ فطرت کے مطابق، یہاں ہر لمحہ غیر موافق باتیں پیش آتی ہیں، ایسی باتیں جو آدمی کو بے برداشت کردیں۔ ایسے تمام مواقع پر آدمی کو صبر کرنا پڑتا ہے، تاکہ انحراف کے بغیر وہ مسلسل طور پر ایمان کے راستے پر قائم رہے۔

دوسری چیز محاسبہ (introspection) ہے۔ امتحان کی اِس دنیا میں آدمی بار بار غلطی کرتا ہے۔ اُس وقت ضرورت ہوتی ہے کہ بے لاگ محاسبہ کرکے اپنی اصلاح کی جاتی رہے۔ فوری محاسبہ کے اِس عمل کے بغیر یہ ہوگا کہ غلطیاں آدمی کی شخصیت کا حصہ بن جائیں گی اور پھر وہ کبھی اس سے جدا نہ ہوں گی۔

اِس سلسلے میں تیسری چیز توسم ہے۔ توسم کا مطلب ہے۔ غور وفکر کی زندگی گزارنا، اپنے تجربات اور اپنے آس پاس کی دنیا سے مسلسل طور پر نصیحت اور سبق لیتے رہنا۔ یہ توسم مومن کے لیے اس کی ایمانی غذا ہے۔ مسلسل توسم کے بغیر کوئی شخص اپنے آپ کو ایمانی ترقی کے راستے کا مسافر نہیں بنا سکتا۔

اسلامی زندگی، ایمان سے شروع ہوتی ہے۔ مگر ایمان، اسلامی زندگی کا صرف آغاز ہے،

وہ اس کی آخری منزل نہیں۔ اِس آغاز کے بعد آدمی کو مسلسل طور پر ایک کورس سے گزرنا پڑتا ہے۔ اِس کورس کی تکمیل کے بغیر حقیقی معنوں میں کوئی شخص مومن ومسلم کے درجے تک نہیں پہنچ سکتا۔ اِس کورس کے اجزا بنیادی طور پر یہی تین ہیں— صبر اور محاسبہ اور توسم۔ یہ کورس کسی قسم کے رسمی اعمال کے ذریعے انجام نہیں پاتا۔ یہ مکمل طور پر ایک شعوری سفر ہے۔ اپنے شعور کو متحرک کر کے ہی آدمی اس امتحان میں کامیاب ہوسکتا ہے۔

صبر کرنے والے

قرآن میں صبر کی بہت زیادہ اہمیت بتائی گئی ہے۔ چار مقام پر صبّار کا لفظ آیا ہے، یعنی بہت زیادہ صبر کرنے والے (14:5; 31:31; 34:19; 42:33)۔ ایک مقام پر یہ آیا ہے: فَاصۡبِرۡ إِنَّ الۡعَاقِبَةَ لِلۡمُتَّقِينَ (11:49)۔ یعنی، پس صبر کرو بیشک آخری انجام ڈرنے والوں کے لیے ہے۔ ان آیتوں کا مطالعہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ کامیابی کا تعلق بہت زیادہ صبر سے ہے۔ صبر ہے تو کامیابی ہے، صبر نہیں تو کامیابی نہیں۔

اس دنیا میں کامیابی کے لیے صبر کی اتنی زیادہ اہمیت کیوں ہے۔ اس کا سبب یہ ہے کہ یہ دنیا اجتماعی زندگی کی دنیا ہے۔ یہ دنیا کسی اکیلے انسان کی دنیا نہیں ہے، بلکہ اجتماعی زندگی (collective life) کی دنیا ہے۔ یہاں بہت سے لوگوں کو مل جل کر رہنا پڑتا ہے۔ آپ کوئی منصوبہ بنائیں، اور اس کے لیے اللہ سے دعا کریں، تو آپ خواہ کتنا ہی زیادہ صحیح راستے پر ہوں، لیکن آپ کی کامیابی کا راستہ بہت سے دوسرے لوگوں کے درمیان سے گزرے گا۔ اب صورتِ حال یہ ہے کہ یہ دنیا اسباب وعلل کے اصولوں پر قائم ہے۔ اس دنیا میں کوئی کامیابی تدریجی عمل (gradual process) کے روپ میں حاصل ہوتی ہے۔ ہر آدمی کو دوسرے انسان کے ساتھ مل جل کر آگے بڑھنا ہوتا ہے۔ دوسرے لفظوں میں یہ کہ

ہر آدمی اپنے سفر کے ساتھ دوسرے لوگوں کو اپنے سفر کا راستہ دینا پڑتا ہے۔ تب ایسا ہوتا ہے کہ ایک انسان اپنے سفر کو کامیابی کی منزل تک پہنچائے۔

یہی زندگی کا وہ تقاضا ہے، جس کی وجہ سے ہر انسان کو صبر کا اصول اختیار کرنا پڑتا ہے۔ دوسروں کو مواقع دینے کے بعد ہی ایک شخص کو اپنے لیے زندگی کا موقع حاصل ہوتا ہے۔ یہ عین وہی اصول ہے، جس کو ٹریفک کا اصول کہا جاتا ہے، یعنی راستے پر دوسرے چلنے والے کو موقع دے کر اپنے لیے چلنے کا راستہ نکالنا۔ گویا سفر ایک مینجمنٹ کا معاملہ ہے۔ صحیح مینجمنٹ سے آپ کا سفر کامیابی کی منزل تک پہنچے گا، اور اگر غلط مینجمنٹ ہو تو آپ کا سفر کہیں پہنچنے والا نہیں۔ کامیاب سفر صابرانہ مینجمنٹ کے نتیجے کا دوسرا نام ہے۔

قدرت کے باوجود

حدیث میں آیا ہے کہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جب تم کو اپنے دشمن پر قدرت حاصل ہو جائے تو اسے معاف کرنے کو اس پر اپنی قدرت کا شکرانہ بنالو: رُوِيَ عَنِ النَّبِيِّ ﷺ أَنَّهُ قَالَ إِذَا قَدَرْتَ عَلَى عَدُوِّكَ، فَاجْعَلِ العَفْوَ عَنْهُ شُكْرًا لِلْقُدْرَةِ عَلَيْهِ (ادب الدنیا والدین للماوردی، جلد 1، صفحہ 262)۔

اخلاق کیا ہے۔ اخلاق اعلیٰ انسانی کردار کا دوسرا نام ہے۔ انسانی تعلقات میں کسی شخص سے جس اعلیٰ سلوک کی توقع کی جاتی ہے اسی کو اخلاق کہتے ہیں۔ کسی انسان کی انسانیت کو پہچاننے کا معیار یہی اخلاق ہے۔

ایک شخص سے آپ کی دشمنی ہو گئی۔ پھر ایسے حالات پیش آئے کہ آپ نے اس کو زیر کر کے اس کے اوپر قابو پالیا۔ اس وقت ایک صورت یہ ہے کہ آپ اس معاملہ کو صرف انتقام کی نظر سے دیکھیں، آپ یہ سوچیں کہ اب وہ وقت آ گیا ہے کہ اس سے بھرپور بدلہ لیا

جائے اور اپنے انتقام کے جذبات کو ٹھنڈا کیا جائے۔ مگر یہ نہایت چھوٹی سوچ ہے، اعلیٰ انسانیت سے اس کا کوئی تعلق نہیں۔

دوسری صورت یہ ہے کہ آپ سارے معاملہ کو خدا کی نظر سے دیکھیں۔ آپ اپنی کامیابی کو خدا کی طرف سے ملی ہوئی کامیابی سمجھیں۔ ایسی حالت میں آپ کے جذبات بالکل مختلف ہوں گے۔ اب آپ کے اندر شکر کا جذبہ ابھر آئے گا۔ اپنی کامیابی کے بعد شکر کی سب سے زیادہ اعلیٰ صورت آپ کو یہ دکھائی دے گی کہ آپ اپنے دشمن کو معاف کر دیں۔

قابو پانے کے باوجود دشمن کو معاف کر دینا کوئی سادہ بات نہیں۔ یہ ایک زبردست قربانی کا معاملہ ہے۔ اس کے لیے باہر کے دشمن کو کچلنے کے بجائے، خود اپنے نفس کو کچلنا پڑتا ہے۔ اپنے اندر بھڑکتی ہوئی انتقام کی آگ کو ٹھنڈا کرنے کے بعد ہی کسی کے لیے یہ ممکن ہوتا ہے کہ وہ قابو پانے کے بعد بھی اپنے دشمن کو معاف کر دے۔

معاف کرنا ایک نیکی ہے۔ اور قدرت کے باوجود معاف کرنا سب سے بڑی نیکی۔

صبر، صبر، صبر

انسان کی سب سے بڑی کمزوری یہ ہے کہ وہ حد درجہ خود پسند واقع ہوا ہے۔ ہر آدمی چاہتا ہے کہ وہ اپنے کو عزت اور بڑائی کے مقام پر دیکھے، ہر آدمی چاہتا ہے کہ اس کی رائے سب سے اچھی رائے سمجھی جائے۔ یہی وہ چیز ہے جس نے حق کے سفر کو موجودہ دنیا میں مشکل ترین سفر بنا دیا ہے۔ ظاہر ہے کہ کروروں انسانوں میں ہر آدمی جب اپنے کو صحیح سمجھے تو کون کس کی بات سنے گا اور کون حق کو حق سمجھ کر قبول کرے گا۔

مگر یہی وہ مقام ہے جہاں آدمی کا امتحان لیا جا رہا ہے۔ خدا کا محبوب بندہ وہ ہے جو ”میں پرستوں“ کے ہجوم میں اپنے کو ”بے میں“ بنا لے۔ جو اپنی خود پسندی کو خدا پسندی میں تحلیل

کر دے۔ جو اپنی بات کے مقابلہ میں حق کی بات کو اختیار کر لے۔ جو دنیا کی عزت کے مقابلہ میں آخرت کی عزت کو اہمیت دینے لگے۔ لوگوں کی طرف سے خواہ کتنی ہی تلخیاں پیش آئیں وہ اپنی طرف سے منفی عمل کا اظہار نہ کرے۔ اسی کا نام صبر ہے۔ اس میں شک نہیں کہ یہ ایک بے حد مشکل راستہ ہے، مگر اس میں بھی شک نہیں کہ یہی وہ راستہ ہے جو کسی آدمی کو جنت کی طرف لے جانے والا ہے۔ جنت صبر کرنے والوں کو ملتی ہے، اور صبر کرنے والا وہ ہے جو اللہ کی خاطر اپنے آپ کو کچل ڈالے۔

حق کا سفر جنت کا سفر ہے۔ اور جنت کے متعلق حدیث میں ارشاد ہوا ہے کہ وہ ناخوش گواریوں سے ڈھانک دی گئی ہے: حُجِبَتِ النَّارُ بِالشَّهَوَاتِ، وَحُجِبَتِ الجَنَّةُ بِالْمَكَارِهِ (صحیح البخاری، حدیث نمبر 6487)۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ نے اپنی دنیا کا نظام اس طرح بنایا ہے کہ یہاں جنت کی طرف بڑھنے والے کے لیے ناخوش گوار حالات سے گزرے بغیر چارہ نہیں۔ جو شخص بھی جنت کا مسافر بننا چاہے اس کو پہلے ہی جان لینا چاہیے کہ وہ ایک ایسے راستہ پر چلنے کا ارادہ کر رہا ہے جس میں لوگوں کی طرف سے تلخ باتیں آئیں گی، جس میں طویل انتظار کی مشقت برداشت کرنی ہوگی، جس میں مخالفین کی طرف سے طرح طرح کی دل آزاری کی باتیں پیش آئیں گی۔ حتیٰ کہ کبھی جارحانہ کارروائیوں کا سامنا ہوگا۔ ان مواقع پر حق کا مسافر اگر صبر کھودے، اگر وہ بے برداشت ہو جائے تو وہ یا تو بد دل ہو کر اپنا راستہ بدل لے گا یا درمیان کے کانٹوں سے الجھ کر رہ جائے گا اور آگے نہ بڑھ سکے گا۔

جنت کا سفر تمام تر صبر کا سفر ہے۔ جنت میں وہی شخص پہنچے گا جو صبر کی تلخیوں کو سہنے کے لیے تیار ہو، جو جذبات کی پامالی پر بھی بے ہمت ہونا نہ جانے، جو نفس کی ہر چوٹ کو اپنے سینہ کی ویرانیوں میں چھپالے۔

صبر و برداشت

حضرت ابوسعید سعد بن مالک بن سنان الخدری کی ایک روایت ہے جس کو امام بخاری اور امام مسلم دونوں نے اپنی ''صحیح'' میں نقل کیا ہے۔ اس کا ایک جزء یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ کسی شخص کو اللہ کی طرف سے صبر سے زیادہ بہتر اور زیادہ بڑا عطیہ نہیں دیا گیا: وَمَا أُعْطِيَ أَحَدٌ عَطَاءً خَيْرًا وَأَوْسَعَ مِنَ الصَّبْرِ (صحیح البخاری، حدیث نمبر 1469؛ صحیح مسلم، حدیث نمبر 1053)۔

صبر تمام کامیابیوں کی کنجی ہے۔ خواہ اس کا تعلق دنیا کی کامیابی سے ہو یا آخرت کی کامیابی سے۔ پیغمبر اسلام کی یہ تعلیم اعلیٰ ترین فطری صداقت تھی۔ چنانچہ وہ ساری دنیا میں مختلف شکلوں میں دہرائی گئی۔ شیخ سعدی شیرازی (1213-1292ء) نے اس کو فارسی زبان میں اس طرح بیان کیا کہ صبر کڑوا ہے، مگر اس کا پھل میٹھا ہے:

صبر تلخ است ولیکن بر شیریں دارد

اس کے بعد زندگی کا یہ قیمتی سبق عالمی ادب میں پہنچا اور ہر ملک میں اس کو کسی نہ کسی صورت سے نقل کیا گیا۔ مثلاً فرانسیسی مفکر روسو (Jean Jacques Rousseau) نے یہی بات اس طرح کہی کہ برداشت کڑوی چیز ہے مگر اس کا پھل میٹھا ہوتا ہے:

Patience is bitter, but its fruit is sweet.

صبر کا کڑوا پن چند منٹ کے لیے ہوتا ہے، مگر بے صبری کے نتیجہ میں جو کڑوا پن آتا ہے، وہ برسوں تک بھی ختم نہیں ہوتا۔ صبر کا جھٹکا ذہن کے اندر صرف نفسیاتی طور پر سہنا پڑتا ہے، مگر بے صبری وہ چیز ہے جس کا انجام جانوں کی ہلاکت ہے۔ جائدادوں کو برباد کرتی ہے۔ وہ آدمی کو آگ اور خون کے دریا میں پہنچا دیتی ہے۔

صبر ایک اصول ہے۔ جب کہ بے صبری صرف ایک منفی ردِّ عمل ہے۔ صبر کرنے والا اپنے آپ کو با اصول انسان ثابت کرتا ہے۔ اس کو اندرونی طور پر اطمینان کی یہ لذت ملتی ہے کہ وہ کٹھن گھڑیوں میں بھی اصول پر قائم رہا۔ اس کے برعکس، بے صبر انسان کے حصہ میں یہ بدنصیبی آتی ہے کہ وہ وقتی طور پر بھڑک کر ایک جذباتی کارروائی کرے، اور پھر ساری عمر پچھتاتا رہے کہ کاش میں نے ایسا نہ کیا ہوتا۔

صبر کی زمین پر

ہری بھری فصل مٹی کے کھیت میں آتی ہے، نہ کہ سونے چاندی کے فرش پر — یہ محدود معنوں میں صرف زراعت کی بات نہیں، بلکہ یہ زندگی کا عالم گیر قانون ہے۔ خدا نے ہر چیز کے وجود میں آنے کے لیے ایک نظام مقرر کر دیا ہے۔ اسی خاص نظام کے تحت وہ چیز وجود میں آتی ہے۔ کسی اور طریقہ سے ہم اس کو وجود میں نہیں لا سکتے۔

یہی انسانی زندگی کا معاملہ بھی ہے۔ زندگی ایک ایسا امتحان ہے جو صبر کی زمین پر دینا پڑتا ہے۔ زندگی ایک ایسی کھیتی ہے، جو صبر کی زمین پر اگتی ہے۔ خدا نے ابدی طور پر مقرر کر دیا ہے کہ زندگی کی تعمیر صبر کی زمین پر ہو، اب قیامت تک یہی ہونا ہے۔ ہم اس کی تعمیر کے لیے کوئی دوسری زمین نہیں بنا سکتے۔

صبر کسی منفی چیز کا نام نہیں، وہ سراسر ایک مثبت رویہ ہے۔ صبر کا مطلب ہے — بے سوچے سمجھے کر گزرنے کے بجائے سوچ سمجھ کر اپنا کام کرنا۔ جذباتی ردعمل کے بجائے شعوری فیصلہ کے تحت اپنا منصوبہ بنانا۔ وقتی نا امیدیوں میں مستقبل کی امید کو دیکھ لینا۔ حالات میں گھر کر رائے قائم کرنے کے بجائے، حالات سے اوپر اٹھ کر رائے قائم کرنا۔

ایک بیج کو آپ سونے کی پلیٹ میں رکھ دیں تو وہ اپنی زندگی کے سرچشموں سے مربوط

نہیں ہوتا۔ وہ زندگی کے اسباب سے بھری ہوئی کائنات میں بے اسباب بنا ہوا پڑا رہتا ہے۔ وہ زرخیزی کی ساری صلاحیت رکھتے ہوئے بھی زرخیزی سے محروم رہتا ہے۔

یہی حال انسان کا ہے۔ اگر وہ بے صبری کی حالت میں ہوتو وہ خدا کی سرسبز وشاداب دنیا میں ایک ٹھنٹھ کی مانند سوکھا ہوا پڑا رہے گا۔ لیکن صبر کو اختیار کرتے ہی وہ اچانک خدا کی زمین میں اپنی جڑیں پالیتا ہے اور بڑھتے بڑھتے بالآخر پورا درخت بن جاتا ہے۔

جب آدمی حقیقی معنوں میں صبر کا ثبوت دیتا ہے تو وہ انسانوں کی سطح پر جینے کے بجائے ربّانی سطح پر جینے لگتا ہے۔ دنیا کی تنگیوں سے گزر کر وہ آخرت کی وسعتوں میں پہنچ جاتا ہے۔ وہ بے معنی زندگی کے مرحلہ سے نکل کر بامعنی زندگی کے مرحلہ میں داخل ہوجاتا ہے۔

صبر والا انسان ہی مومن انسان ہے۔ اس کے لیے وہ ابدی انعام مقدر کیا گیا ہے جس کا دوسرا نام جنت ہے۔

صبر — سپیریر سولیوشن

قرآن کی تقریباً 103 آیتیں براہِ راست طور پر صبر سے متعلق ہیں۔ اور بقیہ آیتیں بالواسطہ طور پر صبر سے متعلق۔ گویا قرآن کی تمام تعلیمات صبر پر مبنی ہیں۔ یہ کہنا بالکل صحیح ہوگا کہ قرآن صبر کی کتاب ہے۔

صبر کی براہِ راست آیتوں کا معاملہ واضح ہے۔ مثلاً—

وَاسْتَعِينُوا بِالصَّبْرِ وَالصَّلَاةِ (2:45)۔ یعنی، اے ایمان والو، صبر اور نماز سے مدد حاصل کرو۔

وَإِنْ تَصْبِرُوا وَتَتَّقُوا فَإِنَّ ذَلِكَ مِنْ عَزْمِ الْأُمُورِ (3:186)۔ یعنی، اگر تم صبر کرو اور تقویٰ اختیار کرو تو یہ بڑے حوصلہ کا کام ہے۔

وَاصْبِرْ عَلٰى مَآ أَصَابَكَ (31:17)۔یعنی، جو مصیبت تم کو پہنچے اس پر صبر کرو۔
وَتَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ (90:17)۔یعنی،اور ایک دوسرے کو صبر کی نصیحت کی۔
وغیرہ

یہ آیتیں وہ ہیں جن میں براہِ راست الفاظ میں صبر کا حکم دیا گیا ہے۔مگر دوسری بیشتر آیتوں کا بھی صبر سے نہایت گہرا تعلق ہے۔مثلاً قرآن کی پہلی آیت ہے:اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعَالَمِینَ (2:2)۔اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کو یہ مطلوب ہے کہ اس کے بندے اس کا شکر اور تعریف کریں۔ یہ ایک معلوم حقیقت ہے کہ موجودہ دنیا میں کوئی بھی آدمی ناخوش گوار تجربات سے محفوظ نہیں رہ سکتا۔قرآن کے مطابق انسان کو کبد (مشقت) میں پیدا کیا گیا ہے(90:4)۔ایسی حالت میں کسی کے لیے بھی یہ ممکن نہیں کہ وہ یہاں خوشیوں اور مسرتوں کی زندگی بنا سکے۔

پھر حقیقی معنوں میں کوئی آدمی شکر کرنے والا کیسے بن سکتا ہے۔اس کا واحد راز صبر ہے۔یعنی آدمی جب دنیا میں پیش آنے والی مصیبتوں پر صبر کرے گا،اس وقت اس کے لیے ممکن ہوگا کہ سچا کلمۂ شکر اس کی زبان پر جاری ہو سکے۔اسی لیے قرآن میں شکر کے ساتھ صبر کو وابستہ کیا گیا ہے(31:31)۔

صبر آدمی کو اس قابل بناتا ہے کہ وہ مسائل کے مقابلہ میں تسخیری انداز کا برتر حل دریافت کر سکے۔آدمی جب فریق ثانی کے مقابلہ میں بھڑک جائے تو وہ اس پوزیشن میں نہیں ہوتا کہ وہ سوچ کر کوئی گہرا جواب دے یا کوئی دوررس منصوبہ بنا سکے۔مگر جب وہ صبر وتحمل سے کام لیتا ہے تو وہ اس قابل ہو جاتا ہے کہ فوری اقدام کے بجائے سوچا سمجھا ہوا اقدام کرے۔اور یہ تاریخ کا تجربہ ہے کہ فوری اقدام کرنے والا ہمیشہ ناکام ہوتا ہے اور سوچ سمجھ کر اقدام کرنے والا ہمیشہ کامیاب — صبر ہر قسم کے مسائل کا برتر حل (سپیریر سولیوشن) ہے۔

صبر کی طاقت

حضرت موسیٰ اور حضرت مسیح کے درمیانی زمانہ میں بنی اسرائیل کے یہاں جنگ کا ایک واقعہ ہوا۔ اس وقت بنی اسرائیل کے جوانوں کی تعداد کم تھی اور دشمن کی فوج تعداد اور اسباب میں بہت زیادہ تھی۔ اس فرق کو دیکھ کر بنی اسرائیل کے لوگ ڈر گئے۔ انھوں نے کہا کہ ہم کو دشمن سے لڑنے کی طاقت نہیں (البقرہ، 2:249)۔

بائبل کے بیان کے مطابق، اس وقت بنی اسرائیل کے سردار (یونتن) نے اپنے ساتھی سے کہا کہ آ، ہم اُدھر ان نامختونوں کی چوکی کو چلیں۔ ممکن ہے کہ خداوند ہمارا کام بنا دے۔ کیوں کہ خداوند کے لیے بہتوں یا تھوڑوں کے ذریعہ سے بچانے کی قید نہیں (1۔ سموئیل 6:14)۔ یہی بات قرآن میں ان الفاظ میں نقل کی گئی ہے:

قَالَ الَّذِينَ يَظُنُّونَ أَنَّهُمْ مُلَاقُو اللهِ كَمْ مِنْ فِئَةٍ قَلِيلَةٍ غَلَبَتْ فِئَةً كَثِيرَةً بِإِذْنِ اللهِ وَاللهُ مَعَ الصَّابِرِينَ (2:249)۔ یعنی، جو لوگ یہ جانتے تھے کہ وہ اللہ سے ملنے والے ہیں، انھوں نے کہا کہ کتنی ہی چھوٹی جماعتیں اللہ کے حکم سے بڑی جماعتوں پر غالب آئی ہیں۔ اور اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے۔

اس آیت میں قلیل اور کثیر کا لفظ صرف عددی معنوں میں اقلیت اور اکثریت کے لیے نہیں ہے۔ اسی کے ساتھ وہ کمزور اور طاقت ور کے معنی میں بھی ہے۔ عربی زبان میں قلیل اور کثیر کا لفظ اس توسیعی مفہوم میں بھی استعمال ہوتا ہے۔ ایک عرب شاعر کا یہ شعر اس کی ایک مثال ہے:

فَإِن أَكُ فِي شِرَارِكُم قَلِيلًا　　فإِنّي فِي خِيَارِكُم كَثِيرُ

قرآن کی اس آیت میں دراصل اس بات کا اعلان ہے کہ کسی گروہ کا قلیل التعداد یا کمزور

ہونا اس بات کا ثبوت نہیں کہ وہ کثیر التعداد یا طاقت ور فریق کے مقابلہ میں ہمیشہ ناکام رہے۔ اس دنیا کا نظام اس طرح بنا ہے کہ یہاں کمزور بھی طاقت ور پر غالب آسکتا ہے۔ یہاں اقلیت بھی اکثریت کو مفتوح کرسکتی ہے۔

اس فتح وکامرانی کا راز آیت میں صبر بتایا گیا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ صبر کوئی انفعالی کیفیت یا بزدلی کی چیز نہیں۔ صبر ایک فعال صفت ہے۔ وہ ایک بہادرانہ خصوصیت ہے۔ صبر اتنی عظیم چیز ہے کہ جو لوگ اس کا ثبوت دیں وہ خدا کی خصوصی نصرت کے مستحق بن جاتے ہیں۔ حتٰی کہ اس کا نتیجہ اس صورت میں نکلتا ہے کہ ایک بظاہر کمزور گروہ ایک بظاہر طاقت ور گروہ کے اوپر غلبہ حاصل کرلیتا ہے۔

موجودہ دنیا امتحان کی دنیا ہے۔ یہاں ایک گروہ اور دوسرے گروہ کے درمیان ہمیشہ مقابلہ جاری رہتا ہے۔ اس مقابلہ میں کبھی ایک گروہ غالب آجاتا ہے اور دوسرا گروہ اس کے مقابلہ میں بظاہر مغلوب اور کمزور ہو کر رہ جاتا ہے۔

جب کوئی گروہ دوسرے کے مقابلہ میں کمزور پڑ جائے اور اس کو نقصان اٹھانا پڑے تو اس کے بعد کمزور گروہ کے ردعمل کی دو صورتیں ہوتی ہیں۔ ایک غیر صابرانہ ردعمل، دوسرا صابرانہ ردعمل۔ غیر صابرانہ ردعمل یہ ہے کہ آدمی مایوسی اور احساس شکست کا شکار ہو کر رہ جائے۔ وہ پست ہمت ہو کر بیٹھ جائے۔ وہ سمجھ لے کہ اب میرے لیے یہاں کچھ نہیں ہے۔ وہ دوسرے گروہ کو اپنی مصیبتوں کا ذمہ دار ٹھہرا کر اس کے خلاف فریاد اور احتجاج کرنے لگے۔ یہ تباہی کی صورت ہے۔ دوسروں نے اگر اس کو ابتدائی نقصان پہنچایا تھا تو اس کے بعد وہ خود اپنے آپ کو نقصان پہنچا کر اپنی تباہی کی تکمیل کرلیتا ہے۔

دوسرا ردعمل صابرانہ ردعمل ہے۔ یہ وہ شخص ہے جو چوٹ لگنے کے بعد اپنے آپ کو سنبھالتا ہے۔ اس کا ذہن شکایت کرنے کے بجائے تدبیر کے رخ پر چلنے لگتا ہے۔ وہ

مایوسی میں پڑنے کے بجائے امید کے پہلوؤں پر غور کرتا ہے۔ وہ کھوئے ہوئے کا غم کرنے کے بجائے یہ چاہتا ہے کہ ملے ہوئے کو استعمال کرے۔

جو لوگ زک (نقصان) اٹھانے کے بعد اس طرح صبر کے طریقہ کو اختیار کریں وہ گویا اپنے آپ کو حالات سے اوپر اٹھاتے ہیں۔ وہ اپنے آپ کو اس حالت کی طرف لے جاتے ہیں، جہاں ان کے اندر چھپے ہوئے امکانات جاگیں۔ ان کی شخصیت مزید طاقت کے ساتھ ابھر آئے۔

غیر صابر آدمی نقصان کو نقصان کے روپ میں دیکھتا ہے۔ صابر آدمی نقصان کو اپنے لیے چیلنج سمجھتا ہے۔ وہ حالات کا مقابلہ کر کے اپنے آپ کو آگے لے جانا چاہتا ہے۔ اور جو لوگ نقصان کا اس طرح استقبال کریں، وہ ہمیشہ آگے بڑھتے ہیں۔ وہ اپنی ناکامی کو دوبارہ عظیم تر کامیابی میں تبدیل کر لیتے ہیں۔

جب ایسا ہو کہ ایک گروہ دوسرے گروہ کے اوپر ظلم کرے، اور مظلوم گروہ کبھی اس کے جواب میں ظالمانہ کارروائی کرنے لگے تو دونوں گروہ اخلاقی اعتبار سے برابر ہو گئے۔ ایسے دونوں گروہوں کو اللہ ان کی اپنی ذات کے حوالے کر دیتا ہے۔ ان میں سے کسی کو کبھی اللہ کی مدد حاصل نہیں ہوتی۔

لیکن اگر ایسا ہو کہ ایک گروہ دوسرے گروہ کو اپنے ظلم اور سرکشی کا نشانہ بنائے، مگر مظلوم گروہ جوابی کارروائی کرنے کے بجائے اس پر صبر کر لے، تو خدا صابر گروہ کے ساتھ ہو جاتا ہے۔ وہ مظلوم گروہ کی مدد کر کے اس کو ظالم گروہ کے اوپر فاتح بنا دیتا ہے۔

مظلوم گروہ کو یہ فائدہ تمام تر صبر کی وجہ سے حاصل ہوتا ہے۔ صبر کوئی بے عملی کی حالت نہیں، صبر سب سے بڑا عمل ہے۔ صبر یہ ہے کہ آدمی اپنے اندر اٹھتے ہوئے جذبات کو منفی رخ سے ہٹا کر مثبت رخ کی طرف پھیر دے۔

صبر کی صفت اللہ تعالیٰ کو بے حد پسند ہے ۔ جو شخص صبر کرے، وہ بے پناہ شخصیت کا مالک بن جاتا ہے ۔تمام قوانین فطرت اس کے حق میں متحرک ہو جاتے ہیں ۔ اللہ تعالیٰ کی خصوصی مدد کے تحت وہ ایک ناقابل تسخیر ہستی بن جاتا ہے ۔

صبر آدمی کو اس قابل بناتا ہے کہ وہ اپنے آپ کو ردعمل کی نفسیات سے اوپر اٹھائے ۔ وہ ظالم کی بدخواہی کے جواب میں اس کے ساتھ خیر خواہی کرنا سکھاتا ہے ۔ وہ برے عمل کا جواب بھلے عمل سے دینے کا مزاج پیدا کرتا ہے ۔ صابر آدمی ظالم کے ظلم پر اس کے خلاف بددعا نہیں کرتا، بلکہ اللہ تعالیٰ سے اس کی ہدایت کی دعا مانگتا ہے ۔

صبر آدمی کو اس قابل بناتا ہے کہ وہ ایسا نہ کرے کہ وہ اشتعال انگیزی کے وقت مشتعل ہو جائے اور عاجلانہ کارروائی میں اپنی طاقت کو ضائع کرے ۔ صبر آدمی کو بے پناہ حد تک طاقتور بنا دیتا ہے ۔ وہ آدمی کی خفیہ صلاحیتوں کو جگاتا ہے ۔ وہ آدمی کے چھپے ہوئے امکانات کو بیدار کرتا ہے ۔ وہ آدمی کے اندر منصوبہ بند کام کرنے کا مزاج پیدا کرتا ہے ۔ صبر آدمی کو معمولی انسان کے درجہ سے اٹھا کر غیر معمولی انسان کے درجہ میں پہنچا دیتا ہے ۔

صبر اسلامی تاریخ میں

اسلام کی تاریخ وسیع تقسیم کے مطابق، تین قسم کے حالات سے گزری ہے — دعوت، خلافت، ملوکیت ۔ دعوتی دور کی معیاری مثال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا 23 سالہ زمانہ ہے ۔ یہی وہ زمانہ ہے جس کے مطالعہ سے دعوت کے آداب اور اس کے طریقے صحیح طور پر معلوم کیے جاسکتے ہیں ۔ اس کے بعد خلافت کا زمانہ آتا ہے، جو گویا صحیح معنی میں نائبین رسول کا زمانہ ہے ۔ یہ زمانہ حضرت ابو بکر بن ابی قحافہ سے شروع ہوتا ہے اور حضرت علی ابن ابی طالب پر ختم ہوتا ہے ۔ اس کے بعد، مورخینِ اسلام کے مطابق، ملوکیت کا دور ہے ۔ یہ زمانہ حضرت امیر معاویہ سے شروع ہوا اور آج تک کسی نہ کسی شکل میں جاری ہے ۔

ان تینوں دوروں میں جو اسلامی کردار مطلوب ہے، اس پر قائم ہونے کے لیے یکساں طور پر صبر کی اہمیت ہے۔

دعوت کا دور

محمد بن اسحٰق بیان کرتے ہیں کہ بیعت عقبہ سے پہلے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو جنگ کی اجازت نہیں دی گئی تھی۔ آپ کو صرف یہ حکم تھا کہ آپ لوگوں کو اللہ کی طرف بلائیں، اور تکلیفوں پر صبر کریں، اور جاہلوں سے روگردانی کریں۔ قریش کا یہ حال تھا کہ آپ کی قوم میں سے جو لوگ آپ کی پیروی کرتے، وہ ان پر ظلم کرتے۔ ان کے دین کے بارے میں انھیں سخت آزمائش میں مبتلا کرتے۔ قریش نے ان کو ان کی بستیوں سے نکال دیا۔ چنانچہ آپ کے پیروؤں میں سے کچھ لوگ سخت آزمائش میں مبتلا ہو گئے۔ اور کچھ لوگ قریش کے ہاتھ سے تکلیفوں کا شکار ہوئے۔ اور کچھ لوگ ان سے بچنے کے لیے دوسرے علاقوں میں چلے گئے۔ ایک جماعت حبش چلی گئی۔ کچھ لوگوں نے مدینہ کی طرف ہجرت کی یا اور کسی طرف چلے گئے۔ جب قریش نے اس طرح اللہ کے مقابلہ میں سرکشی اختیار کی اور اللہ نے ان کے لیے جس عزت کا ارادہ کیا تھا اس کو رد کر دیا، اور اپنے نبی کو جھٹلایا۔ اور ان لوگوں کو تکلیف دی اور جلاوطن کیا، جنھوں نے اللہ کی عبادت کی اور اس کو ایک مانا اور اس کے دین کو مضبوطی سے پکڑ لیا، اس وقت اللہ نے اپنے رسول کو جنگ کی اجازت دی اور ان لوگوں کے لیے حفاظت اور مدد کا وعدہ کیا جن پر ظلم اور زیادتی ہو رہی تھی۔ مجھے یہ بات پہنچی ہے کہ اس اجازت کے بارے میں سب سے پہلے سورۃ الحج (آیت 41-39) اتاری گئی۔ (سیرت ابن ہشام، جلد 2، صفحہ 75)۔

مکہ کا دور دعوت کا دور تھا۔ اس زمانہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے اصحاب کو حکم تھا کہ اپنی ساری توجہ صرف دعوت پر مرتکز رکھیں۔ غیر مسلموں کی طرف سے خواہ کتنی ہی دل

آزاریاں کی جائیں اور کتنی ہی تکلیفیں پہنچائی جائیں ان پر کوئی ردعمل ظاہر نہ کریں۔ اشتعال انگیزی کے باوجود مشتعل نہ ہوں۔ یک طرفہ طور پر صبر و برداشت پر قائم رہتے ہوئے دعوت کا مثبت کام جاری رکھیں۔

دعوت کا کام اس وقت تک انجام نہیں پا سکتا، جب تک داعی کے دل میں مدعو کی خیر خواہی نہ ہو۔ یہ خیر خواہی اتنی زیادہ ہونی چاہیے کہ مدعو کی زیادتیوں کے باوجود اس کے حق میں داعی کے دل سے ہدایت کی دعائیں نکلتی رہیں۔ چنانچہ جن لوگوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا مذاق اڑایا اور آپ پر پتھر مارے، ان کے بارے میں آپ نے یہ دعا فرمائی کہ خدایا، میری قوم کو ہدایت دے، وہ نہیں جانتے: رَبِّ اهْدِ قَوْمِي فَإِنَّهُمْ لا يَعْلَمُونَ (فتح الباری، جلد 12، صفحہ 282)۔

خلافت کا دور

خلافت کا دور اقتدار کا دور ہے۔ اقتدار، عین اپنی طبیعت کے اعتبار سے بہت سی خرابیاں پیدا کرتا ہے۔ اس لیے دور خلافت (دور اقتدار) میں صبر کی اہمیت ہمیشہ سے زیادہ بڑھ جاتی ہے۔

1۔ دور خلافت کا سب سے بڑا مسئلہ یہ ہے کہ لوگوں کے اندر عہدوں کی طلب بڑھ جاتی ہے۔ ہر آدمی یہ چاہنے لگتا ہے کہ اس کو ایک اچھا سیاسی عہدہ مل جائے۔ اگر یہ مزاج باقی رہے تو خلافت کا پورا نظام برباد ہو کر رہ جائے گا۔

یہاں صبر (اپنی خواہشات کو روکنا) اس بات کی ضمانت ہے کہ خلافت کے دور میں عہدوں کی طلب کی برائی نہ پیدا ہو۔ عہدے اگر اہلیت کی بنیاد پر دیے جائیں تو اس سے خلافت کا نظام طاقت ور ہوتا ہے۔ اس کے برعکس، عہدے اگر خواہشات کی بنیاد پر دیے جانے لگیں تو خلافت کا پورا نظام کمزور ہو کر رہ جائے گا۔ ایسی حالت میں خلافت کے نظام کو

صحت مند حالت پر باقی رکھنے کے لیے صبر کی صفت انتہائی طور پر ضروری ہے۔

دور اول میں اس کی ایک عظیم الشان مثال انصار کا اس پر راضی ہونا ہے کہ وہ عہدہ خلافت کے معاملہ میں قریش سے نزاع نہیں کریں گے۔ انصار نے اسلامی انقلاب لانے کے لیے یکساں طور پر قربانیاں دی تھیں۔ مگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد جب یہ مسئلہ پیدا ہوا کہ کس شخص کو خلیفہ بنایا جائے تو حضرت ابوبکر صدیق نے ایک تقریر کی جس میں انھوں نے کہا کہ موجودہ حالات کا تقاضا یہ ہے کہ خلیفہ قریش میں سے ہو۔ اگر قریش کے باہر کسی کو خلیفہ بنایا جائے تو تاریخی روایت کی بنا پر اہل عرب کے لیے وہ قابل قبول نہ ہوگا اور لوگ اس کی اطاعت سے انکار کر دیں گے۔ انصار نے اس مصلحت کی اہمیت کو محسوس کیا اور خلافت کے مطالبہ سے دست بردار ہو گئے۔

انصار کا یہ فعل بلاشبہ اسلامی تاریخ کا ایک عظیم الشان واقعہ ہے۔ اگر وہ اپنی قربانیوں کی فہرست بنا کر عہدۂ خلافت کے لیے اصرار کرتے تو یقینی تھا کہ مسلمان اقتدار کی رسہ کشی میں مشغول ہو جاتے اور اسلام کی تاریخ بننے سے پہلے مدینہ میں دفن ہو جاتی۔ یہ واقعہ بلاشبہ صبر کا واقعہ ہے۔ انصار کے اندر اگر صبر کا مادہ نہ ہوتا تو وہ ہرگز یہ عظیم الشان کارنامہ انجام نہیں دے سکتے تھے۔ حکومت ایک ایسی چیز ہے جس کا تعلق پورے ملک سے ہوتا ہے۔ ملک میں ہر قسم کے لوگ ہوتے ہیں۔ اچھے بھی اور برے بھی، جاہل بھی اور عالم بھی، نرم بھی اور سخت بھی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ خلیفہ (حکمراں) کو لوگوں کی طرف سے تنقیدوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ خلیفہ اگر لوگوں کی تنقیدوں کو برداشت نہ کرے اور اس کو ذاتی انتقام کا مسئلہ بنالے تو وہ کبھی انصاف نہیں کر سکتا۔ خلیفہ کو عدل پر قائم رکھنے کے لیے لازمی طور پر یہ صفت درکار ہے کہ وہ لوگوں کی تنقیدوں کو برا نہ مانے۔ لوگوں کی سخت کلامی کے باوجود وہ ان کے ساتھ نرمی اور اعتدال کا رویہ اختیار کرے۔

خلیفۂ اول حضرت ابوبکر کے ایک سرکاری فرمان کو ایک بار حضرت عمر نے برسرعام پھاڑ کر پھینک دیا۔ مگر خلیفہ اول نے اس کو برا نہیں مانا اور نہ اس بنا پر ان کے دل میں عمر فاروق کی اہمیت کم ہوئی (ادب الدنیا والدین للماوردی، صفحہ 163)۔ حضرت عمر فاروق جب خلیفہ ہوئے تو بار بار ایسا ہوا کہ لوگوں نے ان پر سخت الفاظ میں تنقیدیں کیں۔ مگر حضرت عمر نے کبھی ان کے خلاف منفی ردِّ عمل ظاہر نہیں کیا۔ مثلاً ایک بار تقریر کے دوران برسرعام ایک شخص نے کہا کہ اگر ہم تمہارے اندر ٹیڑھ دیکھیں گے تو ہم اسی طرح سیدھا کریں گے، جس طرح تیر کو سیدھا کرتے ہیں۔ خلیفہ ثانی اس پر غصہ نہیں ہوئے، بلکہ یہ کہا کہ اس خدا کا شکر ہے جس نے مجھے ایک ایسی قوم میں بنایا کہ اگر میرے اندر انحراف پیدا ہو تو وہ مجھے سیدھا کر دے (الزھد والرقائق لابن المبارک، حدیث نمبر 512)۔

خلیفہ کے اندر تنقید کو برداشت کرنے کا یہ مادہ انتہائی طور پر ضروری ہے۔ اس کے بغیر وہ ملک اور قوم کے ساتھ انصاف نہیں کرسکتا۔ مگر یہ اعلیٰ صفت کسی شخص کے اندر اسی وقت پیدا ہوتی ہے جب کہ اس میں صبر کا مادہ موجود ہو۔ صبر کسی خلیفہ کو عدل پر قائم رکھتا ہے، اگر اس کے اندر صبر نہ ہو تو کوئی بھی چیز اس کو ظلم کی راہ پر جانے سے روک نہیں سکتی۔

ملوکیت کا دور

اسی طرح ملوکیت کے دور میں بھی صبر انتہائی طور پر ضروری ہے۔ زندگی میں اتار چڑھاؤ کا آنا لازمی ہے، اسی طرح ملوکیت کا زمانہ بھی ضرور آ کر رہتا ہے۔ ایسے وقت میں اگر ملوکیت کے نظام پر صبر نہ کیا جائے تو مسلم معاشرہ میں زبردست خلفشار برپا ہوگا۔ امت دو طبقوں میں بٹ جائے گی۔ ایک، ملوک اور ان کے ساتھی۔ دوسرے، عوام اور ان کے رہنما۔ دونوں ایک دوسرے کے خلاف مسلح اور غیر مسلح لڑائی شروع کر دیں گے، جس کا انجام دوطرفہ بربادی کے سوا اور کسی شکل میں نہیں نکلے گا۔

ایسے حالات میں صبر یہ کارنامہ انجام دیتا ہے کہ لوگ حکمرانوں سے اعراض کا طریقہ اختیار کرتے ہوئے دوسرے تعمیری اور اصلاحی میدانوں میں اپنے آپ کو مصروف کرلیں۔ اس طرح نہ صرف یہ ہوتا ہے کہ مسلمانوں کی طاقت ضائع ہونے سے بچ کر اپنا مفید استعمال پالیتی ہے، بلکہ اگر یہ غیر سیاسی اصلاحی کوششیں زیادہ بڑے پیمانہ پر صالح معاشرہ کی تشکیل کرسکیں تو بالواسطہ طور پر حکومت کا ادارہ بھی ضرور متاثر ہوتا ہے۔ وہ سیاسی مقصد جو براہ راست عمل کے ذریعہ حاصل نہیں ہوا تھا، وہ بالواسطہ عمل کے ذریعہ حاصل کرلیا جاتا ہے۔

صبر، خواہ وہ دعوت کے مرحلہ میں ہو یا خلافت اور ملوکیت کے مرحلہ میں، ہمیشہ ناگزیر طور پر ضروری ہوتا ہے۔ ہر قسم کی ترقی اور کامیابی صبر کے ساتھ بندھی ہوئی ہے۔ صبر اس بات کی ضمانت ہے کہ آدمی ناممکن کے پیچھے نہیں دوڑے گا، بلکہ ممکن کے دائرہ میں اپنی کوششیں صرف کرے گا۔ صبر آدمی کو اس قابل بناتا ہے کہ وہ الاقدم فالاقدم کے اصول پر عمل کرے، وہ منصوبہ بند انداز میں اپنا تمام کام کرنے لگے۔

دور ملوکیت میں صبر کی اہمیت کی تفصیل راقم الحروف کی کتاب "راہ عمل" میں درج ہیں۔

اشتعال کے بغیر

اسلام کے خلیفہ ثانی عمر فاروق رضی اللہ عنہ کا قول ہے: لَا تَعْتَمِدْ عَلَى خَلْقِ رَجُلٍ حَتَّى تُجَرِّبَهُ عِنْدَ الْغَضَبِ (التبر المسبوک فی نصیحۃ الملوک للغزالی، صفحہ 24)۔ یعنی، کسی آدمی کے حسن اخلاق پر بھروسہ مت کرو جب تک غصہ کے وقت اس کا تجربہ نہ کرلو۔

جب غصہ دلانے والی بات کی جائے تو اس کے جواب کے دو طریقے ہیں۔ ایک یہ کہ آدمی بپھر اٹھے اور ناقدین پر لعن طعن کرنے لگے۔ دوسرا طریقہ یہ ہے کہ ناقد کی بات کو بالکل ٹھنڈے ذہن سے سنا جائے۔ اس کی بات کے غیر متعلق پہلوؤں کو نظر انداز کرتے

ہوئے اصل بات کا جواب بالکل سادہ طریقے سے دے دیا جائے۔ دونوں طریقوں میں صرف دوسرا طریقہ اسلامی طریقہ ہے۔ اس سلسلے میں یہاں دو مثالیں نقل کی جاتی ہیں۔

1۔ ابن عبد البر اندلسی (م 463ھ) لکھتے ہیں: أَنَّ طَاوُسًا وَوَهْبَ بْنَ مُنَبِّهٍ الْتَقَيَا، فَقَالَ طَاوُسٌ لِوَهْبٍ: يَا أَبَا عَبْدِ اللّٰهِ، بَلَغَنِي عَنْكَ أَمْرٌ عَظِيمٌ فَقَالَ: مَا هُوَ؟ قَالَ: تَقُولُ: إِنَّ اللّٰهَ حَمَلَ قَوْمَ لُوطٍ بَعْضَهُمْ عَلَى بَعْضٍ، قَالَ: أَعُوذُ بِاللّٰهِ ثُمَّ سَكَتَ قَالَ: فَقُلْتُ: هَلِ اخْتَصَمَا؟ قَالَ: لَا (جامع بیان العلم وفضلہ، اثر نمبر 1799)۔ یعنی، طاؤس بن کیسان (وفات 106ھ) اور وہب بن منبہ (وفات 114ھ) دو تابعی ہیں۔ ایک مرتبہ ان دونوں کی ملاقات ہوئی تو طاؤس نے وہب سے کہا: اے ابوعبداللہ، آپ کے بارے میں مجھے ایک بڑی سنگین بات پہنچی ہے۔ انھوں نے پوچھا کہ وہ کیا؟ طاؤس نے کہا: میں نے سنا کہ آپ کہتے ہیں کہ اللہ ہی نے تو قوم لوط کے بعض لوگوں کو بعض لوگوں پر چڑھایا تھا۔ یہ سن کر وہب نے کہا: اللہ کی پناہ۔ پھر دونوں چپ ہوگئے۔ میں نے راوی سے پوچھا: کیا دونوں میں بحث ہوئی۔ انھوں نے جواب دیا: نہیں۔

2۔ مولانا احمد علی لاہوری (1962-1887ء) کے صاحبزادہ مولانا حبیب اللہ لاہوری نے مولانا سید حسین احمد مدنی (1957-1879ء) کا ایک واقعہ بیان کیا ہے۔ وہ دار العلوم دیوبند میں مولانا مدنی کے دورۂ حدیث میں شریک تھے۔ شرکاءِ درس میں سے کسی طالب علم کو شرارت سوجھی۔ اس نے مولانا کے پاس ایک رقعہ بھیجا اور اس کے ذریعہ تحریری طور پر یہ سوال کیا کہ آپ کے متعلق کہا جاتا ہے کہ آپ حرامی ہیں۔ مولانا مدنی نے رقعہ لے کر رکھ لیا اور پہلی نشست میں کوئی جواب نہیں دیا۔ دوسری نشست میں جب طلبہ جمع ہوئے تو آپ نے فرمایا" کسی دوست نے مجھ کو رقعہ لکھا ہے کہ تو اپنے باپ سے نہیں ہے"۔

یہ سنتے ہی تمام مجلس میں ہیجان برپا ہوگیا۔ طلبہ غیظ و غضب سے بھر گئے کہ کس گستاخ

نے یہ حرکت کی ہے۔ مولانا مدنی نے فرمایا" خبردار کسی کو غصہ کرنے کی ضرورت نہیں۔ میرا حق ہے کہ میں سوال کرنے والے کی تسلی کروں"۔ پھر سنجیدگی کے ساتھ فرمایا" میں ضلع فیض آباد، قصبہ ٹانڈہ کا رہنے والا ہوں۔ اس وقت بھی میرے والدین کے نکاح کے گواہ زندہ ہیں۔ خط بھیج کر سمجھ لیا جائے"۔

خاموش تدبیر

الطاف حسین حالی (1837-1914ء) اصلاحی شاعری کو پسند کرتے تھے۔ اس اعتبار سے انھوں نے قدیم اُردو شاعری کا جائزہ لیا تو وہ انہیں نہایت بے معنی نظر آئی۔ انھوں نے پایا کہ قدیم اردو شاعری میں مبالغہ ہے۔ حسن وعاشقی کی داستان ہے۔ فرضی خیال آرائی ہے۔ حالی نے اس شاعری پر سخت تنقید کی اور اس کے بجائے بامقصد شاعری کی وکالت کی۔

یہ تنقید ان لوگوں کو بہت ناگوار ہوئی جو قدیم اردو شاعری کو اپنے لیے فخر کا سرمایہ بنائے ہوئے تھے۔ ان کو برداشت نہیں ہوا کہ ایک شخص ان کے پرفخر اثاثہ کو بے قیمت بتائے۔ چنانچہ وہ حالی کے دشمن ہو گئے۔ ان لوگوں نے حالی کے خلاف نہایت غیر سنجیدہ قسم کے مخالفانہ مضامین چھاپنے شروع کیے۔ حالی نے اس لغو طوفان کے جواب میں خاموشی اختیار کرلی۔ اس پر اودھ پنچ (لکھنؤ) نے ایک فاتحانہ نظم شائع کی۔ اس کا ایک شعر یہ تھا:

ابتر ہمارے حملوں سے حالی کا حال ہے
میدان پانی پت کی طرح پائمال ہے

مخالفت برائے مخالفت کا یہ طوفان مکمل طور پر یک طرفہ تھا۔ اس لیے وہ بہت زیادہ دیر تک جاری نہیں رہ سکتا تھا۔ چنانچہ کچھ دنوں کے بعد مخالفین خاموش ہو گئے۔ حالی سے کسی نے پوچھا کہ آپ کے مخالفین کیسے چپ ہو گئے۔ وہ تو بظاہر چپ ہونے والے نظر نہیں آتے تھے۔ حالی نے اس کے جواب میں ایک نظم لکھی۔ اس کا ایک شعر یہ تھا:

کیا پوچھتے ہو کیونکر سب نکتہ چیں ہوئے چپ
سب کچھ کہا انھوں نے پر ہم نے دم نہ مارا

کوئی شخص سنجیدہ اختلاف اور علمی تنقید کرے تو وہ بلا شبہ قابل غور ہوتی ہے۔ اگر وہ درست ہے تو اس کو مان لینا چاہیے اور اگر اس کے اندر استدلالی نقص ہے تو دلائل کے ساتھ اس کی غلطی کا تجزیہ کرنا چاہیے۔

مگر جو مخالفت برائے مخالفت ہو، جو علمیت اور سنجیدگی سے خالی ہو، جس کی بنیاد حقائق کے بجائے الزام تراشی اور عیب جوئی پر ہو، ایسی مخالفت کا بہترین جواب خاموشی ہے۔ ایسے لوگوں کا جواب دینا ایسا ہی ہے جیسے کوئی شخص چیختے ہوئے گدھے کے سامنے وَاغۡضُضۡ مِنۡ صَوۡتِكَ (31:19) کا وعظ کہنے لگے، یعنی اور اپنی آواز کو پست کرو۔

صبر کا کرشمہ

گل برگا (کرناٹک) کے ایک صاحب نے اپنے ایک خط (10 فروری 2010ء) میں اپنا ایک واقعہ لکھا ہے۔ یہ واقعہ انھیں کے الفاظ میں یہاں نقل کیا جاتا ہے:

”ایک غلط پروپیگنڈے کی بنا پر مجھ کو تین ماہ سروس سے معطل ہونا پڑا۔ لیکن اِس دوران نہایت صبر واستقلال کے ساتھ غیر ضروری باتوں سے اعراض کرتے ہوئے بلا طلبِ حجت یک طرفہ طور پر ”میں غلطی پر تھا“ کے مشورے پر رجوع بکار ہوا (یعنی اس اصول پر عمل کیا)۔ اِس کے بعد ایسا معلوم ہوا کہ مجھ کو سروس سے برخاست کرنے کے لیے جو طریقے اپنائے گئے تھے، وہ بالکل ناکام ثابت ہوئے، اور میں پہلے سے زیادہ مضبوط طور پر اپنی جگہ واپس آ گیا۔ یہ بلا شبہ الرسالہ کی فکری پالیسی کا نتیجہ تھا“۔

یہ ایک مثال ہے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ نزاعی مسائل کا حل کیا ہے۔ اس کا

بہترین حل یہ ہے کہ آپ صبر کا طریقہ اختیار کرتے ہوئے خاموش ہوجائیں اور صرف دعا کریں۔ اگر آپ ایسا کریں تو آپ دیکھیں گے کہ بہت جلد آپ کا مسئلہ نہایت خوش اسلوبی کے ساتھ حل ہو گیا ہے۔

نزاع کے موقع پر جب ردّعمل کا طریقہ اختیار کیا جائے تو اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ فریقِ ثانی کے اندر ضد اور انانیت جاگ پڑتی ہے۔ اِس طرح مسئلہ اور زیادہ پیچیدہ ہوجاتا ہے۔

اِس کے برعکس، اگر آپ خاموشی اختیار کرلیں اور دعاء کریں تو اس کے بعد یہ ہوگا کہ فریقِ ثانی کا ضمیر جاگ اٹھے گا۔ اِس کے بعد وہ معاملے پر ٹھنڈے دماغ کے ساتھ سوچنے لگے گا، یہاں تک کہ عین ممکن ہے کہ اس کو خود اپنی غلطی کا احساس ہوجائے اور وہ اعلان کے ساتھ یا بلا اعلان خود ہی معاملے کو ختم کردے۔

صبر کا طریقہ فرشتے کو آپ کا مددگار بنا دیتا ہے۔ اِس کے برعکس، جب آپ بے صبری کا طریقہ اختیار کریں تو شیطان کو موقع مل جاتا ہے کہ وہ معاملے کو زیادہ سے زیادہ بگاڑے، یہاں تک کہ آپ کو تباہی کے کنارے پہنچا دے۔ جو آدمی اِس راز کو سمجھ لے، وہ کبھی ناکامی سے دوچار نہیں ہوسکتا۔

ایک کے بعد دوسرا

پرل ہاربر امریکا کے جزائر ہوائی میں واقع امریکا کی ایک بندرگاہ ہے۔ دوسری جنگ عظیم (1939-1945ء) کے زمانہ میں یہاں امریکی بحریہ کا زبردست فوجی اڈہ قائم تھا۔ 7 دسمبر 1941ء کو جاپان نے اچانک پرل ہاربر پر بمباری کرکے اس کو تباہ کردیا۔ امریکہ کا جرم یہ تھا کہ وہ جاپان دشمن طاقتوں کے ہاتھ فوجی ہتھیار فروخت کرتا ہے۔ مگر جاپان کے اس جنگی اقدام نے مسئلہ کو اور زیادہ بڑھا دیا۔ اب امریکہ براہ راست جنگ میں شریک ہو گیا۔ اس

کے بعد امریکہ، برطانیہ اور روس نے مل کر وہ فوجی محاذ قائم کیا جو تاریخ میں اتحادی طاقتوں (Allied Powers) کے نام سے مشہور ہے۔ اس فوجی اتحاد کا سب سے زیادہ نقصان جاپانیوں کے حصہ میں آیا۔ امریکہ نے اگست 1945ء میں جاپان کے دو صنعتی شہروں (ہیروشیما اور ناگاساکی) پر تاریخ کے پہلے ایٹم بم گرائے۔ جاپان کے دونوں صنعتی مراکز بالکل برباد ہو گئے اور اسی کے ساتھ جاپان کی فوجی طاقت بھی۔

پرل ہاربر پر بمباری کرنا بلاشبہ جاپان کی عظیم الشان فوجی غلطی تھی۔ اس اقدام نے غیر ضروری طور پر امریکہ کو جاپان کا دشمن بنا کر براہ راست اس کے خلاف کھڑا کر دیا۔ مگر جاپان ایک زندہ قوم تھی۔ اس نے ایک غلطی کے بعد دوسری غلطی نہیں کی۔ اس نے نئے حالات کو تسلیم کرتے ہوئے اس سے لڑنے کے بجائے اس کے ساتھ ہم آہنگی کا طریقہ اختیار کر لیا۔ جاپان کی اس عقل مندی نے اس کے لیے ایک نیا عظیم تر امکان کھول دیا۔ جنگی میدان میں اقدام کے مواقع نہ پا کر اس نے تعلیم اور صنعت کے میدان میں اپنی جد و جہد شروع کر دی۔ سیاسی اور فوجی اعتبار سے اس نے امریکہ کی بالادستی تسلیم کر لی اور دوسرے پر امن میدانوں میں اپنے آپ کو موڑ دیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ 30 سال میں جاپان نے پہلے سے بھی زیادہ طاقت ور حیثیت حاصل کر لی۔ اس واقعہ کا ذکر کرتے ہوئے ایک مبصر نے لکھا ہے:

> That is a queer culmination of Pearl Harbour, but history has many contrived corridors and perhaps Pearl Harbour was one of them.

یہ پرل ہاربر کے واقعہ کا بڑا عجیب اختتام ہے۔ مگر تاریخ میں اس طرح سے راستہ نکال لینے کی بہت سی مثالیں ہیں اور شاید پرل ہاربر ان میں سے ایک ہے (ہندوستان ٹائمس، 30 نومبر 1981ء)۔

ہر ناکامی کے بعد ایک نئی کامیابی کا امکان آدمی کے لیے موجود رہتا ہے، بشرطیکہ وہ نہ

جھوٹی اکڑ دکھائے اور نہ بے فائدہ ماتم میں اپنا وقت ضائع کرے۔ بلکہ حالات کے مطابق ازسرنو اپنی جدوجہد شروع کردے۔

صبر کا ہتھیار

4 ستمبر 1980ء کا واقعہ ہے۔ مسز کملیش (22 سال)، شاہدرہ کی ایک سڑک پر چل رہی تھیں۔ ان کے گلے میں سونے کی زنجیر تھی۔ اچانک اشوک نامی ایک شخص جس کی عمر 25 سال تھی جھپٹا اور مسز ملیش کی زنجیر کھینچ کر بھاگا۔ پولیس کانسٹبل کشن چند تیاگی (42 سال) اس وقت ڈیوٹی پر گھوم رہے تھے۔ کسی نے ان کو واقعہ کے بارے میں بتایا۔ وہ تلاش کرتے ہوئے ایک بالمیکی مندر میں پہنچے جہاں مجرم موجود تھا۔ پولیس کی وردی دیکھتے ہی وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ کشن چند نے اس کا پیچھا کیا۔ مجرم کے پاس ایک ریوالور تھا۔ اس نے فائر کیا تو اس کی گولی کشن چند کی آنکھ کے نیچے ان کے چہرہ اور گردن کو زخمی کرتی ہوئی گزر گئی۔ انھوں نے چلا کر کہا ایک بار تو نے مجھے مار دیا۔ پر دوبارہ تو نہیں مار سکتا۔ مجھے معلوم نہیں تھا تیرے پاس ریوالور ہے۔ اب وہ چوکنا ہو گئے۔ مجرم نے دو بار اور گولی چلائی۔ مگر ہر بار وہ نہایت پھرتی کے ساتھ بیٹھ گئے اور اس کے وار کو خالی کر دیا۔ کشن چند کسی خوف کے بغیر تنہا مجرم کا پیچھا کرتے رہے جب کہ دشمن کے پاس ریوالور تھا اور ان کے اپنے پاس لاٹھی بھی نہیں تھی۔ دوڑتے دوڑتے آخر کار ساڑھے چار فٹ کی ایک چہار دیواری سامنے آ گئی۔ مجرم اس پر کود گیا۔ کشن چند نے بھی فوراً چھلانگ لگائی اور دوسری طرف جا کے اس کو پکڑ لیا۔

''ایک مسلّح مجرم کو دوڑاتے ہوئے آپ کو ڈر نہیں لگا''۔ ایک اخبار نویس نے کشن چند سے پوچھا۔ ''نہیں''۔ انھوں نے جواب دیا۔ میں جانتا تھا کہ جب اس کا ریوالور خالی ہو

چکا ہوگا تو میں اس کو پکڑلوں گا۔ مجرم کے پاس تین گولی تھی۔ کشن چند نے نہایت ہوشیاری کے ساتھ اس کی تینوں گولیاں خالی کرادیں۔ اب مجرم کا ہتھیار ناقابل استعمال ہو چکا تھا۔ کشن چند نے اس کو پکڑلیا (ہندوستان ٹائمز، ستمبر 1980ء)۔

اس چھوٹے سے واقعہ میں بہت بڑا سبق ہے۔ اکثر حالات میں حریف سے مقابلہ کا بہترین طریقہ یہ ہوتا ہے کہ ابتدائی مرحلہ میں اس کے وار کو خالی کردیا جائے، یہاں تک کہ اس کے ہتھیار کی "تین گولی" ختم ہو جائے۔ پھر اس سے مقابلہ کرنا نہایت آسان ہوگا۔ مثلاً ایک شخص آپ سے طاقتور ہے اور وہ آپ کی کسی بات پر برہم ہو جاتا ہے۔ جب وہ آپ کو ڈانٹنا اور بگڑنا شروع کرے تو ابتدا میں آپ اس کے وار کو خالی کردیں، یعنی بالکل چپ ہو کر اس کی بات کو سنتے رہیں۔ یہاں تک کہ جب اس کے الفاظ ختم ہو جائیں اور اس کی بھڑاس نکل جائے، اس وقت سنجیدگی کے ساتھ صورت حال کے بارے میں اس کو بتائیں۔ اگر آپ ابتداء میں اس قسم کا صبر دکھائیں تو آپ یقیناً کامیاب رہیں گے۔ کیوں کہ اب وہ اپنے ہتھیار کی "تین گولیاں" ختم کر چکا ہے اور اب بہت آسانی کے ساتھ اس کا مقابلہ کیا جا سکتا ہے۔

اسی طرح کچھ لوگ ہیں جو آپ کے خلاف متحد ہو کر آ گئے ہیں اور آپ کو مٹا دینا چاہتے ہیں۔ غور کیجیے تو یہ اتحاد صرف اس بنیاد پر ہوگا کہ آپ ان کے سامنے ان کے حریف بن کر کھڑے ہوئے ہیں۔ اگر آپ حکمت عملی کا طریقہ اختیار کریں اور کچھ دیر کے لیے اپنے کو نشانہ سے ہٹا دیں تو آپ دیکھیں گے کہ ان کا اتحاد ٹوٹ رہا ہے۔ ان کے اتحاد کے ہتھیار کی گولی آپ کا حریف بن کر کھڑا ہونا تھا۔ جب آپ نے اپنے کو حریف کے مقام سے ہٹا دیا تو گویا آپ نے ان کی "تینوں گولیاں" خالی کرادیں۔ اس کے بعد وہ اپنے آپ منتشر ہو جائیں گے اور جو گروہ اختلاف اور انتشار میں پڑ جائے اس کو ختم کرنے کے لیے کچھ کرنے کی ضرورت نہیں۔ ایسا گروہ خود اپنے ہی ہاتھوں اپنے کو ختم کر لیتا ہے۔

کوئی حریف جب سامنے آتا ہے تو آدمی جوش میں آکر اس سے لڑنے لگتا ہے۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ پہلے ہی مرحلہ میں وہ حریف کی طاقت کا نشانہ بن جاتا ہے۔ اگر آدمی صبر اور دانش مندی سے کام لے اور مقابلہ کے ابتدائی مرحلہ میں حریف کے وار کو خالی جانے دے تو بہت جلد ایسا ہوگا کہ حریف خود اپنی کارروائیوں کے نتیجہ میں اپنے کو غیر مسلح کر چکا ہوگا۔ یاد رکھئے، کوئی بھی شخص جو آپ کے مقابلہ میں آتا ہے اس کے پاس ہمیشہ "تین" ہی گولیاں ہوتی ہیں۔ لاتعداد گولیاں کسی کے پاس نہیں ہوتیں۔ اگر آپ یہ ہوشیاری دکھائیں کہ مقابلہ کے آغاز میں کسی طرح اپنے کو نشانہ سے ہٹالیں تو اس کے بعد یقینی طور پر ایسا ہوگا کہ دشمن اپنی "تین گولیوں" کو ختم کر کے خالی ہاتھ ہو چکا ہوگا۔ اب زیادہ بہتر طور پر وہ وقت آجائے گا کہ آپ اس کو زیر کر سکیں۔ یہ کامیابی ہر ایک حریف کے اوپر حاصل کی جا سکتی ہے۔ بشرطیکہ مقابلہ پیش آنے کے بعد آدمی اپنے حواس کو نہ کھوئے۔

صبر کا طریقہ

فساد کا کوئی سبب پیدا ہو تو اس وقت ایک طریقہ صبر کا ہے اور دوسرا طریقہ اشتعال کا۔ ایسے موقع پر مشتعل ہونا فساد کو بڑھاتا ہے۔ اس کے برعکس، اگر ذہن کو قابو میں رکھ کر سوچا جائے اور صبر کا طریقہ اختیار کیا جائے تو مسئلہ جہاں تھا وہیں ختم ہو جاتا ہے۔ یہاں ہم چند واقعات لکھتے ہیں جن سے اندازہ ہوتا ہے کہ صبر کا طریقہ اختیار کرنا کس طرح فساد کی آگ کو ٹھنڈا کر دیتا ہے۔

1۔ غالباً 1973ء کی بات ہے۔ دارالعلوم ندوہ (لکھنؤ) کے قریبی محلہ میں ایک غیر مسلم کی گائے تھی۔ ایک مقامی مسلمان نے کسی وجہ سے گائے کو مارا۔ اتفاق سے چوٹ کسی نازک مقام پر لگ گئی اور گائے مر گئی۔ غیر مسلم حضرات کو جب معلوم ہوا کہ ان کی گائے

ایک مسلمان نے مار ڈالی ہے تو پورے علاقہ میں اشتعال پیدا ہو گیا۔ سیکڑوں کی تعداد میں غیر مسلم لوگ جمع ہو گئے۔ سب سے قریب مسلم مرکز ندوہ تھا۔ وہ لوگ ندوہ میں گھس آئے اور اشتعال انگیز نعرے لگانے لگے۔

یہ بڑا نازک وقت تھا۔ اندیشہ تھا کہ وہ لوگ ندوہ کو آگ لگا دیں اور پھر سارے شہر میں فساد برپا ہو جائے۔ ندوہ کے ذمہ داروں نے اس موقع پر مشورہ کیا۔ طے ہوا کہ اس مشتعل مجمع کو ٹھنڈا کرنے کی تدبیر صرف یہ ہے کہ گائے کے قاتل کو مجمع کے حوالے کر دیا جائے۔ اگرچہ یہ ایک خطرناک کام تھا، مگر شہر کو آگ اور خون سے بچانے کی کوئی دوسری تدبیر ممکن نہ تھی۔

چنانچہ ذمہ دار حضرات مذکورہ مسلمان کے پاس گئے، جو غالباً ندوہ کے ایک کمرہ میں چھپا ہوا تھا۔ اس سے کہا کہ اس وقت ندوہ اور سارا شہر خطرہ میں ہے۔ مگر ان کا سارا غصہ تمھاری وجہ سے ہے۔ اگر وہ تم کو پا جائیں تو ان کا غصہ ٹھنڈا ہو جائے گا۔ اگرچہ یہ تمھارے لیے ایک خطرہ کی بات ہے۔ تاہم امید ہے کہ اللہ کی مدد حاصل ہوگی اور تم کو کوئی نقصان نہ پہنچے گا۔ آخر کار وہ راضی ہو گیا۔ اور نکل کر مجمع کے سامنے آ گیا۔ اس نے کہا کہ آپ کی گائے میں نے ماری ہے، اس لیے آپ میرے ساتھ جو چاہیں کریں۔ البتہ یہ ضرور کہوں گا کہ میں نے مارنے کی نیت سے نہیں مارا تھا، بلکہ اس کو بھگانے کے لیے مارا تھا۔ اتفاق کی بات تھی کہ وہ مر گئی۔ مجمع نے جب گائے کے قاتل کو دیکھا اور اس کی باتیں سنیں تو ان کا غصہ ٹھنڈا ہو گیا۔ وہ لوگ جو ندوہ کو پھونکنے اور شہر کی مسلم آبادی کو ویران کرنے پر تلے ہوئے تھے، وہ صرف اتنی سی بات پر راضی ہو گئے کہ گائے کا قاتل گائے کی قیمت ادا کر دے۔ قیمت فوراً ادا کر دی گئی اور مسئلہ اسی وقت ختم ہو گیا۔

2۔ فیروز پور جھر کا ضلع گڑ گاؤں (ہریانہ) کا ایک قصبہ ہے۔ قصبہ میں تقریباً تمام دکانیں غیر مسلم حضرات کی ہیں۔ مگر اطراف کے تمام دیہاتوں میں مسلمانوں (میوؤں) کی اکثریت

ہے۔ فیروز پور کے بازار میں زیادہ تر یہی مسلمان خریداری کرتے ہیں۔ 1980ء کے آغاز میں یہ واقعہ ہوا کہ ایک غیر مسلم خاندان کی لڑکی گھر سے غائب ہوگئی۔ لوگوں کو شبہ ہوا کہ کچھ مسلم نوجوانوں نے ایسا کیا ہے۔ چنانچہ غیر مسلم حضرات نے کافی شور وغل کیا۔ پولس میں رپورٹ کر کے کچھ مسلمانوں کو گرفتار کرایا۔ ایک روز احتجاجی ہڑتال کی۔ بسوں کو روک کر مسلم مسافروں کو پریشان کرنا شروع کیا۔ ہندی اخبارات میں اغوا کی رپورٹ شائع کرائی۔ اس طرح کے واقعات نے علاقہ میں سخت اشتعال پیدا کردیا۔ اور اندیشہ ہوگیا کہ کسی بھی دن فساد برپا ہوجائے اور اس کے بعد سارا علاقہ آگ اور خون کی نذر ہوجائے۔

اس علاقہ میں مسلمانوں کی پنچایت قائم ہے اور اہم قومی مسائل پر پنچایتی فیصلہ کیا جاتا ہے۔ چنانچہ پنچایت کا اعلان ہوا، تاکہ باہمی مشورہ سے اقدام کا فیصلہ کیا جائے۔ ایک خاص تاریخ کو علاقہ کے چودھری اور ذمہ دار مسلمان کئی سو کی تعداد میں فیروز پور کے پاس ایک مقام پر جمع ہوئے۔ کئی گھنٹہ کی گفتگو کے بعد بالآخر بائیکاٹ کا فیصلہ ہوا۔ طے ہوا کہ مسلمان کوئی براہ راست کارروائی نہ کریں، بلکہ خاموشی سے یہ کریں کہ غیر مسلم دکان داروں کے یہاں سے خریداری کرنا بالکل بند کردیں۔ کچھ لوگ نگراں مقرر ہوئے جو بازار کے تمام راستوں پر بیٹھیں اور یہ دیکھتے رہیں کہ کوئی مسلمان خریداری کے لیے غیر مسلم دکان داروں کے یہاں نہ جائے۔

اگلے دن سے بائیکاٹ شروع ہوگیا۔ میوؤں کے نزدیک برادری کے فیصلہ کی بڑی اہمیت ہوتی ہے، اس لیے بائیکاٹ کا فیصلہ صد فی صد کامیاب رہا۔ فیروز پور کا بازار نیز اطراف کے بازار جو روزانہ بھرے رہتے تھے بالکل سونے ہوگئے۔ دکان دار سارے دن بے کار رہنے لگے۔ ابھی بائیکاٹ کو صرف تین دن گزرے تھے کہ غیر مسلم دکاندار چیخ اٹھے۔ غیر مسلم دکان داروں نے باہم مشورہ کر کے علاقہ کے ذمہ دار مسلمانوں کو بلایا اور مسلمانوں

اور غیر مسلموں کی ایک مشترکہ پنچایت کی۔ غیر مسلم حضرات نے کہا کہ ہم آپ کے بھائی ہیں۔ جو کچھ ہوا اس کو بھول جائیے اور ہماری کوتاہی معاف کیجیے اور بائیکاٹ کو ختم کر دیجیے۔ مسلمانوں نے اس پیش کش کو قبول کر لیا اور چوتھے دن بائیکاٹ ختم ہو گیا اور اسی کے ساتھ مسلمانوں کے خلاف جو کارروائیاں کی جارہی تھیں، وہ بھی ختم ہو گئیں۔

3۔ علی گڑھ یونیورسٹی کیمپس میں ستمبر 1980ء میں یہ واقعہ ہوا کہ ہادی حسن ہال کے پیچھے ایک جھاڑی میں دوسرے فرقہ سے تعلق رکھنے والے چار آدمی ایک سور کاٹ رہے تھے۔ بظاہر ان کا منصوبہ یہ تھا کہ سور کے ٹکڑے یونیورسٹی میں پھینک کر وہاں کے مسلمانوں کو مشتعل کر دیا جائے اور اس طرح بہانہ پیدا کر کے یونیورسٹی کے علاقہ میں فساد کیا جائے۔ اتفاق سے کچھ مسلم طلباء نے اس کو دیکھ لیا۔ انھوں نے فوراً یونیورسٹی پراکٹر (proctor) کو مطلع کیا۔ پراکٹر نے اسی وقت پولیس کو ٹیلی فون کیا۔ پولیس اطلاع ملتے ہی فوراً پہنچ گئی اور چاروں آدمیوں کو عین موقع پر گرفتار کر لیا۔ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے لوگوں کی یہی دانش مندی تھی جس کی وجہ سے ایسا ہوا کہ 80-1979ء میں علی گڑھ میں مہینوں تک فساد کا سلسلہ جاری رہا، مگر سارا فساد شہر کے علاقہ میں ہوا اور ریلوے لائن کے دوسری طرف یونیورسٹی کا وسیع علاقہ بالکل محفوظ رہا۔ علی گڑھ کا یہ تجربہ بتاتا ہے کہ ہر تخریبی سازش کو دانش مندی کے ذریعہ غیر موثر بنایا جا سکتا ہے۔

یہ اور اس طرح کے دوسرے واقعات سے معلوم ہوتا ہے کہ فساد کے اسباب مکمل طور پر پیدا ہونے کے باوجود اس کا مکمل طور پر خاتمہ کیا جا سکتا ہے۔ کوئی واقعہ خواہ کتنا ہی شدید کیوں نہ ہو ہمیشہ اس کے اندر اس کی کاٹ کے اسباب بھی موجود ہوتے ہیں۔ اور یہ ممکن ہوتا ہے کہ ان کو استعمال کر کے اس کو غیر موثر بنا دیا جائے۔ مگر اس امکان کو استعمال کرنے کی لازمی شرط صبر ہے۔ واقعہ خواہ کتنا ہی خلاف مزاج ہو، مگر دانش مندی یہ ہے کہ اس کو دیکھ کر

آدمی مشتعل نہ ہو۔ مشتعل آدمی کی عقل کھوئی جاتی ہے۔ وہ کسی معاملہ کو صحیح طور پر سمجھ نہیں سکتا۔ اس لیے وہ اس کو دفع کرنے کی صحیح منصوبہ بندی بھی نہیں کرسکتا۔

اس کے بعد انتہائی ضروری ہے کہ آدمی مشورہ کرے۔ مشورے سے بیک وقت دو فائدے حاصل ہوتے ہیں۔ ایک یہ کہ اس میں کئی آدمیوں کی سوچ اور تجربات شامل ہوجاتے ہیں۔ اس لیے معاملہ کو زیادہ وسعت کے ساتھ سمجھنا ممکن ہوجاتا ہے۔ دوسرے یہ کہ اس میں متاثر ذہن کے ساتھ غیر متاثر ذہن کی رائے بھی شامل ہوجاتی ہے۔ اس لیے جو فیصلہ ہوتا ہے، وہ ٹھنڈے ذہن سے سوچا سمجھا فیصلہ ہوتا ہے، نہ کہ مغلوب ذہن کے تحت کیا ہوا فیصلہ۔

اسی کے ساتھ یہ بھی ضروری ہے کہ یک طرفہ الزام بازی کا طریقہ ہرگز اختیار نہ کیا جائے۔ بلکہ فیاضی کے ساتھ اپنی غلطی کا اعتراف کرلیا جائے۔ انسان کی یہ نفسیات ہے کہ اگر وہ دیکھتا ہے کہ مقابل کا آدمی اپنی غلطی کو نہیں مان رہا ہے تو اس کے متعلق اس کے اندر انتقام کے جذبات امنڈتے ہیں۔ اس کے برعکس، اگر آدمی دیکھے کہ اس کا حریف اپنی غلطی کو کھلے دل سے مان رہا ہے تو اچانک اس کے اندر رحم اور عفو کے جذبات امنڈ آتے ہیں۔ وہ محسوس کرتا ہے کہ غلطی کا اعتراف کرکے اس نے اپنی سزا آپ دے دی ہے، اب میں مزید سزا اسے کیا دوں۔

یہ بھی حد درجہ ضروری ہے کہ قانون کو کبھی اپنے ہاتھ میں لینے کی کوشش نہ کی جائے۔ ایک ایسے ملک میں جہاں باقاعدہ قانون کی حکومت قائم ہو، وہاں قانون اپنے ہاتھ میں لینا اپنے کو مجرم کی صف میں کھڑا کرنا ہے۔ قانون اپنے ہاتھ میں لے کر آدمی اپنے آپ کو بیک وقت دو فریقوں کا مدمقابل بنا لیتا ہے۔ ایک وہ شخص جس نے کوئی شر کیا تھا، اور دوسرے ملک کا انتظامیہ۔ اس کے برعکس، اگر آپ معاملہ کو فوراً انتظامی ذمہ داروں کے حوالے کردیں تو آپ درمیان سے ہٹ جاتے ہیں۔ اب سارا معاملہ شرپسند اور انتظامیہ کے درمیان ہوجاتا ہے۔

آخری ضروری چیز اتحاد ہے۔ کوئی بھی اجتماعی تدبیر اجتماعی طاقت ہی سے کامیاب ہوتی ہے، اور اتحاد ہی کا دوسرا نام اجتماعی طاقت ہے۔ اس سلسلے میں یہ بات بخوبی سمجھ لینا چاہیے کہ اتحاد اس طرح کبھی نہیں ہوتا کہ تمام لوگوں کی رائیں ایک ہو جائیں۔ ایسا اتحاد موجودہ دنیا میں ممکن نہیں۔ اتحاد دراصل اختلاف رائے کے باوجود متحد ہونے کا نام ہے، نہ کہ اختلاف رائے نہ ہونے پر متحد ہونے کا۔ اگر ہم اپنے حریف کے مقابلہ میں موثر بننا چاہتے ہیں تو ہم کو رائے کی قربانی دینے پر تیار ہونا پڑے گا۔ رائے کی قربانی ہی پر اتحاد قائم ہوتا ہے اور جہاں اتحاد موجود ہو وہاں کسی شریر کی شرارت کا کوئی گزر نہیں۔

تدبیر وہی ہے جو خاموش تدبیر ہو۔ کسی ناخوش گوار صورت حال کے پیش آنے کے بعد جب آدمی شور وغل کرنے لگے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ جذبات سے مغلوب ہو گیا ہے۔ اور جذبات سے مغلوب انسان کبھی کوئی گہری تدبیر سوچ نہیں سکتا۔ گہری تدبیر گہرے غور و فکر سے حاصل ہوتی ہے، جب کہ شور وغل آدمی کو اس قابل ہی نہیں رکھتا کہ وہ کسی معاملہ میں گہرائی کے ساتھ غور کر سکے۔

صبر کب تک

ایک تعلیم یافتہ مسلمان نے کہا کہ آپ الرسالہ میں اکثر صبر کی تلقین کرتے ہیں۔ آخر یہ صبر کب تک۔ میں نے کہا کہ آپ کے سوال کا جواب دینے سے پہلے میں خود آپ سے ایک بات پوچھتا ہوں۔ آپ پہلے میرے سوال کا جواب دیں۔ اس کے بعد میں اس بات کی وضاحت کروں گا جو آپ نے دریافت فرمائی ہے۔

پھر میں نے کہا کہ اسلام میں پانچ وقت کی نماز پڑھنے کا حکم دیا گیا ہے۔ اگر ایک شخص آپ سے پوچھے کہ آخر یہ پانچ وقت کی نماز کب تک پڑھی جاتی رہے گی تو آپ ایسے شخص کو کیا جواب دیں گے۔ انھوں نے کہا کہ نماز تو اللہ کی عبادت ہے۔ اس کی کوئی آخری حد نہیں

۔نماز ہر آدمی کو ساری عمر ادا کرنا ہے، یہاں تک کہ اس کی موت کا وقت آجائے۔

میں نے کہا کہ یہی آپ کے سوال کا جواب بھی ہے۔ صبر بھی اللہ تعالیٰ کی عبادت ہے۔ آدمی کو اپنی زندگی کے آخری لمحہ تک صبر کی روش اختیار کرنا ہے۔ موت سے پہلے کسی سے یہ حکم رفع نہیں ہوتا۔ ایک مسلمان کو جس طرح نماز پڑھنا ہے، اسی طرح اس کو صبر بھی کرنا ہے۔

آپ دیکھئے۔ قرآن میں نماز کا حکم جن لفظوں میں دیا گیا ہے، ٹھیک انھیں لفظوں میں صبر کا حکم بھی دیا گیا ہے۔ نماز کے بارے میں قرآن میں ہے کہ: فَصَلِّ لِرَبِّكَ (108:2)۔ اسی طرح صبر کے بارے میں قرآن میں فرمایا کہ: وَلِرَبِّكَ فَاصْبِرْ (74:7)۔ اس سے معلوم ہوا کہ نماز بھی اللہ کے لیے ہے اور صبر بھی اللہ کے لیے۔ دونوں ہی مومن کی پوری زندگی کا کورس ہیں۔ دونوں ہی کی حد اس وقت آتی ہے، جب کہ خود مومن کی زندگی کی حد آجائے۔

صبر بامقصد انسان کا اخلاق ہے۔ مومن سب سے بڑا بامقصد انسان ہوتا ہے۔ اس لیے مومن سب سے زیادہ صبر والا ہوتا ہے۔ ایمان آدمی کے دل کو نرم کرتا ہے۔ وہ آدمی کو دوسروں کا خیر خواہ بناتا ہے۔ وہ آدمی کے اندر تواضع اور اعتراف کی صفت پیدا کرتا ہے۔ وہ آدمی کے اندر یہ جذبہ ابھارتا ہے کہ وہ دوسروں کے لیے نفع بخش بنے۔ ان صفتوں کے ساتھ جو اخلاقی روش مناسبت رکھتی ہے، وہ صبر ہی ہے۔ صبر کے بغیر کوئی شخص کبھی ان اعلیٰ صفات پر قائم نہیں رہ سکتا۔

صبر ایک پیغمبرانہ عمل

ایک صاحب نے ماہنامہ الرسالہ میں ایک مضمون پڑھا۔ اس میں قرآن کے حوالے سے صبر کے طریقے کی اہمیت بتائی گئی تھی۔ وہ اس مضمون کو پڑھ کر غصہ ہوگئے، انھوں نے کہا کہ صبر کب تک، ہمارے اوپر ظلم ہو رہا ہے تو ہم کب تک صبر کریں۔ ہمیں ظلم کے خلاف لڑنا ہے۔ ظلم کے خلاف صبر کرنا، بزدلی ہے، نہ کہ صبر۔ صبر بزدل کا ہتھیار ہے، وہ

مظلوم کا ہتھیار نہیں۔ اگر ہر حال میں صبر کیا جائے تو صرف ظالموں کے لیے اس دنیا میں جگہ ہوگی، مظلوموں کے لیے خدا کی بنائی ہوئی اس دنیا میں کوئی جگہ باقی نہ رہے گی۔

جو لوگ اس طرح سوچتے ہیں، میرے نزدیک وہ اس بات کو نہیں جانتے کہ صبر کوئی مجبوری کی چیز نہیں۔ صبر بہادر آدمی کا طریقہ ہے۔ صبر دانش مند آدمی کا ہتھیار ہے۔ صبر تمام پیغمبروں کا طریقہ ہے (ابراہیم، 14:12)۔ حتیٰ کہ خود اللہ رب العالمین کا بھی (صحیح البخاری، حدیث نمبر 6099)۔ تاریخ بتاتی ہے کہ اس دنیا میں صبر کرنے والوں کو ہمیشہ کامیابی حاصل ہوئی ہے۔ جو لوگ بے صبری کا طریقہ اختیار کریں، وہ آخر کار ہمیشہ ناکام ہو کر رہ جاتے ہیں۔ اس معاملہ کا عزت نفس سے کوئی تعلق نہیں۔ عزت نفس (self respect) کا لفظ صرف نادانوں کی ڈکشنری میں پایا جاتا ہے۔

جو لوگ صبر کو بزدلی کہتے ہیں، وہ اپنے نقطہ نظر کو بتانے کے لیے غلط لفظ استعمال کرتے ہیں۔ ایسے لوگ قرآن کی اس آیت کے مصداق ہیں: وَإِذَا تُتْلَى عَلَيْهِمْ آيَاتُنَا بَيِّنَاتٍ قَالَ الَّذِينَ لَا يَرْجُونَ لِقَاءَنَا ائْتِ بِقُرْآنٍ غَيْرِ هَذَا أَوْ بَدِّلْهُ (10:15)۔ یعنی، اور جب ان کو ہماری کھلی ہوئی آیتیں پڑھ کر سنائی جاتی ہیں تو جن لوگوں کو ہمارے پاس آنے کا کھٹکا نہیں ہے، وہ کہتے ہیں کہ اس کے سوا کوئی اور قرآن لاؤ یا اس کو بدل دو۔ اسی طرح ایسے لوگوں کو چاہیے کہ وہ قرآن کی اس آیت پر غور کریں:

> وَلَقَدْ أَرْسَلْنَا مُوسَى بِآيَاتِنَا أَنْ أَخْرِجْ قَوْمَكَ مِنَ الظُّلُمَاتِ إِلَى النُّورِ وَذَكِّرْهُمْ بِأَيَّامِ اللَّهِ إِنَّ فِي ذَلِكَ لَآيَاتٍ لِكُلِّ صَبَّارٍ شَكُورٍ (14:5)۔ یعنی، اور ہم نے موسیٰ کو اپنی نشانیوں کے ساتھ بھیجا کہ اپنی قوم کو اندھیروں سے نکال کر اجالے میں لاؤ اور ان کو اللہ کے دنوں کی یاد دلاؤ۔ بیشک ان کے اندر بڑی نشانیاں ہیں ہر اس شخص کے لیے جو صبر اور شکر کرنے والا ہو۔

صبر اور امن

نان وائلنس اپنی حقیقت کے اعتبار سے عین وہی چیز ہے جس کو قرآن میں صبر کہا گیا ہے۔ صبر دراصل مثبت ردِ عمل کا دوسرا نام ہے۔ ناخوش گوار حالات میں منفی ردِ عمل سے اپنے آپ کو بچانا اور یک طرفہ طور پر اپنے آپ کو مثبت ردِ عمل پر قائم رکھنا، یہی صبر کی حقیقت ہے۔ چونکہ اس اخلاقی روش پر قائم ہونے کے لیے برداشت کی ضرورت ہوتی ہے اس لیے اس کو شریعت میں صبر کا نام دیا گیا۔

23 جولائی 1993ء کو میں نے جمعہ کی نماز دہلی کی مسجد سنگ تراشان پہاڑ گنج میں پڑھی۔ اس مسجد کے چاروں طرف صد فی صد ہندوؤں کی آبادی ہے۔ 1947ء کے بعد یہ مسجد بند ہوگئی تھی۔ یہاں محلہ کے لوگ کوڑا ڈالا کرتے تھے۔ 1982ء میں دہلی کے ایک مسلمان جناب محمود سعید بلالی (پیدائش 1953ء) کو خیال ہوا کہ اس مسجد کو واگزار کیا جائے۔

انھوں نے کوشش کر کے اس مسجد کو کھلوایا۔ اس کی صفائی اور مرمت کرائی۔ اب سوال یہ تھا کہ اس کو آباد کس طرح کیا جائے۔ کیوں کہ یہاں قریب میں کوئی مسلمان نہیں۔ چنانچہ انھوں نے ایک استاد رکھ کر یہاں ایک مدرسہ قائم کر دیا۔ دو درجن مسلمان بچے یہاں رہنے اور پڑھنے لگے۔ اس طریقہ یہاں پنج وقتہ نماز قائم ہوگئی۔

محمود سعید بلالی صاحب (Tel. 3260028) نے اپنے واقف کاروں کے حلقہ میں اس مسجد کے بارے میں بتایا تو جمعہ کے دن کافی لوگ یہاں آنے لگے۔ یہاں تک کہ مسجد نمازیوں سے بھر جاتی تھی۔ بلال صاحب نے طلبہ اور نمازیوں کی سہولت کے لیے یہ منصوبہ بنایا کہ صحن کے نصف حصہ میں چھت ڈال کر ایک سائبان بنا دیا جائے۔ انھوں نے کام شروع کر دیا۔ سانچہ بن گیا اور اس پر چھت کی تعمیر کی جانے لگی۔

یہ 9 مارچ 1991 کا واقعہ ہے۔ اچانک تقریباً ڈیڑھ سو ہندو جمع ہو گئے، جن میں زیادہ تر نوجوان تھے۔ انھوں نے کہا کہ ہم چھت بننے نہیں دیں گے۔ تم اس چھت کو اتارو، ورنہ یہاں خون ہو جائے گا اور تمہاری مسجد بھی باقی نہیں رہے گی۔ ایک طالب علم نے پولس اسٹیشن جا کہ انہیں خبر کر دی۔ اس کے بعد بڑی تعداد میں پولس آ گئی۔ ان میں پولیس افسران بھی تھے۔ پولیس نے موقع کا جائزہ لینے کے بعد کہا کہ یہ تعمیر قانون کے دائرہ میں ہو رہی ہے، اس لیے کوئی اس کو روک نہیں سکتا۔ پولیس نے مسلمانوں سے کہا کہ تم لوگ چھت بناؤ، ہم یہاں کھڑے ہوئے ہیں۔

محمود سعید بلالی نے سوچا کہ اگر میں پولیس کے کہنے سے چھت کا کام جاری رکھوں تو یہ پولیس والے یہاں کب تک میری حفاظت کریں گے، آخر کار تو سابقہ انھیں پڑوس کے ہندوؤں سے رہے گا۔ اور وہ چھت تو کیا، مسجد بھی توڑ کر رکھ دیں گے۔ اور کوئی انہیں روک نہ سکے گا۔ بلالی صاحب انھیں خیالات میں تھے کہ ہندو مجمع میں سے ایک بوڑھا آدمی آگے آیا۔ اس نے کہا کہ میاں جی، اس وقت یہ لوگ بہت جوش میں ہیں۔ وہ کچھ بھی کر سکتے ہیں۔ تم ضد نہ کرو اور اپنی چھت اتار دو۔

بلالی صاحب نے فوراً اس کو استعمال کیا۔ انھوں نے کہا کہ یہ بڑے میاں جس طرح تمہارے بڑے ہیں، اسی طرح وہ میرے بھی بڑے ہیں۔ میں ان کی بات مانتا ہوں۔ اور اسی وقت اپنے مزدوروں سے کہہ دیا کہ چھت اتار دو۔ چنانچہ چھت اتار دی گئی۔ اس وقت تک اس چھت پر 25 ہزار روپے خرچ ہو چکے تھے۔

اس واقعہ کا علاقہ کے تمام ہندوؤں پر بہت اچھا اثر پڑا۔ سب کے سب مسجد اور مسجد والوں کے ہمدرد بن گئے۔ اب یہاں لاؤڈ سپیکر کی اذان کے ساتھ پنج وقتہ نماز ہوتی ہے۔ باقاعدہ جمعہ ہوتا ہے۔ اسلامی تعلیم کا ایک مدرسہ چل رہا ہے۔ رمضان میں شاندار تراویح

ہوتی ہے، وغیرہ۔مگر ہندوؤں کی طرف سے کوئی رکاوٹ نہیں۔ وہ لوگ اکثر کہتے رہتے ہیں کہ آپ کی کوئی ضرورت ہوتو ہم کو بتائیے۔ اگر کوئی ہندو آپ کو پریشان کرے تو فوراً ہم کو بتائیے۔ہم اس سے نمٹ لیں گے۔

6 دسمبر 1992ء کو جب یہ خبر پھیلی کہ اجودھیا کی بابری مسجد توڑ دی گئی، ساری دہلی میں تناؤ کی صورت پیدا ہوگئی۔ کئی جگہ ہندو مسلم فسادات بھی ہوئے۔ اس علاقہ میں بھی تناؤ کی حالت تھی۔ جبکہ اس وقت مسجد میں 23 مسلم بچے موجود تھے۔

محمود سعید بلالی صاحب اس وقت جامع مسجد کے علاقہ میں تھے اور کچھ کر نہیں سکتے تھے۔مگر پڑوس کے ہندو ان کا بدل بن گئے۔ وہ خود مسجد میں آئے۔ بچوں کو لے جا کر ایک قریبی اسکول میں رکھا۔ ان کے کھانے پینے کا انتظام کیا۔ اور پھر تمام بچوں کو حفاظت کے ساتھ ان کے گھروں تک پہنچایا۔

بلالی صاحب اگر ضد کرتے اور اکڑ دکھاتے تو دوسری طرف بھی ضد اور اکڑ پیدا ہوتی۔ اور پھر فساد برپا ہوجاتا۔مگر جب انھوں نے نرمی اور تواضع کا انداز اختیار کیا تو دوسری جانب بھی نرمی اور تواضع پیدا ہوگئی۔ اس کے بعد فساد کا ماحول امن کے ماحول میں تبدیل ہوگیا۔

بے صبری کا نتیجہ

15 جنوری 1986ء کا واقعہ ہے ۔ انڈین ایر لائنز کا ایک جہاز (فلائٹ نمبر 406) بمبئی سے دہلی کے لیے اڑا۔مگر صرف پندرہ منٹ بعد وہ واپس ہوا اور دوبارہ بمبئی کے ہوائی اڈہ پر اتر گیا۔ اس کی وجہ یہ ہوئی کہ یہ جہاز کسی ٹیکنکل سبب سے آدھ گھنٹہ لیٹ ہوگیا تھا۔ جہاز جب اوپر فضا میں پہونچا تو اس کے ایک مسافر نے کیپٹن بھٹناگر کے نام ایک نوٹ بھیجا کہ وہ بتائے کہ جہاز کیوں آدھ گھنٹہ لیٹ روانہ ہوا ہے۔

کیپٹن نے مذکورہ مسافر کو کاک پٹ میں بلایا اور وضاحت کرنے کی کوشش کی کہ

لیٹ ہونے کی وجہ کیا تھی۔ مسافر اس کی وضاحت سے مطمئن نہیں ہوا اور کیپٹن کی پیٹھ پر گھونسہ مار کر کہا کہ میں نے تمہارے جیسے بہت پائلٹ دیکھے ہیں:

I have seen many pilots like you.

کیپٹن بھٹناگر اس صورت حال سے گھبرا اٹھے۔ انھوں نے فوراً جہاز کو موڑ دیا اور اس کو واپس لاکر دوبارہ بمبئی کے ہوائی اڈہ پر اتار دیا۔ اس کے بعد بمبئی کے ہوائی اڈہ پر کافی دیر تک ہنگامہ رہا۔ بالآخر انڈین ایر لائنز کے ذمہ داروں نے جہاز کو دوسرے پائلٹ کے ذریعہ روانہ کیا۔

اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مذکورہ جہاز جب بمبئی سے دہلی پہنچا تو وہ تین گھنٹہ لیٹ ہو چکا تھا۔ مسافر نے آدھ گھنٹہ کی تاخیر برداشت نہ کی۔ اس کی قیمت انھیں یہ دینی پڑی کہ وہ تین گھنٹہ تاخیر کے ساتھ اپنی منزل پر پہنچے۔ مزید یہ کہ انڈین ایرلائنز کے ذمہ داروں نے ایک اعلیٰ سطحی انکوائری (high-level inquiry) بٹھائی ہے (ٹائمس آف انڈیا، ہندستان ٹائمس، 16 جنوری 1986ء)۔

مذکورہ مسافر بالفرض کسی سزا سے بچ جائیں، تب بھی وہ ایک انجام سے بچ نہیں سکتے۔ اسی چیز کی اور زیادہ قیمت دینا جس کی تھوڑی قیمت دینے پر وہ راضی نہیں ہوئے تھے، یعنی وقت۔ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ آدمی یہ سمجھتا ہے کہ وہ اپنے مقصد کو حاصل کر رہا ہے۔ حالاں کہ وہ اپنے مقصد کو کھو رہا ہوتا ہے۔ وہ سمجھتا ہے کہ میں اپنی منزل کی طرف تیزی سے بڑھ رہا ہوں۔ حالاں کہ اس کی تیزی کا انجام صرف یہ ہوتا ہے کہ وہ اپنی منزل سے کچھ اور دور ہو جائے۔

صبر کا پھل

نسیم علی خاں صاحب (پیدائش 1959ء) گیارہ سال سے بمبئی میں رہتے ہیں۔ 23 اگست 1990ء کی ملاقات میں انھوں نے ایک واقعہ بتایا جو بہت سبق آموز ہے۔

بمبئی میں سیوری کراس روڈ کے علاقہ میں ''مقدس مسجد'' کے نام سے ایک مسجد ہے۔ یہاں پچھلے 25 سال سے تبلیغی جماعت کا کام ہو رہا تھا۔ تین سال پہلے کی بات ہے، ایک روز سنی (بریلوی) مسلمانوں کی ایک جماعت اچانک مسجد میں آ گئی۔ یہ جمعہ کا دن تھا، وہ کھڑے ہو کر سلام پڑھنے لگے۔ دوسرے مسلمانوں نے انھیں روکا۔ اس پر بات بڑھی، اور پولس بلانی پڑی۔

بریلوی حضرات کے مطالبہ پر آخر کار یہ طے ہوا کہ وہ سلام نہیں پڑھیں گے، مگر تبلیغی جماعت والے بھی یہاں اپنی کتاب پڑھنا بند کر دیں گے۔ اس پر تبلیغ والے راضی ہو گئے۔

اب مسجد میں تبلیغ والوں کی کتاب کا پڑھنا بند ہو گیا۔ تاہم تبلیغ والوں نے اپنا کام بند نہیں کیا۔ اب وہ مسجد کے دروازہ پر اپنا پروگرام کرنے لگے۔ تبلیغ والوں نے کوئی جوابی کارروائی نہیں کی۔ البتہ اخلاقی تدبیریں کرتے رہے۔ مثلاً ایک بار انھوں نے سیوری کے سنی مسلمانوں کے سرکردہ افراد کو کھانے پر بلایا۔ ان کے لیے عمدہ طریقہ پر دعوت کا انتظام کیا، وغیرہ۔

یہ سلسلہ تقریباً ڈیڑھ سال تک جاری رہا۔ تبلیغ والے صبر کے ساتھ مسجد کے باہر اپنا پروگرام کرتے رہے۔ اسی کے ساتھ خوش اخلاقی اور خوش تدبیری کے ذریعہ ان کے دلوں کو نرم بھی کرتے رہے۔ آخر کار تمام مخالف لوگ نرم پڑ گئے، یہاں تک کہ انھوں نے تبلیغ والوں کو اجازت دے دی کہ وہ مسجد کے اندر آ کر اپنا پروگرام کر سکتے ہیں۔

یہی موجودہ دنیا میں کامیابی کا طریقہ ہے۔ اسی کے ذریعہ تمام مسئلے حل ہو سکتے ہیں، خواہ وہ مسئلہ مسلمان اور مسلمان کے درمیان پیدا ہوا ہو یا مسلمان اور ہندو کے درمیان۔

موجودہ دنیا آزادی کی دنیا ہے۔ یہاں ہر ایک کو اپنی مرضی کے مطابق عمل کرنے کا اختیار ہے۔ اس لیے یہاں ایک دوسرے کے درمیان اختلاف کا پیش آنا عین فطری ہے،

اس کا حل ٹکراؤ میں نہیں۔ اس کا واحد حل وہی ہے جس کو "حکمت اعراض" کہا جاتا ہے۔

صبر کی ضرورت

مغل حکمراں اورنگ زیب کو اپنے والد شاہ جہاں سے سیاسی اختلاف ہوا۔ 1658ء میں اس نے شاہ جہاں کو تخت سے بے دخل کر کے آگرہ کے قلعہ میں قید کر دیا۔ اسی حال میں شاہجہاں 1666ء میں 74 سال کی عمر میں مر گیا۔ اسیری کے زمانہ میں اس کی بہن جہاں آراء بھی قلعہ میں اس کے ساتھ تھی۔ شاہ جہاں آگرہ کے قلعہ سے تاج محل کو دیکھا کرتا تھا اور اشعار پڑھتا رہتا تھا۔

ڈاکٹر آر سی مجمدار، ڈاکٹر ایچ سی رائے چودھری اور ڈاکٹر کالی کنکر دتا نے اپنی مشترک کتاب تاریخ ہند (An Advanced History of India) میں شاہ جہاں کے آخری حالات کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ اس نے مذہب میں اپنی تسکین کا سامان پا لیا۔ اور صبر کا طریقہ اختیار کرتے ہوئے اپنے آخری ایام اپنی پارسا لڑکی جہاں آراء کے ساتھ عبادت اور مراقبہ میں گزار دیے، یہاں تک کہ وہ مر گیا:

> He found solace in religion, and, in a spirit of resignation, passed his last days in prayer and meditation in the company of his pious daughter Jahanara, till his death (p. 477).

کہا جاتا ہے کہ ایک عرصہ کے بعد شاہ جہاں قید کی زندگی سے گھبرا اٹھا۔ اس نے اورنگ زیب کو ایک مصرعہ لکھ کر بھیجا، جس کا مطلب یہ تھا کہ یا تو ہم کو مار ڈالو یا دام دو یا پھر ہم کو آزاد چھوڑ دو:

یا بکش یا دام دہ یا از قفس آزاد کن

اورنگ زیب نے بھی اس کے جواب میں ایک اور مصرعہ لکھ کر شاہ جہاں کے پاس بھیج

دیا۔ جو یہ تھا کہ ہوشیار چڑیا جب جال میں پھنس جائے تو اس کو برداشت سے کام لینا چاہیے:

مرغ زیرک چوں بدام افتد تحمل بایدش

ہوسکتا ہے کہ یہ واقعہ نہ ہو، صرف ایک لطیفہ ہو۔ تاہم یہ بذات خود ایک حکمت کی بات ہے۔ بعض اوقات ایسا ہوتا ہے کہ آدمی کسی غلطی یا کسی حادثہ کی بناء پر ایک ایسی صورت حال میں پھنس جاتا ہے، جو اس کے لیے عام حالات میں بالکل ناقابل برداشت ہوتی ہے۔ مگر اب جہاں وہ پھنس گیا ہے، وہاں سے فوری طور پر نکلنا عملاً ممکن نہیں ہوتا۔ ایسی حالت میں گھبرا کر کوئی اقدام کرنا سراسر نادانی ہے۔ جال میں پھنسنے کے بعد چڑیا اگر پر پھڑ پھڑائے تو وہ اور زیادہ پھنستی چلی جاتی ہے، اسی طرح کسی نازک صورت حال میں پھنس جانے کے بعد آدمی اگر بے صبری کے ساتھ کارروائی کرے تو وہ اور زیادہ اس میں الجھ جائے گا۔

حکمت کا یہ اصول افراد کے لیے بھی ہے اور قوموں کے لیے بھی۔

مسائل پر صبر

ایک بستی تھی۔ وہاں کے لوگ بہت تیز زبان تھے۔ وہاں دو آدمیوں نے دکان کھولی۔ ایک نوجوان تھا اور دوسرا بوڑھا۔ نوجوان کی دکان جلد ہی ختم ہوگئی۔ بوڑھے کی دکان چلتی رہی۔ آج وہ اس بستی میں سب سے بڑا دولت مند بنا ہوا ہے۔ اب ہر آدمی اس سے ادب کے ساتھ بات کرتا ہے۔

اس کی وجہ یہ تھی کہ نوجوان دکان دار نے جب دیکھا کہ جو گاہک آتا ہے وہ تیز زبان میں بات کرتا ہے تو اس نے لوگوں کی تیز کلامی کے خلاف جنگ شروع کردی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اس کے خلاف لوگوں کی تیز کلامی تیز دستی تک پہنچ گئی۔ لوگوں نے اس کو پکڑ کر مارا، یہاں تک کہ وہ دکان بند کر کے وہاں سے بھاگ گیا۔

بوڑھے دکان دار کی کامیابی کا راز یہ تھا کہ اس نے لوگوں کی تیز زبان اور درشت کلام کو نظر انداز کیا۔ اس نے اپنی نظر صرف لوگوں کی جیب پر رکھی، اور لوگوں کی زبان سے اپنی نظر ہٹالی۔ اسی پالیسی کا نتیجہ تھا کہ اس نے اپنی دکان داری میں شاندار کامیابی حاصل کی۔

یہ دنیا کی کامیابی کا واقعہ ہے۔ آخرت کی کامیابی کا اصول بھی یہی ہے۔ آخرت کی کامیابی کے لیے بھی اسی طرح لوگوں کی زیادتیوں پر صبر کرنا پڑتا ہے۔ جو شخص دنیا میں صبر کا طریقہ اختیار نہ کرے، اس کے لیے آخرت کی "تجارت" کو کامیاب بنانا ممکن نہیں۔

آخرت کی کامیابی کے لیے اہل ایمان کو جو فرض سونپا گیا ہے، وہ دعوت الی اللہ ہے۔ اسی فرض کی انجام دہی پر ان کو وہ کامیابی ملنے والی ہے جس کو آخرت کی جنت کہا گیا ہے۔ نیز جب اہل ایمان یہ خدائی ذمہ داری ادا کرتے ہیں تو ابتدائی انعام کے طور پر انھیں دنیا میں بھی سربلندی دے دی جاتی ہے۔ لیکن اگر وہ صبر پر قائم نہ ہوسکیں تو وہ دنیا میں بھی محروم رہتے ہیں اور آخرت میں بھی۔

موجودہ زمانہ کے مسلمانوں کا کیس، ایک لفظ میں، یہ ہے کہ جن باتوں پر انھیں صبر کرنا تھا ان پر وہ لڑ رہے ہیں، اور اس کو غلط طور پر جہاد کہتے ہیں۔ اس دنیا میں لازماً ایسا ہوگا کہ مسلمانوں کو دوسروں کی طرف سے زیادتیوں کا تجربہ ہوگا۔ اہل ایمان کو لازماً ایسا کرنا ہے کہ وہ مسائل سے اپنی نظریں ہٹالیں اور اپنی ساری توجہ صرف فرض کی ادائیگی پر لگادیں۔

بے صبری نہیں

میں نے اپنی پوری زندگی مطالعہ میں گزاری ہے۔ میں نے جب انسانی تاریخ کا مطالعہ کیا تو مجھے سمجھ میں آیا کہ وہی انسان کامیاب ہوسکتا ہے، جو مستقل مزاج ہو۔ لیکن جس کے اندر گراس ہاپر (grasshopper) والا مزاج ہو، یعنی جو مستقل مزاجی کے ساتھ کسی ایک

چیز پر ٹک کر نہیں رہتا ہو، وہ ہر میدان میں ناکام ہوتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ مستقل مزاجی سے انسان کو کامیابی ملتی ہے۔ کیوں کہ فطری قانون کے مطابق، اس دنیا میں کامیابی چند لمحوں کی محنت سے حاصل نہیں ہوتی، اس کے لیے صبر کے ساتھ لگاتار کوشش کرنا پڑتا ہے۔ برطانیہ کے سابق وزیر اعظم ونسٹن چرچل (1874-1965) کا ایک قول ہے— مستقل کوشش، نہ کہ قوت یا عقل، ہمارے پوٹنشل کو ایکچول بنانے کی چابی ہے:

Continuous effort, not strength or intelligence, is the key to unlocking our potential.

یہ صرف دنیوی امور کا معاملہ نہیں ہے، بلکہ دینی امور میں بھی یہی مستقل کوشش پسندیدہ ہے۔ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا گیا کہ کون سا عمل اللہ کو سب سے محبوب ہے (أَيُّ الْعَمَلِ أَحَبُّ إِلَى اللّٰهِ؟)، آپ نے کہا کہ جو مسلسل کیا جائے اگرچہ کم ہو: أَدْوَمُهُ وَإِنْ قَلَّ (صحیح مسلم، حدیث نمبر 782)۔

اس کی وجہ یہ ہے کہ جب آپ کسی چیز کو پانے کی کوشش کرتے ہیں تو یہ صرف آپ کا معاملہ نہیں ہوتا، بلکہ اس میں دوسری چیزوں کو مینج کرنے کا معاملہ بھی شامل ہوجاتا ہے، خواہ وہ دوسرے انسانوں کا معاملہ ہو یا کوئی اور چیز۔ اللہ کا طریقہ یہ ہے کہ وہ ان تمام چیزوں کو مینج کرتے ہوئے انسان کی کوشش کا نتیجہ ظاہر کرتا ہے۔ اس لیے انسان کو اس کی کوشش کا نتیجہ فوراً نہیں مل پاتا، اس کو مسلسل کوشش کرنا پڑتا ہے۔ اس کو جلد بازی کے بجائے تدریج کے ذریعہ اپنا سفر طے کرنا پڑتا ہے۔

خدا جلدی نہیں چاہتا

ایک شخص اپنے عیسائی دوست سے ملنے گیا۔ جب وہ دوست کے یہاں پہنچا تو اس نے دیکھا کہ وہ اپنے گھر کے سامنے بے تابی کے ساتھ ٹہل رہے ہیں۔ ”آج میں آپ کو پریشان

دیکھ رہا ہوں، آخر کیا بات ہے"۔ اس نے پوچھا۔ عیسائی دوست اچانک سنجیدہ ہو گئے۔ انھوں نے کہا:

I am in hurry, but God isn't.

میں جلدی چاہتا ہوں، مگر خدا جلدی نہیں چاہتا۔ اس کے بعد انھوں نے اپنے صحن میں ایک مرجھائے ہوئے آم کے درخت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا: میں نے اس کو بڑی امیدوں کے ساتھ پچھلے ہفتہ لگایا تھا۔ مگر اب وہ سوکھ کر ختم ہو چکا ہے۔

"یہ درخت تو کافی بڑا ہے، پھر ایک ہفتہ پہلے کیسے آپ نے اس کو لگایا تھا"۔ آدمی نے پوچھا۔ "یہی تو اصل بات ہے"۔ عیسائی دوست نے کہا۔ "میں نے چاہا کہ میں اچانک ایک بڑا درخت اپنے یہاں کھڑا کر دوں۔ مگر خدا کی اس دنیا میں ایسا ہونا ممکن نہیں۔ میں نے آم کا چھوٹا پودا لگانے کے بجائے یہ چاہا کہ پانچ سال کا درخت لا کر اپنے صحن میں لگاؤں اور اس طرح پانچ سال کا سفر ایک دن میں طے کرلوں۔ میں نے درخت تو کہیں نہ کہیں سے لا کر لگالیا، مگر وہ اگلے ہی دن سوکھ گیا۔ اور اب اس کی جو صورت ہے وہ تم اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہو"۔

اس کے بعد عیسائی دوست نے کہا: اس دنیا میں کسی چیز کو وجود میں لانے کے لیے خدا کا ایک قانون ہے۔ ہم اس قانون کی پیروی کر کے ہی اس چیز کو اپنے لیے وجود میں لا سکتے ہیں۔ اگر ہم قدرت کے اصول کی پیروی نہ کریں اور اپنی خواہشوں پر چلنے لگیں تو ہمارے حصہ میں "سوکھا درخت" آئے گا، نہ کہ "ہرا بھرا باغ"۔

لکڑی کی ایک کشتی کی تاریخ اگر چھوٹے پودے سے شروع کی جائے تو ہم کہہ سکتے ہیں کہ ہر کشتی والا انتظار کرتا ہے کہ قدرت ایک درخت اگائے۔ زمین و آسمان کے تمام انتظامات اس کو پروان چڑھانے کے لیے وقف ہوں۔ یہ کام سو برس تک ہوتا رہے۔ یہاں تک کہ جب مسلسل عمل کے نتیجہ میں ننھا پودا پختہ درخت کی عمر کو پہنچ جاتا ہے، اس وقت

کشتی والا اس کو کاٹتا ہے۔ اس کے تنے بناتا ہے اور پھر ان تختوں کو لوہے کی کیلوں سے جوڑ کر وہ کشتی تیار کرتا ہے جو انسانی قافلوں کو پانی کے اوپر سفر کرنے کے قابل بنائے۔

ذاتی معاملات میں ہر آدمی اس بات کو جانتا ہے۔ مگر جب ملت کا معاملہ ہو تو وہ چاہتا ہے کہ فی الفور ایک عظیم الشان کشتی دریا میں اتار دے، خواہ اس کے پاس کشتی کے نام سے کاغذ کی ناؤ ہی کیوں نہ ہو۔

یاد رکھئے، یہ دنیا خدا کی دنیا ہے۔ اس کو خدا نے بنایا ہے۔ اور وہ اسی خدا کے قانون کے تحت چل رہی ہے۔ ہم اس سے موافقت کر کے اپنی زندگی کی تعمیر کر سکتے ہیں۔ اگر ہم اس کے ساتھ موافقت نہ کریں تو ہمیں اس دنیا میں کچھ ملنے والا نہیں۔

جس طرح درخت تدریج کے ساتھ اگتا ہے، اسی طرح انسانی زندگی کے معاملات بھی تدریج کے ساتھ درست ہوتے ہیں۔ اگر آپ اپنی زندگی کی تعمیر کرنا چاہتے ہیں تو سب سے پہلے قدرت کے اس تدریجی قانون کو جانیے اور اس کے ساتھ موافقت کرتے ہوئے اپنا سفر شروع کیجیے۔ اس کے سوا اس دنیا میں کامیابی کا کوئی اور راستہ نہیں۔ بقیہ تمام راستے کھڈ کی طرف جاتے ہیں، نہ کہ کسی منزل کی طرف۔

قرآن میں بار بار صبر کی تاکید کی گئی ہے۔ صبر کا مطلب بے عملی نہیں، صبر دراصل منصوبہ بند عمل کا دوسرا نام ہے۔ بے صبر آدمی فوری ردعمل کے تحت بے سوچے سمجھے کارروائی کرتا ہے۔ اس کے برعکس، صبر والا آدمی اپنے جذبات کو روک کر پورے معاملہ پر غور کرتا ہے۔ وہ اپنی طاقت اور دوسرے کی طاقت کا اندازہ کرتا ہے۔ وہ حالات کا جائزہ لیتا ہے۔ وہ قانون قدرت کو سمجھتا ہے جس کے دائرہ میں اس کو اپنا عمل کرنا ہے۔

اسی طرح سوچ بچار کے بعد عمل کا نقشہ بنانے کے لیے اپنے جذبات کو تھامنا پڑتا ہے، اس لیے اس کو شریعت میں صبر کہا گیا ہے۔ موجودہ زمانہ میں اسی کو منصوبہ بند عمل کہتے

ہیں۔ اس دنیا میں صابرانہ عمل ہمیشہ کامیاب ہوتا ہے، اور غیر صابرانہ عمل ہمیشہ ناکام۔

ایک خط

برادر محترم عبد السلام اکبانی صاحب السلام علیکم ورحمۃ اللہ

29 نومبر 2002 کو آپ سے ٹیلی فون پر گفتگو ہوئی۔ اس کے بعد یہ خط لکھ رہا ہوں۔ ایک صاحب نے کہا کہ صبر کا مطلب آپ برداشت بتاتے ہیں، یہ غلط ہے، صبر کا مطلب حوصلہ ہے۔

صبر کا ابتدائی لغوی مفہوم برداشت (patience) یا اپنے آپ کو روکنا ہے۔ مشہور عربی لغت لسان العرب میں صبر کا مفہوم ان الفاظ میں بتایا گیا ہے: أَصْلُ الصَّبْرِ الْحَبْسُ ...الصَّبْرُ نَقِيْضُ الجَزَعِ (جلد 4، صفحہ 438)۔ یعنی، صبر کی حقیقت رکنا ہے... صبر کی ضد بے چینی اور جلد بازی ہے۔

جہاں تک حوصلہ (courage) کا تعلق ہے وہ بلا شبہ زندگی کی ایک اہم قدر ہے۔ زندگی میں برداشت کی بھی ضرورت ہوتی ہے اور حوصلہ کی بھی۔ مگر بنیادی سوال یہ ہے کہ کس کو کس کے تابع کیا جائے۔ حوصلہ کو برداشت کے تابع کیا جائے یا برداشت کو حوصلہ کے تابع۔ اسی راز کو جاننے کا نام کامیابی ہے۔

میرے علم کے مطابق، تاریخ کی بیشتر تباہیاں، خواہ وہ انفرادی ہوں یا اجتماعی، اس لیے ہوئی ہیں کہ لوگوں نے حوصلہ کو اوپر کر دیا اور برداشت کو نیچے۔ اور اپنے حوصلہ مندانہ جذبات کے تحت ایک ایسا اقدام کر ڈالا جو ان کی حقیقی استطاعت (manageable limit) سے باہر تھا۔ چنانچہ ان کا نتیجہ ایسے شخص کا سا ہوا جو کسی ندی کے دہانہ کے نصف کے بقدر چھلانگ لگانے کی طاقت رکھتا ہو مگر وہ پورے دہانے کے اوپر چھلانگ لگا دے۔

کوئی صورت حال پیش آنے پر آدمی اگر ایسا کرے کہ وہ حوصلہ مندانہ چھلانگ سے اپنے آپ کو روکے اور برداشت کے اصول کو اختیار کرتے ہوئے صورت موجودہ پر قائم رہے تو وہ خواہ بروقت کوئی بڑا فائدہ حاصل نہ کر سکے مگر وہ مزید نقصان سے یقیناً بچ جائے گا۔

اصل یہ ہے کہ حوصلہ جذبات کا نتیجہ ہوتا ہے اور برداشت سوچ کا نتیجہ۔ جذبات کے تحت کیا ہوا اقدام اکثر آخرکار آدمی کے لیے ایک پرسٹیج اشو (prestige issue) بن جاتا ہے۔ وہ چاہتے ہوئے بھی اپنا قدم واپس لینے کے لیے اپنے آپ کو تیار نہیں کر پاتا۔ یہی وجہ ہے کہ اکثر لوگوں کو حوصلہ جس انجام تک پہنچاتا ہے وہ صرف بے حوصلگی ہے، اس کے سوا اور کچھ نہیں۔

یہ ایک حقیقت ہے کہ زندگی میں اصل اہمیت سوچ کی ہے۔ جب بھی کوئی معاملہ پیش آتا ہے تو فطری طور پر آدمی کے اندر سوچ کا عمل (thinking process) جاری ہوتا ہے۔ حوصلہ مندانہ اقدام اکثر اس سوچ کے عمل کو زیادہ دیر تک جاری نہیں رہنے دیتا۔ اس کے برعکس، برداشت کی صفت آدمی کو یہ موقع دیتی ہے کہ سوچ کا عمل اس کے اندر بلا رکاوٹ مسلسل جاری رہے۔ برداشت کی حیثیت سوچ کے عمل کے لیے ایک معاون کی حیثیت رکھتی ہے۔ برداشت کی بنا پر آدمی کے لیے یہ ممکن ہوتا ہے کہ وہ اپنے معاملہ پر زیادہ دیر تک سوچ سکے اور پھر زیادہ صحیح فیصلہ تک پہنچ جائے۔

26 دسمبر 2002، نئی دہلی — دعا گو: وحید الدین

سوال وجواب

سوال

آپ نے لکھا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس دنیا میں ہم کو امتحان کے لیے رکھا ہے، تاکہ وہ دیکھے کہ کون صبر واستقامت کے اِس امتحان میں کامیاب ہوتا ہے۔ آخرت کی جنت اسی کامیاب ہونے والے انسان کے لیے ہے۔ سوال یہ ہے کہ — خدا نے آخرت کی کامیابی کے لیے امتحان کا یہ طریقہ کیوں رکھا؟ اس کی وضاحت فرمائیں۔ (مکرم حسین، نئی دہلی)

جواب

یہ بات درست ہے کہ موجودہ دنیا میں ہمارے لیے ایک ہی آپشن (option) ہے اور وہ ہے — صبر واستقامت اور یک طرفہ ایڈجسٹ مینٹ کا آپشن۔ یہی آپشن، اللہ کے تخلیقی نقشہ کے مطابق ہے۔ اِس دنیا میں کامیاب زندگی کی تعمیر کے لیے اِس کے سوا کوئی دوسرا طریقہ سرے سے ممکن ہی نہیں۔ دوسرا طریقہ خودکشی کا طریقہ ہے، نہ کہ کامیابی کا طریقہ۔

اب سوال یہ ہے کہ ہمارے خالق نے ہمارے لیے یہ طریقہ کیوں مقرر کیا۔ اس کا سبب یہ ہے کہ اِسی طریقے کے ذریعے آدمی کے اندر ذہنی ارتقا ہوتا ہے۔ خالق نے انسان کو بے شمار صلاحیتوں کے ساتھ پیدا کیا، مگر یہ صلاحیتیں بالقوہ (potential) کے روپ میں ہیں، یعنی امکان کے روپ میں، نہ کہ واقعہ کے روپ میں۔

اللہ کے تخلیقی نقشے کے مطابق، انسان کی شخصیت کے اندر چھپی ہوئی فطری صلاحیتوں کو واقعہ بنانے کا طریقہ صرف ایک ہے اور وہ ہے چیلنج (challenge)۔ چیلنج آدمی کے سوئے ہوئے ذہن کو جگاتا ہے۔ چیلنج آدمی کو اس قابل بناتا ہے کہ وہ زیادہ گہرائی کے ساتھ سوچ سکے۔ چیلنج اس بات کا ذریعہ ہے کہ آدمی منفی تجربات میں مثبت آئٹم کو دریافت کرے۔ آدمی ابتدائی طور پر ایک ناپختہ (immature) مخلوق ہے۔ یہ صرف چیلنج ہے جو

آدمی کو پختہ (mature) بنا تا ہے۔چیلنج آدمی کو یہ موقع دیتا ہے کہ وہ اپنی شخصیت کو انفولڈ (unfold) کرے۔

عام طور پر عورتوں اور مردوں کا حال یہ ہے کہ چیلنج پیش آنے کی صورت میں وہ منفی ردِعمل (negative reaction) کا طریقہ اختیار کر لیتے ہیں۔ اِس طرح کے مواقع پر منفی ردِّ عمل، ڈی ریلمینٹ (derailment) کی حیثیت رکھتا ہے۔

یہی وہ مقام ہے جہاں کسی عورت یا مرد کی زندگی غلط رخ پر چل پڑتی ہے۔دھیرے دھیرے وہ اِسی میں کنڈیشنڈ (conditioned) ہو جاتے ہیں۔ اِس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ اِسی منفی مزاج میں جیتے ہیں اور اِسی منفی مزاج میں مر جاتے ہیں۔ یہ کسی عورت یا مرد کی بدترین ناکامی ہے۔ اِس دنیا میں ہر شخص سے یہ مطلوب ہے کہ وہ اپنے اندر ایک مثبت شخصیت (positive personality) کی تشکیل کرے۔مگر انسان اللہ کے تخلیقی منصوبے کو نہ سمجھنے کی بنا پر یہ کرتا ہے کہ وہ چیلنج کو ایک برائی (evil) سمجھ لیتا ہے۔وہ دنیا سے اُس چیز کو حاصل کیے بغیر چلا جاتا ہے جس کو حاصل کرنے کے لیے خالق نے اُس کو اِس دنیا میں بھیجا تھا۔

سوال

حال ہی میں ہوئے بہار شریف میں فرقہ وارانہ ہندو مسلم فسادات کی خاص وجہ یہ تھی کہ ہندو "درگا" کی مورتی لے کر مسلم محلہ میں آ گئے اور اشتعال انگیز نعرہ لگانے لگے کہ مسلمان ہندوستان کے غدار ہیں۔ مسلمان پاکستانی ایجنٹ ہیں، ان کو ہندستان سے مار بھگاؤ۔ ایسے موقع پر مسلمانوں کو کیا کرنا چاہیے تھا؟ (شاہ فیصل، ویاؤ، نالندہ)

جواب

اس سوال کا جواب پیشگی طور پر خلیفۂ ثانی حضرت عمر فاروق نے دے دیا ہے۔ وہ اُنھیں کے الفاظ میں یہ ہے: اَمِیتُو البَاطِل بِا لصَمتِ عَنهُ (دیکھیے: حلیۃ الاولیاء، جلد 1، صفحہ 55)۔یعنی، باطل کو ہلاک کرو اس سے چپ رہ کر۔

مذکورہ قسم کے مسائل کا بہترین حل یہ ہے کہ اُن کے بارے میں خاموشی اوراعراض کا طریقہ اختیار کیا جائے۔ اعراض سے یہ مسئلہ صرف دو منٹ کے نعرہ پر ختم ہو جاتا ہے اور جب مسلمان اس طرح کے مواقع پر خاموشی کے بجائے جوابی اقدام کا طریقہ اختیار کریں تو غیر ضروری طور پر وہ برا انجام سامنے آجاتا ہے جو بہار شریف اور بھاگل پور جیسے مقامات پر پیش آیا۔

سوال

قرآن میں آیا ہے کہ تم صبر کرو جس طرح اولوالعزم انبیاء نے صبر کیا اوران کے معاملہ میں جلدی نہ کرو (46:35)۔ اس کا مطلب کیا ہے؟ اس کی تفصیل فرمائیں (اسجد نواز صابری، ہلمل، بہار)۔

جواب

عزم کا مطلب پختہ ارادہ (determination) ہے۔ یعنی، اپنے مقصد پر پوری طرح جمے رہنا، کسی بھی چیز کا اثر لے کر اپنے مقصد سے منحرف نہ ہونا۔ اِس آیت میں داعی کا کردار بتایا گیا ہے۔ داعی سے جو کردار مطلوب ہے وہ یہ ہے کہ مدعو کی طرف سے خواہ کتنا ہی زیادہ منفی ردّ عمل کا اظہار ہو مگر داعی اپنے مثبت رویہ پر قائم رہے۔ مدعو اگر اشتعال دلائے تب بھی داعی مشتعل نہ ہو۔ مدعو اگر قابل نفرت سلوک کرے تب بھی داعی اُس کا خیر خواہ بنا رہے۔ مدعو اگر نزاع چھیڑے تب بھی داعی اُس سے اعراض کرتے ہوئے لڑائی کی نوبت نہ آنے دے۔ یہی عزیمت ہے اور دعوت کا کام اِس عزیمت کے بغیر نہیں ہوسکتا۔

سوال

الرسالہ میں اکثر یہ کہا جاتا ہے کہ ظلم وزیادتی کے خلاف مسلمانوں کو صبر کی روش اختیار کرنا چاہیے۔ اس سلسلہ میں کچھ لوگوں کا یہ کہنا ہے کہ ظلم وزیادتی پر صبر کرنا تو ظلم وزیادتی کو بڑھاوا دینا ہے۔ اس شبہ کا کیا جواب ہے؟ (ندیم احمد سنابلی، دہلی)

جواب

اس سلسلہ میں پہلی بات یہ کہ قرآن میں پیغمبروں کی زبان سے ارشاد ہوا ہے کہ:

وَلَنَصۡبِرَنَّ عَلٰى مَآ اٰذَیۡتُمُوۡنَا (14:12)۔ یعنی، تمہاری ایذاؤں پر ہم صبر ہی کریں گے۔

اگر ظلم وزیادتی پر صبر کرنا اس کو بڑھاوا دینے کے ہم معنیٰ ہوتا تو پیغمبروں کو کبھی اللہ کی طرف سے یہ تعلیم نہ دی جاتی جو مذکورہ آیت کے مطابق انہیں دی گئی۔ اصل یہ ہے کہ جب کوئی مسئلہ پیدا ہوتا ہے تو لوگ عام طور پر اس کے خلاف جوابی کارروائی کو تدبیر سمجھتے ہیں مگر یہ صرف ایک جذباتی ردّعمل ہے۔ جس کا نتیجہ ہمیشہ الٹا نکلتا ہے۔

ایسے مواقع پر جوابی کارروائی صرف مسئلہ کو بڑھاتی ہے۔ وہ فریق ثانی کے اندر ضد اور انتقام کی آگ بھڑکا کر مسئلہ کو شدید تر بنا دیتی ہے۔ وہ کسی حال میں مسئلہ کا حل نہیں۔

صبر کا مطلب عدم عمل نہیں، صبر کا مطلب زیادہ مؤثر عمل ہے۔ صبر اور بے صبری میں یہ فرق ہے کہ بے صبر آدمی پیش آمدہ مسئلہ کو جذباتی تدبیر کے ذریعہ حل کرنا چاہتا ہے۔ اس کے مقابلہ میں صبر والا آدمی حکیمانہ تدبیر کے ذریعے مسئلہ کا حل نکالنے کی کوشش کرتا ہے، بے صبری کا طریقہ ہمیشہ ناکام ہوتا ہے اور صبر کا طریقہ ہمیشہ کامیاب۔

اس معاملہ کی ایک معلوم اور معروف مثال یہ ہے کہ ہر سال ہندو لوگوں کی طرف سے گن پتی کا جلوس نکلتا ہے۔ ابتدءً مسلمان یہ کرتے تھے کہ گن پتی کا جلوس جب ان کی مسجد کے سامنے سے گذرتا تو وہ روک ٹوک کرتے۔ وہ جلوس کی روٹ بدلنے کی مانگ کرتے۔ اس کے نتیجہ میں دونوں فرقوں کے درمیان ٹکراؤ ہوتا اور خونی فساد کی نوبت آجاتی۔

اب اللہ کا فضل ہے کہ الرسالہ کی تعمیری مہم کے نتیجہ میں اس معاملہ میں مسلمان صبر واعراض کی حکمت کو سمجھ گئے ہیں۔ چنانچہ اب بھی ہر سال پہلے کی طرح گن پتی کا جلوس نکلتا ہے۔ جلوس والے اب بھی وہی کرتے ہیں جو وہ پہلے کرتے تھے۔ مگر اب کئی سالوں سے گن

پتی کے جلوس کے موقع پر فرقہ وارانہ فساد کا ہونا تقریباً بند ہو گیا ہے۔

اس کا سبب صرف یہ ہے کہ اب مسلمان گن پتی کے جلوس کے موقع پر صبر و اعراض کا فارمولہ اختیار کرتے ہیں، جب کہ اس سے پہلے وہ بے صبری اور جذباتیت کا طریقہ اختیار کیے ہوئے تھے۔

سوال

قرآن کریم کو آپ نے کتاب الصبر فرمایا ہے۔ یہ قول ان کے مقابلے میں نہایت وزنی ہے جو اس کو کتاب الجہاد سمجھتے ہیں اور اسی انداز میں اس کو متعارف کراتے ہیں۔

جہاں تک حقیقتِ واقعہ کا تعلق ہے تو میرے نزدیک کتاب الجہاد کہنا اگر افراط ہے تو کتاب الصبر قرار دینا تفریط۔ قرآن کے لیے اگر ہمیں اس طرح کی کسی وضاحت کی واقعی ضرورت ہے تو میں سمجھتا ہوں کہ اسے کتاب الاعتدال کہنا چاہیے اور اس کے نتیجہ میں جو مذہب وجود میں آتا ہے اسے مذہبِ اعتدال سے متعارف کرایا جا سکتا ہے۔ (محمد عمران مظاہری، مدرسہ حسینیہ، اغوان پور، میرٹھ)

جواب

آپ نے صبر کو بہت محدود معنیٰ میں لیا ہے اس لیے آپ نے ایسا فرمایا۔ حقیقت یہ ہے کہ جہاد خود صبر ہے۔ موجودہ امتحان کی دنیا میں اہل ایمان کو سو میں ننانوے بار صبر کرنا پڑتا ہے اس کے بعد جہاد کا موقع آتا ہے۔

موجودہ امتحان کی دنیا میں ایمان کے تقاضوں پر زندگی گذارنے کے لیے صبر لازمی شرط ہے۔ مثلاً اللہ کا شکر ادا کرنے کے لیے بھی صبر درکار ہے۔ کیوں کہ اگر آپ کھوئے ہوئے پر صبر نہ کریں تو ملے ہوئے پر حقیقی جذبۂ شکر کا اظہار آپ کی زبان سے نہیں ہو سکتا۔ دعوت

کے لیے صبر لازمی شرط ہے۔ کیوں کہ مدعو کی زیادتیوں پر یک طرفہ صبر کیے بغیر آپ سچے داعی نہیں بن سکتے۔

نماز بھی آپ خشوع کے ساتھ صرف اُس وقت پڑھ سکتے ہیں جب کہ آپ دنیوی تقاضوں پر صبر کر کے اللہ کی طرف متوجہ ہو گئے ہوں۔ انفاق بھی آپ اسی وقت کر سکتے ہیں جب کہ آپ مال کی محبت کے جذبات پر صبر کرنے کے لیے تیار ہوں۔

اسی طرح حج مبرور بھی اسی وقت کیا جا سکتا ہے جب کہ سفر حج کے دوران پیش آنے والے مکارہ پر صبر کیا جائے۔ اسی طرح اسلامی اخلاق کے اصولوں پر عمل اسی وقت ممکن ہے جب کہ لوگوں کی طرف سے پیش آنے والی شکایتوں پر صبر کیا جائے۔

یہی معاملہ خود جہاد کا ہے۔ جہاد کا آغاز دوسروں کے خلاف قتال سے نہیں ہوتا بلکہ خود اپنے نفس پر کنٹرول کرنے سے ہوتا ہے۔ مومن دوسروں کی قابل شکایت باتوں پر صبر کرتے ہوئے اس کے ساتھ خیر خواہی کا معاملہ کرتا ہے۔ مومن دوسروں کی زیادتیوں پر صبر کرتے ہوئے اس کو دعوت کا مخاطب بناتا ہے۔

مومن دوسروں کے جارحانہ عزائم کو یک طرفہ اعراض کے ذریعے بے اثر بناتا رہتا ہے اور اگر بالفرض جنگ کی نوبت آجائے تب بھی مومن یہ کرتا ہے کہ وہ صرف حملہ آور پر ہاتھ اٹھاتا ہے۔ بوڑھوں، بچوں اور عورتوں کو پھر بھی مومن اپنی زد سے محفوظ رکھتا ہے۔

مومن اپنے منفی جذبات کو یک طرفہ طور پر دبا کر غیر حملہ آوروں کو نقصان پہنچانے سے بچتا ہے۔ صبر کی ان تمام کارروائیوں کے باوجود جو جہاد کیا جائے وہی دراصل اسلامی جہاد ہے۔ جہاد خود ایک صابرانہ عمل ہے، نہ کہ غیر صابرانہ عمل۔

جہاد بمعنیٰ قتال ایک استثنائی حکم ہے اور صبر ایک عمومی حکم۔ اور یہ ایک حقیقت ہے کہ قرآن کا عنوان بحیثیت عموم کے اعتبار سے متعین کیا جائے گا، نہ کہ استثناء کے اعتبار سے۔

سوال

بمبئی کے ایک روزنامہ میں آپ کے خلاف ایک مضمون چھپا ہے۔ اس مضمون کا عنوان یہ ہے ”مولانا وحیدالدین صاحب! صلح حدیبیہ سے پہلے بیعت رضوان بھی ہے“۔ مضمون میں بتایا گیا ہے کہ مولانا وحیدالدین صاحب مسلمانوں کو صلح حدیبیہ کی نصیحت کرتے ہیں۔ وہ بھول جاتے ہیں کہ صلح حدیبیہ سے پہلے بیعت رضوان ہوئی تھی جس میں صحابہ نے جہاد پر بیعت کی تھی۔ اس کے بارے میں آپ کیا فرماتے ہیں؟ یہ سوال یہاں کئی لوگوں کے ذہن میں آرہا ہے۔ (فاروق فیصل، بمبئی)

جواب

بیعت رضوان اگر بالفرض بیعت جہاد ہو تب بھی میری بات ثابت شدہ ہے۔ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ”بیعت جہاد“ کے باوجود صُلح حدیبیہ کو قبول فرمایا تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ اس سے پہلے کی بیعت، اگر بالفرض وہ جہاد کی بیعت ہو، تب بھی وہ سنتِ رسول کے مطابق منسوخ قرار پائے گی۔ کیوں کہ اس موقع پر آپ کا جو آخری عمل تھا وہ جہاد کا نہ تھا، بلکہ صلح کا تھا۔ مگر اصل حقیقت یہ ہے کہ بیعتِ رضوان کے نام پر حدیبیہ کے مقام پر جو بیعت ہوئی وہ جہاد یا قتال کی بیعت نہ تھی بلکہ وہ صرف عدمِ فرار کی بیعت تھی۔ چنانچہ بیعت میں شامل ہونے والے صحابی کہتے ہیں کہ — لَمْ نُبَايِعْ رَسُولَ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَلَى الْمَوْتِ، إِنَّمَا بَايَعْنَاهُ عَلَى أَنْ لَا نَفِرَّ (صحیح مسلم، حدیث نمبر 1856)۔ یعنی، ہم نے رسول اللہ سے موت کی بیعت نہیں کی تھی، ہم نے آپ سے صرف اس پر بیعت کی کہ ہم فرار اختیار نہیں کریں گے۔

دوسرے الفاظ میں یہ ہے کہ اگر فریقِ ثانی کی طرف سے عملی جارحیت کی صورت پیش آجائے تو ہم مقابلہ کا طریقہ اختیار کریں گے، نہ کہ فرار کا طریقہ۔ اس معاملہ میں اگر سنجیدگی

کے ساتھ غور کیا جائے تو اس کے سوا کوئی اور مطلب اس کا نہیں نکلتا۔ یعنی اگر فرار اور عدم فرار کے درمیان انتخاب (option) کا معاملہ ہو تو فرار کو چھوڑ کر عدم فرار کے طریقہ کو اختیار کیا جائے گا۔ اسی طرح اگر جنگ اور صلح کے درمیان انتخاب ہو تو صلح کا طریقہ اختیار کیا جائے گا، نہ کہ جنگ کا طریقہ۔

سوال

آپ نے اپنی تحریروں میں لکھا ہے کہ حدیث کی کتابوں میں ابواب الفتن کے تحت بیان کردہ روایات میں پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے پیشگی طور پر فرما دیا تھا کہ تم اپنے حکمرانوں کے خلاف خروج (بغاوت) نہ کرنا۔ تم ہر حال میں صبر کے اصول پر قائم رہنا۔ تم کسی بھی عذر کو لے کر حکمرانوں سے لڑائی نہ کرنا، بلکہ اپنی بکری اور اونٹ میں مشغول ہو کر اپنے ضروری دینی فرائض کو ادا کرتے رہنا (فکر اسلامی، صفحہ: 153)۔

لیکن بہت سی روایات میں آپ کے اس نقطۂ نظر کے برعکس ہدایات ملتی ہیں۔ مثال کے طور پر صحیح ابن حبان میں ہمیں یہ حدیث پڑھنے کو ملتی ہے:

1-عَنْ عَبْدِ اللّٰہِ بْنِ خَبَّابٍ عَنْ أَبِیہِ قَالَ: کُنَّا قُعُودًا عَلَی بَابِ النَّبِیِّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ فَخَرَجَ عَلَیْنَا فَقَالَ: اسْمَعُوا قُلْنَا: قَدْ سَمِعْنَا قَالَ: اسْمَعُوا قُلْنَا: قَدْ سَمِعْنَا قَالَ: اسْمَعُوا قُلْنَا: قَدْ سَمِعْنَا قَالَ: إِنَّہُ سَیَکُونُ بَعْدِي أُمَرَاءُ فلا تصدقوھم بکذبھم ولا تعینوھم علی ذکر الزَّجْرِ عَنْ تَصْدِیقِ الْأُمَرَاءِ بِکَذِبِہِمْ وَمَعُونَتِہِمْ عَلَی ظُلْمِہِمْ إِذْ فَاعِلُ ذَلِكَ لَا یَرِدُ الْحَوْضَ (صحیح ابن حبان، حدیث نمبر 284)۔ یعنی، حضرت عبداللہ بن خباب اپنے والد حضرت خباب سے روایت کرتے ہیں کہ انھوں نے کہا کہ ہم نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے دروازے پر بیٹھے ہوئے تھے کہ آپ ہمارے پاس آئے۔ آپ نے فرمایا سنو۔ ہم نے عرض کیا یقیناً ہم نے سُنا۔ آپ نے فرمایا سنو، ہم نے کہا یقیناً ہم نے سُنا۔ آپ نے فرمایا، سنو،

ہم نے کہا یقیناً ہم نے سنا۔آپ نے فرمایا، بے شک میرے بعد حکمراں ہوں گے، تم اُن کے جھوٹ کی تصدیق نہ کرنا اور نہ ہی ان کے ظلم کی اعانت کرنا، کیوں کہ جس نے ان کے جھوٹ کو سچ قرار دیا اور ان کے ظلم پر ان کی اعانت کی، وہ میرے پاس حوض کوثر پر نہیں آئے گا۔

اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ جب بھی کوئی جھوٹی باتوں کا فریب دینے والا اور ظلم کرنے والا حکمراں تمہارے اوپر مسلط ہو جائے تو اس کی کسی طرح کی بھی حمایت و اعانت نہ کرو۔

2- قرآن میں آیا ہے کہ ایک مظلوم شخص کو اس بات کی اجازت ہے کہ وہ ظالم کے خلاف آوازِ حق بلند کرے اور اس دوران اگر مظلوم کی زبان سے کچھ ناشائستہ الفاظ نکل جائیں تو اللہ تعالیٰ اس کی پکڑ نہیں کرتا، کیوں کہ وہ مظلوم کی مظلومیت کو جانتا ہے اور اس کی آہ وفغاں کو سنتا ہے، اس لیے وہ درگزر سے کام لیتا ہے اور وہ ظالم کے خلاف اس کی فریاد کو قبول کرتا ہے۔

ارشاد خداوندی ہے: لَا يُحِبُّ اللّٰهُ الْجَهْرَ بِالسُّوْٓءِ مِنَ الْقَوْلِ اِلَّا مَنْ ظُلِمَ ۭ وَكَانَ اللّٰهُ سَمِيْعًا عَلِيْمًا (4:148)۔ یعنی، اللہ بدگوئی کو پسند نہیں کرتا مگر یہ کہ کسی پر ظلم ہوا ہو، اور اللہ سننے والا، جاننے والا ہے۔

اسی طرح ایک اور حدیث میں ظالم بادشاہ کا ظلم روکنے کے لیے اس کے سامنے انصاف کی بات کہنا افضل جہاد بتایا گیا ہے: عَنْ أَبِي سَعِيدٍ الْخُدْرِيِّ، قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: أَفْضَلُ الْجِهَادِ كَلِمَةُ عَدْلٍ عِنْدَ سُلْطَانٍ جَائِرٍ (سنن ابی داؤد، حدیث نمبر 4344؛ سنن ابن ماجہ 4011؛ مسند احمد، حدیث نمبر 11144)۔ یعنی، حضرت ابوسعید خدری بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی علیہ وسلم نے فرمایا، سب سے افضل جہاد ظالم بادشاہ کے سامنے انصاف کی بات کہنا ہے۔

کچھ لوگ اس حدیث کو دعوت الی اللہ کے معنی میں لیتے ہیں مگر حدیث کے سیاق اور

الفاظ سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ صحیح نہیں ہے۔ کیوں کہ اگر ایسا ہوتا تو پھر متنِ حدیث میں کلمۂ عدل (انصاف کی بات) کے بجائے کلمۂ حق (حق کی بات) کا فقرہ ہوتا۔

نیز حدیث کا آخری فقرہ سلطان جائر (ظالم بادشاہ) بھی آیا ہے جو اس بات کو ثابت کرنے کے لیے کافی ہے کہ یہاں ''کلمۂ عدل'' سے مراد دعوت الی اللہ نہیں ہے، بلکہ ایک ظالم حکمراں کو ظلم سے روکنا مراد ہے اور اس کے سامنے عدل اور انصاف کی بات کہنا ہے تا کہ وہ بھی اپنی رعایا سے عدل اور انصاف کا معاملہ کرے۔

اس طرح ان واضح دلائل سے ثابت ہوتا ہے کہ — ظلم اور بربریت کے خلاف عَلمِ بغاوت اٹھانا اور حق اور انصاف کی خاطر اٹھ کھڑا ہونا کوئی غیر شرعی مسئلہ نہیں ہے، بلکہ ایسا کرنا عین شریعتِ اسلامی کے مطابق ہوتا ہے۔

لیکن اگر اس ظلم پر خاموشی اختیار کی جائے تو وہ ظلم کی حمایت اور اعانت تصور کی جائے گی۔ نیز ایک اور حدیث میں آیا ہے کہ جو شخص ظالم حکمراں کو تقویت دینے کے لیے اس کے ساتھ چلے، یہ جانتے ہوئے بھی کہ وہ ظالم ہے تو وہ اسلام سے باہر سمجھا جائے گا۔

أَنَّ أَوْسَ بْنَ شُرَحْبِيلَ سَمِعَ رَسُولَ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَ سَلَّمَ يَقُولُ: مَنْ مَشَى مَعَ ظَالِمٍ وَ هُوَ يَعْلَمُ أَنَّهُ ظَالِمٌ فَقَدْ خَرَجَ مِنَ الْإِسْلَامِ (شعب الایمان، حدیث نمبر 7676)۔

یعنی، حضرت اوس بن شرجیل سے روایت ہے کہ انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے ہوئے سنا، جو شخص کسی ظالم کو تقویت پہنچانے کے لیے اس کے ساتھ چلے اور وہ یہ جانتا ہو کہ وہ ایک ظالم ہے تو وہ شخص اسلام سے خارج ہو جاتا ہے۔

ان ساری تفصیل کے بعد سوال یہ ہے کہ آپ کی کتاب '' فکر اسلامی'' کے حوالے سے اوپر دیے گئے اقتباس اور مندرجہ بالا دوسری احادیث کے درمیان جو نمایاں اختلاف نظر آتا ہے، اُن کے درمیان کس طرح تطبیق دی جائے گی؟ (غلام نبی کشافی، سری نگر، کشمیر)۔

جواب

اگر کوئی حکمراں آپ کو ظالم نظر آئے تو شرعی اعتبار سے، اس کے خلاف عمل کی دو صورتیں ہیں— خروج اور نصیحت۔

خروج کا مطلب ہے مسلّح بغاوت، اور نصیحت کا مطلب ہے پُرامن خیر خواہی۔ میرے مطالعے کے مطابق، ظالم کے خلاف مسلّح بغاوت حرام ہے۔ مگر جہاں تک خیر خواہانہ نصیحت کا معاملہ ہے، وہ عین جائز ہے، بشرطیکہ وہ مثبت نتیجہ پیدا کرنے والی ہو۔ ظالم حکمراں کے خلاف مسلح خروج اس لیے حرام ہے کہ وہ ہمیشہ کاؤنٹر پروڈکٹیو (counter productive) ثابت ہوتا ہے، اور جو چیز اُلٹا نتیجہ پیدا کرے، وہ نہ عقل کے مطابق درست ہوسکتی ہے اور نہ دین کے مطابق۔

میں ذاتی طور پر مسلح بغاوت کے خلاف ہوں، مگر جہاں تک خیر خواہانہ نصیحت کی بات ہے، میں ہمیشہ اس پر عامل رہا ہوں۔ مثال کے طور پر ملاحظہ ہو راقم الحروف کی کتاب، ہند— پاک ڈائری۔ اس معاملے میں آپ نے جو حدیثیں نقل فرمائی ہیں، اُن سے آپ کا دعویٰ ثابت نہیں ہوتا۔ ان حدیثوں میں وہی بات کہی گئی ہے جس کا میں خود ہمیشہ قائل رہا ہوں۔ قرآن اور حدیث سے آپ نے جو حوالے دیے ہیں، ان کی وضاحت نمبر وار ذیل میں درج کی جاتی ہے۔

1- ابن حبان کی جو روایت آپ نے نقل کی ہے، اس سے صرف یہ ثابت ہوتا ہے کہ کوئی حکمراں مبینہ طور پر ظالم ہو تو اہل ایمان کو یہ نہیں کرنا چاہیے کہ وہ اس کے جھوٹ کو سچ بتانے لگیں، بلکہ اُنھیں اس کے جھوٹ کو جھوٹ بتانا چاہیے۔

یہ واضح طور پر ایک پُرامن اظہارِ خیال کا معاملہ ہے، نہ کہ متشددانہ ٹکراؤ کا معاملہ۔ اور اس قسم کے پُرامن اور خیر خواہانہ اظہارِ خیال سے کسی کو اختلاف نہیں ہوسکتا۔ ”ظلم پر

اعانت" کا مطلب صرف یہ ہے کہ اہل ایمان کسی مبینہ ظالم کا آلۂ کار نہ بنیں، بلکہ وہ اس سے الگ رہیں اور اس کے لیے اصلاح کی دعا کرتے رہیں۔

2- سورہ النساء کی جو آیت آپ نے نقل کی ہے، اس میں واضح طور پر "قول" کی بات کہی گئی ہے، نہ کہ کسی قسم کے عملی تصادم کی بات۔ اس آیت سے جو کچھ معلوم ہوتا ہے، وہ یہ کہ ایک شخص اگر مظلوم ہے تو اس کو یہ حق ہے کہ وہ پُرامن قول کے دائرے میں رہتے ہوئے ظالم کے خلاف بولے۔ یہ عین وہی بات ہے جس کو میں بار بار لکھتا رہا ہوں۔

3- تیسرے نمبر پر آپ نے جو حدیث نقل کی ہے، وہ کسی مبینہ ظالم کے خلاف "کلمہ" یا قول کی اجازت دیتی ہے، نہ کہ عملی تصادم کی اجازت۔ ایک شخص اگر مبینہ طور پر ظالم ہو تو اہل ایمان کو بلاشبہ یہ حق ہے کہ وہ اس کے خلاف امن اور انصاف اور خیر خواہی کی شرائط کے ساتھ اپنے جذبات کا اظہار کریں۔ اس حدیث میں بھی واضح طور پر "کلمہ" کی اجازت ہے، نہ کہ ٹکراؤ اور جنگ کی اجازت۔

4- چوتھے نمبر پر آپ نے جو حدیث نقل کی ہے، وہ بھی واضح طور پر "مَشیِ" کے بارے میں ہے، نہ کہ جنگ کے بارے میں۔ یعنی اگر کوئی شخص مبینہ طور پر ظالم ہو تو ظلم پر اس کا ساتھ دینا اہل ایمان کے لیے جائز نہیں۔ ایسے مواقع پر اہل ایمان کو صرف یہ کرنا ہے کہ وہ ظالم کے حق میں دعا کریں، وہ اس کو خیر خواہانہ انداز میں نصیحت کریں، وہ مکمل طور پر امن کے دائرے میں رہتے ہوئے اس کی اصلاح کی کوشش کریں۔

آپ نے لکھا ہے کہ "اگر ظلم پر خاموشی اختیار کی جائے تو وہ ظلم کی حمایت اور اعانت تصور کی جائے گی"۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ خاموشی کا معاملہ نہیں ہے بلکہ حدیث کے مطابق، وہ استطاعت کا معاملہ ہے یعنی اس طرح کے معاملے میں دخل دینے کا اصول یہ ہے کہ:

نتیجہ (result) کو سامنے رکھا جائے۔ اگر دخل دینے سے نتیجہ برعکس نکلتا ہو تو صرف دعا

کی جائے گی ۔ دعا کے سوا کوئی اور عملی اقدام نہیں کیا جائے گا۔ اس معاملے کو آپ مشہور حدیثِ رسول کے مطالعے سے بخوبی طور پر سمجھ سکتے ہیں:

مَنْ رَأَى مِنْكُمْ مُنْكَرًا فَلْيُغَيِّرْهُ بِيَدِهِ، فَإِنْ لَمْ يَسْتَطِعْ فَبِلِسَانِهِ، فَإِنْ لَمْ يَسْتَطِعْ فَبِقَلْبِهِ، وَ ذَلِكَ أَضْعَفُ الْإِيمَانِ (صحیح مسلم، حدیث نمبر 49)۔ یعنی، تم میں سے جو شخص کسی منکر کو دیکھے، تو وہ اس کو اپنے ہاتھ سے روکے، اور اگر وہ اِس کی استطاعت نہ رکھتا ہو تو پھر اپنی زبان سے، اور اگر وہ اس کی استطاعت نہ رکھتا ہو تو پھر اپنے دل سے، اور یہ سب سے زیادہ کم زور ایمان ہے۔

سوال

راقم آج کل "تذکیر القرآن" کے ساتھ الرسالہ کا مطالعہ کر رہا ہے۔ الرسالہ کو پڑھ کر مختصراً یہ محسوس ہوا کہ آپ ایک انسان کو اس کی انفرادی اور اجتماعی زندگی کے معاملات میں ہر صورت میں خود ذمّہ دار ٹھہراتے ہیں اور ہر مسئلے کو افہام و تفہیم سے حل کرنے کا درس دیتے ہیں۔ لیکن یہ تب ہی ممکن ہوسکتا ہے جب کہ فریقین باہمی رضامندی سے مسئلہ فساد کو مٹانے کی نیت رکھتے ہوں اور زور آور کم زور کی مجبوری کا ناجائز فائدہ نہ اٹھائے (سید غلام احمد بخاری، بیروہ، کشمیر)۔

جواب

میں نے جو کچھ لکھا ہے، وہ میں نے اپنے ذاتی خیال کے طور پر نہیں لکھا ہے، بلکہ خدا کے مقرر کردہ قانونِ فطرت کے حوالے سے لکھا ہے۔ ہم جس دنیا میں ہیں، اُس دنیا کو خدا نے بنایا ہے۔ یہ خود خدا ہے جس نے اِس دنیا کے لیے قوانین مقرر کیے ہیں۔ ہمارے لیے کامیابی کا واحد راستہ یہ ہے کہ ہم خدا کے قانون کو دریافت کریں اور اُس کے مطابق، اپنی زندگی کی تعمیر کریں۔

قرآن کا مطالعہ کیجیے تو قرآن سے واضح طور پر معلوم ہوتا ہے کہ کوئی اجتماعی معاملہ پیش

آئے تو آدمی کو سب سے پہلے خود اپنی غلطی کو دریافت کرنا چاہیے۔ اپنی غلطی کو دریافت کر کے اُس کی اصلاح کرنا، یہی مسئلے کا واحد حل ہے۔ قرآن میں واضح طور پر بتایا گیا ہے کہ تمہارے اوپر جو مصیبت بھی آتی ہے، وہ صرف تمہارے کیے کا نتیجہ ہوتی ہے (42:30)۔ دوسری جگہ قرآن میں ارشاد ہوا ہے کہ اگر تم صبر کرو اور تقویٰ کی روش اختیار کرو تو دوسروں کی سازش تم کو کچھ بھی نقصان نہ پہنچائے گی (3:120)۔

اِس قسم کی آیتوں اور حدیثوں پر غور کیجیے تو معلوم ہوگا کہ شکایت اور احتجاج کا ذہن سراسر ایک غیر فطری ذہن ہے۔ شکایت اور احتجاج پر مبنی تحریکوں سے کسی کو کچھ ملنے والا نہیں۔ کیوں کہ ایسی تحریکیں، خدا کے نقشے کے خلاف ہیں۔

ہمارے لیے واحد راستہ یہ ہے کہ ہم اپنی روش پر نظر ثانی کریں۔ داخلی محنت اور پُرامن تدبیر کے ذریعے اپنے مسائل کو حل کرنے کی کوشش کریں۔ اِس کے سوا جو طریقہ ہے، وہ صرف ایک خود ساختہ طریقہ ہے اور ایسے خود ساختہ طریقوں سے خدا کی مدد ملنے والی نہیں۔

سوال

عام تاثر یہ ہے کہ پوری دنیا کی غیر مسلم قومیں مسلمانوں کے درپے ہیں، اور مسلم دنیا سازشوں کے نرغے میں ہے۔ کیا یہ صحیح ہے، اور اگر یہ صحیح ہے تو اس کا حل کیا ہے؟ (ایک قاری الرسالہ، سری نگر)

جواب

اس قسم کی سوچ بلا شبہ غلط ہے۔ کیوں کہ وہ فطرت کے قانون کے خلاف ہے۔ موجودہ دنیا کو امتحان کی بنیاد پر بنایا گیا ہے۔ اس لیے انسان کو خود خالق نے مکمل آزادی عطا کی ہے۔ اور جب آدمی اپنی آزادی کو استعمال کرے گا تو وہ صرف اپنے انٹرسٹ کو دیکھے گا، وہ دوسرے کے انٹرسٹ کو دیکھ کر اپنا منصوبہ نہیں بنائے گا۔ یہی وجہ ہے کہ ایک کی آزادی

دوسرے کے لیے مسئلہ بن جاتی ہے۔ ایسی حالت میں دوسرے انسان کے لیے صرف یہ چوائس ہے کہ وہ اس قسم کے مسئلے کو چیلنج سمجھے۔ اور دوسرے سے لڑائی یا نفرت کیے بغیر اپنے لیے ترقی کا راستہ نکالے۔ یہ بات قرآن میں ان الفاظ میں کہی گئی ہے:

وَإِنْ تَصْبِرُوْا وَتَتَّقُوْا لَا يَضُرُّكُمْ كَيْدُهُمْ شَيْئًا (3:120) یعنی اگر تم صبر کرو اور تقویٰ اختیار کرو تو ان کی کوئی سازش تم کو نقصان نہ پہنچائے گی۔

اِس آیت میں جو رہنمائی دی گئی ہے، وہ یہ ہے کہ اگر تم کو دوسروں کی طرف سے کوئی مسئلہ پیدا ہو تو اُس کو سازش بتا کر احتجاج (protest) نہ کرو۔ بلکہ صورتِ حال کا بے لاگ جائزہ لے کر مثبت بنیادوں پر اپنی زندگی کی تعمیر کرو۔ زندگی کے مواقع جس طرح ایک شخص کے لیے کھلے ہوئے ہیں، اسی طرح وہ دوسرے شخص کے لیے بھی کھلے ہوئے ہیں۔ اس لیے کرنے کا اصل کام مواقع کو استعمال کرنا ہے، نہ کہ دوسرے کے خلاف چیخ و پکار کرنا۔

کسی کو دشمن بتا کر اس کے خلاف چیخ و پکار کرنا، باعتبار نتیجہ صرف اپنی تباہی میں اضافہ کرنا ہے۔ کیوں کہ یہ ملے ہوئے وقت کو ضائع کرنے کے ہم معنی ہے۔ اس دنیا میں کامیابی کا راز صرف ایک ہے، اور وہ ہے — حالات کے مطابق درست منصوبہ بندی۔

سوال

اپنے علم میں اضافہ کی غرض سے میں نے اپنے 21 جون 2004ء کے خط میں آپ کی مدد چاہی تھی۔ مگر آپ کا جواب مورخہ 3 جولائی اپنی نوعیت میں میرے استفسار کا جواب نہیں ہے بلکہ محض میرے سوال کی تردید ہے۔ عالمانہ جواب باقی ہے۔

"ذوالکفل" قرآن ہی کے تو الفاظ ہیں۔ النبی الخاتم کا حوالہ اس لیے نہیں تھا کہ آپ میرے ہم خیال ہو جائیں بلکہ اس لیے تھا کہ براہِ راست اسے دیکھ لیں اور اس کی روشنی میں دوسرے علماء و مفسرین جن تک میری رسائی نہیں ہے، اور آپ کی یقیناً ہو سکتی ہے، ان کی تحقیق یا آراء کی روشنی میں مفصل رہنمائی فرمائیں (محمد رضوان احمد، شیخ پورہ، بہار)۔

جواب

ذوالکفل کا ذکر قرآن میں دو سورتوں میں آیا ہے: سورہ ص (آیت 48) اور سورہ الانبیاء (آیت 85)۔ مگر قرآن یا حدیث میں ذوالکفل کے بارے میں مزید تفصیل مذکور نہیں۔ بعض مفسرین مثلاً مفسر آلوسی (صاحب روح المعانی) نے لکھا ہے کہ ذوالکفل سے مراد وہ بزرگ ہیں جن کا ذکر بائبل میں 'حزقی ایل' پیغمبر کی حیثیت سے آیا ہے۔

مگر یہ محض قیاس ہے۔ اس کی کوئی بنیاد نہ تاریخ میں موجود ہے اور نہ قرآن وحدیث میں۔ خود بائبل میں 'حزقی ایل' کا ذکر تو ہے مگر بائبل میں یہ نہیں بتایا گیا ہے کہ 'حزقی ایل' کا لقب ذوالکفل تھا۔ ذوالکفل کے لفظی معنیٰ صاحب نصیب کے ہوتے ہیں۔

میرے نزدیک اس قسم کے مسائل میں زیادہ غور وخوض کرنا درست نہیں۔ غور وخوض مفید طور پر صرف اُن مسائل میں کیا جاسکتا ہے جن میں رائے قائم کرنے کے لیے کوئی متفق علیہ بنیاد موجود ہو۔ یہ بنیاد صرف دو ہوسکتی ہے، تاریخ یا وحی۔ مگر ذوالکفل کے بارے میں رائے قائم کرنے کے لیے دونوں میں سے کوئی بھی بنیاد دستیاب نہیں۔

ایسی حالت میں اس سوال کو اُس خانہ میں ڈالنا چاہیے جس کی بابت حدیث میں آیا ہے کہ خدا نے کچھ باتوں کو علم کے باوجود ظاہر نہیں کیا ہے۔ اس لیے انسان کو چاہیے کہ وہ ان معاملات میں بحث نہ کرے: وَسَكَتَ عَنْ أَشْيَاءَ مِنْ غَيْرِ نِسْيَانٍ فَلَا تَبْحَثُوا عَنْهَا (سنن الدار قطنی، حدیث نمبر 4396)۔

ذوالکفل کے بارے میں زیادہ اہم بات یہ ہے کہ اُن کا ذکر قرآن میں کس پہلو سے آیا ہے۔ وہ پہلو یہ ہے کہ ذوالکفل اور دوسرے انبیاء کا ذکر کرکے قرآن میں ارشاد ہوا ہے کہ یہ سب کے سب صبر کرنے والے لوگ تھے (21:85)۔ ایسی حالت میں ہمیں اس سے یہ نصیحت لینا چاہیے کہ ذوالکفل اور دوسرے پیغمبروں کا کردار صابرانہ کردار تھا۔ ہمیں بھی اِسی پیغمبرانہ اُسوہ کو لیتے ہوئے ہر معاملہ میں صبر کی روش اختیار کرنا چاہیے۔

سوال

عام طور پر کہا جاتا ہے کہ میں تشدد کا حامی نہیں، لیکن دشمنوں کی سازش سے واقف ہونا تو بہت ضروری ہے۔ براہِ کرم اِس معاملے میں وضاحت فرمائیں۔ (ڈاکٹر محمد اسلم خان، سہارن پور)

جواب

قرآن میں بتایا گیا ہے:

وَإِن تَصْبِرُوا وَتَتَّقُوا لَا يَضُرُّكُمْ كَيْدُهُمْ شَيْئًا (3:120)۔ یعنی، اگر تم صبر کرو اور تقویٰ اختیار کرو تو ان کی سازش تم کو کچھ بھی نقصان نہ پہنچا سکے گی۔

دوسرے الفاظ میں، سازش سے واقف ہونا سازش کا توڑ نہیں ہے، بلکہ صبر اور تقویٰ کی روش اس کا توڑ ہے۔ قرآن کی اس آیت پر غور کیجیے تو معلوم ہوگا کہ اس معاملے میں کرنے کا اصل کام یہ ہے کہ مسلمانوں کی بے صبری اور ان کے غیر متقیانہ مزاج سے واقفیت حاصل کی جائے، اور پھر اس کی اصلاح کی کوشش کی جائے۔

کیوں کہ مسلمانوں کے اندر صبر اور تقویٰ کی روش پیدا کرکے ہی سازش کو بے اثر بنایا جا سکتا ہے۔ قانونِ فطرت کے تحت "سازش" کا خاتمہ ممکن نہیں، البتہ یہ ممکن ہے کہ مسلمان اپنے مثبت ردعمل کے ذریعے اپنے آپ کو اس کے نقصان سے بچا سکیں۔

جس چیز کو "سازش" کہا جاتا ہے، وہ دراصل ایک امرِ فطری ہے۔ اس کا تعلق خدا کی دی ہوئی آزادی سے ہے۔ یہ آزادی مصلحتِ امتحان کی بنا پر دی گئی ہے، اس لیے وہ قیامت تک باقی رہے گی، اس کو ہرگز ساقط نہیں کیا جا سکتا۔ کرنے کا کام یہ نہیں ہے کہ لاحاصل طور پر خود سازش کا خاتمہ کرنے کی کوشش کی جائے۔ کرنے کا اصل کام یہ ہے کہ مسلمانوں کو اتنا باشعور بنایا جائے کہ وہ اشتعال کے باوجود مشتعل نہ ہوں۔ مشتعل نہ ہو کر سازش کو بے اثر بنایا جا سکتا ہے۔ اس معاملے میں اصل حقیقت تدبیر کار کی ہے، نہ کہ

سازش سے باخبر ہونے کی۔ اِسی لیے قرآن میں یہ نہیں فرمایا کہ اے مسلمانوں، تم سازش سے باخبر رہو، بلکہ یہ فرمایا کہ تم ہر حال میں صبر کی روش اختیار کرو۔ صبر کی روش اختیار کر کے تم سازش کا شکار ہونے سے بچ جاؤ گے۔

سوال

میں ایم اے انگریزی (M.A. English from IGNOU) کی طالبہ ہوں اور جنوری 2002ء سے میں الرسالہ پڑھتی رہی ہوں۔ پہلی بار جب الرسالہ میرے ہاتھوں میں آیا تو میری خوشی کی انتہا نہ رہی اور پڑھنے کے بعد حقیقت میں دل بہت خوش ہوا اور سب سے بڑی بات یہ کہ میں الرسالہ سے فوراً متاثر ہوگئی۔ اس سے میری معلومات میں اضافہ ہوا۔ ایسا لگا جیسے الرسالہ صرف دل کو ہی نہیں بلکہ روح کو بھی تسکین دیتا ہے۔ تب سے میں نہایت ہی پابندی کے ساتھ الرسالہ کا مطالعہ ہر ماہ کر رہی ہوں۔ بے شک اس کے مطالعے سے میں نے بہت کچھ سیکھا ہے۔ بہت کچھ حاصل کیا ہے اور میں اس کا پورا کریڈیٹ آپ کے نام کروں گی۔

بلا شبہ آپ کی عظیم شخصیت کی بدولت ہی یہ سب کچھ ممکن ہوسکا۔ بے شک مجھے اس کے ذریعے اسلام کی حقیقت سے روشناس ہونے کا موقع ملا۔ مگر کچھ باتوں سے میں متفق نہیں ہوں۔ وہ یہ کہ ہر معاملے میں مسلمانوں کو قصوروار ٹھہرانا۔ تالی دونوں ہاتھ سے بجتی ہے۔ پھر یہ کہنا کہاں تک درست ہے کہ یہ مسلمانوں کی غلطی کا ثمرہ ونتیجہ ہے (رخشاں ہاشمی، مونگیر)۔

جواب

"مسلمانوں کو قصور وار ٹھہرانا" ایک غیر متعلق بات ہے۔ اس طرح کے معاملات میں اصل سوال یہ جاننے کا ہے کہ فطرت کا قانون کیا ہے۔ ہماری رائے فطرت کے قانون کے مطابق ہونی چاہیے، نہ کہ اپنے جذبات یا خواہشات کے مطابق۔ قرآن میں فطرت کا یہ قانون اِن الفاظ میں بیان کیا گیا ہے: وَمَآ اَصَابَكُمْ مِّنْ مُّصِيْبَةٍ فَبِمَا كَسَبَتْ اَيْدِيْكُمْ (42:30) ۔یعنی، اور جو مصیبت تم کو پہنچتی ہے تو وہ تمہارے ہاتھوں کے کیے ہوئے کاموں ہی سے

پہنچتی ہے۔ قرآن کی یہ آیت حتمی الفاظ میں بتا رہی ہے کہ لوگوں کے اوپر جو مصیبت آتی ہے وہ ان کے اپنے ہی کیے کا نتیجہ ہوتی ہے۔ ایک اور آیت میں فرمایا: وَإِنْ تَصْبِرُوا وَتَتَّقُوا لَا يَضُرُّكُمْ كَيْدُهُمْ شَيْئًا (3:120)۔ یعنی، اگر تم صبر کرو اور اللہ سے ڈرو تو ان کی کوئی تدبیر تم کو نقصان نہ پہنچا سکے گی۔

اِس دوسری آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ اِس دنیا میں اصل مسئلہ "اغیار کی سازش" کی موجودگی نہیں ہے، بلکہ خود مسلمانوں کے اندر صبر اور تقویٰ کی غیر موجودگی ہے۔ یعنی اگر مسلمانوں میں صبر اور تقویٰ ہوگا تو وہ اَغیار کی سازش سے محفوظ رہیں گے اور اگر صبر اور تقویٰ نہیں ہوگا تو وہ اغیار کی سازشوں کا شکار ہوجائیں گے۔

ان قرآنی آیات کے مطابق، آپ نے جن باتوں کے بارے میں اپنے عدم اتفاق کا اظہار کیا ہے، اس کا تعلق الرسالہ سے نہیں ہے، بلکہ خود قرآن سے ہے۔ آپ کو اگر کہنا ہے تو یہ کہیے کہ مجھ کو قرآن کی بات سے اتفاق نہیں ہے۔ کیوں کہ یہ بات الرسالہ کی بات نہیں ہے، بلکہ وہ خود قرآن کی بات ہے۔

مذکورہ قسم کی آیتوں کا مطالعہ کرنے سے جو بات معلوم ہوتی ہے وہ یہ کہ جب کوئی اُفتاد پڑے تو مسلمانوں کے اندر احتساب خویش (introspection) کا جذبہ جاگنا چاہیے۔ دوسروں کے خلاف احتجاج اور شکایت کرنا، سراسر قرآن کی تعلیمات کے خلاف ہے۔

سوال

میرا ایک مسئلہ ہے جس نے مجھ کو بہت مغموم کر رکھا ہے۔ مسئلہ یوں ہے کہ بندہ بالوں کے گرنے کی پرابلم سے دوچار ہے۔ بال گرتے تو ہیں مگر دواؤں کے باوجود، وہ دوبارہ نہیں اُگتے ۔ کیا رب العالمین اس پر قادر نہیں۔ کیوں ایسا ہے کہ خدا نے کسی کے سر پر خوبصورت بال دیے اور کسی کو گنجا بنا دیا۔ برائے مہربانی آپ اپنی رائے سے نوازیں (عمر رفیق، سری نگر، کشمیر)۔

جواب

آپ کے جذبات قابل قدر ہیں۔ بال کے بارے میں جو کچھ آپ نے لکھا ہے، اس کا جواب یہ ہے کہ موجودہ دنیا امتحان کی جگہ ہے۔ یہاں ہر چیز آزمائش کے لیے ہوتی ہے، ملنا بھی اور نہ ملنا بھی۔ اسی طرح آدمی کے سر پر اچھے بال کا اُگنا بھی آزمائش ہے اور بال کا جھڑنا یا سفید ہونا بھی آزمائش۔ اس آزمائش میں پورا اترنا یہ ہے کہ آدمی دونوں حالتوں کو یکساں طور پر خدا کی طرف سے سمجھے، وہ ملنے پر نازاں نہ ہو اور نہ ملنا اس کو مایوسی میں مبتلا کرے۔

آپ بال کے مسئلہ کے بارے میں علاج کریں، مگر کسی بھی حال میں مایوسی کا شکار نہ ہوں۔ بلکہ اللہ سے یہ دعا کریں کہ اے اللہ، میں تیرے فیصلہ پر راضی ہوں، تو میرے لیے حسن تلافی کا فیصلہ فرما۔ مجھے آخرت میں جنت دے دے، جہاں نہ کوئی بیماری ہوگی اور نہ کوئی محرومی۔ انسان کو خود سے دنیا میں کوئی مصیبت نہیں مانگنا چاہیے۔ لیکن اگر اس پر کوئی مصیبت آجائے تو اُس وقت اُس کو کامل صبر کی روش اختیار کرنی چاہیے۔ یہی مومن کا طریقہ ہے اور یہی جنت کی قیمت ہے۔

سوال

آج ساری دنیا کے مختلف حصوں میں مسلمانوں کے جذبات ابھارے جا رہے ہیں۔ کہیں کارٹون بنانے کے واقعات پیش آرہے ہیں تو کہیں قرآن کریم کی بے حرمتی کی جا رہی ہے۔ ایسی صورت میں امتِ مسلمہ کا کیا رول ہونا چاہیے؟ (جیسا کہ ظلم وستم کو روکنے کا حکم ہے اور نہ روک سکیں تو دعا کرنے کا حکم)۔ برائے مہربانی قرآن اور حدیث کی روشنی میں جواب دیں، جیسا کہ آپ کرتے ہیں۔ یہ بتائیں کہ مسلمان روکنے کی پوزیشن میں ہیں یا صرف دعا کرنے کی پوزیشن میں۔ آپ کی بات اور آپ کا انداز سب سے جدا ہے اور مجھے مطمئن کرنے والا ہوتا ہے۔ (حماد احمد، نئی دہلی)

جواب

یہ کہنا درست نہیں کہ مسلمانوں کے جذبات ابھارے جا رہے ہیں، یا ان کو مشتعل کیا جا رہا

ہے۔ صحیح بات یہ ہے کہ مسلمان بعض واقعات پر غیر ضروری طور پر مشتعل ہورہے ہیں، وہ غیر ضروری طور پر اُن واقعات پر بھڑک اٹھتے ہیں۔ قرآن اور حدیث میں صبر وتحمل پر بہت زیادہ زور دیا گیا ہے، حتیٰ کہ نماز سے پہلے صبر کا حکم ہے: وَاسْتَعِينُوا بِالصَّبْرِ وَالصَّلٰوةِ (2:45)۔ مگر مسلمانوں کا حال یہ ہے کہ وہ نماز تو دھوم سے پڑھتے ہیں، لیکن وہ صبر کو پوری طرح چھوڑے ہوئے ہیں۔ اس مسئلے کا حل صرف یہ ہے کہ مسلمان خود اپنے رویے کو بدلیں۔

آپ نے لکھا ہے کہ اس معاملے میں مسلمان کیا کریں، وہ ان واقعات کو روکیں یا وہ اُس کے لیے دعا کریں۔ حقیقت یہ ہے کہ اِس معاملے میں مسلمانوں کو خود اپنے آپ کو روکنا ہے اور خود اپنے لیے دعا کرنا ہے۔ کارٹون کا واقعہ یا قرآن کی بے حرمتی جیسی خبریں سن کر بھڑک اٹھنا، یہی مسلمانوں کی اصل غلطی ہے۔ مسلمانوں کو چاہیے کہ جب وہ ایسی کوئی خبر سنیں تو وہ فوراً متعلق افراد سے ملیں اور اُن کو اسلامی لٹریچر پڑھنے کے لیے دیں۔

اصل یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے موجودہ دنیا میں ہر انسان کو مصلحتِ امتحان کی بنا پر آزادی دی ہے۔ مذکورہ قسم کا کوئی واقعہ خدا کی دی ہوئی آزادی کا صرف ایک غلط استعمال ہوتا ہے۔ چوں کہ آپ آزادی کو ختم نہیں کرسکتے، اس لیے اُس کے خلاف لڑنا بھی آپ کے لیے درست نہیں۔ آپ صرف یہ کرسکتے ہیں کہ تبلیغ ونصیحت کے ذریعے اُس آدمی کی سوچ کو بدلیں، اسلام کے صحیح تعارف کے ذریعے اُس کے ذہن کو درست کریں اور اس کی اصلاح کے لیے اللہ سے دعا کریں۔

سوال

ایک صاحب اپنے بارے میں لکھتے ہیں: مزاج کاملیت پسند (Perfectionist) ہے۔ جو جذباتی نقصان ہوگیا، دل آج تک اُسی میں پھنسا ہوا ہے۔ کچھ اسباب کی بنا پر معاشرے میں جو مل رہا ہے، وہ دل سے قبول تو نہیں۔ لیکن کیا صبر کر کے جو مل رہا ہے اُس پر گزارا کیا جائے، یہ سوچ کر کہ جو ملا ہے وہ اسی دنیا تک ہے۔ اور من پسند چیز آخرت میں ملے گی۔ (ایک قاری الرسالہ، پاکستان)

جواب

آپ نے جس تجربے کا ذکر کیا ہے، اُس کا تعلق آخرت سے یا جنت سے نہیں ہے۔ اس کا تعلق صرف دنیا کے بارے میں قانونِ فطرت سے ہے۔ موجودہ دنیا کا معاملہ یہ ہے کہ ہر آدمی پیدائشی طور پر حوصلہ مند (ambitious) پیدا ہوتا ہے۔ لیکن اِس عارضی دنیا میں محدودیت (limitations) کا قانون ہے۔ اس لیے یہاں ہر ایک شخص کو اس کے اپنے حوصلے کی نسبت سے کم ملتا ہے۔ تاریخ میں کوئی بھی شخص ایسا پایا نہیں جاتا، جس نے اپنے حوصلے کے بقدر دنیا کو حاصل کیا ہو۔

اس حقیقت کی بنا پر اس دنیا میں انسان کے لیے دانش مندی یہ ہے کہ وہ حقیقت پسند بنے، یعنی زیادہ چاہے مگر کم پر راضی ہوجائے۔ موجودہ دنیا کا یہ قانون قرآن میں اس طرح بیان کیا گیا ہے۔ اس آیت کے الفاظ یہ ہیں:

وَلَنَبْلُوَنَّكُمْ بِشَيْءٍ مِّنَ الْخَوْفِ وَالْجُوْعِ وَنَقْصٍ مِّنَ الْاَمْوَالِ وَالْاَنْفُسِ وَالثَّمَرٰتِ ۭ وَبَشِّرِ الصّٰبِرِيْنَ (2:155)۔ یعنی، اور ہم ضرور تم کو آزمائیں گے کچھ ڈر اور بھوک سے اور مالوں اور جانوں اور پھلوں کی کمی سے۔ اور ثابت قدم رہنے والوں کو خوش خبری دے دو۔

یہ آیت موجودہ دنیا کے مادی قانون کو بتا رہی ہے۔ اس دنیا میں ایسا ہوگا کہ یہاں انسان کو مختلف پہلوؤں سے نقصان کا تجربہ ہوگا۔ کسی شخص کے لیے اس دنیا میں نقصان سے بچنا ممکن نہیں، نہ صالح لوگوں کے لیے، اور نہ غیر صالح لوگوں کے لیے۔ ایسی حالت میں انسان کے لیے صرف ایک چوائس ہے، اور وہ صبر ہے۔ صبر کوئی بزدلی کی بات نہیں۔ صبر دانش مندی کی بات ہے۔ صبر کا مطلب ہے، اپنی زندگی کی منصوبہ بندی ملے ہوئے پر کرنا، اور جو نہیں ملا اُس کو خدا کی اسکیم آف تھنگس (scheme of things) کے خانے میں ڈال دینا۔ یعنی جو ملا اُس کو اپنا سمجھنا، اور جو نہیں ملا اُس کے بارے میں اِس اصول پر راضی ہونا کہ وہ خدا کا فیصلہ تھا، اور خدا کے فیصلے کو کوئی بدل نہیں سکتا۔

اعراض

اور

رواداری

اعراض

اسلام کا ایک اہم معاشرتی اصول اعراض (اوائڈنس) ہے۔ یعنی شکایت اور اختلاف کے موقع پر ٹکراؤ سے پرہیز کرنا۔ اشتعال کے موقع پر ردعمل کا طریقہ اختیار کرنے کے بجائے اپنے آپ کو مثبت رویہ پر قائم رکھنا۔

ہر مرد وعورت کا مزاج دوسرے مرد وعورت سے مختلف ہوتا ہے۔ اسی طرح ایک اور دوسرے کے درمیان اور بہت سے فرق ہیں جس کی بنا پر بار بار ایک کو دوسرے سے ناخوش گواری کا تجربہ پیش آتا ہے۔ ایک اور دوسرے کے درمیان اختلاف کی صورتیں پیدا ہو جاتی ہیں۔ اجتماعی زندگی میں خواہ وہ گھر کے اندر کی ہو یا گھر کے باہر کی، اس طرح کی ناپسندیدہ صورت حال کا پیش آنا بالکل فطری ہے۔ اس کو روکنا کسی حال میں ممکن نہیں۔

اب ایک طریقہ یہ ہے کہ ہر اختلاف سے ٹکراؤ کیا جائے۔ ہر ناخوش گواری سے براہ راست مقابلہ کر کے اس کو دور کرنے کی کوشش کی جائے۔ اس طرح کی کوشش غیر فطری ہے۔ اس لیے کہ وہ مسئلہ کو صرف بڑھانے والی ہے۔ وہ ہرگز اس کو گھٹانے والی نہیں۔

اسلام میں ایسے مواقع پر اعراض کی تعلیم دی گئی ہے۔ یعنی ناخوش گوار صورت حال کو مٹانے کے بجائے اس کو برداشت کرنا، اشتعال انگیزی کا مقابلہ کرنے کے بجائے اس کو نظرانداز کرنا، اختلاف کے باوجود لوگوں کے ساتھ متحد ہو کر رہنا۔

اسلام کے مطابق یہ صرف ایک معاشرتی طریقہ نہیں ہے بلکہ وہ ایک عظیم ثواب بھی ہے۔ لوگوں کے درمیان اچھے طریقے سے رہنا عام حالات میں بھی ایک ثواب ہے۔ مگر جب کوئی شخص شکایت اور اختلاف کے باوجود لوگوں کے ساتھ اچھے رویہ پر قائم رہے، وہ اپنے منفی جذبات کو دبا کر مثبت روش کا ثبوت دے تو اس کا ثواب بہت بڑھ جاتا ہے۔

خدا کے یہاں ایسے لوگوں کا شمار محسنین میں کیا جائے گا یعنی وہ لوگ جنھوں نے دنیا کی زندگی میں بہتر اخلاق اوراعلیٰ انسانیت کا ثبوت دیا۔ اعراض کے بغیر اعلیٰ انسانی کردار پر قائم رہنا ممکن نہیں۔

اعراض کی حکمت

اعراض (avoidance) زندگی کا ایک اہم اصول ہے۔ اعراض کا تعلق دعوتی مشن سے بھی ہے اور زندگی کے دوسرے معاملات سے بھی۔ اعراض کے اصول کو اختیار کیے بغیر اس دنیا میں کوئی بھی کام درست طور پر انجام نہیں دیا جاسکتا۔

اصل یہ ہے کہ موجودہ دنیا میں ہر فرد اور ہر قوم کو خالق کی طرف سے آزادی حاصل ہے۔ ہر آدمی کو یہ موقع ہے کہ وہ اپنی سوچ کے مطابق اپنی آزادی کا استعمال کرے۔ زندگی کا یہی وہ معاملہ ہے جس کی بنا پر لوگوں کے درمیان اختلافات (differences) پیدا ہوتے ہیں۔ اختلاف اجتماعی زندگی کا ایک لازمی حصہ ہے جس کو ختم نہیں کیا جاسکتا۔

ایک شخص جس کی زندگی کا ایک مشن ہو، اس کو جاننا چاہیے کہ مشن کا لازمی اصول یہ ہے کہ آدمی اختلافی امور کو نظر انداز کرتے ہوئے اپنا مشن چلائے۔ وہ دوسرے لوگوں سے الجھے بغیر مثبت ذہن کے ساتھ اپنے منصوبے کی تکمیل میں لگا رہے۔

اعراض کے اصول کی اہمیت جتنی دوسرے معاملات میں ہے، اس سے بہت زیادہ دعوت کے معاملے میں ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ دعوت الی اللہ کا کام اعراض کے بغیر عملاً ممکن نہیں۔ دعوت کا نشانہ لوگوں کو آخرت سے باخبر کرنا ہے۔ اس مشن کو درست طور پر انجام دینے کے لیے ضروری ہے کہ داعی کے اندر یکسوئی کا مزاج ہو۔ اس کے اندر یہ صلاحیت ہو کہ وہ اہل دنیا کی طرف سے چھیڑے ہوئے مسائل کو مکمل طور پر نظر انداز (ignore) کرے۔ اور پوری یکسوئی کے ساتھ لوگوں کو آخرت کی طرف پکارتا رہے۔ جو لوگ دعوت کا نام لیں لیکن وہ اہل دنیا کی طرف

سے چھیڑے ہوئے مسائل میں الجھے رہیں، وہ کبھی خدا کے یہاں داعی کا مقام حاصل نہیں کرسکتے۔ ایسے لوگوں کی کوششیں، قرآن کے مطابق، دنیا میں حبطِ اعمال (18:104) کا شکار ہوجائیں گی، وہ خَسِرَ الدُّنْيَا وَالآخِرَة (22:11) کا مصداق ہوکررہ جائیں گی، یعنی دنیا اور آخرت میں خسارہ۔

دانش مندانہ طریقہ

صحابی رسول عمیر بن حبیب بن خماشہ نے اپنے بیٹے کو نصیحت کرتے ہوئے کہا: مَنْ لَا يَرْضَى بِالْقَلِيلِ مِمَّا يَأْتِي بِهِ السَّفِيهُ يَرْضَى بِالْكَثِيرِ (المعجم الاوسط للطبرانی، حدیث نمبر 2258)۔ یعنی، جو شخص نادان کی طرف سے پیش آنے والے چھوٹے شر پر راضی نہ ہوگا، اس کو نادان کے بڑے شر پر راضی ہونا پڑے گا۔

اس قولِ صحابی میں اجتماعی زندگی کی ایک حکمت کو بتایا گیا ہے۔ اجتماعی زندگی کبھی یکساں نہیں ہوتی۔ اجتماعی زندگی میں ہمیشہ مختلف قسم کے مسائل پیش آتے ہیں۔ اس بنا پر بار بار ایسا ہوتا ہے کہ ایک شخص کو دوسرے کی طرف سے ایسا تجربہ پیش آئے گا جو اس کی مرضی کے خلاف ہوگا، ایسے موقع پر صحیح طریقہ یہ ہے کہ اعراض کیا جائے، نہ کہ ٹکراؤ شروع کردیا جائے۔

اگر آپ ایسے موقعے پر ٹکراؤ کا طریقہ اختیار کریں تو وہ ہمیشہ چین ری ایکشن (chain reaction) کا سبب بنے گا۔ نتیجہ یہ ہوگا کہ آپ ہمیشہ خارجی مسائل میں الجھے رہیں گے، اور کبھی اپنے منصوبے کے مطابق موثر عمل شروع نہ کرسکیں گے۔ دوسروں کے خلاف کارروائی کرنے کا مطلب یہ ہے کہ آدمی نے اپنے آپ کو خود اپنے کام میں استعمال نہیں کیا، بلکہ اس کو دوسروں کی مخالفت میں ضائع کردیا۔

اس مسئلے کا واحد حل یہ ہے کہ صبر واعراض کا طریقہ اختیار کیا جائے۔ دوسرے الفاظ میں

اوائڈنس (avoidance) کا طریقہ۔ اس طرح کے معاملے میں یہی واحد طریقہ قابل عمل ہے، کوئی دوسرا طریقہ اس معاملہ میں ورک (work) کرنے والا نہیں۔ جب آدمی دوسرے کی طرف سے پیش آنے والے ناخوش گوار تجربے پر اعراض کا طریقہ اختیار کرتا ہے تو وہ اس کے لیے ایک پروسیلف (pro-self) طریقہ ہوتا ہے۔ اس طرح وہ خود اپنے وقت اور اپنی انرجی (energy) کو بچاتا ہے، تاکہ اس کو وہ خود اپنے فائدے کے لیے استعمال کرے۔

پریکٹکل وزڈم

اجتماعی زندگی کبھی یکساں نہیں ہوتی۔ اجتماعی زندگی میں ہمیشہ مختلف قسم کے مسائل پیش آتے ہیں۔ اس بنا پر بار بار ایسا ہوتا ہے کہ ایک شخص کو دوسرے کی طرف سے ایسا تجربہ پیش آئے گا، جو اس کی مرضی کے خلاف ہوگا۔ ایسے موقع پر ہمیشہ یہ عقل کی بات ہوتی ہے کہ آدمی کم پر راضی ہوجائے۔ آئڈیل کی مانگ کرنا، عملاً اس نتیجے تک پہنچنا ہے کہ جو ممکن ہے، وہ بھی نہ ملے، اور زیادہ تو ملنے والا ہی نہیں تھا۔ اس کا سبب یہ ہے کہ موجودہ دنیا کا نظام اس طرح بنا ہے کہ اِس دنیا میں اجتماعی اختلافات کبھی معیار (ideal) کی بنیاد پر طے نہیں ہوتے۔

عام طور پر انسان کا طریقہ یہ ہے کہ وہ متاثر ذہن (conditioned mind) سے سوچنے کی بنا پر صحیح فیصلہ نہیں لے پاتا۔ وہ چیزوں کو ان کے فیس ویلو (face-value) پر لیتا ہے۔ جہاں انتظار کی پالیسی اختیار کرنی چاہیے، وہاں وہ جلد بازی کا طریقہ اختیار کرتا ہے۔ جہاں پر امن تدبیر کے ذریعہ مسئلہ حل کرنا چاہیے، وہاں وہ تشدد کا طریقہ اختیار کرلیتا ہے۔ جہاں ردعمل (reaction) سے بچ کر اپنا منصوبہ بنانا چاہیے، وہاں وہ ری ایکشن کا شکار ہوکر ایسا منصوبہ بناتا ہے، جو مسائل میں صرف اضافے کا سبب بن جاتا ہے۔ انسان

چاہتا ہے کہ اسے اس کا مطلوب آئڈیل کی بنیاد پر حاصل ہو۔ اس بنا پر وہ ایسا کرتا ہے۔ مگر یہ طریقہ وزڈم کے خلاف ہے۔ آدمی کو چاہیے کہ وہ چیزوں کو نتیجے کے اعتبار سے دیکھے۔ اس طرح مسئلہ کسی مزید دشواری کے بغیر بہ آسانی حل ہوجائے گا۔

اس دنیا میں اختلاف کے موقع پر آپشن دو بہتر کے درمیان نہیں ہوتا، بلکہ چھوٹے شر (lesser evil) اور بڑے شر (greater evil) کے درمیان ہوتا ہے۔ اسی کو دوسرے خلیفہ راشد حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے خیر الشرین کہا ہے (العقد الفرید، جلد 2، صفحہ 110-109)، یعنی عقل مند وہ ہے، جو دو برائیوں (evils) میں سے کمتر بُرائی (شر) کو پہچانے۔ اگر آدمی چھوٹے شر پر راضی نہ ہو تو اس کے بعد اس کو جس چیز پر راضی ہونا پڑتا ہے، وہ بڑا شر ہے۔ اس حقیقت کو صحابی رسول عمیر بن حبیب بن خماشہ اس طرح بیان کیا ہے: جو شخص نادان کی طرف سے پیش آنے والے چھوٹے شر پر راضی نہیں ہوگا، اس کو نادان کے بڑے شر پر راضی ہونا پڑے گا (المعجم الاوسط للطبرانی، حدیث نمبر 2258)۔

اختلاف کے وقت دانش مند آدمی کے لیے پہلا آپشن کیا ہوتا ہے۔ وہ یہ ہے کہ فریقِ ثانی کی شرطوں کو قبول کرتے ہوئے اس سے صلح کرلی جائے۔ پیغمبر اسلام کی یہی سنت رہی ہے۔ اسی سنت کو قرآن میں حکمت کہا گیا ہے۔ قرآن میں ہے کہ اللہ نے اپنے رسول کو کتاب اور حکمت کے ساتھ بھیجا۔ کتاب سے مراد قرآن ہے، اور حکمت سے مراد وہی چیز ہے، جس کو پریکٹکل وزڈم کہا جاتا ہے۔

پریکٹکل وزڈم کی وجہ سے آپ کو ملنے والی چیز ابتدا میں بہ ظاہر کم نظر آتی ہے۔ جیسا کہ صلح حدیبیہ کے موقع پر بہت سے صحابہ کو لگا تھا (صحیح البخاری، حدیث نمبر 2731)۔ لیکن اپنے نتیجے کے اعتبار سے وہ ہمیشہ زیادہ ہوتی ہے۔ تجربہ بتاتا ہے کہ آئڈیل وزڈم نتیجے کے اعتبار سے بے فائدہ ٹکراؤ کی طرف لے جاتا ہے۔ اس کے برعکس، پریکٹکل وزڈم غیر ضروری

نقصان سے بچا کر کامیابی کی منزل تک پہنچا دیتی ہے۔ پریکٹکل وزڈم ہمیشہ آدمی کو یہ موقع دیتی ہے کہ اس کو اسٹارٹنگ پوائنٹ مل جائے۔ اسٹارٹنگ پوائنٹ سے آغاز کرکے آدمی زیادہ کو پاسکتا ہے۔ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کی پوری زندگی اسی اصول پر مبنی تھی۔

غلط فہمی

یہ 13 مارچ 2002ء کا واقعہ ہے۔ نئی دہلی کے سینٹرل ایڈمنسٹریٹو ٹریبونل (کیٹ) آفس میں ڈاکٹر شمس الآفاق صاحب اپنے کام سے گئے ہوئے تھے۔ وہاں حسب معمول دوسرے بہت سے لوگ تھے۔ ایک آدمی ان کے سامنے تھا۔ ڈاکٹر صاحب آگے جانا چاہتے تھے۔ انہوں نے اس آدمی کی پیٹھ پر ہاتھ رکھ کر اشارہ کیا کہ مجھے راستہ دے دو۔ آفس میں اپنے کام سے فارغ ہوکر جب وہ نکلے تو گیٹ کے باہر دو آدمی کھڑے ہوئے تھے۔ ان میں سے ایک وہی شخص تھا جس کی پیٹھ پر ڈاکٹر صاحب نے ہاتھ رکھا تھا۔ اور دوسرا اس کا ساتھی تھا۔ دونوں صورت سے جاٹ معلوم ہوتے تھے۔

مذکورہ آدمی نے جیسے ہی ڈاکٹر صاحب کو دیکھا وہ اچانک بگڑ گیا۔ وہ نہایت اشتعال انگیز لہجہ میں ان کو برا بھلا کہنے لگا۔ حتیٰ کہ اس نے کہا کہ راجندر، تم کیا سمجھتے ہو، میں تم کو گولی مار دوں گا۔ ڈاکٹر شمس الآفاق صاحب اعراض کے فارمولے پر عمل کرتے ہوئے اب تک بالکل خاموش تھے۔ جب اس آدمی نے راجندر کا نام لیا تو انہوں نے فوراً محسوس کیا کہ یہ غلط فہمی کا معاملہ ہے۔ ابھی وہ چپ ہی تھے کہ ان کے ساتھی مسٹر اشوک کمار نے کہا کہ بھائی، تم کو غلط فہمی ہوئی ہے، یہ تو ڈاکٹر شمس الآفاق ہیں۔ اور یہ فلاں سرکاری محکمہ میں افسر کی حیثیت سے کام کررہے ہیں۔ اس آدمی کو یقین نہیں آیا۔ شاید اس کے مفروضہ راجندر کی صورت ڈاکٹر صاحب سے کچھ ملتی جلتی تھی۔ اس کی طلب پر ڈاکٹر صاحب نے اپنی جیب سے

اپنا آئڈنٹٹی کارڈ نکالا اور اس آدمی کو دکھایا۔ آئڈنٹٹی کارڈ کو دیکھتے ہی وہ ایسا ہو گیا جیسے پھولے ہوئے غبارہ کی ہوا اچانک نکل گئی ہو۔ اور پھر وہ سر جھکا کر خاموشی کے ساتھ چلا گیا۔

اس واقعہ میں بہت بڑا سبق ہے۔ اگر کوئی شخص آپ کے خلاف بُرا برتاؤ کرے تو فوراً اس کو اپنا دشمن نہ سمجھ لیجیے۔ عین ممکن ہے کہ اس کے برے برتاؤ کا سبب اس کی غلط فہمی ہو۔ اگر آپ صبر واعراض کے فارمولے پر عمل کرتے ہوئے اس سے نرمی کا معاملہ کریں تو عین ممکن ہے کہ آپ کی صحیح تصویر کو جاننے کے بعد اس کا رویہ بالکل بدل جائے۔ گولی مارنے کی بات کرنے والا آدمی آپ کو پھول کی پیش کش کرنے لگے۔

تجربہ بتاتا ہے کہ بے صبری کا انداز آدمی کے نفس امارہ کو جگاتا ہے۔ اس کے برعکس، صبر کا انداز اس کے نفس لوّامہ کو جگا دیتا ہے۔ نفس امّارہ کا جاگنا آدمی کو آپ کا دشمن بنا دیتا ہے، اور نفس لوّامہ کا جاگنا آدمی کو آپ کا دوست بنا دیتا ہے۔ انسانی زندگی میں غلط فہمی پیدا ہونا ایک عام بات ہے۔ کسی بھی شخص کو کسی بھی شخص کے خلاف غلط فہمی پیدا ہوسکتی ہے۔ اس لیے غلط فہمی پیدا ہونا بذاتِ خود کوئی جرم نہیں۔ جرم یہ ہے کہ غلط فہمی پیدا ہونے کے بعد وہ درست رویہ اختیار نہ کرے۔

اگر کسی شخص کو کسی کے خلاف غلط فہمی پیدا ہو جائے تو صرف غلط فہمی کی بنیاد پر اسے مان نہیں لینا چاہیے۔ اس پر لازم ہے کہ وہ کھلے ذہن کے ساتھ معاملہ کی تحقیق کرے۔ تحقیق کے بعد اگر وہ بات غلط ثابت ہو تو اس پر فرض ہے کہ وہ اس کو مکمل طور پر اپنے دل سے نکال دے۔ غلط فہمی کی تحقیق سے پہلے اس کا چرچا کرنا سخت گناہ ہے۔ ایک آدمی کسی کے بارے میں تحقیق کے بغیر بھلی بات تو کہہ سکتا ہے مگر تحقیق کے بغیر بری بات کہنا سرتاسر حرام ہے۔ ایسی روش پر اللہ کے یہاں سخت پکڑ کا اندیشہ ہے۔

خدا کا پسندیدہ معاشرہ وہ ہے جس میں لوگوں کے باہمی تعلقات حسن ظن کی بنیاد پر قائم

ہوں۔ کسی کے بارے میں کوئی بری بات معلوم ہو تو تحقیق کے بغیر ہی اس کو رد کر دیا جائے۔ اس قسم کی باتیں براہِ راست طور پر آخرت سے تعلق رکھتی ہیں۔ حدیث میں آیا ہے کہ جو آدمی لوگوں کے عیبوں کی پردہ پوشی کرے، خدا آخرت میں اس کے عیبوں کی پردہ پوشی کرے گا۔ دوسروں کے ساتھ بہتر سلوک کرنا ایک قسم کی عملی دعا ہے۔ ایسا آدمی گویا یہ کہہ رہا ہوتا ہے کہ خدایا، میں نے تیرے بندوں کے ساتھ بہتر معاملہ کیا، تو بھی میرے ساتھ بہتر معاملہ فرما، دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی۔

رواداری

رواداری (tolerance) ایک اعلیٰ انسانی اور اسلامی صفت ہے۔ رواداری کا مطلب دوسروں کی رعایت کرنا ہے۔ اس کے مقابلہ میں عدم رواداری یہ ہے کہ آدمی صرف اپنے آپ کو جانے، وہ دوسروں کے تقاضے سے بے خبر ہو جائے۔ رواداری ایک اعلیٰ انسانی اسپرٹ ہے۔ اس کو شریعت میں مختلف الفاظ میں بیان کیا گیا ہے۔ مثلاً رفق، تالیفِ قلب، شفقت علی الخلق، وغیرہ۔

آدمی کے اندر جب خدا پرستی اور سچی دین داری آتی ہے تو وہ خود غرضی کے تحت پیش آنے والی تمام برائیوں سے اوپر اٹھ جاتا ہے۔ وہ اپنی ذات میں جینے کے بجائے حقائق میں جینے لگتا ہے۔ ایسا انسان اپنے ربانی مزاج کے مطابق دوسروں کو محبت کی نظر سے دیکھنے لگتا ہے۔ وہ دوسروں سے کسی چیز کا امیدوار نہیں ہوتا، اس لیے دوسرے اگر اس سے اختلاف رکھیں یا اس کے ساتھ اچھا سلوک نہ کریں، تب بھی وہ دوسروں کا خیر خواہ بنا رہتا ہے۔ تب بھی وہ دوسروں کی رعایت کرتا ہے۔ تب بھی وہ دوسروں کے ساتھ اپنے روادارانہ سلوک کو باقی رکھتا ہے۔

رواداری یہ ہے کہ آدمی ہر حال میں دوسرے کی عزت کرے، خواہ وہ اس کے موافق ہو

یا اس کے خلاف۔ وہ ہر حال میں دوسرے کو اعلیٰ انسانی درجہ دے، خواہ وہ اس کا اپنا ہو یا غیر۔ وہ دوسرے کے کیس کو ہر حال میں ہمدردی کا کیس سمجھے۔ خواہ دوسرے کی طرف سے بظاہر غیر ہمدردانہ سلوک کا اظہار کیوں نہ ہوا ہو۔

رواداری کا مطلب دراصل دوسروں کی رعایت کرنا ہے۔ اجتماعی زندگی میں لازمی طور پر ایک اور دوسرے کے درمیان اختلافات پیش آتے ہیں۔ مذہب، کلچر، رواج اور ذاتی ذوق کا فرق ہر سماج میں باقی رہتا ہے۔ ایسی حالت میں اعلیٰ انسانی طریقہ یہ ہے کہ آدمی اپنے اصول پر قائم رہتے ہوئے دوسرے کے ساتھ رعایت اور توسع کا طریقہ اختیار کرے۔ وہ اپنی ذات کے معاملہ میں اصول پسند ہو، مگر دوسرے کے معاملہ میں روادار۔ وہ اپنے آپ کو اعلیٰ معیار کی روشنی میں جانچے۔ مگر جب دوسروں کا معاملہ ہو تو وہ رواداری اور وسعتِ ظرفی کا طریقہ اختیار کرے۔ یہ رواداری انسانی شرافت کا لازمی تقاضا ہے۔ اسلام آدمی کے اندر یہی اعلیٰ شرافت پیدا کرتا ہے۔

مذہبی رواداری، تالیفِ قلب

آج کل تالیف قلب اور مذہبی رواداری کا بہت زیادہ چرچا ہے۔ میرا سوال یہ ہے کہ مذہبی رواداری اور تالیف قلب ایک ہیں یا دونوں میں کوئی فرق ہے۔ (سید اقبال احمد عمری، عمر آباد، تامل ناڈو)

جہاں تک میں سمجھتا ہوں رواداری (tolerance) اور تالیف قلب (softening of the heart) اپنی حقیقت کے اعتبار سے دونوں ایک ہیں۔ البتہ رواداری ایک سیکولر اصطلاح (term) ہے، اور تالیف قلب ایک مذہبی اصطلاح۔ تاہم دونوں میں ایک فرق ہے۔ رواداری کا لفظ صرف باہمی ٹالرنس کا مفہوم رکھتا ہے۔ جب کہ تالیف قلب اللہ کی رضا کے لیے یک طرفہ طور پر خیر خواہی کرنا ہے۔ تالیفِ قلب مذہبی معاملات میں

رواداری کا نام ہے۔ اس کے برعکس، رواداری زیادہ عام ہے۔ رواداری کا مطلب ہے ایسے طرزِ عمل، اعتقادات اور خیالات، وغیرہ کو گوارا کرنا جن سے آپ کو اتفاق نہ ہو یا جو آپ کے نزدیک قابلِ قبول نہ ہوں۔

اس کا تعلق زندگی کے ہر معاملے سے ہے، خواہ وہ کسی بھی شعبے سے تعلق رکھتا ہو۔ رواداری کا طریقہ مزاج کی بنیاد پر قائم ہوتا ہے، وہ قانون کے زور پر قائم نہیں ہوتا۔ یہ دراصل اپنی حقیقت کے اعتبار سے سماجی اخلاقیات کا معاملہ ہے۔ اس کا مقصد یہ ہے کہ ہر ایک کو مکمل آزادی حاصل ہو، تاکہ وہ آزادی کے ساتھ اپنے رویے کا انتخاب کر سکے۔

اس معاملے میں صحت مند طریقہ (healthy method) یہ ہے کہ ہر ایک آزادانہ طور پر اپنی رائے کا اظہار کرے، اور اسی کے ساتھ وہ دل سے اس پر راضی ہو کہ دوسرے کو بھی یہ حق ہے کہ وہ جس رائے کو بھی درست سمجھتا ہو، اس کو وہ آزادانہ طور پر ظاہر کرے۔ صحت مند رواداری یہ ہے کہ کسی فریق پر کسی قسم کا دباؤ نہ ڈالا جائے۔ ہر ایک جیو اور جینے دو (live and let live) کے اصول پر قائم رہے۔ ہر ایک کا مزاج یہ ہو کہ جس طرح اس کو خدا کی طرف سے آزادی حاصل ہے، یعنی جس بات کو وہ حق سمجھتا ہے اس کو وہ اختیار کرے، اور جس بات کو وہ ناحق سمجھتا ہے، اس کو وہ ردّ کر دے۔ اسی طرح خدا کی طرف سے دوسروں کو بھی یہ آزادی ملی ہوئی ہے۔ ادنیٰ درجے میں بھی کسی کے ساتھ ناانصافی کا سلوک نہ کیا جائے۔

ٹالرنس، فطرت کا اصول

ٹالرنس (رواداری، برداشت) فطرت کا ایک یونیورسل اصول ہے۔ شیر اور ہاتھی دونوں انتہائی بڑے جانور ہیں۔ دونوں ایک دوسرے کے لیے حریف کی حیثیت رکھتے ہیں۔ پھر بھی دونوں ایک ساتھ جنگل میں رہتے ہیں۔ یہ صرف ٹالرنس کے ذریعہ ممکن ہوتا

ہے۔ چنانچہ جنگلوں میں دیکھا گیا ہے کہ ایک طرف سے ہاتھی آرہا ہو اور دوسری طرف سے شیر گزر رہا ہو تو دونوں اپنا اپنا راستہ بدل کر دائیں اور بائیں سے نکل جاتے ہیں۔ اگر دونوں اس طرح ایک دوسرے کے ساتھ ٹالرنس کا معاملہ نہ کریں تو دونوں آپس میں لڑنے لگیں، یہاں تک کہ دونوں لڑ کر تباہ ہو جائیں۔

شیر اور ہاتھی کو یہ طریقہ فطرت نے سکھایا ہے۔ اسی طرح انسان کے جسم میں فطرت نے ٹالرنس کا نظام قائم کر رکھا ہے۔ میڈیکل سائنس میں اس کو حیاتیاتی ٹالرنس (biological tolerance) کہا جاتا ہے۔ اس سے مراد ایک جسم حیوانی کی یہ صلاحیت ہے کہ وہ ایک چیز سے برا اثر لیے بغیر اس سے ربط کو یا جسم میں اس چیز کے داخل کیے جانے کو برداشت کرے:

The ability of an organism to endure contact with a substance, or its introduction into the body, without ill effects. (Encyclopedia Britannica X/31)

جسم کی اسی صلاحیت پر امراض کے علاج کا پورا نظام قائم ہے۔ بیماری کے وقت جسم کے اندر ایسی دوائیں ڈالی جاتی ہیں جو مجموعی حیثیت سے جسم کے لیے مضر ہیں۔ مگر جسم خارجی چیزوں کے معاملہ میں اپنی ساری حساسیت کے باوجود ایسی دواؤں کو برداشت کرتا ہے۔ وہ ان کے ساتھ ٹالرنس کا معاملہ کرتا ہے۔ اسی حیاتیاتی ٹالرنس کی بنا پر یہ ممکن ہوتا ہے کہ یہ دوائیں جسم میں داخل ہو کر اپنا اثر دکھائیں۔ وہ جسم کے اعضاء پر برا اثر ڈالے بغیر اس کے بیمار عضو پر عمل کر کے اس کو اچھا کر سکیں۔

ٹالرنس کا یہی طریقہ انسانی سماج میں بھی مطلوب ہے۔ جنگل کے جانور جو کچھ اپنی جبلت (instinct) کے تحت کرتے ہیں، اور انسانی جسم جو کچھ اپنی فطرت کے تحت کرتا ہے۔ وہی انسان کو اپنے شعور کے تحت کرنا ہے۔ اس کو اپنے سوچے سمجھے فیصلہ کے تحت ٹالرنس کا طریقہ اختیار کر کے دوسروں کے ساتھ زندگی گزارنا ہے۔

جب بھی زیادہ لوگ ساتھ مل کر زندگی گزاریں گے تو ان کے درمیان شکایت اور اختلاف کے واقعات بھی ضرور پیدا ہوں گے۔ ایسا ایک گھر کے اندر ہوگا، سماج کے اندر ہوگا، پورے ملک میں ہوگا، اور اسی طرح بین اقوامی زندگی میں بھی ہوگا۔ انسان خواہ جس سطح پر بھی ایک دوسرے سے ملیں اور تعلقات قائم کریں، ان کے درمیان ناخوش گوار واقعات کا پیش آنا بالکل لازمی ہے۔

ایسی حالت میں کیا کیا جائے، ٹالرنس اسی سوال کا جواب ہے۔ ایسی حالت میں ایک شخص دوسرے شخص کے ساتھ اور ایک گروہ دوسرے گروہ کے ساتھ رواداری اور برداشت کا معاملہ کرے۔ مل جل کر زندگی گزارنے اور مل جل کر ترقی کرنے کی یہی واحد قابلِ عمل صورت ہے۔ اس اسپرٹ کے بغیر انسانی تمدن کی تعمیر اور اس کی ترقی ممکن نہیں۔

ٹالرنس کوئی انفعالی رویہ نہیں، وہ عین حقیقت پسندی ہے۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ آدمی کے لیے زیادہ بہتر چوائس (choice) لینے کا موقع تھا اور اس نے پست ہمتی کی بنا پر ایک کمتر چوائس کو اختیار کرلیا۔ حقیقت یہ ہے کہ موجودہ دنیا میں اس کے سوا کوئی اور چوائس ہمارے لیے ممکن ہی نہیں۔ ٹالرنس ہماری ایک عملی ضرورت ہے، نہ کہ کسی قسم کی اخلاقی کمزوری۔

اکثر ایسا ہوتا ہے کہ آدمی ایک صورت حال کو اپنے لیے ناخوش گوار پا کر اس سے لڑنے لگتا ہے اور بالآخر تباہی سے دوچار ہوتا ہے۔ ایسا کیوں ہوتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ آدمی نے اپنی کوتاہ نظری کی بنا پر یہ سمجھا کہ اس کے لیے انتخاب خوش گوار اور ناخوش گوار کے درمیان ہے۔ وہ ناخوش گوار واقعہ کے خلاف ٹکراؤ کا طریقہ اختیار کرتا ہے، تاکہ خوش گوار کو حاصل کرسکے۔

حالاں کہ نتیجہ نے بتایا کہ اس کے لیے انتخاب خوش گوار اور ناخوش گوار کے درمیان

نہیں تھا، بلکہ اس کے لیے انتخاب ناخوش گوار اور تباہی کے درمیان تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ اس دنیا میں بہت کم ایسا ہوتا ہے کہ آدمی کے لیے انتخاب خوش گوار اور ناخوش گوار کے درمیان ہو۔ زیادہ تر ایسا ہوتا ہے کہ اس کے لیے انتخاب کا موقع کم ناخوش گوار اور زیادہ ناخوش گوار کے درمیان ہوتا ہے۔ ایسی حالت میں عقل مندی یہی ہے کہ آدمی زیادہ ناخوش گوار واقعہ سے بچنے کے لیے کم ناخوش گوار واقعہ پر راضی ہو جائے۔

بیشتر انسان اسی غلط فہمی کا شکار ہو کر اپنے کو برباد کرتے رہتے ہیں۔ وہ ایک اقدام کرتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ ان کا اقدام ناپسندیدہ صورت حال کو ہٹا کر پسندیدہ صورت حال کو لانے کے لیے ہے۔ مگر جب موجودہ صورت حال ختم ہو جاتی ہے تو ان کو معلوم ہوتا ہے کہ نئی صورت حال میں وہی ناخوش گواری زیادہ بڑی مقدار میں موجود ہے جس کی کم مقدار کو برداشت نہ کرنے کی وجہ سے انھوں نے اپنا اقدام کیا تھا۔

ٹالرنس اسی حکمت کا نام ہے۔ اس دنیا میں برداشت کرنا آدمی کو زندگی کی طرف لے جاتا ہے، اور بے برداشت ہو جانا صرف موت کی طرف۔

ٹالرنس کا طریقہ ہم کو فرصتِ عمل دیتا ہے۔ اس کی وجہ سے یہ ممکن ہوتا ہے کہ ہم ناموافق حالات سے ایڈجسٹ کر کے اپنے لیے وہ موقع حاصل کر لیں، جب کہ ہم اپنی زندگی کا سفر معتدل طور پر جاری رکھ سکیں۔ اس کے برعکس، اگر ہم ٹالرنس کو چھوڑ دیں اور جو چیز بھی ہم کو ناموافق نظر آئے اس سے لڑنے لگیں تو اس کا نتیجہ صرف یہ ہوگا کہ ہم ایک چیز کو ”برائی“ کے نام سے ختم کریں گے، صرف اس لیے کہ اس کے بعد ایک اور شدید تر برائی میں اپنے آپ کو مبتلا کر لیں۔

شیر اور ہاتھی اگر ایک دوسرے کو گوارا نہ کریں تو دونوں اپنی موت کو دعوت دیں گے۔ مگر جب وہ ایک دوسرے کو گوارا کرتے ہیں تو دونوں اپنے لیے زندگی کا موقع پا لیتے ہیں۔ یہ ٹالرنس

کا سب سے بڑا فائدہ ہے۔ ٹالرنس آپ کو فرصتِ عمل دیتا ہے۔ وہ آپ کو عمل کرنے کا موقع فراہم کرتا ہے۔ اور اس دنیا میں بلاشبہ سب سے بڑی چیز فرصتِ عمل ہے۔ فرصتِ عمل سے محرومی ہی کا نام بربادی ہے۔ اور فرصتِ عمل کو پا کر اس کو استعمال کرنے ہی کا نام کامیابی۔

رواداری کا اصول

جنوری 1995ء کی پہلی تاریخ کو تمام اخباروں میں یہ خبر تھی کہ اقوام متحدہ نے 1995ء کے سال کو رواداری کا سال (Year of Tolerance) قرار دینے کا اعلان کیا ہے۔ اقوام متحدہ کے ہیڈ کوارٹر نیویارک سے جاری ہونے والے اعلانیہ میں کہا گیا تھا کہ اپنے عمل، اپنے عقیدہ اور اپنی رائے میں روادار ہونا وہ سب سے بڑا عامل ہے جس کے ذریعہ پر امن دنیا تعمیر کی جاسکتی ہے۔

موجودہ زمانہ میں جگہ جگہ نسلی ٹکراؤ، اقلیتوں کے خلاف امتیاز اور پناہ گزینوں کے خلاف نفرت کا اظہار ہو رہا ہے۔ اس کا واحد حل رواداری ہی ہے۔ نسل پرستی اور مذہبی انتہا پسندی بہت سے ملکوں میں امتیازی سلوک تک پہنچ گئی ہے۔ ان لوگوں کو ڈرایا دھمکایا جارہا ہے جو مختلف نقطۂ نظر رکھتے ہیں۔ اس طرح ان مصنفوں اور صحافیوں کے خلاف تشدد کے واقعات ہو رہے ہیں جو اظہارِ خیال کی آزادی کے حق کو استعمال کرنا چاہتے ہیں۔

اکیسویں صدی کی آمد کے موقع پر یہ زبردست چیلنج ہمارے سامنے ہے اور اس کا واحد حل رواداری ہے۔ نارواداری صرف مسائل میں اضافہ کرتی ہے۔ وہ مسائل کو ختم نہیں کرتی۔ نارواداری اگر زیادہ بڑھ جائے تو وہ عالمی امن کے لیے ایک زبردست خطرہ بن جائے گی۔

1995 as Year of Tolerance

The United Nations has proclaimed 1995 as the Year of Tolerance,saying the ability to be tolerant of the actions,

beliefs and opinions of others is a major factor in promoting world peace. Amid the resurgence of ethnic conflicts, discrimination against minorities and xenophobia directed against refugees and asylum-seekers, tolerance is the only way forward, said the statement of the United Nations Educational, Scientific and Cultural Organisation, (UNESCO). It said, racism and religious fanaticism in many countries had led to many forms of discrimination and the intimidation of those who hold contrary views. Violence and intimidation against authors, journalists and others who exercise their freedom of expression, were also on the increase along with political movements which seek to make particular groups responsible for social ills such as crime and unemployment. Intolerance is one of the greatest challenges we face on the threshold to the 21st century, said the UNESCO statement. Intolerance is both an ethnic and a political problem. It is a rejection of the differences between individuals and between cultures. When intolerance becomes organised or institutionalised it destorys democratic principles and poses a threat to world peace. (*The Hindustan Times,* January 1, 1995)

اقوام متحدہ کا یہ اعلان نہایت صحیح اور بروقت ہے۔ آج دنیا کو سب سے زیادہ جس چیز کی ضرورت ہے وہ یہی رواداری یا ٹالرنس ہے۔

زندگی کی حقیقتوں میں سے ایک حقیقت یہ ہے کہ انسان اور انسان کے درمیان فرق ہوتا ہے۔ یہ فرق ہر سطح پر پایا جاتا ہے۔ خواہ کوئی خاندان ہو یا کوئی سماج ہو یا کوئی ملک ہو، ہر جگہ ایک اور دوسرے میں فرق اور اختلاف ضرور پایا جائے گا۔ اب سوال یہ ہے کہ اس فرق اور اختلاف کی موجودگی میں اتحاد اور میل ملاپ کس طرح پیدا کیا جائے۔

کچھ لوگ سمجھتے ہیں کہ اتحاد کا ماحول اگر بنانا ہے تو اختلافات کو مٹا دینا ہوگا۔ مگر یہ رائے غلط

ہے، کیوں کہ وہ قابل عمل نہیں۔ اگر آپ پھول کے ساتھ کانٹے کو پسند نہ کرتے ہوں تو آپ ایسا نہیں کر سکتے کہ کانٹوں کو توڑ کر کانٹوں کا خاتمہ کر دیں۔ کیوں کہ آپ ڈالی کا ایک کانٹا توڑیں گے تو اس کی جگہ دوسرا کانٹا نکل آئے گا۔ حتیٰ کہ اگر آپ تمام پھولوں پر بلڈوزر چلادیں تب بھی جو نیا درخت اُگے گا، اس میں دوبارہ پھول کے ساتھ کانٹے بھی ضرور موجود ہوں گے۔

اس دنیا میں کانٹوں کو گوارا کرکے ہی پھول کو حاصل کیا جا سکتا ہے۔ اسی طرح اختلافات کو برداشت کرکے ہی پرامن سماج بنایا جا سکتا ہے۔ اس دنیا میں اختلاف کے باوجود متحد ہونے سے اتحاد حاصل ہوتا ہے، نہ کہ اختلاف کو مٹا کر متحد ہونے سے۔ کیوں کہ اختلاف کو مٹانا سرے سے ممکن ہی نہیں۔ امن کی زندگی کو حاصل کرنے کا واحد راز ہے — بے امنی کو گوارا کرنا۔

دنیا میں فرق اور اختلاف ہونا کوئی برائی کی بات نہیں۔ یہ ایک مثبت خصوصیت ہے اور اس کے بہت سے بڑے بڑے فائدے ہیں۔ باغ حیات کی خوشنمائی کے لیے ضروری ہے کہ اس میں اتحاد کے پھول کے ساتھ اختلاف کا کانٹا بھی پایا جائے۔

اس کا ایک فائدہ یہ ہے کہ اس کے ذریعہ انسانوں میں اعلیٰ اخلاقیات کی تربیت ہوتی ہے۔ اپنے ہم خیال لوگوں کے درمیان اگر آپ خوش اخلاق ہوں تو آپ نے محض ابتدائی اخلاق کا ثبوت دیا۔ لیکن اگر آپ ان لوگوں کے درمیان خوش اخلاقی کا رویہ اختیار کریں جو آپ سے الگ خیال رکھتے ہیں یا آپ کے ناقد ہیں تو آپ نے یہ استحقاق حاصل کیا کہ آپ کو اعلیٰ اخلاقی سلوک کا کریڈٹ دیا جائے۔

اسی طرح اگر سماج میں تمام لوگ بالکل ایک رائے کے ہوں۔ ان میں کوئی اختلافی بحث نہ پیدا ہوتی ہو تو ایسا سماج پتھر کے اسٹیچو کا سماج بن جائے گا۔ اس کے درمیان رہنے والوں کی فکری ترقی رک جائے گی۔ فکری ترقی ہمیشہ افکار کے ٹکراؤ کے درمیان ہوتی ہے۔ پھر جہاں افکار کا ٹکراؤ ہی نہ ہو وہاں فکری ترقی کس طرح ہو سکتی ہے۔

نزاع اور اختلاف کے مقابلہ میں رواداری کا طریقہ اختیار کرنا کوئی انفعالی صفت نہیں۔ یہ عین ایجابی صفت ہے۔ زندگی کی تعمیر میں اختلافات کا نہایت اہم رول ہے۔ اختلافات کے عمل کے دوران ہی اعلیٰ انسانی شخصیت بن کر تیار ہوتی ہے۔ اگر انسانی سماج سے اختلاف کی حالت کو ختم کر دیا جائے تو اس کے بعد اعلیٰ شخصیتوں کا بننا بھی یقینی طور پر رک جائے گا۔

اس دنیا میں کوئی بھی انسان کامل نہیں ہوتا۔ ہر آدمی کا یہ حال ہوتا ہے کہ اس میں ایک صفت ہوتی ہے تو دوسری صفت اس کے اندر نہیں ہوتی۔ یہ بھی ایک سبب ہے جس کی وجہ سے لوگوں کے درمیان فرق اور اختلاف پیدا ہو جاتا ہے۔

مگر اجتماعی زندگی کے لیے یہ اختلاف ایک رحمت ہے۔ کیوں کہ اسی اختلاف کی بنا پر یہ ممکن ہوتا ہے کہ ایک آدمی کی کمی کو دوسرا آدمی پورا کرے۔ ایک کی خصوصیت دوسرے کے کام آئے۔ اگر لوگوں کے اندر ایک دوسرے کے اختلاف کو گوارا کرنے کا مزاج ہو تو یہ اختلاف مجموعی انسانی ترقی کا ایک طاقتور وسیلہ بن جائے گا۔

1947ء کے بعد جب انڈیا میں پہلی آزاد حکومت بنی تو اس میں دو اہم لیڈر شامل تھے۔ ایک پنڈت جواہر لال نہرو، دوسرے سردار ولبھ بھائی پٹیل۔ پنڈت نہرو کے اندر مغربیت تھی اور سردار پٹیل کے اندر مشرقیت۔ اس بنا پر دونوں لیڈروں میں اکثر رائے کا اختلاف ہو جاتا تھا۔ مگر یہ اختلاف قوم کے لیے نہایت مفید ثابت ہوا۔ کیوں کہ پنڈت نہرو کی صلاحیت سے سردار پٹیل کی کمی پوری ہوئی، اور سردار پٹیل کی صلاحیت پنڈت نہرو کی کمی کو پورا کرنے کا ذریعہ بن گئی۔

یہ ایک قریبی مثال ہے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ رائے اور طبیعت کا اختلاف انسانیت کی عمومی ترقی کے لیے کتنا زیادہ ضروری ہے۔

رواداری کی خصلت آدمی کو اس سے بچاتی ہے کہ وہ اپنے وقت اور اپنی صلاحیت کو غیرضروری چیز میں ضائع کرنے لگے۔ جب آپ کسی کی خلافِ مزاج بات سے منفی اثر قبول کرلیں تو آپ کا ذہنی اعتدال بگڑ جائے گا۔ اس کے برعکس، جب اس طرح کی صورت پیش آنے پر آپ اس کا منفی اثر نہ لیں تو آپ کا ذہنی اعتدال پوری طرح برقرار رہے گا۔ آپ اپنا ایک لمحہ کھوئے بغیر ایک نارمل انسان کی طرح ہمیشہ اپنا کام جاری رکھیں گے۔ رواداری اور تحمل کی پالیسی آپ کی کارکردگی کی عمر کو بڑھاتی ہے، اور نارواداری اور عدمِ تحمل کا رویہ آپ کی کارکردگی کی عمر کو گھٹا دیتا ہے۔

رواداری یا ٹالرنس کوئی مجبورانہ فعل نہیں، وہ زندگی کا ایک مثبت اصول ہے۔ یہ ایک اعلیٰ انسانی کردار ہے۔ کسی سماج میں روادار انسانوں کا ہونا ایسا ہی ہے جیسے کسی باغ میں پھول کا ہونا۔ پھول کے بغیر باغ نہیں، اسی طرح روادار نسانوں کے بغیر ترقی یافتہ سماج نہیں۔ (آل انڈیا ریڈیو ممبئی سے 3 مارچ 1995ء کو نشر کیا گیا)

جاہلوں سے اعراض

اسلام کا ایک اہم اصول ہے جس کو قرآن میں جاہلوں سے اعراض کہا گیا ہے (7:199)۔ سیرت ابن ہشام میں ایک واقعہ نقل کیا گیا ہے:

قَدِمَ عَلَى رَسُولِ اللَّهِ -صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ- وَهُوَ بِمَكَّةَ، عِشْرُونَ رَجُلًا أَوْ قَرِيبٌ مِنْ ذَلِكَ مِنْ النَّصَارَى حِينَ بَلَغَهُمْ خَبَرُهُ مِنْ الْحَبَشَةِ. فَوَجَدُوهُ فِي الْمَسْجِدِ، فَجَلَسُوا إلَيْهِ وَكَلَّمُوهُ وَسَأَلُوهُ، وَرِجَالٌ مِنْ قُرَيْشٍ فِي أَنْدِيَتِهِمْ حَوْلَ الْكَعْبَةِ، فَلَمَّا فَرَغُوا مِنْ مَسْأَلَةِ رَسُولِ اللَّهِ صَلَّى اللّٰهُ علیه وسلم عَمَّا أَرَادُوا دَعَاهُمْ رَسُولُ اللَّهِ -صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ- إلَى اللَّهِ عَزَّ وَجَلَّ وَتَلَا عَلَيْهِمْ الْقُرْآنَ. فَلَمَّا سَمِعُوا الْقُرْآنَ فَاضَتْ أَعْيُنُهُمْ مِنْ الدَّمْعِ، ثُمَّ اسْتَجَابُوا

لِلّٰهِ، وَآمَنُوا بِهِ وَصَدَّقُوهُ، وَعَرَفُوا مِنْهُ مَا كَانَ يُوصَفُ لَهُمْ فِي كِتَابِهِمْ مِنْ أَمْرِهِ، فَلَمَّا قَامُوا عَنْهُ اعْتَرَضَهُمْ أَبُو جَهْلِ بْنُ هِشَامٍ فِي نَفَرٍ مِنْ قُرَيْشٍ فَقَالُوا لَهُمْ: خَيَّبَكُمُ اللّٰهُ مِنْ رَكْبٍ! بَعَثَكُمْ مَنْ وَرَاءَكُمْ مِنْ أَهْلِ دِينِكُمْ تَرْتَادُونَ لَهُمْ لِتَأْتُوهُمْ بِخَبَرِ الرَّجُلِ، فَلَمْ تَطْمَئِنَّ مجالسكم عنده، حَتَّى فَارَقْتُمْ دينكم وَصَدَّقْتُمُوهُ بِمَا قَالَ، مَا نَعْلَمُ رَكْبًا أَحْمَقَ مِنْكُمْ. أَوْ كَمَا قَالُوا. فَقَالُوا لَهُمْ: سَلَامٌ عَلَيْكُمْ، لَا نُجَاهِلُكُمْ، لَنَا مَا نَحْنُ عَلَيْهِ، وَلَكُمْ مَا أنتم عليه، لم نألُ أنفسَنا خيرًا (سیرۃ ابن ہشام، جلد 2، صفحہ 29)۔

اس واقعہ میں بتایا گیا ہے کہ رسول اللہ کے پاس کچھ نصرانی لوگ حبش سے آئے تھے۔ انھوں نے آپ کی باتیں سنیں، پھر انھوں نے آپ کے ہاتھ پر اسلام قبول کرلیا۔ جب وہ رسول اللہ کی صحبت سے نکلے تو ان کی ملاقات ابوجہل سے ہوگئی۔ ابوجہل نے ان سے کہا کہ تم لوگ بہت احمق ہو، تم لوگوں نے اس شخص کی بات سنی، اور پھر اس کے مومن بن گئے۔ تم کچھ لوگوں کے نمائندہ بن کر آئے تھے، تم کو اس شخص کے بارے میں تحقیق کرنا چاہیے تھا اور جاکر اپنے لوگوں کو بتانا چاہیے تھا۔ انھوں نے جواب میں اعراض کا طریقہ اختیار کیا۔ قابلِ غور ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان لوگوں کو اعراض کا فلسفہ نہیں بتایا تھا۔ لیکن انھوں نے خود سے اعراض کے طریقے پر عمل کیا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ایمان آدمی کے اندر ذہنی بیداری لاتا ہے، آدمی کے اندر وہ چیز پیدا کرتا ہے جس کو تخلیقی فکر (intellectual thinking) کہا جاتا ہے۔

رُجز سے اعراض

مکہ کے ابتدائی دور میں پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم پر یہ حکم اترا کہ لوگوں کے درمیان انذار کا کام کرو۔ اس سلسلے میں ایک مزید حکم دیا گیا: وَالرُّجْزَ فَاهْجُرْ (74:5)۔ یعنی، رجز کو

چھوڑ دو۔ رجز کو چھوڑنے کا مطلب یہ ہے کہ رجز سے اعراض کرتے ہوئے اپنے مشن کا کام مثبت طور پر جاری رکھو۔

رجز کا لفظی مطلب ہے گندگی (dirt)۔ مزید غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کا مطلب یہ ہے کہ رکاوٹ والی چیزوں سے نہ الجھتے ہوئے اپنا کام جاری رکھو۔ اتھارٹی (authority) سے ٹکراؤ نہ کرتے ہوئے اپنا مشن ممکن حدود میں پرامن طور پر جاری رکھو، بے نتیجہ عمل سے دور رہتے ہوئے نتیجہ خیز سرگرمیوں میں اپنی کوشش صرف کرو۔

عام طور پر دیکھا گیا ہے کہ لوگ جب کسی مقصد کے لیے اٹھتے ہیں تو سب سے پہلے رکاوٹوں سے لڑنا شروع کردیتے ہیں۔ وہ اتھاریٹی سے ٹکراؤ کو اپنے عمل کا آغاز سمجھ لیتے ہیں۔ اس طرح لوگوں کی طاقتیں ضائع ہوتی ہیں۔ نفرت اور تشدد بڑھتا ہے۔ منفی سرگرمیاں فروغ پاتی ہیں، لیکن مثبت سرگرمیوں کو فروغ پانے کا موقع نہیں ملتا۔ جو ملنے والی چیز ہے اس کو حاصل کرنے کی کوشش نہیں کی جاتی، البتہ جو چیز ملنے والی نہیں، اس پر ساری طاقت خرچ کردی جاتی ہے۔ یہ بلاشبہ غیر حکیمانہ طریقہ ہے۔ لیکن پوری تاریخ میں لوگ اسی طریقے پر عمل کرتے رہے ہیں۔

اصل یہ ہے کہ ہر صورت حال میں مواقع (opportunities) موجود رہتے ہیں۔ مواقع کو استعمال کرکے فوراً ہی نتیجہ خیز عمل شروع کیا جاسکتا ہے۔ لیکن غیر دانش مندانہ سوچ کی بنا پر لوگوں کا دھیان فوراً مسائل (problems) کی طرف چلا جاتا ہے۔ اس معاملے میں قرآن نے ایک ایسی رہنمائی دی جو سرتاسر دانش مندی پر قائم ہے۔ یعنی مسائل اور مواقع کو ایک دوسرے سے ڈی لنک (delink) کرنا، مسائل کو نظرانداز کرتے ہوئے مواقع کو استعمال کرنا:

ignore the problem, avail the opportunity

اعراض کا طریقہ

سورہ الاعراف میں اہل ایمان کو چند اخلاقی نصیحتیں کی گئی ہیں۔ ان میں سے ایک نصیحت یہ ہے کہ باہمی معاملات میں اعراض کا طریقہ اختیار کیا جائے۔ آیت کے الفاظ یہ ہیں: خُذِ الْعَفْوَ وَأْمُرْ بِالْعُرْفِ وَأَعْرِضْ عَنِ الْجَاهِلِينَ (7:199)۔ یعنی، درگزر کرو، نیکی کا حکم دو اور نادانوں سے اعراض کرو۔

اجتماعی زندگی میں بار بار ایسا ہوتا ہے کہ ایک شخص اور دوسرے شخص کے درمیان اختلاف پیدا ہوتا ہے۔ ایک دوسرے کے درمیان بحث اور تکرار شروع ہو جاتی ہے۔ ایسے موقع پر درست طریقہ کیا ہے۔ وہ یہ ہے کہ اگر فریق ثانی سنجیدہ ہو، وہ مسئلہ کو حقیقی طور پر سمجھنا چاہتا ہو تو ایسی صورت میں دلیل کے ذریعہ اس کے سامنے اپنا موقف رکھنا چاہیے۔ اور اگر وہ سنجیدہ نہ ہو تو ایسی حالت میں دلیل اور منطق اس کو متاثر نہ کرسکے گی۔ وہ ہر دلیل کے جواب میں کچھ خود ساختہ الفاظ بول دے گا اور پھر یہ سمجھے گا کہ اس نے پیش کردہ دلیل کو رد کر دیا ہے۔

اس دوسری صورت میں درست طریقہ یہ ہے کہ اعراض (avoidance) کے اصول پر عمل کیا جائے۔ اعراض کا مقصد دراصل یہ ہے کہ آدمی کو اس کے ضمیر کے حوالہ کر دیا جائے۔ عین ممکن ہے کہ جو مقصد دلیل کے ذریعہ پورا نہیں ہوا وہ ضمیر کی خاموش آواز کے ذریعہ پورا ہو جائے۔

عملی نزاع کو ختم کرنے کے لیے بھی سب سے زیادہ موثر ذریعہ اعراض ہے۔ عملی نزاع کے وقت اگر اعراض کا طریقہ اختیار کیا جائے تو نزاع اپنے پہلے ہی مرحلہ میں ختم ہو جائے گی۔ جب کہ اعراض نہ کرنے کا نقصان یہ ہے کہ نزاع بڑھتی رہے، یہاں تک کہ چھوٹی برائی (lesser evil) کی جگہ بڑی برائی (greater evil) کا سامنا کرنا پڑے۔

اعراض کوئی سادہ چیز نہیں، وہ ایک اعلیٰ اخلاقی روش ہے۔ وہ ایک اعلیٰ انسانی طریقہ

ہے۔ کوئی شخص جب اشتعال کی صورت پیش آنے پر بھڑک اٹھے تو وہ ثابت کرتا ہے کہ وہ ایک پست انسان ہے۔ اس کے برعکس، جو آدمی اشتعال کی صورت پیش آنے پر نہ بھڑکے۔ وہ ایسا کرکے یہ ثابت کررہا ہے کہ وہ ایک بلند انسانی مرتبہ پر ہے۔ وہ صحیح معنوں میں اعلیٰ انسان کہے جانے کا مستحق ہے۔

نفرت، دہشت گردی

نفرت (hate) اور دہشت گردی (terrorism) دونوں ایک ہی حقیقت کے دو رخ ہیں۔ نفرت، منفی سوچ کا نتیجہ ہے، اور دہشت گردی منفی عمل کا نتیجہ۔ نفرت منفعل دہشت گردی (passive terrorism) ہے، اور دہشت گردی عملی نفرت (terrorism in action) کا نام ہے۔ منفی سوچ داخلی طور پر نفرت ہے اور خارجی اعتبار سے دہشت گردی۔ نفسیاتی اعتبار سے دیکھیے تو جو لوگ نفرت کی باتیں کرتے ہیں، وہ زیادہ بڑے مجرم ہیں۔ کیوں کہ یہ لوگ نفرت کی بولی بول کر لوگوں کو مشتعل کرتے رہتے ہیں اور یہی اشتعال مزید بھڑک کر دہشت گردی کی صورت اختیار کرلیتا ہے۔

منفی سوچ کیا ہے۔ منفی سوچ نفسیاتی ہلاکت کا دوسرا نام ہے۔ جو لوگ انسانوں کے اندر منفی سوچ پیدا کریں، وہ انسانیت کے سب سے بڑے دشمن ہیں۔ کیوں کہ منفی سوچ آدمی کے اندر تعمیری سوچ کا خاتمہ کردیتی ہے۔ ایسے لوگ سماج کے اندر معتدل مزاج کے ساتھ نہیں رہ سکتے، اور جن لوگوں کے اندر تعمیری سوچ اور معتدل مزاج نہ ہو، وہ کبھی ترقی نہیں کرسکتے۔ اور اگر وہ ترقی کریں گے تو منافق بن کر ترقی کریں گے، یعنی دل میں تو لوگوں کو برا سمجھنا لیکن ظاہری طور پر لوگوں کے ساتھ مفاہمت (adjustment) کرکے اُن سے مادّی فائدہ اٹھانا۔

دہشت گردی بلاشبہ ایک بھیانک برائی ہے، لیکن دہشت گردی کو گن اور بم کی طاقت

سے ختم نہیں کیا جا سکتا۔ دہشت گردی کو ختم کرنے کا مؤثر طریقہ صرف ایک ہے، اور وہ ہے لوگوں کی منفی سوچ کو بدلنا اور ان کے اندر مثبت سوچ پیدا کرنا۔ جب تک لوگوں کے ذہن کو نہ بدلا جائے، دہشت گردی کا خاتمہ نہیں ہو سکتا۔ منفی سوچ ہمیشہ شکایتوں کو لے کر پیدا ہوتی ہے۔ لوگ اِن شکایتوں کو کسی گروہ کی "سازش" سمجھ کر اُس گروہ کے خلاف ہو جاتے ہیں، مگر حقیقت یہ ہے کہ شکایت، فطرت کے نظام کا حصہ ہے، شکایت کے اسباب کبھی ختم ہونے والے نہیں۔ اِس لیے صحیح طریقہ یہ ہے کہ شکایت سے اوپر اٹھ کر سوچا جائے، شکایت کے باوجود لوگوں سے خیر خواہی اور ہمدردی کا تعلق قائم کیا جائے۔

فساد اور اسبابِ فساد

کوئی فساد (riot) جب ہوتا ہے تو وہ اچانک نہیں ہوتا۔ ہر فساد سے پہلے اُس کے اسباب ظاہر ہوتے ہیں جو دھیرے دھیرے فساد بن جاتے ہیں۔ گویا کہ ہر فساد دراصل اسبابِ فساد کا نقطۂ انتہا (culmination) ہوتا ہے۔ اِس لیے فساد کے خلاف اصلاحی کوشش کا آغاز، ظہورِ فساد سے پہلے ہونا چاہیے، نہ کہ ظہورِ فساد کے بعد۔ اسلام میں نہی عن المنکر کا مطلب یہی ہے۔ نہی عن المنکر کا حکم اِسی لیے دیا گیا ہے کہ فساد سے پہلے اسبابِ فساد کو روکا جائے، تا کہ فساد کی نوبت نہ آئے۔

حقیقت یہ ہے کہ اسبابِ فساد کو ختم کرنے کی کوشش کرنا، اصلاح ہے۔ اور فساد ہو جانے کے بعد متحرک ہونا صرف لیڈری ہے۔ جو لوگ اسبابِ فساد کے ظہور کے وقت خاموش رہیں اور جب عملاً فساد ہو جائے تو وہ جوش وخروش کے ساتھ حرکت میں آ جائیں، ایسے لوگ خود بھی فساد انگیزی کے مجرم ہیں۔ اِس قسم کے لوگوں کو اصلاحِ فساد کا کریڈٹ (credit) نہیں مل سکتا۔ اصلاحِ فساد کا کام، فساد سے پہلے شروع ہوتا ہے، نہ کہ عملی طور پر فساد ہو جانے کے بعد۔

اسبابِ فساد کیا ہیں۔ جب کسی سماج میں نفرت کی بولی بولی جائے، جب ایسا ہو کہ کسی گروہ کو ظالم اور دشمن بتا کر اس کے خلاف بُری خبریں پھیلائی جائیں، جب کسی سماج میں ایسے لوگ اس کے لیڈر بن جائیں جو ذاتی ذمے داریوں (duties) کی بات نہ کرتے ہوں، بلکہ وہ حقوق (rights) کو لے کر اپنی محرومی کی داستان سناتے ہوں، جب اپنے لوگوں کی برائیوں پر اُن کو نہ روکا جائے اور دوسروں کے خلاف شکایت اور احتجاج کی مہم چلائی جائے، تو سمجھ لیجیے کہ ایسے سماج میں اسبابِ فساد کی آگ بھڑکائی جارہی ہے، جو کسی نہ کسی دن بڑھ کر عملی فساد کی صورت اختیار کرلے گی۔

صحیح طریقہ یہ ہے کہ قوم کے رہ نما خود اپنی قوم کی اصلاح پر ساری توجہ لگائیں، نہ کہ دوسری قوم کے خلاف لوگوں کے اندر منفی جذبات پیدا کریں۔ جو لوگ ایسا نہ کریں، وہ مفسد ہیں، نہ کہ مُصلح۔ فساد کا علاج اسبابِ فساد کی روک تھام ہے، نہ کہ فساد کے خلاف شکایت اور احتجاج۔

فخر اور نفرت

انسان کا مطالعہ بتاتا ہے کہ ہر عورت اور ہر مرد کے اندر ایک نفسیات مشترک طور پر موجود رہتی ہے — فخر اور نفرت۔ فخر کا جذبہ اپنے لیے، اور نفرت کا جذبہ دوسروں کے لیے۔ ہر آدمی اِنھیں دو احساسات کے درمیان جیتا ہے اور اِنھیں دو احساسات کے درمیان مرجاتا ہے۔

یہ دونوں جذبات اتنے قوی ہیں کہ فخر کا اگر صرف ایک ذرہ اسے مل جائے تو اس کو لے کر وہ اپنے فخر کا گنبد کھڑا کردیتا ہے۔ اِس طرح اگر اُس کو نفرت کا ایک ذرہ مل جائے تو اُس کو لے کر وہ دوسروں کو نفرت کا موضوع بنا لیتا ہے۔ یہ دونوں جذبے اتنا زیادہ عام ہیں کہ اُس کو انسان کا عالمی مزاج کہا جاسکتا ہے۔

اِس مزاج کا یہ نتیجہ ہے کہ ہر آدمی اپنے بارے میں فخر کی نفسیات میں جیتا ہے، اور دوسرے

کے بارے میں نفرت کی نفسیات ہیں۔ یہ دونوں جذبات دھیرے دھیرے انسان کے لاشعور کا حصہ بن جاتے ہیں، یہاں تک کہ انسان کا یہ حال ہوجاتا ہے کہ اُس کو اِس معاملے میں سوچنے کی ضرورت نہیں ہوتی۔ ہر صورتِ حال میں یہ چیزیں اپنے آپ اس کے اندر پیدا ہوتی رہتی ہیں۔ ہر صورتِ حال اپنے آپ اُس کو اپنے لیے فخر کی غذا دینے والی بن جاتی ہے۔

اِس طرح ہر صورتِ حال اپنے آپ اُس کو دوسروں کے بارے میں نفرت کی غذا دیتی رہتی ہے۔ یہ دوطرفہ نفسیاتی عمل آدمی کے اندر اِس طرح مسلسل طور پر جاری رہتا ہے کہ اِس میں اس کی کنڈیشننگ ہوجاتی ہے۔

یہ برائی آدمی کے اندر سوچے بغیر اپنے آپ پیدا ہوتی ہے۔ لیکن جب اُس کو ختم کرنا ہو تو آدمی کو سوچ کر اسے ختم کرنا ہوتا ہے۔ یہ اِس معاملے کا سب سے زیادہ نازک پہلو ہے۔ اِس معاملے میں کوئی شخص اپنی اصلاح اُسی وقت کرسکتا ہے، جب کہ وہ شعوری طور پر اس کو دریافت کرلے، وہ شعوری طور پر اپنے اوپر اصلاح کا عمل کرنے لگے۔

مسلمان عالمی محاصرہ میں

موجودہ زمانے کے تعلیم یافتہ مسلمانوں کا عام مزاج یہ ہے کہ مسلمان عالمی سطح پر زیر محاصرہ (under seige) ہیں۔ اُن کا خیال ہے کہ تمام قومیں مسلمانوں کی مخالف ہیں۔ تمام قوموں نے مسلمانوں کے خلاف سازش کررکھی ہے۔ تمام قومیں متفقہ طور پر یہ چاہتی ہیں کہ مسلمان دوبارہ ابھرنے نہ پائیں، چنانچہ وہ یہ سمجھتے ہیں کہ ہر سطح پر مسلمانوں کے خلاف کارروائیاں جاری ہیں۔

یہ سوچ سرتاسر ایک بے بنیاد سوچ ہے۔ خالص علمی اعتبار سے اِس کی کوئی حقیقت نہیں۔ اصل یہ ہے کہ موجودہ دنیا کا نظام خود خالق کے نقشے کے مطابق، مسابقت (competition) اور چیلنج پر قائم ہے۔ یہ فطرت کا نظام ہے۔ اس نظام کی بنا پر کوئی

آگے بڑھتا ہے اور کوئی پیچھے ہو جاتا ہے، کوئی پانے والا بنتا ہے اور کوئی کھونے والا۔ یہ نظام اِس لیے ہے تاکہ زندگی کی سرگرمیاں جاری رہیں، تاکہ ہر فرد اور ہر گروہ کو عمل کا محرک (incentive) ملتا رہے۔

فطرت کے اِس نظام کی بنا پر ایسا ہوتا ہے کہ ایک گروہ اپنی کوشش کے ذریعے آگے بڑھ جاتا ہے اور وہ دوسرے گروہ کو پیچھے چھوڑ دیتا ہے۔ ایسی حالت میں پچھڑے ہوئے گروہ کو چاہیے کہ وہ اپنے عمل کی نئی منصوبہ بندی کرے، وہ کھوئی ہوئی بازی کو دوبارہ جیتنے کے لیے اپنی ساری توانائی خرچ کردے۔ زندگی کو چیلنج سمجھنا آدمی کو نیا جذبۂ عمل دیتا ہے۔ اِس کے برعکس، سازش اور دشمنی کا نظریہ آدمی کو منفی نفسیات میں مبتلا کرکے اس کو زندگی کی دوڑ میں پیچھے ڈال دیتا ہے۔

موجودہ زمانے کے مسلمانوں کا مسئلہ یہ ہے کہ انھوں نے اپنے رہنماؤں کی غلط رہنمائی کے نتیجے میں چیلنج کو محاصرہ سمجھ لیا۔ انھوں نے ایک مثبت واقعے کو خالص منفی رخ دے دیا۔ مسلمانوں کی یہی غلط سوچ ہے جس کی اصلاح میں ان کی ترقی کا راز چھپا ہوا ہے۔ یہی وہ مقام ہے جہاں موجودہ زمانے کے مسلمان زوال کا شکار ہوئے ہیں۔ اور یہی وہ مقام ہے جہاں وہ اپنی اصلاح کرکے دوبارہ عروج تک پہنچ سکتے ہیں۔

شکایت کو نفرت تک پہنچانا

ایک روایت حدیث کی کتابوں صحیح مسلم، ابوداؤد، الترمذی، ابن ماجہ، اور مسند احمد میں آئی ہے۔ صحیح البخاری کے الفاظ یہ ہیں:

عَنْ أَبِي أَيُّوبَ الأَنْصَارِيِّ: أَنَّ رَسُولَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ: لاَ يَحِلُّ لِرَجُلٍ أَنْ يَهْجُرَ أَخَاهُ فَوْقَ ثَلاَثِ لَيَالٍ، يَلْتَقِيَانِ: فَيُعْرِضُ هَذَا وَيُعْرِضُ هَذَا،

وَخَيْرُهُمَا الَّذِي يَبْدَأُ بِالسَّلاَمِ (صحیح البخاری، حدیث نمبر6077)۔ یعنی، ابوایوب انصاری سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ کسی انسان کے لیے یہ جائز نہیں کہ وہ اپنے بھائی کو تین دن سے زیادہ چھوڑے رہے۔ دونوں ملیں اور پھر وہ ایک دوسرے سے منہ پھیر لیں۔ دونوں میں بہتر وہ ہے جو سلام کرنے میں پہل کرے۔

انسانی تعلقات میں کبھی ایسا ہوتا ہے کہ ایک شخص کو دوسرے شخص سے ناخوش گوار تجربہ پیش آتا ہے۔ دونوں کے درمیان ناگواری بڑھتی ہے، یہاں تک کہ وہ ایک دوسرے سے ترکِ تعلق کر لیتے ہیں۔ وہ ایک دوسرے سے ملنا اور سلام کرنا بھی چھوڑ دیتے ہیں۔

یہ طریقہ اسلامی شریعت میں جائز نہیں۔ ایسا کرنے والے لوگ سخت گنہ گار ہیں، وہ خدا کے یہاں اِس کے لیے پکڑے جائیں گے۔

اِس معاملے میں صحیح طریقہ یہ ہے کہ اگر دونوں کے درمیان تلخی کا سبب غلط فہمی ہے تو غلط فہمی کو دور کر کے تعلق کو درست کر لیا جائے۔ اور اگر ایک آدمی دوسرے کے بارے میں یہ سمجھے کہ وہ بد دیانت ہے تو ایسی حالت میں اُس کے لیے صرف یہ جائز ہے کہ وہ اُس سے مزید کوئی عملی معاملہ نہ کرے۔ لیکن جہاں تک ظاہری تعلق یا سلام وکلام کی بات ہے، وہ بدستور جاری رہنا چاہیے۔

اِس طرح کے معاملات میں آدمی کو چاہیے کہ وہ سماجی تعلق کو بدستور برقرار رکھے۔ اِس کے آگے کا جو معاملہ ہے، وہ اُس کو خدا کے حوالے کر دے۔ اِس طرح کے معاملے میں کسی سے سلام وکلام بند کرنا شکایت کو نفرت تک پہنچانا ہے، اور شکایت کو نفرت تک پہنچانا کسی کے لیے جائز نہیں۔

نصفِ ثانی کی سیاست

کچھ مسلم نوجوان مجھ سے ملنے کے لیے آئے۔ وہ نہایت جوش میں تھے اور ”غیر قوم“ کے ظلم کی شکایت بیان کرر ہے تھے۔ اُن کا کہنا تھا کہ ہم کو اِس ظلم کے خلاف کچھ کرنا چاہیے۔ میں نے کہا کہ اِس معاملے میں آپ کو سب سے پہلے یہ کرنا ہے کہ آپ اُس کو ظلم سمجھنا چھوڑ دیں۔ آپ دوسروں کے خلاف احتجاج کرنے کے بجائے خود اپنے آپ پر نظر ثانی کریں۔

میں نے کہا کہ آپ سب نوجوان لوگ ہیں۔ اگر میں آپ کو مارنے لگوں تو آپ کیا کریں گے۔ آپ میرے اوپر جوابی حملہ کریں گے اور مار کر چلے جائیں گے۔ اب اگر میں لوگوں سے یہ کہوں کہ کچھ مسلم نوجوان میرے پاس آئے تھے، وہ مجھ کو مار کر بھاگ گئے، تو یہ جھوٹ ہوگا۔ کیوں کہ اصل حقیقت یہ ہوگی کہ میں نے آپ کو مارا، اس کے بعد آپ نے جوابی طور پر مجھ کو مارا۔ ایسی حالت میں اصلی قصوروار میں ہوں۔ اگر میں اپنی بات نہ کہوں اور آپ نے جو کچھ کیا، میں صرف اُس کو دہراؤں تو یہ اصل واقعے کے نصف حصے کو دہرانا ہوگا۔ یہ کہانی کے نصف اول (first half) کو چھوڑ کر اس کے نصف ثانی (second half) کا چرچا کرنا ہوگا، اور اِس طرح نصف ثانی کا چرچا کرنا، عقل کے بھی خلاف ہے، اور اسلام کے بھی خلاف۔

موجودہ زمانے کے تمام لکھنے اور بولنے والے لوگ اِسی کے مطابق لکھتے اور بولتے ہیں۔ وہ نصف ثانی کی سیاست چلا رہے ہیں۔ اِس قسم کی سیاست اور صحافت، یا اِس قسم کا جلسہ اور جلوس بلا شبہ لغو بھی ہے اور غیر مفید بھی۔ عقل اور شریعت کے اعتبار سے وہ ایک مجرمانہ کام کی حیثیت رکھتا ہے، اور نتیجے کے اعتبار سے وہ سرتاسر بے فائدہ کام ہے۔ اس قسم کی نصف ثانی کی سیاست کا کوئی مثبت نتیجہ اِس دنیا میں نکلنے والا نہیں۔ مزید یہ کہ آخرت

کے اعتبار سے وہ ایک گناہ کا کام ہے۔ قرآن کی اصطلاح میں وہ تطفیف (83:1) ہے۔ اور قرآن کے مطابق، جو لوگ تطفیف کا عمل کریں، اُن کے لیے قانونِ الٰہی میں صرف وَیل مقدر ہے، نہ کہ کوئی خیر۔

مقامِ نزاع سے پیچھے ہٹنا

تجربہ بتاتا ہے کہ جب دو فریقوں کے درمیان کسی مسئلے پر نزاع پیدا ہوجائے تو آگے جانے کا راستہ ہمیشہ بند ہوجاتا ہے۔ البتہ پیچھے لوٹنے کا راستہ ہمیشہ کھلا رہتا ہے۔ ایسے موقع پر آگے بڑھنے کی کوشش کرنا، صرف اپنے نقصان میں اضافہ کرنے کے ہم معنی ہوتا ہے۔ ایسے موقع پر آدمی کے لیے صرف ایک ہی چوائس باقی رہتا ہے، اور وہ یوٹرن (U-Turn) کا چوائس ہے، یعنی پیچھے کی طرف لوٹ جانا۔

ایسے موقع پر پیچھے کی طرف لوٹنے کا مطلب پسپائی نہیں، بلکہ یہ تدبیر کا ایک معاملہ ہے۔ یہ پیچھے ہٹ کر دوبارہ آگے بڑھنے کی ایک تدبیر ہے۔ عقل مند آدمی ہمیشہ ایسے موقع پر یوٹرن کا چوائس لیتا ہے۔ مثال کے طور پر 1799ء میں سلطان ٹیپو اور انگریزوں کے درمیان نزاع پیدا ہوئی۔ سلطان ٹیپو نے یوٹرن کا چوائس نہیں لیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ان کی پوری سلطنت تباہ ہوگئی۔ اِس کے برعکس، حیدرآباد کی مسلم ریاست نے اِسی طرح کی صورتِ حال میں، انگریزوں کے مقابلے میں یوٹرن کا چوائس لے لیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ وہ سو سال تک کامیابی کے ساتھ باقی رہی۔

عقل مند انسان وہ ہے جو نزاع کی صورتِ حال کو تجربہ کے خانے میں ڈالے۔ وہ نتیجہ (result) کی بنیاد پر اپنے عمل کی نئی منصوبہ بندی کرے۔ وہ اپنے جذبات کو اپنا رہنما نہ بنائے، بلکہ عملی حالات کی بنیاد پر اپنے عمل کی منصوبہ بندی کرے۔ وہ پیچھے کی طرف مارچ کرنے کو بھی اتنا ہی اہم سمجھے، جتنا کہ اِس سے پہلے وہ آگے کی طرف مارچ کو اہم سمجھے ہوئے تھا۔

ایسا کرنے والا آج کے دن کو کھو کر، کل کے دن کو پالیتا ہے اور جو ایسا نہ کرے، وہ آج کے دن کو بھی کھوئے گا اور کل کے دن کو بھی۔ زندگی میں اکثر ایسا ہوتا ہے کہ پیش قدمی کا راستہ پچھلے مقام پر ہوتا ہے، مگر آدمی اُس کو اگلے مقام پر ڈھونڈنے لگتا ہے۔ حالاں کہ قانونِ فطرت کے مطابق، ایسا ہونا ممکن نہیں — مقامِ نزاع سے پیچھے ہٹنا، دانش مندی بھی ہے اور بہادری بھی۔ اس کے برعکس، مقامِ نزاع پر ٹکراؤ شروع کر دینا، نہ دانش مندی ہے اور نہ بہادری۔

ردِّ عمل اسلام میں نہیں

بہت سے لوگ جنگ اور تشدد میں مبتلا ہیں، انفرادی سطح پر بھی اور اجتماعی سطح پر بھی۔ اُن سے کہا جائے کہ تم یہ تباہ کُن کام کیوں کر رہے ہو، تو وہ یہ جواب دیں گے کہ — یہ تو ایک فطری ردّ عمل ہے۔ جب کسی گروہ کے خلاف ظلم اور ناانصافی کا واقعہ پیش آئے گا، تو اس کے اندر ضرور جوابی ردّ عمل (reaction) پیدا ہوگا۔ وہ گن اور بم استعمال کرے گا۔ یہاں تک کہ آخر کار وہ خودکُش بم باری (suicide bombing) کا طریقہ اختیار کرے گا۔ اگر ہمارے متشددانہ ردّ عمل کو ختم کرنا ہے، تو فریقِ ثانی کی طرف سے کیے جانے والے ظلم اور ناانصافی کو ختم کرنا ہوگا، ورنہ ہماری طرف سے متشددانہ کارروائیوں کا سلسلہ برابر جاری رہے گا۔ ردّ عمل (reaction) کو ختم کرنا ہے تو پہلے عمل (action) کو ختم کیجیے۔ اِس معاملے میں یک طرفہ نصیحت سے کوئی فائدہ ہونے والا نہیں۔

ردّ عمل کا یہ فلسفہ سرتاسر غیر فطری ہے۔ ایسے لوگوں کی اصل غلطی یہ ہے کہ انھوں نے اپنے ذہنوں میں عمل کا غلط معیار قائم کرلیا ہے۔ عمل کا صحیح معیار یہ ہے کہ عمل کے بعد پیش آنے والے نتیجہ (result) کو دیکھا جائے۔ صحیح عمل کی پہچان یہ ہے کہ وہ عمل کرنے والوں کے لیے مفید نتیجہ پیدا کرے۔ جو عمل مفید نتیجہ پیدا نہ کرے، وہ سرے سے قابلِ ترک ہے۔

یہ ایک فطری حقیقت ہے کہ کوئی عمل یا تو مفید نتیجہ پیدا کرتا ہے، یا وہ عمل کرنے والوں کے لیے کاؤنٹر پروڈکٹیو (counter productive) ثابت ہوتا ہے۔ اِس معاملے میں تیسری کوئی صورت نہیں۔ عملی اقدام وہی درست ہے جو نتیجہ خیز ہو۔ جو عملی اقدام نتیجہ خیز نہ ہو، وہ صرف اپنی تباہی میں اضافے کے ہم معنیٰ ہے، اور اپنی تباہی میں اضافہ کبھی کسی دانش مند کا کام نہیں ہوسکتا۔

کسی عمل کے مقابلے میں جذباتی ردِّ عمل، اُس عمل کا جواب نہیں۔ عمل کا حقیقی جواب یہ ہے کہ پہلے صورتِ حال کا جائزہ لیا جائے، مثبت ذہن کے ساتھ نتیجہ خیز منصوبہ بندی کی جائے، پھر ٹکراؤ کے بجائے تعمیر کے اصول پر اپنے عمل کا آغاز کیا جائے۔ یہی صحیح اسلامی طریقہ ہے۔

نفرت کا بم

ہر آدمی کے اندر ایک شیطان چھپا ہوا ہے۔ یہ شیطان، نفرت کا بم (hate bomb) ہے۔ ہر آدمی امکانی طور پر نفرت کا بم اپنے اندر لیے ہوئے ہے۔ نفرت کا یہ بم عام حالات میں، انسان کے اندر سویا ہوا ہوتا ہے۔ لیکن اگر کسی طرح اُس کو جگا دیا جائے تو اچانک وہ بے پناہ ہو کر بھڑک اٹھتا ہے۔ واقعات بتاتے ہیں کہ اِس معاملے میں کسی عورت یا مرد کا کوئی استثنا نہیں۔

اِس صورتِ حال کا مطلب، دوسرے لفظوں میں، یہ ہے کہ ہر انسان ایک انتہائی آتش گیر (highly inflammable) مادّہ کی حیثیت رکھتا ہے۔ کسی سماج میں اگر دس ہزار آدمی ہیں، تو وہ گویا کہ دس ہزار چلتے پھرتے آتش گیر مادّے کا مجموعہ ہیں۔ یہ دراصل ذاتی مفاد (personal interest) ہے جو لوگوں کو مزاجاً متشدد ہونے کے باوجود، مجبورانہ طور پر امن پسند بنائے رہتا ہے۔ ایسی صورت میں قیادت (leadership) کا کام ایک بے حد مشکل کام ہے۔ جس قائد کے پاس صرف شکایت اور احتجاج کا نعرہ ہو، اُس کو ہرگز میدان

میں نہیں آنا چاہیے۔ کیوں کہ اس کا منفی نعرہ لوگوں کو بھڑکائے گا اور آخرکار، سماج کا وہ حال ہوجائے گا، جیسے ایک مقام پر بہت سے آتش گیر مادّے ہوں اور وہ اچانک بھڑک اٹھیں۔

قائد پر لازم ہے کہ اگر اس کے پاس محبت کا نعرہ ہے، تب تو وہ اپنی تحریک لے کر سماج میں آئے۔ اور اگر اُس کے پاس صرف نفرت اور شکایت کی باتیں ہوں، تو اس کے لیے فرض کے درجے میں ضروری ہے کہ وہ اجتماعی تحریک ہرگز نہ شروع کرے۔ اس کے بجائے، وہ اپنے آپ کو اپنے گھر کے اندر محصور کرلے۔ یہی اس کے لیے نجات کی واحد صورت ہے۔

اجتماعی تحریکیں دو قسم کی ہوتی ہیں — مثبت تحریک، اور منفی تحریک۔ مثبت تحریک وہ ہے جو ذاتی ذمّے داری (duty) کی بنیاد پر اٹھائی جائے۔ ایسی تحریک ایک صالح تحریک ہے۔ منفی تحریک وہ ہے جو حقوق طلبی اور احتجاج کی بنیاد پر اٹھائی جائے۔ ایسی تحریک ایک غیر صالح تحریک ہے۔ صالح تحریک کا نتیجہ ہمیشہ اچھا نکلتا ہے، اور غیر صالح تحریک ہمیشہ بُرے انجام پر ختم ہوتی ہے۔

مبنی برنظام یا مبنی برنفرت

اسلام کے لیے نظام (system) کی اصطلاح ایک نئی اصطلاح ہے۔ یہ اصطلاح بیسویں صدی عیسوی میں کچھ مسلم رہنماؤں نے ایجاد کی۔ شاہ ولی اللہ دہلوی (وفات 1762ء) نے اپنی کتاب حجۃ اللہ البالغہ میں "فکُّ کلِّ نظام" کا لفظ استعمال کیا ہے۔ لیکن اس جملے میں یقینی طور پر نظام سے مراد اسلامی نظام نہیں ہے۔ اِس میں لفظ 'نظام' کو اس کے عمومی معنیٰ میں استعمال کیا گیا ہے۔ اِسی تصور کو اقبال نے اپنے ایک شعر میں اس طرح بیان کیا ہے:

گفتند جہانِ ما، آیا بتو می سازد　　گفتم کہ نمی سازد، گفتند کہ برہم زن

اسلام کی تعبیر نظام سے کرنا کوئی سادہ بات نہیں، یہ دراصل ایک سنگین انحراف کے ہم معنی ہے۔ جب آپ کہتے ہیں کہ اسلام ایک مکمل نظام ہے، تو اِس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ اسلام کا

اتباع جس طرح عقیدہ اور عبادت اور اخلاق کے معاملے میں کرنا ہے، اسی طرح اس کا اتباع قانون اور سیاست کے معاملے میں بھی لازماً کرنا ہے۔ مگر یہ بریکٹ کوئی سادہ بریکٹ نہیں۔ کیوں کہ عقیدہ اور عبادت اور اخلاق کے معاملے میں اسلام کا اتباع ایک شخص صرف اپنے ذاتی فیصلے کے تحت کرسکتا ہے۔ لیکن قانون اور سیاسی اقتدار کے معاملے میں اسلام کا اتباع اول دن ہی سے ٹکراؤ کے ہم معنی بن جاتا ہے۔ کیوں کہ سیاسی اقتدار ہمیشہ کسی کے ہاتھ میں ہوتا ہے، اور اسلام کو ''کامل نظام'' کے طور پر نافذ کرنے والوں کے لیے لازم ہوجاتا ہے کہ وہ سیاسی حاکموں کو اقتدار سے بے دخل کریں اور ان کی جگہ مسلم اقتدار کو قائم کریں۔

حقیقت یہ ہے کہ اسلام کی نظامی تعبیر، اسلام کی متشددانہ تعبیر کا خوب صورت نام ہے۔ اِس تعبیر کے لازمی نتیجے کے طور پر یہ ہوتا ہے کہ مفروضہ باطل پسندوں کے خلاف نفرت کا مزاج بنتا ہے، اُن کے خلاف تشدد کا کلچر وجود میں آتا ہے، دوسروں کے خلاف جارحیت کی فضا قائم ہوتی ہے اور آخر کار یہ معاملہ خودکش بم باری (suicide bombing) تک پہنچ جاتا ہے۔ اسلام کی نظامی تعبیر میں انتہا پسندی، نفرت، ٹکراؤ اور تشدد اِس طرح شامل ہیں کہ دونوں کو ایک دوسرے سے جدا نہیں کیا جاسکتا۔

اختلاف کے وقت

اختلاف زندگی کا ایک حصہ ہے۔ مختلف اسباب سے لوگوں کے درمیان اختلاف ہوتا رہتا ہے۔ جس طرح عام لوگوں کے درمیان اختلاف ہوتا ہے، اسی طرح مخلص اور مومن کے درمیان بھی اختلاف پیش آتا ہے۔ اختلاف کے ہونے کو روکا نہیں جاسکتا۔ البتہ یہ ہو سکتا ہے کہ اختلاف کے باوجود آدمی اپنے آپ کو صحیح رویہ پر قائم رکھے۔

مومن وہ ہے جو اختلاف کو نیت کا مسئلہ نہ بنائے۔ اختلاف کو اسی دائرہ تک محدود رکھے جہاں اختلاف پیدا ہوا ہے۔ ایک معاملہ میں اختلاف کی وجہ سے کسی کو ہر معاملہ میں

غلط سمجھ لینا، ایک معاملہ میں اختلاف پیش آنے کے بعد اس کو منافق، بدنیت اور غیر مخلص کہنے لگنا، یہ سراسر غیر اسلامی طریقہ ہے۔

اختلاف پیش آنے کے وقت تعلقات ختم کرنا صحیح نہیں۔ اختلافی مسئلہ پر سنجیدہ بحث جاری رکھتے ہوئے باہمی تعلقات کو بدستور قائم رکھنا چاہیے۔ اختلاف والے شخص سے سلام وکلام بند کرنا یا اس کے ساتھ اٹھنا بیٹھنا چھوڑ دینا کسی بھی حال میں درست نہیں۔

موجودہ دنیا میں ہر چیز برائے امتحان ہوتی ہے۔ اسی طرح اختلاف بھی امتحان کے لیے ہے۔ آدمی کو چاہیے کہ وہ اختلاف کے وقت سخت محتاط رہے۔ وہ مسلسل کوشش کرے کہ اس سے کوئی ایسا غلط ردعمل ظاہر نہ ہو جو اللہ کو پسند نہیں۔

اختلاف کے وقت انصاف پر قائم رہنا بلا شبہ ایک مشکل کام ہے۔ مگر اس کا ثواب بھی بہت زیادہ ہے۔ اسلام میں ہر درست کام عبادت ہوتا ہے۔ یہ بھی ایک اعلیٰ عبادت ہے کہ اختلاف اور نزاع کی صورت پیش آنے کے باوجود آدمی اپنے دل کو دشمنی اور انتقام کی نفسیات سے بچائے، اختلاف کے باوجود وہ انصاف کی روش پر قائم رہے۔

اختلاف پیش آنا برا نہیں، برا یہ ہے کہ اختلاف پیش آنے کے بعد آدمی امتحان میں پورا نہ اترے۔ اختلاف کے وقت تقویٰ کی حد میں رہنا عظیم اسلامی عمل ہے، اور اختلاف کے وقت تقویٰ کی حد سے نکل جانا انتہائی سنگین قسم کا غیر اسلامی عمل۔

نفرت کی تیزاب

مغرب کے ایک ماہر نفسیات کا قول ہے کہ نفرت کی مثال ایک قسم کی تیزاب کی سی ہے۔ ایک عام برتن میں اس کو رکھا جائے تو وہ اپنے برتن کو اس سے زیادہ نقصان پہنچائے گا جتنا اس کو جس پر وہ تیزاب ڈالا جانے والا ہے:

Hatred is like an acid. It can do more damage to the container in which it is stored than to the object on which it is poured.

اگر آپ کو کسی کے خلاف بغض اور نفرت ہو جائے اور آپ اس کو نقصان پہنچانے کے درپے ہو جائیں تو جہاں تک آپ کا تعلق ہے، آپ کے سینے میں رات دن ہر وقت نفرت کی آگ بھڑکتی رہے گی۔ مگر دوسرے شخص پر اس کا اثر صرف اس وقت پہنچتا ہے جب کہ آپ عملاً اس کو نقصان پہنچانے میں کامیاب ہو گئے ہوں۔ مگر ایسا بہت ہی کم ہوتا ہے کہ آدمی کسی کو وہ نقصان پہنچا سکے جو اس کو وہ پہنچانا چاہتا ہے۔ نفرت کے تحت عمل کرنے والے کا منصوبہ بیشتر حالات میں ناکام رہتا ہے۔

مگر جہاں تک نفرت کرنے والے کا تعلق ہے، اس کی لیے دو میں سے ایک عذاب ہر حال میں مقدر ہے۔ جب تک وہ اپنے انتقامی منصوبہ میں کامیاب نہیں ہوا ہے انتقام کی آگ میں جلتے رہنا اور اگر بالفرض کامیاب ہو جائے تو اس کے بعد ضمیر اس کا پیچھا کرتا ہے۔ وہ اپنے حریف کو قتل کر کے خود بھی اپنے چین کو ہمیشہ کے لیے قتل کر لیتا ہے۔ انتقام کے جنون میں اس کا انسانی احساس دبا رہتا ہے مگر جب حریف پر کامیابی کے نتیجہ میں اس کا انتقامی جوش ٹھنڈا پڑتا ہے تو اس کے بعد اس کا ضمیر جاگ اٹھتا ہے اور ساری عمر اس کو ملامت کرتا رہتا ہے کہ تم نے بہت برا کیا۔

فوجداری کے ایک وکیل نے ایک بار راقم الحروف سے کہا کہ میرا سابقہ زیادہ تر ایسے لوگوں سے پیش آتا ہے جن پر قتل کا الزام ہوتا ہے۔ مگر میں نے اپنی زندگی میں جتنے بھی قاتل دیکھے سب کو میں نے پایا کہ قتل کے بعد وہ اپنے قتل پر پشیمان تھے۔ وقتی جوش میں آ کر انہوں نے قتل کر دیا مگر جب جوش ٹھنڈا ہوا تو ان کا دل انھیں ملامت کرنے لگا۔ یہی ہر مجرم کا حال ہے۔ کوئی مجرم اپنے کو احساس جرم سے آزاد نہیں کر پاتا۔ جرم کے بعد ہر مجرم کا سینہ

ایک نفسیاتی قید خانہ بن جاتا ہے جس میں وہ مسلسل سزا بھگتتا رہتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ منفی کارروائی سب سے پہلے اپنے خلاف کارروائی ہے منفی کارروائی کا نقصان آدمی کی اپنی ذات کو پہنچ کر رہتا ہے خواہ وہ دوسروں کو پہنچے یا نہ پہنچے۔

ہجر جمیل

قرآن کی سورہ المزمل میں ایک حکم ان الفاظ میں آیا ہے: وَاصْبِرْ عَلَىٰ مَا يَقُولُونَ وَاهْجُرْهُمْ هَجْرًا جَمِيلًا (73:10)۔ اُردو مترجمین نے اس آیت کے جو ترجمے کیے ہیں اُن میں سے چند یہاں نقل کیے جاتے ہیں:

1۔ اور سہتا رہ جو کہتے رہیں اور چھوڑ اُن کو بھلی طرح کا چھوڑنا (شاہ عبد القادر)

2۔ اور یہ لوگ جو باتیں کرتے ہیں اُن پر صبر کرو اور خوبصورتی کے ساتھ اُن سے الگ ہو جاؤ۔ (اشرف علی تھانوی)

3۔ اور سہتا رہ جو کچھ وہ کہتے رہیں اور چھوڑ دے اُن کو بھلی طرح کا چھوڑنا۔
(محمود حسن دیوبندی)

4۔ اور یہ لوگ جو کچھ کہتے ہیں اُس پر صبر کر اور اُن کو خوبصورتی سے نظر انداز کر۔
(امین احسن اصلاحی)

5۔ اور یہ لوگ جو کچھ کہتے ہیں اس پر صبر کیجیے اور خوبصورتی کے ساتھ ان سے علیحدگی اختیار کیجیے۔ (عاشق الٰہی)

6۔ اور ان باتوں پر صبر کیے رہیے جو یہ لوگ کہتے ہیں، اور ان سے خوبصورتی کے ساتھ الگ ہو جائیے۔ (عبد الماجد دریابادی)

7۔ اور اے پیغمبر آپ صبر کریں ان باتوں پر جو مخالفین کہتے ہیں اور آپ خوش اسلوبی کے ساتھ ان سے کنارہ کش ہو جائیں۔ (صوفی عبد الحمید سواتی)

اس آیت کا انگریزی زبان میں ترجمہ کیا جائے تو وہ اس طرح ہوگا:

Endure patiently whatever they say, and avoid them in a decent manner.

قرآن کی یہ آیت مکی دور میں اُتری۔ اُس وقت مکہ میں مشرکین کا غلبہ تھا۔ یہ لوگ سمجھتے تھے کہ رسول اور اصحاب رسول نے اُن کے آبائی دین سے انحراف کیا ہے۔ اس بنا پر وہ لوگ رسول اور اصحاب رسول کو ستانے لگے۔ اُنھوں نے آپ کو اور آپ کے ساتھیوں کو ہر قسم کی تکلیفیں پہنچائیں۔ اس ماحول میں قرآن کی یہ آیت اُتری۔ اس میں خدا کی طرف سے یہ حکم دیا گیا کہ تم لوگ صبر کرو اور ہجر جمیل کا طریقہ اختیار کرو۔

ہجر جمیل کے لفظی معنیٰ ہیں — خوبصورتی کے ساتھ چھوڑنا یعنی حسن اعراض۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ان ستانے والوں کے ساتھ حسن اعراض کا طریقہ اختیار کرو۔ ان کے معاملہ میں تمہارا طریقہ منفی ردِّعمل کا طریقہ نہیں ہونا چاہیے بلکہ مثبت ردعمل کا طریقہ ہونا چاہیے۔ تم کو چاہیے کہ اُن کے معاملہ میں درگزر کرو، اور اُن کے برے انداز کے مقابلہ میں تم اُن کے ساتھ اچھا انداز اختیار کرو۔

مفسرین نے عام طور پر یہ لکھا ہے کہ صبر اور ہجر جمیل کا یہ حکم آیات قتال کے نزول کے بعد منسوخ ہو گیا۔ مگر یہ ایک غلط تفسیر ہے۔ ہجر جمیل (حسن اعراض) کوئی مجبوری کا فعل نہیں ہے، یہ اہل ایمان کا ایک مثبت رویہ ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ مومن منفی ردِّعمل کا تحمل نہیں کرسکتا۔ شکایت کی نفسیات شکر کے جذبہ کی قاتل ہے اس لیے مومن یک طرفہ طور پر شکایت کے جذبات کو ختم کرتا ہے تاکہ اُس کے اندر شکر کا جذبہ مجروح نہ ہونے پائے۔ اسی طرح نفرت کی نفسیات محبت کے جذبہ کی قاتل ہے اس لیے مومن نفرت کی نفسیات کو اپنے اندر پنپنے نہیں دیتا تاکہ اُس کے اندر محبتِ الٰہی کا جذبہ پوری طرح باقی رہے۔ اس کام کو کبھی سختی سے کرنا پڑتا ہے اور کبھی حسن تدبیر سے۔

ہجر جمیل (حسن اعراض) بظاہر دوسرے کے مقابلہ میں ہوتا ہے مگر اُس کا تعلق خود اپنی ذات سے ہے۔ مومن آخری حد تک یہ چاہتا ہے کہ اُس کے اندر اعلیٰ اسلامی احساس ہمیشہ زندہ رہے۔ کسی بھی حال میں اُس کے اندر کمی (erosion) نہ ہونے پائے۔

قرآن کے مطابق، اللہ نے کسی انسان کے اندر دو دل نہیں بنائے (33:4)۔ یعنی، انسان کے دل میں بیک وقت دو متضاد نفسیات پرورش نہیں پاسکتیں۔ جو دل انسان سے نفرت کرے، عین اُسی وقت وہ خدا سے محبت نہیں کرسکتا۔ جس دل کے اندر انسانوں کے بارے میں شکایات بھری ہوئی ہوں وہ دل کبھی خدا کے شکر سے سرشار نہیں ہوسکتا۔ جس آدمی کا سینہ انتقامی نفسیات کا جنگل بنا ہوا ہو، وہ خدا سے طلبِ عفو کی لذت کا تجربہ نہیں کرسکتا۔ جو انسان ظلم کی یادوں میں جی رہا ہو، وہ خدائے رحمٰن ورحیم کی یادوں کا تجربہ نہیں کرسکتا۔

حقیقت یہ ہے کہ صبر اور حسن اعراض مومن کے لیے ایک خود حفاظتی تدبیر ہے۔ یہ اپنے آپ کو اس سے بچانا ہے کہ اُس کے سینے میں غیر مومنانہ نفسیات کی پرورش ہونے لگے۔ اس لیے جب بھی ایسا کوئی موقع پیش آتا ہے تو مومن کہہ اُٹھتا ہے کہ میں اس قسم کی منفی سوچ کا تحمل نہیں کرسکتا۔ یہاں اس معاملہ کی مزید وضاحت کے لیے رسول اور اصحاب رسول کی زندگی سے حسن اعراض کی کچھ عملی مثالیں درج کی جاتی ہیں۔

1۔ ابن اسحق کی روایت ہے کہ قدیم مکہ کے قریش رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ہجو کرتے تھے اور سبّ وشتم کرتے تھے۔ چنانچہ اُنھوں نے آپ کا نام محمد کے بجائے مذمّم رکھ دیا تھا۔ محمد کا مطلب ہے، تعریف کیا ہوا۔ اس کے بجائے وہ آپ کو مذمّم (مذمت کیا ہوا) کہتے تھے۔ روایت کے مطابق، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے جواب میں فرمایا: أَلَا تَعْجَبُونَ لِمَا يَصْرِفُ اللَّهُ عَنِّي مِنْ أَذَى قُرَيْشٍ، يَسُبُّونَ وَيَهْجُونَ مُذَمَّمًا، وَأَنَا مُحَمَّدٌ (سیرت ابن ہشام، جلد 1، صفحہ 356)۔ یعنی، کیا تم کو تعجب نہیں کہ اللہ نے

مجھے قریش کی اذیت سے کس طرح بچالیا، وہ سبّ وشتم کرتے ہیں اور مذمم کہہ کر ہجو کرتے ہیں، حالانکہ میں محمد ہوں۔

پیغمبر اسلام کے اس قول کو اس طرح سمجھا جا سکتا ہے کہ مثلاً قریش اگر یہ کہیں کہ "مذمّم مجنون ہے" تو رسول اللہ اس کا بُرا اثر نہ لیتے ہوئے یہ کہہ دیں گے کہ تمھاری یہ بات اُس کے اوپر پڑے گی جس کا نام مذمّم ہو، میرا نام تو محمد ہے۔ یہ حسن اعراض کی ایک لطیف مثال ہے۔ اس طرح مومن اپنے آپ کو اس نقصان سے بچاتا ہے کہ کسی کی بدگوئی اُس کے اندر منفی نفسیات پیدا کرنے کا سبب بن جائے۔ مومن کا قول یہ ہوتا ہے کہ میں منفی جذبات کا تحمل نہیں کرسکتا۔

اس طرح کے حسن اعراض کی ایک دلچسپ مثال ڈاکٹر ذاکر حسین (1897-1969ء) کے یہاں پائی جاتی ہے۔ ایک بار وہ دہلی کی ایک سڑک پر اپنی گاڑی چلا رہے تھے، اتفاق سے اُن کی گاڑی ایک اور شخص کی گاڑی سے معمولی طور پر ٹکرا گئی۔ اُن کی گاڑی میں رگڑ (dent) آ گیا۔ اُس آدمی نے ابھی نئی گاڑی لی تھی۔ وہ گاڑی روک کر اُترا۔ ذاکر صاحب بھی اپنی گاڑی روک کر اُتر گئے۔ اُس آدمی نے ذاکر صاحب کی طرف غصہ سے دیکھتے ہوئے کہا کہ ایڈیٹ (idiot)۔ اس انگریزی لفظ کے معنیٰ ہوتے ہیں، احمق۔ ذاکر صاحب نے جوابی غصہ نہیں دکھایا۔ اُنھوں نے اس کی بات کو نظر انداز کرتے ہوئے نرمی سے کہا:

Sir, I am not Mr. Idiot, I am Zakir Husain.

جناب، میں مسٹر ایڈیٹ نہیں ہوں۔ میں ذاکر حسین ہوں۔ یہ سُن کر اُس آدمی کا غصہ ٹھنڈا ہو گیا۔ ساری (sorry) کہہ کر وہ خاموشی کے ساتھ اپنی گاڑی پر بیٹھا اور آگے کے لیے روانہ ہو گیا۔

2۔ ہجرت کے بعد حدیبیہ کا واقعہ پیش آیا۔ مکہ کے سرداروں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اور آپ کے صحابہ کو مکہ میں داخل ہونے سے روک دیا۔ اُس وقت حدیبیہ کے مقام پر

دونوں فریقوں کے درمیان ایک معاہدۂ امن تیار کیا گیا۔ اس معاہدہ کے وقت قریش نے ضد کا مظاہرہ بھی کیا اور تشدد کا مظاہرہ بھی۔ اُنہوں نے اصرار کیا کہ اُن کی یک طرفہ شرطوں پر معاہدہ کیا جائے۔ اصحاب رسول کو اس سے بے حد تکلیف ہوئی۔ اس طرح کی شرطوں پر معاہدہ کرنا اُن کو بظاہر ایک ذلت کا معاہدہ معلوم ہوتا تھا۔ اُس وقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ فرمایا کہ: لَا تَدْعُونِي قُرَيْشٌ الْيَوْمَ إِلَى خُطَّةٍ يَسْأَلُونَنِي فِيهَا صِلَةَ الرَّحِمِ إِلَّا أَعْطَيْتُهُمْ إِيَّاهَا (سیرت ابن ہشام، جلد 2، صفحہ 310)۔ یعنی، قریش آج جو خاکہ بھی پیش کریں گے، بشرطیکہ اُس میں صلہ رحمی کو ملحوظ رکھا گیا ہو، میں ضرور اُس پر راضی ہو جاؤں گا۔

پیغمبر اسلام کا یہ قول ہجر جمیل کی ایک حکیمانہ مثال ہے۔ دشمن کی یک طرفہ شرطوں کو ماننا ایک سخت ناگوار معاملہ تھا۔ مگر آپ نے مذکورہ بات کہہ کر اس ناگوار کو ایک خوش گوار معاملہ بنا لیا۔ قدیم عربوں کے نزدیک صلہ رحمی بہت بڑی انسانی قدر سمجھی جاتی تھی۔ اور قطع رحمی کو وہ بہت بُرا سمجھتے تھے۔ اس لیے اس کا سوال ہی نہ تھا کہ وہ معاہدہ کے لیے ایسا خاکہ پیش کریں جس میں قطع رحم کی دفعہ رکھی گئی ہو۔ باعتبار حقیقت رسول اللہ یہ کہنا چاہتے تھے کہ میں ہر قیمت پر قریش سے صلح کرلوں گا۔ اس بات کو کہنے کے باعزت طریقہ کے طور پر آپ نے فرمایا کہ میں قریش کی طرف سے صُلح کے ہر خاکہ کو منظور کرلوں گا بشرطیکہ اُس میں قطع رحم نہ پایا جاتا ہو۔ حالانکہ پیشگی طور پر یہ معلوم تھا کہ وہ قطع رحم کی شرط کبھی نہیں رکھیں گے۔

3۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مکہ سے ہجرت کرکے مدینہ آئے تو جلد ہی یہاں کے باشندوں کی اکثریت اسلام میں داخل ہوگئی۔ اُس وقت مدینہ میں ایک شخص تھا جس کا نام عبداللہ بن اُبی تھا۔ وہ اپنے زمانہ کا ایک بڑا لیڈر تھا۔ وہ بھی اگرچہ اپنے قبیلہ والوں کے ساتھ اسلام میں داخل ہو گیا مگر اُس کے دل میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف حسد کا جذبہ تھا جس کی وجہ سے وہ اکثر آپ کے خلاف شر انگیز باتیں کیا کرتا تھا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس معاملہ کا ذکر مدینہ کے ایک مسلمان اُسید بن حضیر سے کیا۔ اُنھوں نے اس کا جواب دیتے ہوئے کہا: یَا رَسُولَ اللّٰہِ! اُرْفُقْ بِہِ فَوَاللّٰہِ لَقَدْ جَاءَنَا اللّٰہُ بِكَ، وَإِنَّا لَنَنْظِمَ لَهُ الْخَرَزَ لنتوِّجه. فَوَاللّٰہِ إِنَّهُ لَيَرَى أَنْ قَدْ سَلَبْتَهُ مُلكًا (سیرت ابن ہشام، جلد 2، صفحہ 292)۔ یعنی، اے خدا کے رسول، اُس کے ساتھ نرمی کا معاملہ کیجیے، خدا کی قسم، اللہ آپ کو ہمارے پاس لے آیا اور اُس کی قوم کے لوگ اُس کے لیے جواہر کا تاج تیار کر رہے تھے تاکہ وہ اُس کو بادشاہ بنائیں۔ وہ محسوس کرتا ہے کہ آپ نے اُس کا مقام اُس سے چھین لیا ہے۔

یہ حسن اعراض کی ایک حکیمانہ مثال ہے۔ ایک صورت یہ تھی کہ عبداللہ بن اُبی کی شرانگیزی کا جواب سختی کے ساتھ دیا جاتا۔ صحابی نے گویا اپنے جواب میں یہ بتایا کہ اس معاملہ میں سختی کی ضرورت نہیں۔ حسن اعراض ہی اس مسئلہ کو ختم کرنے کے لیے کافی ہے۔

4۔ اوپر ہجر جمیل کی وہ مثالیں ہیں جو سطوریں ہوتی ہیں۔ اب ایک بین السطور کی مثال لیجیے۔ جب کسی معاملہ میں ہجر جمیل کا طریقہ اختیار کیا جائے تو اُس میں ایک اور بات پوشیدہ ہوتی ہے جو اگرچہ زبان سے بولی نہیں جاتی مگر وہ حقیقی مطلوب کے طور پر اس میں شامل رہتی ہے۔ اس کی ایک مثال حدیبیہ کا معاہدہ ہے۔

حدیبیہ کے مقام پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دو ہفتہ قیام فرمایا۔ اس دوران قریش نے مختلف قسم کی زیادتیاں کیں۔ مثلاً ایک صحابی کو تنہا پا کر اُنھیں تیر مار کر ہلاک کر دیا۔ ایک بار رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے صحابہ کے ساتھ باجماعت نماز ادا کر رہے تھے، اتنے میں قریش کے کچھ لوگ آئے اور آپ پر تیر برسانے لگے۔ اس طرح کی اشتعال انگیز صورت حال کے باوجود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے قریش سے دس سال کا امن معاہدہ کر لیا۔

اس معاہدہ کی دفعات حضرت عمر پر سخت ناگوار تھیں۔ وہ حضرت ابوبکر کے پاس آئے اور کہا: يَا أَبَا بَكْرٍ، أَلَيْسَ بِرَسُولِ اللّٰہِ؟ قَالَ: بَلَى، قَالَ: أَوَ لَسْنَا بِالْمُسْلِمِينَ؟ قَالَ: بَلَى،

قَالَ: أَوَ لَيْسُوا بِالْمُشْرِكِينَ؟ قَالَ: بَلَى، قَالَ: فَعَلَامَ نُعْطِى الدَّنِيَّةَ (سیرت ابن ہشام، جلد 2، صفحہ 317)۔ یعنی، اے ابوبکر! کیا محمد اللہ کے رسول نہیں، اُنھوں نے کہا کہ ہاں۔ عمر نے کہا کہ کیا ہم مسلمان نہیں، اُنھوں نے کہا کہ ہاں۔ عمر نے کہا کہ کیا وہ مشرک نہیں، اُنھوں نے کہا کہ ہاں۔ عمر نے کہا کہ پھر ہم اپنے دین میں یہ ذلت کیوں گوارا کریں۔ روایات کے مطابق، حضرت عمر نے یہی بات خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے بھی کہی۔

یہاں غور طلب امر یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے قریش کی زیادتیوں کے باوجود اُن کی یک طرفہ شرطوں پر دس سال کا جو امن معاہدہ کیا تھا، وہ ایک نہایت اہم اسلامی مصلحت کی بنا پر تھا۔ اور وہ مصلحت یہ تھی کہ دشمن سے معاہدۂ امن کر کے معتدل حالات پیدا کیے جائیں تاکہ اسلامی دعوت کا عمل مؤثر طور پر جاری ہو سکے۔ مگر یہ نصیحت نہ امن معاہدہ کے اندر لکھی گئی اور نہ حضرت عمر اور دوسرے صحابہ کی شدید ناگواری کے باوجود آپ نے حدیبیہ کے مقام پر اس کا اعلان کیا۔

یہ ہجر جمیل (حسن اعراض) کا دوسرا پہلو ہے۔ یہ دوسرا پہلو ہمیشہ مخفی حالت میں ہوتا ہے۔ اس پہلو کو لفظوں میں پانا ممکن نہیں۔ اگر اُس کو لفظوں میں لکھا یا بولا جائے تو اُس کی ساری معنویت ختم ہو جائے گی۔

ایسی حالت میں لوگوں کے لیے صرف دو میں سے ایک رویّہ درست ہے۔ یا تو وہ اتنا زیادہ ہوش مند ہوں کہ سطور کے اندر بین السطور کو پڑھ لیں۔ وہ اعلان کے بغیر اُس کی اہمیت کو دریافت کر لیں۔ جن لوگوں کے اندر اتنی ہوش مندی نہیں ہے اُن کے لیے صحیح رویہ یہ ہے کہ وہ اپنے لیڈر کی بصیرت پر اعتماد کریں۔ وہ صرف اعتماد اور حسن ظن کی بنا پر یہ عقیدہ رکھیں کہ اُن کے رہنما نے جو بات کہی ہے اُس کے پیچھے ضرور کوئی گہری مصلحت ہوگی۔ ہمارا کام اپنے رہنما کی اتباع کرنا ہے، نہ کہ اُس کی دیانت داری (integrity) پر شک کرنا۔

5۔ صُلح حدیبیہ بظاہر ایک ایسی صُلح تھی جو دشمن کے مقابلہ میں دب کر کی گئی۔ مگر اس کے اندر ایک غیر اعلان شدہ مقصد چھپا ہوا تھا اور وہ تھا — ٹکراؤ کو اَوائڈ کرکے اپنے لیے وقفۂ تعمیر حاصل کرنا۔ اگر یہ بات معاہدہ کے متن میں لکھ دی جاتی یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے اصحاب کے درمیان اُسی وقت اس کا اعلان کر دیتے تو صلح کے مقاصد سرے سے فوت ہوجاتے۔ اس قسم کے مقاصد ہمیشہ اعلان کے بغیر ہوتے ہیں، نہ کہ اعلان کے ساتھ۔ چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خاموش رہے۔ یہاں تک کہ بعد کو جب اس کا عملی نتیجہ ظاہر ہوگیا، اُس وقت لوگوں نے جانا کہ اس صلح کے اندر کتنی بڑی مصلحت چھپی ہوئی تھی۔

یہی وہ حقیقت ہے جو حضرت ابوبکر صدیق نے بعد کے زمانہ میں ان الفاظ میں بیان کی:

مَا كَانَ فَتْحٌ فِي الْإِسْلَامِ أَعْظَمَ مِنْ فَتْحِ الْحُدَيْبِيَةِ، وَلَكِنَّ النَّاسَ يَوْمَئِذٍ قَصُرَ رَأْيُهُمْ عَمَّا كَانَ بَيْنَ مُحَمَّدٍ وَرَبِّهِ، وَالْعِبَادُ يَعْجَلُونَ، وَاللَّهُ تَبَارَكَ وَتَعَالَى لَا يَعْجَلُ كَعَجَلَةِ الْعِبَادِ حَتَّى تَبْلُغَ الْأُمُورُ مَا أَرَادَ اللَّهُ (مغازی الواقدی، جلد 2، صفحہ 610)۔ یعنی، اسلام میں حدیبیہ کی فتح سب سے بڑی فتح تھی۔ لیکن معاہدہ کے دن لوگوں کو اس بات میں رائے قائم کرنے میں کوتاہی ہوئی جو محمد اور آپ کے رب کے درمیان تھا۔ انسان عجلت پسند ہے اور اللہ انسانوں کی طرح عجلت نہیں کرتا۔ یہاں تک کہ معاملہ وہاں تک پہنچ جائے جو اللہ چاہتا ہے۔

6۔ ہجر جمیل (حسن اعراض) سادہ طور پر محض ایک بچاؤ کی تدبیر نہیں، بلکہ وہ با مقصد انسان کی سوچی سمجھی ایک مستقل اخلاقی روش ہے۔ با مقصد انسان کے سامنے ایک متعین منزل ہوتی ہے، جہاں پہنچنا اُس کا سب سے بڑا کنسرن (concern) ہوتا ہے۔ اس لیے وہ راستہ کے ہر اُلجھاؤ سے اپنے آپ کو دور رکھتا ہے تاکہ وہ کسی رُکاوٹ کے بغیر اپنی آخری منزل تک پہنچ سکے۔

جیسا کہ معلوم ہے، قدیم مکہ کے لوگوں نے پیغمبر اسلام کو بہت زیادہ ستایا تھا۔ آپ پر

اور آپ کے ساتھیوں پر اتنا زیادہ تشدد کیا کہ آپ کو اپنے ساتھیوں کے ہمراہ مکہ چھوڑ دینا پڑا۔ اس ترک وطن کے بعد بھی وہ آپ کے خلاف مسلسل جارحیت کرتے رہے۔

آخر کار وہ وقت آیا جب کہ پیغمبر اسلام، اللہ کی مدد سے مکہ کے فاتح بن گئے۔ اب وقت تھا کہ ماضی کے ظلم کی اُنھیں سزا دی جائے۔ عام رواج کے مطابق، اُن کو قتل کر دینا عین جائز تھا۔ مگر پیغمبر اسلام نے اُن لوگوں کے ساتھ ہجر جمیل کی روش اختیار کی۔ تاریخ بتاتی ہے کہ فتح مکہ کے بعد جب قریش کے یہ مجرمین آپ کے سامنے حاضر ہوئے تو آپ نے اُن سے پوچھا کہ تم کیا سمجھتے ہو کہ میں تمہارے ساتھ کیا سلوک کروں گا۔ اُنھوں نے کہا کہ: أَخٌ كَرِيمٌ وَابْنُ أَخٍ كَرِيمٍ (سیرت ابن ہشام، جلد 2، صفحہ 412)۔ یعنی، آپ شریف بھائی ہیں اور شریف بھائی کے بیٹے ہیں۔

پیغمبر اسلام نے اس کے بعد فرمایا کہ ٹھیک ہے۔ میں تمہارے بارے میں وہی کہوں گا جو پیغمبر یوسف نے اپنے بھائیوں کے بارے میں کہا: لَا تَثْرِيبَ عَلَيْكُمُ الْيَوْمَ (12:92)۔ یعنی، آج تمہارے اوپر کوئی الزام نہیں۔ یہ کہہ کر آپ نے فرمایا کہ: جاؤ تم سب لوگ آزاد ہو۔ اس طرح آپ نے اُن تمام لوگوں کو آزاد کر دیا جو اس سے پہلے آپ کے خلاف کھلے دشمن بنے ہوئے تھے (السنن الکبریٰ للبیہقی، حدیث نمبر 76-18275)۔

پیغمبر اسلام کا یہ عمل ایک بامقصد انسان کے عمل کی ایک اعلیٰ مثال تھی۔ پیغمبر اسلام کا مقصد یہ تھا کہ آپ بیت اللہ کو بتوں سے پاک کریں۔ مکہ کے لوگوں کو شرک سے نکال کر اُنھیں خدائے واحد کا پرستار بنائیں۔ اپنے دشمن انسان کو دوست انسان میں تبدیل کر کے توحید کی بنیاد پر وہ انقلاب لائیں جس کے لیے آپ کو مبعوث کیا گیا تھا۔

پیغمبر اسلام کے یک طرفہ حسن سلوک کا نتیجہ یہ ہوا کہ مکّہ کے یہ تمام لوگ اسلام میں داخل ہو گئے۔ راوی کہتے ہیں: فَخَرَجُوا كَأَنَّمَا نُشِرُوا مِنَ الْقُبُورِ فَدَخَلُوا فِي الْإِسْلَامِ۔ یعنی،

پھر وہ لوگ وہاں سے اس طرح نکلے جیسے کہ وہ قبروں سے نکلے ہوں اور وہ اسلام میں داخل ہو گئے (السنن الکبریٰ للبیہقی، حدیث نمبر 18275)۔

پیغمبر اسلام اگراس کے برعکس، اُن دشمنوں سے اُن کی ظالمانہ روش کا انتقام لیتے تو اس کے بعد یہ ہوتا کہ وہاں انتقام در انتقام کا دور چل پڑتا۔ ایک انتقام کے بعد دوسرا انتقام شروع ہو جاتا اور پھر حالات ایسا منفی رُخ اختیار کر لیتے کہ سارا تعمیری منصوبہ درہم برہم ہو کر رہ جاتا۔

غیر فطری ردعمل

جب کوئی خلاف مزاج بات پیش آئے تو اُس کے مقابلہ میں آدمی کی روش کی دو مختلف صورتیں ہوتی ہیں۔ ایک جذباتی ردعمل کا طریقہ، اور دوسرا غیر جذباتی ردعمل کا طریقہ۔ جذباتی ردعمل عین وہی چیز ہے جس کو میڈیکل اصطلاح میں الرجی (allergy) کہا جاتا ہے۔ الرجی کی تعریف اس طرح کی جاتی ہے کہ الرجی نام ہے معتدل حالات میں غیر معتدل ردعمل کا۔

Abnormal reaction to normal things.

مثلاً اپنے خلاف تنقید کو سُن کر غصہ ہونا، اس قسم کی ایک الرجی ہے۔ اگر کوئی شخص آپ کی کسی بات پر تنقید کرتا ہے تو اُس کا معتدل اور فطری ردعمل یہ ہے کہ آپ کھلے ذہن کے ساتھ اُس کو سنیں اور کھلے ذہن کے ساتھ اُس پر غور کریں۔ اگر تنقید غلط ہے تو آپ کو چاہیے کہ آپ دلیل کے ساتھ اُس کا جواب دیں اور اگر تنقید درست ہے تو سیدھی طرح اُس کو مان لیں۔ اس کے برعکس تنقید کو سُن کر بگڑ جانا، تنقید کا غیر معتدل اور غیر فطری انداز میں جواب دینا ہے۔ پہلی صورت مریضانہ ذہنیت کا ثبوت ہے، اور دوسری صورت صحت مند ذہنیت کا ثبوت۔

اسی طرح مخالفانہ نعرہ کو سُن کر مشتعل ہو جانا، توہین کے کسی معاملہ پر بھڑک اُٹھنا، اپنے راستہ میں کوئی رکاوٹ دیکھ کر بگڑ جانا، اپنی سوچ کے خلاف سوچ کو برداشت نہ کرسکنا، یہ سب جذباتی ردِعمل کی صورتیں ہیں۔ ایسے لوگ ہمیشہ دوسروں کے خلاف نفرت اور تشدد میں

پڑے رہتے ہیں۔ وہ زندگی کے مثبت اور تعمیری رخ کا تجربہ کرنے میں ناکام رہتے ہیں۔

اس کے برعکس، دوسرا طریقہ غیر جذباتی ردعمل کا طریقہ ہے۔ اسی کو قرآن میں ہجر جمیل کہا گیا ہے۔ یعنی جب اپنے مزاج کے خلاف کوئی بات پیش آئے تو مشتعل نہ ہو کر ٹھنڈے ذہن کے ساتھ اس پر غور کرنا، اور سوچے سمجھے فیصلہ کے تحت معتدل انداز میں اس کا جواب دینا۔ اس معتدل جواب کی مختلف صورتیں ہوسکتی ہیں۔ ایک یہ کہ سادہ طور پر بس اُس کو نظر انداز کردیا جائے۔ یعنی وہی رویہ جس کو عام زبان میں اس طرح بیان کیا جاتا ہے — کتے بھونکتے رہتے ہیں اور ہاتھی چلتا رہتا ہے۔

اسی طرح کبھی ہجر جمیل کی صورت یہ ہوتی ہے کہ مخالف گروہ کی بدعملی کا جواب خوش عملی سے دیا جائے۔ اس کے پست اخلاق کے مقابلہ میں برتر اخلاق کا طریقہ اختیار کرکے اس کو مغلوب کرلیا جائے۔ اسی طرح کبھی حالات کا تقاضا یہ ہوسکتا ہے کہ دباؤ کی سیاست (pressure tactics) کا طریقہ اختیار کرکے اس کو خاموش ہونے پر مجبور کردیا جائے۔

ہجر جمیل کی کوئی ایک لگی بندھی صورت نہیں۔ حالات کے اعتبار سے اس کی مختلف صورتیں ہوسکتی ہیں۔ تاہم جو صورت بھی اختیار کی جائے وہ سوچے سمجھے منصوبہ کی بنیاد پر ہوگی، نہ کہ بلا سوچے سمجھے ردعمل کی حیثیت سے۔ اس کا بنیادی مقصد اعراض کرنا ہوگا، نہ کہ اُلجھ جانا۔ وہ ہمیشہ امن کے اصول پر ہوگی، نہ کہ تشدد کے اصول پر۔ اس کے پیچھے کبھی بھی نفرت اور انتقام کا جذبہ نہیں ہوگا بلکہ صرف یہ جذبہ ہوگا کہ کسی نہ کسی طرح حسن تدبیر کے ذریعہ معاملہ کو ٹال دیا جائے تاکہ زندگی کی گاڑی معمول کے مطابق اپنے مطلوب رُخ پر چلنے لگے۔

ہجر جمیل کا نشانہ خارجی مسئلہ نہیں ہوتا بلکہ آدمی کی خود اپنی ذات ہوتی ہے۔ ہجر جمیل کا نشانہ یہ نہیں ہوتا کہ خود مسئلہ کا خاتمہ کردیا جائے۔ اُس کا نشانہ یہ ہوتا ہے کہ مسئلہ کو اپنے خلاف مسئلہ بننے سے روک دیا جائے۔

انسان کی رعایت

نفرت کے جواب میں نفرت پیدا ہوتی ہے اور محبت کے جواب میں محبت۔ اسی لیے اسلام نے یہ طریقہ سکھایا ہے کہ کسی کو غلطی کرتے دیکھو تو اس کو حکمت و محبت کے ساتھ سمجھاؤ جس طرح ایک باپ اپنے بیٹے کو سمجھاتا ہے۔

حضرت انس سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے اصحاب کو خطاب کرتے ہوئے فرمایا: يَسِّروا ولا تعسِّروا، وبشِّروا ولا تُنَفِّروا (صحیح البخاری، حدیث نمبر 69)۔ یعنی تم لوگوں کے ساتھ آسانی کا معاملہ کرو، تم لوگوں کے ساتھ سختی کا معاملہ نہ کرو۔ تم لوگوں کو خوش خبری دو، تم لوگوں کو متنفر نہ کرو۔

حضرت عبداللہ ابن مسعود رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ ایک شخص نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا اور کہا کہ میں فجر کی جماعت میں اس لیے پیچھے رہ جاتا ہوں کہ فلاں صاحب ہماری مسجد میں نماز پڑھاتے ہیں اور وہ اس کو بہت لمبا کر دیتے ہیں۔ آپ یہ سن کر غضبناک ہو گئے۔ حتیٰ کہ اس سے زیادہ غضبناک میں نے آپ کو کبھی نہیں دیکھا تھا۔ پھر آپ نے تقریر کرتے ہوئے فرمایا: يَا أَيُّهَا النَّاسُ، إِنَّ مِنْكُمْ مُنَفِّرِينَ، فَمَنْ أَمَّ النَّاسَ فَلْيَتَجَوَّزْ، فَإِنَّ خَلْفَهُ الضَّعِيفَ وَالْكَبِيرَ وَذَا الْحَاجَةِ (صحیح البخاری، حدیث نمبر 704)۔ یعنی، اے لوگو! تم میں کچھ ایسے ہیں جو لوگوں کو دین سے دور کر دیتے ہیں۔ تم میں سے جو شخص لوگوں کی امامت کرے، اس کو چاہیے کہ مختصر نماز پڑھائے۔ کیونکہ اس کے پیچھے کوئی کمزور ہے، کوئی بوڑھا، کوئی ضرورت مند۔

حضرت جابر رضی اللہ عنہ ایک روایت میں بتاتے ہیں کہ معاذ بن جبل رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ آپ کی مسجد میں نماز پڑھتے تھے۔ یہاں سے واپس ہو کر جاتے اور اپنے محلہ والوں کی امامت کرتے۔ ایک دن انھوں نے عشاء کی نماز پڑھائی اور اس میں سورہ البقرہ

پڑھی۔ ایک آدمی لمبی قرأت سے گھبرا کر نماز سے الگ ہو گیا۔ اس کے بعد حضرت معاذ اس سے کھنچے کھنچے رہنے لگے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو خبر ہوئی تو آپ نے اس آدمی کو کچھ نہیں کہا۔ البتہ حضرت معاذ کی بابت فرمایا: فَتَّانٌ، فَتَّانٌ، فَتَّانٌ (صحیح البخاری، حدیث نمبر 701)۔ یعنی، فتنہ انگیز فتنہ انگیز، فتنہ انگیز۔

اس سلسلے کا سب سے زیادہ حیرت انگیز واقعہ وہ ہے جب کہ ایک دیہاتی شخص آیا اور مسجد نبوی میں پیشاب کرنے لگا۔ لوگ اس کی طرف دوڑے تو آپ نے لوگوں کو روکا۔ جب وہ پیشاب سے فارغ ہو چکا تو آپ نے گندگی کی صفائی کرائی اور صحابہ سے فرمایا: فَإِنَّمَا بُعِثْتُمْ مُيَسِّرِينَ وَلَمْ تُبْعَثُوا مُعَسِّرِينَ (صحیح البخاری، حدیث نمبر 6128)۔ یعنی، تم آسانی کرنے والے بنا کر بھیجے گئے ہو، سختی کرنے والے بنا کر نہیں بھیجے گئے۔

قدیم زمانہ میں کعبہ کی عمارت ایک بار بارش کی زیادتی سے گر گئی تھی۔ قریش نے دوبارہ بنایا تو سامان کی کمی کی وجہ سے اصل بنائے ابراہیمی پر نہیں بنایا، بلکہ چھوٹا کر کے بنایا۔ آپ چاہتے تھے کہ اس کو دوبارہ بنائے ابراہیم کے مطابق بنوا دیں، مگر اس اندیشہ سے کہ کعبہ کی عمارت کے ساتھ جو تقدس شامل ہے، اس کی وجہ سے لوگ شاید اس کے انہدام کا تحمل نہ کر سکیں، آپ اس سے باز رہے۔ آپ نے ایک بار حضرت عائشہ سے فرمایا: لَوْلَا حَدَاثَةُ عَهْدِ قَوْمِكِ بِالْكُفْرِ لَنَقَضْتُ الْكَعْبَةَ، وَلَجَعَلْتُهَا عَلَى أَسَاسِ إِبْرَاهِيمَ (صحیح البخاری، حدیث نمبر 1585؛ صحیح مسلم، حدیث نمبر 1333)۔ یعنی، اگر تمہاری قوم نئی نئی کفر سے نہ نکلی ہوتی تو میں بیت اللہ کو توڑ کر پھر سے ابراہیم کی بنیاد کے مطابق بنا دیتا۔

اِن احادیثِ رسول میں دراصل انسانی رعایت کی تعلیم دی گئی ہے۔ حدیثوں کا مطالعہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنتوں میں سے ایک سنت یہ ہے کہ انسان کے ساتھ آخری حد تک رعایت کا معاملہ کیا جائے۔ قول یا عمل، کسی میں بھی شدت کا انداز اختیار نہ کیا جائے۔

اِس رعایت کا مطلب لوگوں کو اُن کے حال پر چھوڑنا نہیں ہے، بلکہ اِس کا مطلب یہ ہے کہ اصلاح کے عمل کے لیے صحیح نقطۂ آغاز (starting point) اختیار کیا جائے۔ اصلاح کا صحیح طریقہ یہ ہے کہ اعمال کے ظاہری پہلوؤں کے بارے میں رعایت کا معاملہ کیا جائے اور زیادہ زور اور تاکید اعمال کے داخلی پہلوؤں پر دیا جائے۔ کیوں کہ ظواہر کی اصلاح سے داخلی اصلاح نہیں ہوتی۔ بلکہ اِس کے برعکس، داخلی اصلاح سے ظواہر کی اصلاح ہوتی ہے۔

رعایت کا فائدہ یہ ہوتا ہے کہ آدمی کو دین پر عمل کرنا، زیادہ مشکل نہیں معلوم ہوتا۔ وہ متوحش ہوئے بغیر دینی اعمال کو اختیار کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ اِس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ پہلے آدمی کے داخل کی اصلاح ہوتی ہے، پھر دھیرے دھیرے اس کے ظواہر بھی دین کے رنگ میں رنگ جاتے ہیں۔ رعایت دراصل حکیمانہ طریقِ کار کا دوسرا نام ہے، اور یہ ایک واقعہ ہے کہ حقیقی اصلاح ہمیشہ حکیمانہ طریقِ کار کے ذریعے حاصل ہوتی ہے، نہ کہ غیر حکیمانہ طریقِ کار کے ذریعے۔ مُصلح کا طریقہ ہمیشہ رعایت کا ہونا چاہیے۔ مصلح کا سارا زور اِس پر ہونا چاہیے کہ وہ لوگوں کے اندر جذبۂ عمل پیدا کرے۔ عمل کا جذبہ پیدا ہوتے ہی آدمی وہ کام خود کرنے لگتا ہے جس کو شدت پسند مصلح ناکام طور پر انجام دینا چاہتا ہے۔

اشتعال نہیں

ایک صاحب ہیں۔ وہ بظاہر عام حلیہ میں رہتے ہیں، مگر مزاج کے اعتبار سے بہت دیندار ہیں۔ وہ ایک تعلیم یافتہ آدمی ہیں اور قرآن وحدیث کے موضوعات پر کئی کتابیں لکھی ہیں۔

ایک روز نماز جمعہ کے بعد مسجد میں ان کی ملاقات ایک بزرگ سے ہوئی۔ موصوف کے ساتھی نے ان کا تعارف کراتے ہوئے کہا کہ یہ فلاں صاحب ہیں اور وہ قرآن وحدیث پر کئی کتابیں لکھ چکے ہیں۔ بزرگ نے موصوف کی طرف دیکھا تو انھوں نے پایا کہ وہ قمیص

پہنے ہوئے ہیں۔ سر پر گاندھی ٹوپی ہے۔ داڑھی بھی ایک مشت کے ناپ سے کم ہے۔ بزرگ نے یہ دیکھ کر فرمایا:

صورت سے تو ایسا معلوم نہیں ہوتا

بزرگ کی زبان سے یہ توہین آمیز تبصرہ سن کر موصوف کو غصہ آ گیا۔ تاہم انھوں نے برداشت کرلیا۔ وہ ایک لمحہ چپ رہے اور اس کے بعد بولے:

آپ کا ارشاد بجا ہے۔ مگر اللہ تعالیٰ کبھی گنہ گاروں سے بھی اپنا کام لے لیتے ہیں۔

یہ ٹھنڈا جواب مذکورہ بزرگ کے لیے اتنا سخت ثابت ہوا کہ اس کے بعد وہ کچھ بول نہ سکے اور خاموشی کے ساتھ واپس چلے گئے۔

یہ ایک مثال ہے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اشتعال کے وقت آدمی کو کیسا جواب دینا چاہیے۔ جب بھی کوئی آدمی آپ پر تنقید کرتا ہے، آپ کے خلاف کوئی سخت بات کہہ دیتا ہے تو آپ کے بدن میں آگ لگ جاتی ہے۔ آپ چاہنے لگتے ہیں کہ اس کو بھسم کر دیں، جس طرح اس نے آپ کو بھسم کیا ہے۔ مگر یہ طریقہ شیطانی طریقہ ہے۔ صحیح طریقہ یہ ہے کہ آپ اس کڑواہٹ کو پی جائیں۔ جو جھٹکا آپ پر لگا ہے، اس کو دوسرے کے اوپر ڈالنے کے بجائے خود اپنے آپ پر سہہ لیں۔ جب آپ ایسا کریں گے تو آپ کو ایک نئی قوت حاصل ہوگی۔ آپ اس حکمت کو جانیں گے کہ کڑوے الفاظ کا جواب میٹھے الفاظ سے دینا زیادہ سخت جواب ہے۔

یہ ایک حقیقت ہے کہ اشتعال کے وقت جو شخص صبر کرے اور سوچ سمجھ کر بولے، وہ زیادہ طاقتور انداز میں اپنی بات کہنے کے لائق ہو جاتا ہے۔ وہ اس قابل ہو جاتا ہے کہ مشتعل الفاظ کا جواب ٹھنڈے الفاظ سے دے اور ٹھنڈک آگ کو زیادہ بجھانے والی ہے۔ وہ اس قابل ہو جاتا ہے کہ اپنے مخالف کو معاف کر دے اور معاف کر دینا یقیناً سب سے بڑا انتقام ہے۔

نفرت نہیں محبت

کرکٹ کے کھیل میں سب سے زیادہ کامیاب باؤلر وہ سمجھا جاتا ہے جو سب سے زیادہ تیز گیند پھینکے۔ ڈنیس لیلی (Dennis Lille) کرکٹ کا مشہور کھلاڑی ہے۔ اس کی باؤلنگ کی رفتار 140 کیلومیٹر فی گھنٹہ سے زیادہ ہے۔ ڈنیس لیلی (پیدائش 1949ء) سے پوچھا گیا کہ تیز باؤلنگ کا راز کیا ہے۔ اس نے جواب دیا: تیز گیند پھینکنے کی حیرت ناک کوشش کو برقرار رکھنے کے لیے آپ کو عملی طور پر بیٹ والے سے نفرت کرنا ہوگا۔ میں بیٹ والوں کو چور سمجھتا ہوں، جو میرے رن کو چرانے کی کوشش کر رہے ہوں:

To keep up the tremendous effort of fast bowling. you've practically got to hate the batsman. I think of batsman as thieves, trying to steal runs from me.

(*Reader's Digest*, June 1981, p. 48)

کھیل کے میدان کا یہی اصول سیاست کے میدان میں بھی رائج ہے۔ ہر سیاسی لیڈر، شعوری یا غیر شعوری طور پر، یہ جانتا ہے کہ سیاست کو کامیاب بنانے کا سب سے بڑا ذریعہ نفرت ہے۔ وہ اپنے پیروؤں میں جتنا زیادہ نفرت کا جذبہ پیدا کرے گا، اتنا ہی زیادہ وہ سرگرمی دکھاسکیں گے اور قربانیاں دیں گے۔ اس دنیا میں وہی لیڈر کامیاب ہوتا ہے، جو اپنی سیاست کے لیے کوئی ایسا جذباتی ایشو تلاش کرلے جس کے نام پر لوگوں کے اندر زیادہ سے زیادہ نفرت کی آگ بھڑکائی جاسکتی ہو۔ موجودہ زمانہ کی تمام بڑی بڑی سیاسی تحریکیں کسی نہ کسی قابل نفرت نشانہ کے اوپر کھڑی ہوئی ہیں، کسی کا نشانہ کوئی قوم ہے، کسی کا کوئی بادشاہ اور کسی کا کوئی حکمراں۔

مگر نفرت کی بنیاد پر اٹھنے والی تحریک خدا کی نظر میں سراسر باطل ہے، خواہ وہ بظاہر مکمل اسلام ہی کے نام پر کیوں نہ اٹھی ہو۔ مخصوص اسباب کی بنا پر موجودہ زمانہ میں دنیا بھر کے مسلمان احساس مظلومی (persecution complex) میں مبتلا ہیں۔ اس لیے ان کے

درمیان جب کوئی ایسی تحریک اٹھتی ہے جو کسی مسلم دشمن طاقت کی نشان دہی کر کے اس کو مٹانے کا نعرہ دے رہی ہو تو مسلمان بہت جلد اس کے گرد جمع ہو جاتے ہیں۔ اور اگر یہ تحریک اسلام کی اصطلاحوں میں بول رہی ہو تو مسلمان اور بھی زیادہ جوش جہاد کے ساتھ اس کی طرف بڑھتے ہیں، کیوں کہ ایسی صورت میں ان کو یہ اطمینان رہتا ہے کہ ان کی نفرت کی سیاست عین اسلام کی سیاست ہے، نہ کہ کوئی غیر اسلامی سیاست۔ مگر یہ سراسر بھول ہے۔ اسلام کی سیاست صرف وہ ہے جو محبت اور خیر خواہی کی بنیاد پر اٹھے۔ جس کی دشمنی "کفر" سے ہو، نہ کہ "کافر" سے۔ جو "شرک" کے خلاف برپا ہوئی ہو، نہ کہ "مشرک" کے خلاف۔

اسلامی رواداری

انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا (1984ء) کے مقالہ نگار نے سائنس کی تاریخ (History of Science) کے موضوع پر تفصیلات پیش کرتے ہوئے اعتراف کیا ہے کہ جس وقت اسلامی تہذیب عروج پر تھی، اس وقت مغربی یورپ میں تہذیب بالکل پست حالت میں تھی۔ پیغمبر اسلام کے پیروؤں کی فتوحات ساتویں صدی عیسوی میں شروع ہوئیں۔ دسویں صدی عیسوی تک یہ حال ہوا کہ ایران سے لے کر اسپین تک تمام قوموں کی علمی زبان عربی بن چکی تھی۔

عرب فاتحین عام طور پر ان ملکوں میں امن اور خوش حالی لے آئے جہاں وہ آباد ہوئے۔ مثال کے طور پر اسپین میں قرطبہ کے کتب خانہ میں اس وقت پانچ لاکھ سے بھی زیادہ کتابیں تھیں جب کہ پائرینیز کے شمال میں مشکل سے پانچ ہزار کتابیں پائی جاتی تھیں۔ مزید یہ کہ مسلمان دوسرے مذاہب کے ماننے والوں کے لیے بھی روادار تھے۔ چنانچہ مسلم عہدِ حکومت میں یہودی اعلیٰ ترین عہدوں پر فائز تھے، جب کہ اس زمانے میں یورپ کا یہ حال تھا کہ وہاں انھیں زندہ رہنے کا حق بھی مشکل سے دیا جاتا تھا:

The Muslims were tolerant of the other monotheistic faiths. So that Jews rose to high position in Islamic

lands at a time when they were scarcely permitted survival in Europe (EB. 16/368).

موسیٰ بن میمون (1204-1138ء) یہود کے اکابر علماء میں سے تھا۔ وہ کلدانی، یونانی، عبرانی اور عربی زبانیں جانتا تھا۔ یہود کے یہاں اُس کی مقبولیت اتنی زیادہ تھی کہ انھوں نے اس کو حضرت موسیٰ علیہ السلام سے تشبیہ دی۔ انھوں نے کہا کہ موسیٰ سے موسی تک موسیٰ جیسا کوئی شخص پیدا نہیں ہوا (من موسی الی موسی لم یظھر واحد کموسی)۔

موسی بن میمون کی پیدائش اندلس کے شہر قرطبہ میں ہوئی۔ اس کے بعد وہ مصر پہنچا۔ اس وقت صلاح الدین ایوبی مصر کا حکمراں تھا۔ اس نے موسیٰ بن میمون کو اپنا طبیب خاص مقرر کیا۔ موسیٰ بن میمون کی یہودیت کے باوجود صلاح الدین ایوبی (1193-1137ء) نے اس کی قدرومنزلت میں کوئی کمی نہ کی۔

توسع اور رواداری

برطانیہ کی یہودی ایکٹرس وینیسا ریڈ گریو (Vannesa Redgrave, b. 1937) کو 1977ء میں ہالی وڈ کا بہترین انعام "آسکر ایوارڈ" ملا ہے۔ مالٹا کے سفر میں ایک اخبار نویس نے اس سے سوال کیا: "کسی فن کار کے سیاسی نظریات کس حد تک عوام کو اس کے فن سے برگشتہ کرسکتے ہیں"۔ ریڈ گریو نے جواب دیا: "میں نے ایک سامع کی حیثیت سے ویگنر (Richard Wagner, 1813-1883) کی موسیقی کو سننے سے اس لیے کبھی انکار نہیں کیا کہ ظالم ہٹلر اس کو بہت پسند کرتا تھا"۔

دو ملک ایک واقعہ

ہندستان کے شہر بھاگلپور میں 24 اکتوبر 1990ء کو ہندو مسلم فساد ہوا، جس کا سلسلہ کئی

دن تک جاری رہا۔ اس میں مسلمانوں کا زبردست جانی و مالی نقصان ہوا۔ اس کے بارے میں بہت سی رپورٹیں اخبارات میں آچکی ہیں۔ بھاگل پور کے مولانا اکرام الدین قاسمی (پیدائش 1938ء) نے ذاتی جائزہ کے بعد ایک مفصل رپورٹ شائع کی ہے، جو 104 صفحات پر مشتمل ہے۔ اس رپورٹ کا عنوان ہے: بھاگلپور میں آگ اور خون کی ہولی۔

اس رپورٹ کے ٹائٹل پر ایک تصویر ہے، جس میں دکھایا گیا ہے کہ کس طرح سات مسلمانوں کو بے دردی کے ساتھ جلایا اور قتل کیا گیا۔ اس تصویر کے نیچے لکھا ہوا ہے:

بھاگلپور کے ایک خاندان کے سات افراد کی لاشیں، جن میں ایک سال کا معصوم بچہ بھی شامل ہے۔

اب دوسری تصویر دیکھیے۔ پاکستان کے شہر کراچی میں 7 فروری 1990ء کو مسلم- مسلم فساد ہوا، جس کا سلسلہ کئی روز تک برابر جاری رہا۔ پاکستان کے مشہور اخبار نوائے وقت (8 فروری 1990ء) کے صفحہ اول پر اس کی خبر نمایاں طور پر چھپی ہے۔ اس خبر کی سرخی یہ ہے: کراچی میں آگ اور خون کا کھیل۔

اس سلسلہ میں نوائے وقت (10 فروری 1990ء) کے صفحہ اول پر مزید یہ خبر درج ہے کہ کراچی میں پانچ افراد پیٹ چاک کرنے کے بعد زندہ جلا دیے گئے۔ یہ المناک اور بہیمانہ واقعہ منگھو پیر روڈ پر ہوا۔ یہاں ایک جلی ہوئی سوزوکی وین سے پانچ مسخ شدہ لاشیں برآمد کی گئیں۔ ان پانچ افراد کو رسیوں کے ساتھ وین کے اندر باندھا گیا اور ان کا پیٹ پھاڑ کر زندہ جلا دیا گیا۔

جو لوگ "بھاگلپور" کے واقعہ کو ہندو ظلم کے خانہ میں ڈالتے ہیں، وہ کراچی کے اسی قسم کے واقعہ کو کس کے ظلم کے خانہ میں ڈالیں گے۔ حقیقت یہ ہے کہ ہمیں ان دونوں واقعات کا کوئی مشترک سبب تلاش کرنا ہوگا۔ یہ مشترک سبب صرف ایک ہے۔ اور وہ ہے عدمِ برداشت۔

زندگی ناخوش گوار واقعات کوخوش گواری کے ساتھ برداشت کرنے کا نام ہے۔ اگر آپ اس برداشت کے لیے تیار ہوں تو آپ اپنی زندگی میں کامیاب رہیں گے۔ اور اگر آپ اس برداشت پر راضی نہ ہوں تو آپ "آگ اور خون" کے حوالے کیے جائیں گے، خواہ آپ مسلم ملک میں ہوں یا غیر مسلم ملک میں۔

حکمتِ اعراض

ایک صاحب اپنے خط مورخہ 28 ستمبر 1999ء میں لکھتے ہیں: میں نے ہندی اخبار "ہندستان" کا شمارہ 28 ستمبر 1999ء پڑھا۔ اس کے اداریہ میں یہ لکھا تھا کہ حال میں سورت (گجرات) میں "گنیش وسرجن" کا جلوس نکلا۔ اس موقع پر پولیس اور جلوس کے درمیان ٹکراؤ ہو گیا۔ پتھراؤ اور فائرنگ کے نتیجہ میں جلوس کے آٹھ افراد ہلاک اور کئی درجن زخمی ہو گئے۔ یہ جلوس شہر کے مسلم محلہ کی ایک مسجد کے پاس سے گزر رہا تھا۔ ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ مسلم اور ہندو یا مسلم اور پولیس کے درمیان لڑائی ہوجاتی مگر عملاً اس کا الٹا ہوا۔ مسلمانوں نے وہاں پر صبر کا رویہ اپنایا جس کی وجہ سے انہیں اس کا پھل مل گیا۔ اس میں کسی بھی مسلمان کا نقصان نہیں ہوا۔ کیونکہ ٹکراؤ انتظامیہ اور ہندوؤں کے درمیان ہوا تھا۔ یہ پڑھ کر آپ کی وہ بات یاد آگئی جو آپ "الرسالہ" یا کئی دیگر کتابوں میں لکھ چکے ہیں۔ (سہیل احمد، حسن البنا منزل، جامعۃ الفلاح، بلریا گنج، اعظم گڑھ)

"سورت" کا یہ واقعہ تمام اخباروں میں آچکا ہے۔ اس واقعہ میں بہت بڑا سبق ہے۔ اس سبق کی طرف الرسالہ میں بار بار نشاندہی کی جاتی رہی ہے۔ وہ یہ کہ — مسلم کش فسادات کا اصل سبب جلوس کا نکلنا اور اس کا مسلم محلہ سے گزرنا نہیں ہے، بلکہ اس کا اصل سبب یہ ہے کہ جب جلوس نکلے تو محلہ والے اس کے مقابلہ میں غیر حکیمانہ رویہ اختیار کریں۔ حکیمانہ رویہ ہمیشہ حفاظت کا ضامن ہوتا ہے اور غیر حکیمانہ رویہ ہمیشہ نقصان کا باعث بنتا ہے۔

اس معاملہ کا خلاصہ یہ ہے کہ جلوس کے وقت وہاں کے مسلمان اگر منفی ردِّ عمل کا طریقہ اختیار کریں تو مسئلہ مسلم ورسس پولیس بن جائے گا۔ اور اگر وہاں کے مسلمان ایسے موقع پر اعراض کا رویہ اختیار کریں تو سارا مسئلہ جلوس ورسس پولیس بن جائے گا۔ اس اصول کی صداقت بار بار فسادات کی صورت میں سامنے آچکی ہے۔ سورت کا مذکورہ واقعہ اس حکمت کی ایک مثبت مثال ہے۔

دورِ اول کے مسلمان مخالفین کی سازشوں اور زیادتیوں کے درمیان گھرے ہوئے تھے۔ اس وقت نصیحت کرتے ہوئے ان سے کہا گیا کہ: اگر تم صبر کرو اور اللہ سے ڈرو تو ان کی کوئی سازش تم کو نقصان نہ پہنچائے گی (3:120)۔ اب یہ غور کیجیے کہ دشمن کی سازشوں کے مقابلہ میں صبر کس طرح ڈھال بن جاتا ہے۔ اور زیر سازش گروہ کو اس کے نقصان سے محفوظ رکھتا ہے۔

اصل یہ ہے کہ اجتماعی زندگی میں جب بھی کوئی ناخوشگوار صورتِ حال پیش آئے تو اس کے مقابلہ میں ردِّ عمل کی دو صورتیں ہیں۔ ایک یہ کہ اشتعال انگیز صورتِ حال کو دیکھ کر آدمی بھڑک اٹھے اور فوری جذبات کے تحت جوابی کارروائی کرنے لگے۔ اور دوسرا یہ کہ فریقِ ثانی کی طرف سے اشتعال انگیزی کے باوجود وہ مشتعل نہ ہو بلکہ اپنے جذبات کو روک کر پورے معاملے پر غور کرے۔ اور اس کے بعد جو کچھ کرے ٹھنڈے ذہن کے تحت سوچ سمجھ کر کرے۔

مذکورہ تقسیم میں پہلی قسم کے ردِّ عمل کا نام غیر صابرانہ ردِّ عمل ہے اور دوسری قسم کے ردِّ عمل کا نام صابرانہ ردِّ عمل۔ دوسرے لفظوں میں اس فرق کو اس طرح بیان کیا جاسکتا ہے کہ غیر صابرانہ ردِّ عمل پیش آمدہ صورتِ حال کا جذباتی جواب (emotional response) ہے۔ اس کے برعکس، صابرانہ ردِّ عمل یہ ہے کہ پیش آمدہ صورتِ حال کے مقابلہ میں جو جوابی کارروائی کی جائے وہ ایک سوچا سمجھا جواب (considered response) ہو۔

صبر کوئی بے عملی نہیں ۔اس کا مطلب یہ نہیں کہ آدمی کے سامنے کوئی ناپسندیدہ صورتِ حال پیش آئے تو وہ پست ہمت ہو کر بیٹھ جائے ۔حقیقت یہ ہے کہ صبر اعلیٰ ترین بہادری ہے ۔جب ایک آدمی بے صبری کے ساتھ جذباتی اقدام کرتا ہے تو اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ وہ اپنے جذبات سے مغلوب ہو گیا۔اس کے برعکس، جب ایک آدمی صبر والی روش اختیار کرتا ہے تو یہ اس بات کا ثبوت ہوتا ہے کہ اس نے اپنے بھڑکے ہوئے جذبات کو قابو میں رکھا۔اس نے اپنے جذبات کو اپنی عقل پر غالب ہونے نہیں دیا۔

ایک واقعہ

6 ستمبر 1989ء کو میں انبیھٹہ (سہارن پور) میں تھا۔وہاں ایک واقعہ معلوم ہوا جس میں بہت بڑا اسبق ہے۔اس کو یہاں نقل کیا جاتا ہے۔

انبیھٹہ اتر پردیش (انڈیا) کے ضلع سہارن پور کا ایک قصبہ ہے۔ڈاکٹر شاہد صابری (پیدائش 1951ء) نے 1985ء میں اس آبادی کے باہر ایک زمین خریدی۔اس کا رقبہ تقریباً پانچ ایکڑ ہے۔انھوں نے زمین حاصل کرنے کے بعد اس کے چاروں طرف مینڈھ بنائی۔اس زمین سے متصل ہندوؤں کا مرگھٹ (شمشان) ہے۔مینڈھ بنانے کے بعد کچھ ہندوؤں نے اعتراض کیا کہ آپ نے مینڈھ غلط بنائی۔اس میں مرگھٹ کی زمین کا ایک حصہ شامل ہو گیا ہے۔یہ اعتراض کرنے والے وہ افراد تھے جو مقامی طور پر متعصب اور فرقہ پرست کی حیثیت سے مشہور ہیں۔

ڈاکٹر شاہد صابری نے کہا کہ آپ لوگ پیمائش کرالیں اور جتنی زمین پیمائش میں نکلے، اس کا دگنا لے کر مرگھٹ میں شامل کر لیجیے۔یہ کام آپ مجھ سے پوچھے بغیر خود سے کرلیں۔مجھے کوئی اعتراض نہ ہوگا۔

اگست 1987ء کا واقعہ ہے۔ ڈاکٹر شاہد صابری راستہ سے گزر رہے تھے کہ انھوں نے دیکھا کہ بہت سے ہندو آگے کی طرف جارہے ہیں۔ ملاقات کے بعد انھوں نے بتایا کہ آج ہم آپ کی زمین کو ناپنے جارہے ہیں۔ ڈاکٹر شاہد صاحب نے کہا کہ آپ لوگ ضرور جائیں اور ناپنے کے بعد مرگھٹ کی جو زمین ہماری طرف نکلے، اس کو بلا بحث اس میں شامل کرلیں۔ ان لوگوں نے کہا کہ آپ بھی چلیے تاکہ آپ کے سامنے پیمائش کی جاسکے۔

ڈاکٹر شاہد صابری بھی کچھ دیر بعد اپنی زمین پر پہنچ گئے۔ انھوں نے کوئی مداخلت نہیں کی۔ بلکہ ہندو صاحبان کو آزادانہ طور پر ناپنے کا موقع دیا۔ انھوں نے بار بار ناپا۔ یہاں تک کہ معلوم ہوا کہ ان کا شبہ غلط تھا۔ ڈاکٹر شاہد صاحب نے مینڈھ بالکل صحیح بنائی ہے، بلکہ ایک طرف خود اپنی کچھ زمین مرگھٹ (شمشان) کی طرف چھوڑ دی ہے۔

اس واقعہ کا اتنا اثر ہوا کہ اس کے بعد مقامی ہندوؤں نے ڈاکٹر شاہد صابری سے کہا کہ آپ انیبھٹہ کی چیئر مینی کے لیے کھڑے ہوجائیں۔ یہاں کے ہندو اور مسلمان دونوں آپ کا ساتھ دیں گے اور آپ بلا مقابلہ کامیاب ہوجائیں گے۔ مگر ڈاکٹر صابری نے شکریہ کے ساتھ انکار کردیا۔

اس میں سبق ہے

مولانا اکرام الدین قاسمی (پیدائش 1938ء) ڈمراواں (ضلع بھاگل پور) کے رہنے والے ہیں۔ فروری 1990ء کی ملاقات میں انھوں نے اپنے کچھ واقعات بتائے جن میں بہت بڑا سبق ہے۔

1966ء کا واقعہ ہے۔ مولانا اکرام الدین صاحب نے گنگا کو اسٹیمر سے پار کیا۔ وہ براری ریلوے اسٹیشن پر بھاگل پور جانے والی پسنجر ٹرین پر سوار ہوگئے۔ ٹرین میں بھیڑ تھی۔ ایک جگہ سیٹ پر ڈالڈہ کا ڈبہ رکھا ہوا تھا۔ وہ ڈبہ کو کھسکا کر وہاں بیٹھ گئے۔

تھوڑی دیر کے بعد ایک ہندو نوجوان آیا۔ یہ ڈبہ اسی کا تھا۔ وہ اس کو سیٹ پر رکھ کر باہر چلا گیا تھا۔ جب اس کو اندازہ ہوا کہ ڈبہ اپنی جگہ سے ہٹایا گیا ہے تو اس نے پوچھا کہ اس کو کس نے ہٹایا ہے۔ مولانا اکرام الدین صاحب نے کہا کہ میں نے ہٹایا ہے۔ یہ سنتے ہی وہ سخت غصہ ہو گیا، کیوں کہ اس کے عقیدہ کے مطابق ایک مسلمان نے اس کو چھو کر اس کو گندہ کر دیا تھا۔ اس نے کہا کہ اس ڈبہ میں گنگا جل تھا۔ اس کو لے کر میں دیوگھر جا رہا تھا۔ اس کو تم نے اپوتر (ناپاک) کر دیا، اب وہ لے جانے کے قابل نہیں رہا۔

وہ غصہ میں آپے سے باہر تھا۔ اور نہایت گرم اور اشتعال انگیز لہجہ میں بار بار کہہ رہا تھا کہ تم نے میرے گنگا جل کو اپوتر کر دیا۔ مولانا اکرام الدین صاحب نے ان باتوں کا کوئی اثر نہیں لیا۔ وہ خاموشی سے اٹھ کر کھڑے ہو گئے اور سیٹ نوجوان کے لیے خالی کر دی۔ انھوں نے کہا کہ میں نہیں جانتا تھا کہ اس ڈبہ میں گنگا جل ہے۔ اور وہ میرے چھونے سے اپوتر ہو جائے گا۔ مجھ سے غلطی ہو گئی، مجھے معاف کر دو۔

ہندو نوجوان ان کے خلاف برستا رہا اور وہ خاموشی سے کسی ردّ عمل کے بغیر اس کو سنتے رہے۔ یہ منظر دیکھ کر ڈبہ کے تمام ہندو اس نوجوان کے خلاف ہو گئے۔ اور مولانا اکرام الدین صاحب کی حمایت کرنے لگے۔ انھوں نے نوجوان سے کہا کہ مولانا جب چپ ہیں اور اپنی غلطی مان رہے ہیں تو تم کیوں ان کے خلاف اتنا زیادہ چیخ رہے ہو۔ انھوں نے مولانا اکرام الدین صاحب سے کہا کہ آپ بالکل مطمئن رہیے۔ یہ آپ کا کچھ نہیں کر سکتا ہے۔

آخر کار ہندو نوجوان چپ ہو گیا۔ مولانا اکرام الدین صاحب اپنی جگہ برابر کھڑے رہے۔ کچھ دیر کے بعد نوجوان نے بے رخی کے ساتھ مولانا اکرام الدین صاحب سے پوچھا کہ آپ کہاں سے آ رہے ہیں۔ انھوں نے بتایا کہ کھڑک بازار سے (اس وقت مولانا اسی مقام پر رہتے تھے)۔ نوجوان نے کہا کہ کھڑک بازار میں ایک مولانا اکرام الدین ہیں، کیا

آپ ان کو جانتے ہیں۔ وہ بہت اچھے آدمی ہیں۔ میری ماں ان کے پاس گئی تھی اور ان سے تعویذ لائی تھی۔ اس تعویذ سے بہت فائدہ ہوا۔ میں ان سے ملنا چاہتا ہوں۔

مولانا اکرام الدین صاحب نے مسکراتے ہوئے کہا کہ ابھی تو وہ سفر میں ہیں۔ کل تک وہ وہاں پہنچ جائیں گے۔ اس وقت ان سے ملاقات ہوسکتی ہے۔ ہندو نوجوان نے پوچھا کہ آپ کو کیسے معلوم کہ وہ سفر میں ہیں۔ انھوں نے جواب دیا کہ جس مسافر سے تم بات کر رہے ہو، وہی مولانا اکرام الدین ہیں۔

یہ سنتے ہی ہندو نوجوان نے مولانا اکرام الدین کے پاؤں پکڑ لیے۔ اس نے کہا کہ مجھے چھما کر دیجیے۔ مجھ سے بہت بھاری غلطی ہوگئی۔ اس غلطی پر جی چاہتا ہے کہ میں اپنے آپ کو مار لوں۔ وہ نوجوان اپنی سیٹ سے اٹھ کر کھڑا ہو گیا اور اصرار کر کے مولانا اکرام الدین صاحب کو اپنی جگہ بٹھا دیا۔ اس کے بعد وہ آخری اسٹیشن تک برابر کھڑا رہا۔ اگلے اسٹیشن پر جب دونوں اترے تو نوجوان نے اصرار کر کے مولانا کو ناشتہ کرایا۔

مولانا اکرام الدین صاحب نے اس طرح کے اور کئی واقعات سنائے اور کہا کہ ہندوؤں میں ہم نے جو اخلاق پایا، وہ اخلاق ہم نے موجودہ مسلمانوں میں نہیں پایا۔

اسی طرح انھوں نے بتایا کہ 1982ء میں، میں تراویح سنانے کے لیے بنگلور گیا ہوا تھا۔ ایک روز میں گھنور سے کورم ہلّی بذریعہ اسکوٹر جا رہا تھا۔ راستہ میں میرے اسکوٹر کا پٹرول ختم ہوگیا۔ کچھ دور تک میں اسکوٹر کو دھکیل کر لے گیا۔ پھر سڑک کے کنارے ناریل کا ایک باغ دکھائی دیا۔ اس کے اندر ایک کار کھڑی ہوئی تھی۔ میں باغ کے اندر گیا۔ وہاں ایک ہندو بیٹھا ہوا تھا۔ مجھ کو دیکھتے ہی اس نے اپنے آدمی سے کہا کہ ایک کرسی لے آؤ۔ مجھ کو کرسی پر بٹھا کر پوچھا کہ حضرت کیا کام ہے۔ میں نے کہا کہ میری گاڑی میں پٹرول ختم ہو گیا ہے۔ یہاں سے آٹھ کیلومیٹر دور جانے پر مجھے پٹرول مل سکے گا۔ میں کار دیکھ کر یہاں آ گیا کہ شاید یہاں سے مجھے پٹرول مل جائے۔

مذکورہ ہندو نے فوراً اپنے ڈرائیور سے کہا کہ دیکھو اگر باہر پٹرول ہو تو اس کو حضرت کی گاڑی میں ڈال دو۔ اور اگر باہر نہ ہو تو اپنی گاڑی میں سے نکال کر ان کو پٹرول دے دو۔ پیٹرول لینے کے بعد میں نے اپنی جیب سے بیس روپیہ کا نوٹ نکالا، تا کہ پٹرول کی قیمت ادا کروں۔ اب ہندو فوراً ہاتھ جوڑ کر کھڑا ہو گیا۔ اس نے کہا کہ ہم کو معاف کیجیے۔ پیسہ کی ضرورت نہیں۔ ہم کو بس آپ کی دعا چاہیے۔

انسان کو غصہ نہ دلائیے۔ اور اگر کسی وجہ سے وہ غصہ ہو جائے تو جوابی غصہ نہ کر کے اس کو ٹھنڈا کر دیجیے۔ اس کے بعد آپ دیکھیں گے کہ جس کو آپ اپنا دشمن سمجھ رہے تھے، وہ آپ کے لیے ایسا ہو گیا ہے جیسے کہ وہ آپ کا قریبی دوست ہو۔

ہر آدمی خدا کا بنایا ہوا ہے۔ اس دنیا میں کوئی آدمی نہیں جس کو خدا کے علاوہ کسی اور نے پیدا کیا ہو۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ہر آدمی کے اندر وہی فطرت ہے، جو کسی دوسرے کے اندر ہے۔ ہر آدمی کے اندر اچھے اور برے کی وہی تمیز موجود ہے، جو کسی دوسرے کے اندر پائی جاتی ہے۔

تاہم اسی کے ساتھ ہر آدمی کے اندر انا (ego) بھی موجود ہے۔ یہی ''انا'' ساری خرابیاں پیدا کرتا ہے۔ مگر اللہ تعالیٰ نے اپنی رحمت خاص سے ہر آدمی کی انانیت کو اس کے سینہ کے اندر سلا رکھا ہے۔ ہر آدمی کی انا ابتدائی طور پر حالتِ خواب میں ہے۔ آپ کی عقل مندی یہ ہے کہ آدمی کی اس انا کو سویا رہنے دیں، اس کو کبھی بیدار نہ کریں۔

جب آدمی کی انا (ego) سو رہی ہو تو وہ اپنی حالتِ فطری پر ہوتا ہے۔ اس وقت وہ وہی کرتا ہے جو سچی انسانیت کا تقاضا ہے۔ کوئی آدمی صرف اس وقت برا بنتا ہے، جب کہ اس کی انانیت کو جگا دیا جائے۔ عقل مند آدمی کو چاہیے کہ وہ دوسروں کی انا کو جگانے سے آخری حد تک پرہیز کرے، اور بالفرض اگر کسی کی انا جاگ اٹھے تو پہلی فرصت میں اپنے حکیمانہ رویہ سے اس آگ کو بجھا دے۔

جولوگ عقل مندی کی اس روش کو اختیار کرلیں، ان کو کبھی دوسروں کی طرف سے شکایت نہ ہوگی، خواہ وہ ایک ملک میں رہتے ہوں یا کسی دوسرے ملک میں۔

تدبیر، نہ کہ اشتعال

20 فروری 1991ء کو مئو کے عبد الجبار صاحب (64 سال) سے ملاقات ہوئی۔ انھوں نے کہا کہ ہر فساد کا واحد حل حکیمانہ تدبیر ہے۔ اگر حکمت کا طریقہ اختیار کیا جائے تو کبھی کوئی فساد نہ ہوگا۔ اس سلسلہ میں انھوں نے اپنے ذاتی تجربہ کے کئی واقعات بتائے۔

مئو کے محلہ مرزا ہادی پورہ میں عبد الحکیم گرہست صاحب رہتے ہیں۔ ان کے گھر کے پاس ایک مسجد ہے، جو "جامع مسجد احناف" کے نام سے مشہور ہے۔ 1981ء کا واقعہ ہے۔ رات کے وقت کسی نے خنزیر کا مرا ہوا بچہ اس مسجد میں ڈال دیا۔ صبح کو فجر کی نماز کے لیے لوگ مسجد آئے تو دیکھا کہ وہاں خنزیر پڑا ہوا ہے۔

خبر مشہور ہوتے ہی سارے مئو میں سنسنی پھیل گئی۔ 8 بجے تک عبد الحکیم گرہست کے مکان پر بھیڑ لگ گئی۔ مسلمان بڑی تعداد میں جمع ہو گئے۔ لوگ سخت مشتعل تھے۔ اور قریب تھا کہ کوئی کارروائی کر بیٹھیں اور پھر سارے شہر میں فساد کی صورت پیدا ہو جائے۔ مگر عبد الحکیم گرہست صاحب نے لوگوں کو سختی سے روکا اور پرامن رہنے کی تاکید کی۔

اس کے بعد انھوں نے پولیس کو ٹیلی فون کیا۔ فوراً پولیس جائے واردات پر پہنچ گئی۔ پولیس والوں نے ضلع کے صدر دفتر اعظم گڑھ کو بھی ٹیلی فون کر دیا تھا۔ چنانچہ وہاں سے بھی افسران آگئے۔ پولیس افسروں نے آکر مسلمانوں کو سمجھایا اور کہا کہ آپ لوگ پُرامن رہیں، ہم کو کارروائی کرنے کا موقع دیں۔ اس کے بعد پولیس والوں نے خنزیر کو وہاں سے اٹھوایا۔ اور فائر بریگیڈ کو بلا کر دور تک پانی سے اچھی طرح دھو دیا۔ اس کے بعد معاملہ وہیں کا وہیں ختم ہو گیا۔ کسی قسم کے فساد کی نوبت نہیں آئی۔ جب کہ اس طرح کے ایک واقعہ پر اکثر پورا شہر فساد کی زد میں آجاتا ہے۔

اس طرح کے مواقع پر بہترین عقل مندی یہ ہے کہ مسلمان امن پسندی کا ثبوت دیں۔ وہ خود کوئی جارحانہ کارروائی نہ کریں، بلکہ معاملہ کو پولیس کے حوالے کردیں۔ اگر وہ ایسا کریں تو یقینی ہے کہ کسی قسم کا فساد نہیں ہوگا۔ خنزیر ڈالنے والے اس لیے خنزیر ڈالتے ہیں کہ مسلمان مشتعل ہوکر کوئی جارحانہ کارروائی کردیں، تاکہ انھیں مکمل فساد کرنے کا موقع مل جائے۔ اس سازش کا توڑ یہ ہے کہ مسلمان بالکل خاموش رہیں اور پولیس کو اطلاع دینے کے سوا کوئی اور کارروائی نہ کریں۔ یہ فساد کے بم کو ناکارہ کردینے کے ہم معنی ہوگا۔

اعراض کا فائدہ

پونہ کے ایک سفر میں وہاں کے لوگوں نے بتایا کہ 22 ستمبر 1991ء کو پونہ میں گنیش چترتھی کا جلوس نکلنے والا تھا۔ اسی دن 12 ربیع الاول کی تاریخ بھی تھی، اور اس کی نسبت سے مسلمان اپنا میلاد النبی کا جلوس نکالنا چاہتے تھے۔ اگر دونوں جلوس ایک ہی دن نکلتا تو یقینی تھا کہ دونوں میں ٹکراؤ ہو اور فرقہ وارانہ فساد کی صورت پیدا ہوجائے۔ اور پھر جشن کا دن شہر کے لیے غم کا دن بن جائے۔

پونہ کی سیرت کمیٹی کی دانش مندی سے یہ خطرہ ٹل گیا۔ انھوں نے ایک اجتماع کرکے مشورہ کیا کہ ایسی حالت میں کیا کیا جائے۔ اتفاق رائے سے فیصلہ ہوا کہ ہم لوگ اس معاملہ میں اعراض کا طریقہ اختیار کریں۔ چنانچہ انھوں نے اپنی تاریخ بدل دی۔ انھوں نے میلاد النبی کا جلوس چند دن کی تاخیر کے ساتھ 27 ستمبر کو نکالا۔ اس طرح ہندو جلوس اور مسلمان جلوس دونوں پرامن طور پر دو الگ الگ تاریخوں میں نکلے اور کسی ٹکراؤ کی نوبت نہیں آئی۔

اس واقعہ پر شہر کے تمام لوگ بہت خوش ہوئے۔ اور مسلمانوں کی دانش مندی کو سراہا۔ خاص طور پر پولیس کے لوگوں نے بہت زیادہ خوشی کا اظہار کیا۔ اور مسلمانوں کے اس عمل کی تعریف کی۔ انھوں نے مسلمانوں سے مل کر ان کا شکریہ ادا کیا۔ فساد نہ ہونا پولیس کے

لیے ایک ذاتی کارنامہ کی حیثیت رکھتا ہے، اور یقینی طور پر پولیس کے لوگ چاہتے ہیں کہ یہ کارنامہ ان کی فہرست اعمال میں لکھا جائے۔

پونہ کی سیرت کمیٹی نے جب تاریخ کی تبدیلی کا فیصلہ کیا تو اس وقت انھوں نے اس کی خبر مراٹھی اخباروں میں شائع کرادی۔ اس طرح پورے مہاراشٹر کے مسلمانوں کو اس کی اطلاع ہوگئی۔ چنانچہ دوسرے جن مقامات پر دونوں جلوس ایک ہی دن نکلنے والے تھے، وہاں بھی اس طرح مسلمانوں نے اپنے جلوس کی تاریخ کو بدل دیا۔ اس کے نتیجہ میں پورا مہاراشٹر فساد کے نقصان سے بچ گیا۔

فرقہ وارانہ فساد سے بچنے کی سب سے زیادہ کارگر تدبیر یہی اعراض کا طریقہ ہے۔ جہاں بھی لوگوں نے اس تدبیر کو استعمال کیا ہے، وہاں فساد نہیں ہوا۔ فساد کے بم کو ناکارہ کرنے کی یہی واحد تدبیر ہے۔ فساد ہمیشہ غصہ کے تحت ہوتا ہے، نہ کہ سازش کے تحت۔

ایم فیکٹر، کیو فیکٹر

دہلی کے ایک مسلم نوجوان ایک انگریزی میگزین میں کام کرتے تھے۔ اِس میگزین کے مالکان سب ہندو تھے۔ چند سال کے بعد منتظمین کی طرف سے مذکورہ مسلم نوجوان سے کہا گیا کہ آپ استعفیٰ دے دیں۔ چوں کہ یہ اندیشہ تھا کہ اگر وہ استعفیٰ نہ دیں تو اُن کو برخاست کر دیا جائے گا۔ اِس لیے انھوں نے استعفیٰ دے دیا۔

اِس کے بعد مذکورہ مسلم نوجوان سے میری ملاقات ہوئی۔ انھوں نے کہا کہ میرے ساتھی کہتے ہیں کہ اِس کا سبب ایم فیکٹر (M-factor) ہے۔ میں نے کہا کہ ہرگز نہیں، اِس کا سبب صرف کیو فیکٹر (Q-factor) ہے، یعنی مسلم فیکٹر نہیں، بلکہ کوالٹی فیکٹر۔ میں نے کہا کہ آپ اپنے دل سے منفی خیال مکمل طور پر نکال دیں اور آپ صرف ایک کام کریں، وہ ہے اپنی انگلش رائٹنگ کو امپروو (improve) کرنا۔

میرے مشورے سے انھوں نے برٹش کاؤنسل میں داخلہ لے لیا۔ وہاں انھوں نے ایک سال اپنی زبان کو امپروو کرنے کی کوشش کی۔ برٹش کاؤنسل سے ایک سال کا کورس پورا کرنے کے بعد ان کی زبان پہلے سے بہتر ہو چکی تھی۔ اِس کے بعد انھوں نے ایک اور انگریزی میگزین میں انٹرویو دیا۔ وہاں ان کا سلیکشن ہو گیا۔ اب وہ اِس دوسرے انگریزی میگزین میں کام کررہے ہیں۔ یہاں ان کو پہلے سے تقریباً تین گنا زیادہ تنخواہ ملتی ہے، جب کہ اِس دوسرے میگزین کے مالکان بھی ہندو ہیں۔

اِس مثال سے زندگی کی ایک حقیقت معلوم ہوتی ہے۔ اکثر لوگوں کا یہ طریقہ ہے کہ جب وہ کسی ناپسندیدہ صورتِ حال سے دوچار ہوتے ہیں تو وہ یہ کرتے ہیں کہ اس کو فوراً تعصب (bias) کا معاملہ سمجھ کر اس کی ذمے داری دوسرے کے خانے میں ڈال دیتے ہیں۔ لیکن گہرا مطالعہ بتاتا ہے کہ تعصب کا لفظ صرف ڈکشنری میں پایا جاتا ہے، حقیقی زندگی میں اس کا کوئی وجود نہیں۔

جب بھی آپ کو دوسروں کی طرف سے کوئی ناخوش گوار تجربہ پیش آئے تو سمجھ لیجیے کہ وہ خود آپ کی کسی کمی کی بنا پر پیش آیا ہے۔ اپنی کمی کو دریافت کرکے اس کو دور کیجیے اور پھر آپ کی شکایت اپنے آپ ختم ہو جائے گی۔

نفرت کلچر

امریکا کے سابق صدر جارج بش اپنے آخری دورِ صدارت میں عراق گئے، وہاں 4 دسمبر 2008ء کو بغداد میں ایک پریس کانفرنس تھی۔ اِس موقع پر ایک عراقی صحافی منتظر الزیدی نے اپنا جوتا نکال کر جارج بش کی طرف پھینکا۔ اِس واقعے پر سارا مسلم ورلڈ جھوم اٹھا۔ ایک عرب دولت مند نے اِس صحافی کو ایک ملین ڈالر دینے کا اعلان کیا، وغیرہ۔ اِس واقعے کے بعد مسلم

دنیا میں ایک نیا احتجاجی کلچر چل پڑا جس کو جوتا کلچر کہا جاسکتا ہے۔ ایک مسلم اخبار نے جوتا پھینکنے کے اِن مناظر کی تصویریں چھاپی ہیں اور اُس پر یہ عنوان قائم کیا ہے:

Shoes that made history.

موجودہ زمانے کے مسلمان منفی سوچ میں جی رہے ہیں۔ مذکورہ واقعہ اِس منفی سوچ کا ایک انتہائی بدنما مظاہرہ ہے۔ اِس جوتا کلچر کا صرف یہ نتیجہ ہوا کہ اس نے عالمی سطح پر اسلام اور مسلمانوں کی تصویر بگاڑ دی۔ اِس لیے اس کا صحیح عنوان یہ ہونا چاہیے:

Shoes that distorted the image of Islam.

جوتا پھینکنے کا یہ کلچر اپنی حقیقت کے اعتبار سے دوسروں پر جوتا پھینکنا نہیں ہے، بلکہ وہ خود اپنے آپ پر جوتا پھینکنا ہے۔ ایسا کر کے مسلمان دوسروں کو کوئی نقصان نہیں پہنچا رہے ہیں، بلکہ وہ خود اپنے آپ کو ایکسپوز (expose) کر رہے ہیں۔ یہ واقعہ اور اِس طرح کے دوسرے واقعات یہ بتاتے ہیں کہ موجودہ زمانے کے مسلمانوں کے پاس دوسروں کے لیے صرف نفرت کا سرمایہ ہے۔ یہ بلا شبہ وہی نفسیات ہے جس کا مظاہرہ آدم کی تخلیق کے وقت ابلیس نے کیا تھا۔ جو لوگ انسان کے خلاف اِس قسم کی نفرت آمیز نفسیات میں مبتلا ہوں، انھیں سوچنا چاہیے کہ وہ اپنے اِس عمل سے کس کی پیروی کر رہے ہیں۔ اِس طرح کے افعال بلا شبہ خدا کے غضب کو دعوت دینے والے ہیں۔ وہ کسی کو خدا کی رحمت کا مستحق بنانے والے نہیں۔ سچا مومن وہ ہے جو انسان سے محبت کرے۔ جو لوگ انسان سے نفرت کریں، وہ سچے مومن نہیں۔ جوتا کلچر انسانی شرافت کے بھی خلاف ہے اور ایمان اور اسلام کے بھی خلاف۔

اختلاف کو حل کرنے کی تدبیر

قدیم زمانہ میں کہا جاتا تھا کہ الحربُ أنفی لِلحَرْبِ (جنگ کا توڑ جنگ ہے)۔ یہ فکر ہزاروں برس سے انسان کے اندر چلی آرہی تھی۔ بد قسمتی سے یہی فکر تاریخی تسلسل کے نتیجہ میں

خود مسلمانوں میں کسی نہ کسی طور پر جاری رہا۔ حضرت عثمان کی شہادت سے لے کر اب تک کی مسلم تاریخ میں اس کے نمونے پھیلے ہوئے ہیں۔ 1948ء میں فلسطین کا مسئلہ پیدا ہوا جو عملاً پوری مسلم دنیا کا سب سے بڑا مسئلہ بن گیا۔ اس وقت بھی تمام مسلم ذہن اسی ڈھنگ پر سوچنے لگے۔ اس سوچ کی نمائندگی ایک عرب شاعر خیر الدین الزرکلی (وفات 1976ء) کے شعر میں ان الفاظ میں ملتی ہے — صلاح الدین ایوبی کو ہمارے درمیان دوبارہ لے آؤ، حطین یا حطین جیسے معرکے دوبارہ گرم کرو:

هاتي صَلاحَ الدِّينِ . . . ثانِيَةً فينا

وجَدِّدي حِطِّينَ . . . أَوْ شِبْهَ حِطِّينَا

اقبال اپنے علم اور ذہانت کے باوجود اس فکر سے اوپر نہ اُٹھ سکے۔ ان کا پورا کلام کسی نہ کسی طور پر اسی فکر کی نمائندگی کرتا ہے۔ مثال کے طور پر ان کا یہ شعر پڑھیے:

گفتند جہان ما آیا بتو می سازد گفتم کہ نمی سازد گفتند کہ برہم زن

یعنی، دریافت فرمایا کہ میرا جہاں تمہارے ساتھ سازگاری کر رہا ہے؟ میں نے جواب دیا سازگاری نہیں کر رہا۔ کہا کہ اسے درہم برہم کر دو۔

اسلام اس معاملہ میں انقلابی تبدیلی کا پیغام تھا۔ جنگ کیوں ہوتی ہے۔ جنگ ہمیشہ اختلافات کے نتیجہ میں ہوتی ہے۔ لوگ اختلاف کو صرف مٹانا جانتے تھے، اس لیے وہ فوراً فریقِ ثانی سے لڑ جاتے تھے۔ اسلام نے اس معاملہ میں ایک نئے اُصول کو رواج دیا۔ قرآن میں یہ اُصول ان الفاظ میں بتایا گیا ہے: وَالصُّلْحُ خَيْرٌ (4:128)۔ یعنی، اور صلح بہتر ہے۔

اس آیت کا لفظی ترجمہ یہ ہے کہ صلح بہتر ہے۔ صلح کیا ہے۔ صلح یہ ہے کہ اختلاف کو مٹانے پر زور نہ دیا جائے بلکہ اختلاف کو گوارہ کرتے ہوئے تعلقات کو بہتر بنانے کی

کوشش کی جائے۔ گویا اس کا مطلب ہے، اختلاف کے باوجود اتحاد۔ اس فارمولے کو اس طرح بیان کیا جاسکتا ہے:

Art of difference management

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کی پوری زندگی اسی تدبیر کا عملی نمونہ ہے۔ مثال کے طور پر آپ نے قدیم مکہ میں 610ء میں دعوتِ توحید کا مشن شروع کیا۔ اس وقت توحید کے نقطۂ نظر سے مکہ میں سب سے زیادہ سنگین مسئلہ یہ تھا کہ توحید کے گھر (کعبہ) میں 360 بت رکھے ہوئے تھے۔ مگر اس وقت قرآن میں اس مفہوم کی کوئی آیت نہیں اتری: طَہِّر الکعبۃ من الأصنام (کعبہ کو بتوں سے پاک کرو)۔ بلکہ اس کے بجائے قرآن میں یہ آیت اتری کہ: وَثِيَابَكَ فَطَهِّرْ (74:4)۔ یعنی، اپنے اخلاق کو درست کرو۔

اس قرآنی اُصول پر عمل کرتے ہوئے پیغمبر اسلام نے یہ کیا کہ آپ نے مکہ کے تیرہ سالہ قیام کے زمانہ میں کبھی بتوں کو توڑنے کی کوشش نہیں کی۔ اس کے بجائے آپ نے یہ کیا کہ لوگوں کو توحید کا پیغام دینے کی پر امن جدو جہد شروع کردی۔ پیغمبر اسلام کی زندگی میں اس قسم کی بہت سی مثالیں ملتی ہیں۔ انھی میں سے ایک نمایاں واقعہ صلح حدیبیہ 628ء کا ہے۔ یہ صلح گویا ڈیفرنس مینجمنٹ (difference management) کی ایک کامیاب مثال تھی جو انسانی تاریخ میں غالباً پہلی بار نہایت کامیابی کے ساتھ قائم کی گئی۔

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی امت کو سخت انتباہ دیا تھا کہ اختلاف خواہ کتنا ہی بڑا ہو وہ ہر حال میں ڈیفرنس مینجمنٹ کے اُصول پر اس کو حل کرے۔ کسی بھی حال میں وہ ایسا نہ کرے کہ اتحاد کے نام پر اختلاف کو مٹانے کی کوشش کرے۔ حدیث کے مجموعوں میں کتاب الفتن کے تحت کثرت سے اس قسم کی روایتیں آئی ہیں جن میں یہ کہا گیا ہے کہ میرے بعد امراء اور حکام کے اندر بگاڑ آئے گا مگر تم ہرگز ان سے ٹکراؤ نہ کرنا۔ تم ظلم کے

باوجود ان کا حق ادا کرنا اور اپنے حق کے لیے اللہ سے دعا کرنا (أَدُّوا إِلَيْهِمْ حَقَّهُمْ، وَسَلُوا اللّٰہ حقکم) مسند احمد، حدیث نمبر 3641۔

اس معاملہ میں ایک حدیث وہ ہے جو سنن ابوداؤد، جامع الترمذی، سنن ابن ماجہ اور مسند احمد میں آئی ہے۔ یہ ایک لمبی روایت ہے، اس کا آخری حصہ یہ ہے:

إِنِّي لَأَخَافُ عَلَى أُمَّتِي الْأَئِمَّةَ الْمُضِلِّينَ، فَإِذَا وُضِعَ السَّيْفُ فِي أُمَّتِي لَمْ يُرْفَعْ عَنْهُمْ إِلَى يَوْمِ الْقِيَامَةِ (تفسیر عبد الرزاق، حدیث نمبر 814)۔ یعنی، مجھے اپنی امت کے بارے میں سب سے زیادہ اندیشہ گمراہ کن لیڈروں سے ہے اور جب تلوار میری امت میں داخل ہوگی تو پھر وہ اس سے قیامت تک نہیں اٹھائی جائے گی۔

اس حدیث کا مطلب دراصل یہ ہے کہ امت میں جب اختلافات پیدا ہوں گے تو نااہل لیڈر ڈیفرنس مینجمنٹ کے اُصول پر اس کو رفع نہ کرسکیں گے بلکہ وہ اختلاف کو دور کرنے کے نام پر لڑائی چھیڑ دیں گے اور جب ایک بار امت میں دین کے نام پر لڑائی کی روایت قائم ہوگئی تو اجتماعی نفسیات کی بنا پر وہ قیامت تک جاری رہے گی۔

حدیث کی یہ پیشین گوئی بدقسمتی سے امت کی بعد کی تاریخ کے بارے میں درست ثابت ہوئی۔ امت کے اندر وضع سیف کا یہ معاملہ خلیفہ ثالث عثمان بن عفان کی شہادت کے ساتھ شروع ہوا۔ پھر اس کے بعد وہ اس طرح مسلسل جاری ہو گیا کہ امت کی ہزار سالہ تاریخ میں وہ کبھی ختم نہیں ہوا۔ خلیفہ چہارم اور دمِ عثمان کے نام پر اُٹھنے والوں کے درمیان جنگ، حسین اور یزید کے درمیان جنگ، بنوامیہ اور بنوعباس کے درمیان جنگ، سنی اور شیعہ کے درمیان جنگ، مغلوں اور غیر مغلوں کے درمیان جنگ، اسی طرح موجودہ زمانہ میں سیکولر حکمرانوں اور اسلام پسند جماعتوں کے درمیان جنگ، وغیرہ سب اسی کی مثالیں ہیں۔

حدیث میں آیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اخْتِلافُ أُمَّتِي رَحْمَةٌ (المقاصد الحسنۃ، حدیث نمبر 39)۔ یعنی، میری امت کا اختلاف رحمت ہے۔ اس حدیث کا مطلب یہ ہے کہ اختلاف (difference) خدا کے تخلیقی نقشہ کا ایک حصہ ہے۔ وہ فطرت کا ایک لازمی جزء ہے اس لیے اختلاف کبھی زندگی سے ختم نہیں ہوتا۔ امت کے اصحاب علم ومعرفت اس راز کو سمجھیں گے اور اختلاف کو مٹانے کے بجائے اختلاف کے ساتھ جینے کی کوشش کریں گے۔ دوسرے لفظوں میں یہ کہ وہ ڈیفرنس مینجمنٹ کے اصول پر اس مسئلہ کو حل کریں گے۔ اس طرح سنت کی پیروی کی صورت میں اختلاف امت محمدی کے لیے رحمت بن جائے گا۔ اختلاف کے ہوتے ہوئے وہ ترقی کا پر امن سفر کامیابی کے ساتھ طے کر سکیں گے۔

حقیقت یہ ہے کہ جس طرح دوسری بہت سی سنتیں ہیں اسی طرح وہ چیز بھی ایک سنت رسول ہے جس کو ہم نے آرٹ آف ڈیفرنس مینجمنٹ کا نام دیا ہے۔ اس اُصول کا تعلق اسلام کے تمام پہلوؤں سے ہے، کوئی بھی پہلو اس سے خالی نہیں۔

مثال کے طور پر فقہی اختلافات جو ہزار سال سے اب تک ٹکراؤ کا سبب بنے ہوئے ہیں ان کے معاملہ میں ڈیفرنس مینجمنٹ کا سادہ اُصول یہ ہے کہ یہ مان لیا جائے کہ یہ اختلافات توسع پر مبنی ہیں، نہ کہ تعدد پر۔ ان میں سے جس طریقہ کی بھی پیروی کی جائے وہ درست ہوگا (بِأَيِّهِمْ اقْتَدَيْتُمْ اهْتَدَيْتُمْ)۔

اسی طرح علی اور معاویہ کا معاملہ یا یہ سوال کہ چاروں خلفاء کے درمیان تفضیل کی بحث۔ اس قسم کے معاملات میں ڈیفرنس مینجمنٹ کے اُصول کا انطباق (application) یہ ہے کہ اس کو خدا کے حوالہ کر دیا جائے اور ہر فرقہ اپنی آج کی ذمہ داریوں کو ادا کرنے میں مشغول ہو جائے۔

موجودہ زمانہ میں اکثر مسلم ملکوں میں سیکولر حکمرانوں اور اسلام پسند جماعتوں کے درمیان تباہ کن ٹکراؤ جاری ہے۔ اس معاملہ میں ڈیفرنس مینجمنٹ کا انطباق یہ ہے کہ اسلام پسند جماعتیں حکومت کے دائرہ میں براہ راست مداخلت کا طریقہ چھوڑ دیں۔ وہ غیر حکومتی دائرہ، مثلاً تعلیم اور اصلاح اور دعوت کے شعبوں میں، اپنی کوششیں صرف کریں۔

موجودہ زمانہ میں ہم دیکھتے ہیں کہ مسلمان لیڈر یا مسلم گروہ مختلف ملکوں میں کسی نہ کسی قومی یا ملّی مقصد کے حوالہ سے غیر مسلم حکومتوں سے متشددانہ ٹکراؤ کا سلسلہ جاری کیے ہوئے ہیں۔ مثلاً فلسطین اور کشمیر اور چیچنیا اور فلپائن، وغیرہ میں۔ ان مقامات پر ڈیفرنس مینجمنٹ کے اُصول کا انطباق یہ ہے کہ ہر قسم کے تشدد کو مکمل طور پر ترک کردیا جائے اور صرف مسلّمہ پرامن طریق کار کی پابندی کرتے ہوئے اپنی تحریک چلائی جائے۔

قرآن کریم کی آیت: وَالصُّلْحُ خَيْرٌ (4:128) ۔یعنی، صلح بہتر ہے— بتاتی ہے کہ ڈیفرنس مینجمنٹ کا مذکورہ طریقہ مطلق طور پر خیر کا سبب ہے۔ وہ ہر حال میں قابل عمل ہے۔ یہ طریقہ صرف اس وقت ناقابل عمل بن جاتا ہے جب کہ تشدد کا آغاز کرکے فضا کو بگاڑ دیا جائے۔ تشدد کا آغاز لازمی طور پر جوابی تشدد پیدا کرے گا اور پرامن طریق کار کو اختیار کرنا ممکن نہ رہے گا۔ اگر مسلمان یہ غلطی کریں کہ تشدد کا آغاز کرکے وہ صورت حال کو بگاڑ دیں تو خود انہیں کو دوبارہ صورت حال کو نارمل بنانے کی ذمہ داری لینی پڑے گی۔ اور وہ ذمہ داری یہ ہے کہ وہ اپنے تشدد کو یک طرفہ طور پر ختم کردیں تاکہ وہ موافق فضا پیدا ہو جس میں ڈیفرنس مینجمنٹ پر عمل کرنا ممکن ہوجائے۔

اسلام دین فطرت ہے۔ مذکورہ اصول فطرت ہی کا ایک اصول ہے جس کو اسلام میں اختیار کیا گیا ہے۔ اصل یہ ہے کہ موجودہ دنیا کا نظام خدا نے اس طرح بنایا ہے کہ یہاں لازماً ایک اور دوسرے کے درمیان اختلافات پیدا ہوں۔ ایک اور دوسرے کے درمیان مختلف اعتبار سے اتنا زیادہ فرق پایا جاتا ہے کہ ہر انسان کو مسٹر ڈیفرنٹ کہنا صحیح ہوگا۔ اس

دنیا میں ہر سماج فرق و اختلاف والا سماج ہے۔ یہ فرق و اختلاف چونکہ خود فطرت کا ایک لازمی حصہ ہے اس لیے اس کو ختم کرنا ممکن نہیں۔ ایسی حالت میں قابل عمل صورت صرف یہ ہے کہ فرق کے ساتھ نبھانے کا اصول اختیار کیا جائے نہ کہ فرق کو مٹانے کا۔

It requires difference management rather than eliminating the difference.

فطرت کے اس اصول کا تعلق مذہبی معاملہ سے بھی ہے اور سیکولر معاملہ سے بھی۔ اس دنیا میں کوئی بھی نظام مذہبی ہو یا غیر مذہبی، کامیاب طور پر وہی لوگ بنا سکتے ہیں جو ڈیفرنس مینجمنٹ کا آرٹ جانتے ہوں۔ فرق واختلاف کو مٹانا تشدد پیدا کرتا ہے اور فرق واختلاف کو مینج کرنا امن اور ہم آہنگی کا سبب بنتا ہے۔

فرق واختلاف کوئی بُرائی نہیں، وہ ترقی کا زینہ ہے۔ فرق واختلاف سے اجتماعی زندگی میں چیلنج پیدا ہوتا ہے۔ اور چیلنج کا سامنا کرنا ہی اس دنیا میں ہر قسم کی ترقی کا واحد راز ہے۔

کوئی دشمن نہیں

پچھلے زمانے میں کوئی کسی کا دوست ہوتا تھا، اور کوئی کسی کا دشمن۔ اب زمانہ بدل چکا ہے۔ اب کوئی نہ کسی کا دوست ہے، اور نہ کوئی کسی کا دشمن۔ اب ہر آدمی پروسیلف (pro-self) ہے۔ ہر آدمی کا ایک ہی کنسرن (concern) ہے۔ اور وہ اس کا اپنا انٹرسٹ ہے۔ آج کا انسان اپنے انٹرسٹ میں اتنا گم ہے کہ اس کو کسی اور کے خلاف سوچنے کی فرصت نہیں۔

اس کا سبب کیا ہے۔ اس کا فرق کا سبب یہ ہے کہ قدیم زمانے میں مواقع (opportunities) بہت محدود ہوتے تھے۔ مواقع پر ایک مراعات یافتہ طبقہ (privileged class) کا قبضہ ہوتا تھا۔ موجودہ زمانے میں اصولی طور پر یہ صورتِ حال ختم ہوگئی ہے۔ اب تمام مواقع ہر آدمی کے لیے کھل گئے ہیں۔ اس لیے ہر آدمی اپنے انٹرسٹ کے

لیے دوڑ رہا ہے۔ ذاتی انٹرسٹ کے اس دوڑ میں کسی کے پاس دوسرے کے خلاف سوچنے کا وقت نہیں۔ کسی کے پاس دوسرے کے خلاف دشمنی اور سازش کرنے کا وقت نہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ دشمنی کا لفظ دور جدید کی ڈکشنری سے عملاً حذف ہو چکا ہے۔ اب اگر کوئی کسی کا دشمن بنتا ہے تو وہ اس وقت بنتا ہے جب کہ اس کو "پتھر" مار کر اس کو مشتعل کر دیا جائے۔ اگر آپ آبیل مجھے مار کی سیاست اختیار کر کے کسی کے ایگو (ego) کو چھیڑ دیں تو وہ ضرور آپ کو سینگ مارے گا۔ اگر آپ مکمل طور پر پر امن بن جائیں تو کوئی شخص نہ آپ کا دشمن ہوگا، اور نہ کوئی شخص آپ کے خلاف سازش کرے گا۔

ایک حدیث رسول موجودہ زمانے میں مزید اضافہ کے ساتھ صادق آتی ہے: الْفِتْنَةُ نَائِمَةٌ لَعَنَ اللّٰهُ مَنْ أَيْقَظَهَا (کنز العمال، حدیث نمبر 30891)۔ یعنی، فتنہ سویا ہوا ہے، اس پر اللہ کی لعنت ہو جو اس کو جگائے — ہوش مندی کے ساتھ زندگی گزاریے، اور پھر آپ کو کسی سے دشمنی کا تجربہ نہ ہوگا۔

انتہا پسندی نہیں

ایک مغربی مصنف لینس آرم اسٹرانگ (Lance Armstrong) کی ایک کتاب چھپی ہے۔ یہ کتاب اسپورٹس اور اس کے شائقین کے بارے میں ہے۔ اِس کتاب کا فرانسیسی نام یہ ہے:

Tour de France.

کتاب کے مصنف نے بتایا ہے کہ اسپورٹس کے شائقین کی یہ نفسیات ہے کہ وہ اپنی قوم کے جیتنے والوں سے جذباتی طور پر محبت کرتے ہیں، اور اگر وہ ہار جائیں تو اسی شدت کے ساتھ وہ اُن سے نفرت کرنے لگتے ہیں۔ اس قسم کے واقعات کا ذکر کرتے ہوئے مصنف نے لکھا ہے

کہ — عوام یا تو آپ سے محبت کرتے ہیں یا آپ سے نفرت۔ اِس معاملے میں ان کے یہاں کوئی درمیانی حالت نہیں:

Either the public loves you or hates you. There is no such thing as a happy middle ground.

عوامی نفسیات کے بارے میں یہ بیان بالکل درست ہے۔ عام لوگ محبت اور نفرت دونوں کے معاملے میں سخت جذباتی واقع ہوئے ہیں۔ یہ بلاشبہ ایک تباہ کن عادت ہے۔ صحیح یہ ہے کہ محبت اور نفرت کو عقل کے تابع کیا جائے، نہ کہ جذبات کے تابع۔

حدیث میں آیا ہے کہ دوستی کرو تو اعتدال کے ساتھ کرو، شاید تمھارا دوست کبھی تمھارا دشمن بن جائے۔ اور دشمنی کرو تو اعتدال کے ساتھ کرو، شاید تمھارا دشمن کبھی تمھارا دوست بن جائے—

أَحْبِبْ حَبِيبَكَ هَوْنًا مَا عَسَى أَنْ يَكُونَ بَغِيضَكَ يَوْمًا مَا، وَأَبْغِضْ بَغِيضَكَ هَوْنًا مَا عَسَى أَنْ يَكُونَ حَبِيبَكَ يَوْمًا مَا (سنن الترمذی، حدیث نمبر 1997)۔

یہ ایک نہایت حکیمانہ ہدایت ہے۔ دنیا میں دوستی اور دشمنی دونوں عارضی چیزیں ہیں۔ اِس معاملے میں ضروری ہے کہ آدمی اعتدال پسندی کا رویہ اختیار کرے، نہ کہ انتہا پسندی کا رویہ۔ اعتدال پسندی کا رویہ ہمیشہ مفید ثابت ہوتا ہے، اور انتہا پسندی کا رویہ ہمیشہ مہلک نتیجے کا سبب بنتا ہے۔

محبت کے بجائے نفرت

”میں مرادآباد میں پیدا ہوا۔ پھر دس برس بجنور میں رہا۔ 14 برس دہلی میں اور اب 35

برس سے حجاز میں ہوں۔ حضرت شاہ عبدالعزیز کے فتوے کی بنا پر میں ہندستان کو دارالحرب جانتا تھا اور اس کے قیام کو حرام۔ اسی نظریہ کے تحت انگریزی دور میں ہندستان سے ہجرت کی، بلکہ ہجرت شرعی سے بھی کچھ زیادہ۔ یہ معاملہ میری نظر میں اتنا سنگین تھا کہ حجاز آنے کے بعد دوبارہ ہندستان واپس جانے کے تصور کو بھی میں ناجائز خیال کرتا تھا۔ ایک بار میں بیوی کے ساتھ حج کے لیے گیا ہوا تھا۔ عرفات کا میدان تھا اور عصر ومغرب کے درمیان کا وقت۔ یہ وقت میدان عرفات میں گناہوں کی بخشش کا ہوتا ہے، میں نے اپنی اہلیہ سے کہا کہ یہ گناہوں کی معافی کا وقت ہے۔ سب سے بڑا مسئلہ حقوق العباد کا ہوتا ہے۔ مجھ سے تمہارے حقوق کی ادائیگی میں جو کوتاہی ہوئی ہو اس کو معاف کردو۔ بیوی نے کہا کہ ایک شرط ہے۔ وہ یہ کہ تم مجھ کو ہندستان لے جا کر ایک بار مجھے میرے عزیزوں سے ملا دو۔ ہندستان کا نام سن کر میرے ہوش اڑ گئے۔ میں اور ہندستان۔ پھر میں نے اپنے دل میں سوچا کہ ایک طرف دوزخ ہو، اور دوسری طرف ہندستان تو تم دونوں میں سے کس کو ترجیح دو گے۔ اس کے بعد میں نے جو فیصلہ کیا وہ آپ خود سمجھ سکتے ہیں"۔

یہ ایک بزرگ کی خودنوشت کہانی کا ایک حصہ ہے، جو انھوں نے دہلی کے ایک اردو روزنامہ (5 اگست 1991ء) میں شائع کی ہے۔ یہ کوئی ایک کہانی نہیں، اس قسم کی ان گنت کہانیاں ہیں، جو ساری دنیا میں بکھری ہوئی ہیں۔ موجودہ زمانہ میں ایسے بے شمار لوگ پیدا ہوئے جنھوں نے غیرمسلم قوموں کو اسلام کا حریف سمجھ کر ان سے نفرت کی، مگر وہ ان کو اسلام کا مدعو اور مخاطب سمجھ کر ان سے محبت نہ کر سکے۔ ان خیالات کے تحت بے شمار لوگ ایسی ہجرت اور جہاد میں مصروف رہے، جس کا کوئی فائدہ نہ دینی صورت میں نکلنے والا تھا اور نہ دنیوی صورت میں۔

کیسی عجیب بات ہے۔ لوگوں نے ہندستان کو دارِحرب سمجھا، مگر وہ اس کو دارِدعوت نہ سمجھ سکے۔ ہندوؤں کو انھوں نے غیرقوم قرار دیا، مگر وہ ان کو مدعو قوم قرار نہ دے سکے۔

انگریزوں اور فرانسیسیوں کو لوگوں نے شیطان کے بندے کہہ کر ان کے خلاف جہاد کیا، مگر وہ ان کو خدا کے بندے سمجھ کر ان کو خدا سے قریب لانے کی کوشش نہ کر سکے۔ انھوں نے مسلم حکمرانوں اور بادشاہوں کو ظالم ٹھہرا کر ان کی ہلاکت کے منصوبے بنائے، مگر وہ ان کو اپنا بھٹکا ہوا بھائی جان کر ان کی اصلاح کی خیر خواہانہ کوشش نہ کر سکے۔ کیسی عجیب تھی یہ ہجرت اور کیسا عجیب تھا یہ جہاد۔ اس عجیب وغریب ہجرت اور جہاد کے نتیجہ میں اگر موجودہ دنیا میں اسلام کو غلبہ حاصل نہ ہو سکا تو اس میں تعجب کی کوئی بات نہیں۔

دشمن میں دوست

روایات میں آتا ہے کہ محرم 3ھ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے غطفان کی جانب سفر کیا۔ اس سفر سے واپسی میں آپ ایک موقع پر ایک درخت کے نیچے تنہا لیٹ کر آرام فرما رہے تھے۔ اس وقت مشرکین میں سے ایک شخص ادھر سے گزرا۔ وہ آپ کو اکیلا دیکھ کر آپ کے پاس آیا۔ اس کے ہاتھ میں ایک تلوار تھی۔ اس نے کہا کہ اے محمد، تم کو مجھ سے کون بچائے گا۔ آپ نے فرمایا کہ اللہ۔ اس کے بعد اس نے تلوار رکھ دی اور آپ کے پاس بیٹھ گیا۔ آپ نے تلوار اپنے ہاتھ میں لے لی اور کہا کہ اب بتاؤ کہ تم کو مجھ سے کون بچائے گا۔ اس نے کہا کہ آپ بہتر تلوار لینے والے ہیں۔ آپ نے اس سے یہ وعدہ لے کر چھوڑ دیا کہ وہ آئندہ کبھی آپ کے مقابلہ میں نہیں آئے گا۔ اس کے بعد وہ اپنے قبیلہ والوں کے پاس گیا اور کہا کہ میں تمھارے پاس سب سے اچھے انسان سے مل کر آ رہا ہوں: جِئْتُكُمْ مِنْ عِنْدِ خَيْرِ النَّاسِ (مسند احمد، حدیث نمبر 15190؛ سنن سعید بن منصور، حدیث نمبر 2504)۔

دوسری روایت کے مطابق، اعرابی کا یہ کہنا اس کے قبیلہ والوں کے لیے اسلام سے قربت کا سبب بن گیا۔ چنانچہ پورا کا پورا قبیلہ آپ کا ساتھی بن گیا (مغازی الواقدی،

جلد 1، صفحہ 196)۔ جس آدمی نے آپ کی جان لینے کا ارادہ کیا تھا، آپ کے حسنِ اخلاق کے نتیجہ میں اس نے اپنے قبیلہ کے تمام آدمی کو آپ کا ساتھی بنا دیا۔

ہر آدمی کے اندر پیدائشی طور پر دو مختلف صلاحیتیں ہیں۔ ایک نفسِ لوّامہ (ضمیر) اور دوسرے، نفسِ امّارہ (انانیت)۔ یہ دونوں صلاحیتیں ابتدائی طور پر سوئی ہوئی حالت میں ہوتی ہیں۔ اب اگر آپ فریق ثانی کے نفسِ لوّامہ کو جگائیں تو اس کی شخصیت کا انسانی جزء آپ کے حصہ میں آئے گا۔ اور اگر آپ فریق ثانی کے نفسِ امّارہ کو جگائیں تو اس کی شخصیت کا حیوانی جزء آپ کے حصہ میں آئے گا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی کوشش ہمیشہ یہ ہوتی تھی کہ آپ آدمی کے وجود کے انسانی حصہ کو جگائیں۔ اس لیے آپ نہ صرف اچھوں کے ساتھ اچھا سلوک کرتے تھے، بلکہ بروں کے ساتھ بھی آپ ہمیشہ اچھا سلوک کرتے تھے۔ اس کی وجہ سے آدمی کی چھپی ہوئی فطرت جاگتی تھی۔ اور آخر کار وہ آپ کا ساتھی بن جاتا تھا۔

موجودہ مسلمان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اس سنت پر عمل نہیں کرتے کہ بروں کے ساتھ بھی اچھا سلوک کرو۔ وہ ہمیشہ ردِّ عمل کا طریقہ اختیار کرتے ہیں۔ چنانچہ ان کا طریقہ صرف فریقِ ثانی کی انانیت کو جگانے کا باعث بنتا ہے۔ خدا کے بندوں کے لیے ان کے پاس "معافی" نہیں، البتہ ان کے پاس "نفرت" کافی مقدار میں موجود ہے، جس کو وہ لوگوں کے اوپر انڈیلتے رہتے ہیں۔ ایسے لوگوں کو خدا کے اس باغ میں صرف کانٹے ملیں گے۔ وہ اس باغ کے پھولوں کے مالک نہیں بن سکتے۔ یہی قانونِ قدرت کا فیصلہ ہے۔

صبر واعراض کا کرشمہ

جناب محمد کلیم اللہ صاحب مدراس کے رہنے والے ہیں۔ انھوں نے مکمل حوالے کے

ساتھ مدراس کے دو تقابلی واقعات ہمیں لکھ کر بھیجے ہیں۔ ان واقعات میں بہت بڑا سبق ہے۔ موصوف کا پتہ یہ ہے:

Mohammad Kalimullah, 352, T.T.K. Road,
Royapettah, Madras 600014.

ان کا خط مورخہ 28 ستمبر 1991ء اور مورخہ 12 اکتوبر 1991ء ہمارے سامنے ہے۔ اس کے ساتھ انھوں نے اس کے انگریزی روزنامہ "ہندو" کی ایک کاپی روانہ کی ہے جس کے صفحہ 3 پر مذکورہ واقعہ کی رپورٹ شائع کی گئی ہے۔ یہ رپورٹ مکمل طور پر اس صفحہ کے نیچے نقل کی جا رہی ہے۔ خبر یہ ہے:

مدراس میں ہر سال گنیش چترتھی کا جلوس نکلتا ہے۔ پچھلے سال ہندوؤں کا یہ مذہبی جلوس 21 ستمبر 1990ء کو نکلا تھا۔ یہ جلوس چلتا ہوا ٹرپلی کین ہائی روڈ میں داخل ہوا۔ یہ ایک مسلم علاقہ ہے، یہاں مسجد کے سامنے باجا بجایا گیا اور اشتعال انگیز نعرے لگائے گئے۔ اس پر مسلمان مشتعل ہو گئے۔ آخر کار مسلمانوں اور پولیس کے درمیان باقاعدہ لڑائی شروع ہو گئی۔ پولیس نے گولی چلائی جس کے نتیجہ میں دو مسلمان مارے گئے۔ بہت سے زخمی ہوئے۔ مسلمانوں کی کئی دکانوں میں توڑ پھوڑ کی گئی۔ جانی اور مالی دونوں نقصان صرف مسلمانوں کا ہوا۔

گنیش چترتھی کا یہ جلوس اس سال بھی 21 ستمبر 1991ء کو نکالا گیا۔ مگر اس سال مسلمانوں نے جوش کے بجائے ہوش سے کام لیا۔ انھوں نے اس بار "اعراض کرو اور کامیابی حاصل کرو" کا فارمولا استعمال کرنے کا فیصلہ کیا۔ جلوس نے حسب معمول مسلم محلہ میں باجا بھی بجایا اور اشتعال انگیز نعرے بھی لگائے۔ مگر مسلمانوں نے نہ تو روٹ بدلنے کا مطالبہ کیا اور نہ وہ اشتعال انگیز باتوں پر مشتعل ہوئے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ جلوس سڑک پر چلتا ہوا گزر گیا۔ مسلمانوں کا کوئی جانی یا مالی نقصان نہیں ہوا۔ علاقہ میں مکمل طور پر امن قائم رہا۔

RESTRAINT PREVENTED LARGE SCALE VIOLENCE

Two organisations—Citizens for a Secular Society and Penn — a Centre for Women's Studies—have expressed deep concem over the Vinayaka Chathurthi procession on Sunday.

In a statement they said "the processions were far from religious in nature. What we found instead was an aggressive and communal campaign directed against members of the minority community. The processionists were boisterous young men, a number of them carrying sticks, shouting slogans like 'This is a Hindu nation and only Hindus can live here: "We will destroy the mosque and build a Ram temple." Fearless Hindus, come forward as a battalion.

This show of communal viciousness made a mockery of a supposedly religious occasion. Members of the minority community, on the whole showed great restraint. It was this, combined with effective police presence that, in our opinion, prevented large scale violence.

The attention of the public is drawn to this transforming of a religious event by blatantly communal and political organisations. (The Hindu, Madras, September 26, 1991).

موجودہ واقعہ پر مدراس کے انگریزی اخبار ہندو (26 ستمبر 1991ء) نے جو رپورٹ چھاپی ہے وہ نہایت سبق آموز ہے۔ اس رپورٹ میں بتایا گیا ہے کہ پچھلے سال کے برعکس، اس سال جلوس کے واقعہ پر فساد نہ ہونے کا خاص سبب مسلمانوں کا صبر وتحمل کا رویہ تھا۔ دو ہندو تنظیموں نے مسلمانوں کی تعریف کرتے ہوئے ہندوؤں کے جلوس کی مذمت کی ہے اور کہا ہے کہ وہ مذہب کے نام پر فرقہ واریت پھیلانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ جلوس

والوں نے اقلیتی فرقہ کے خلاف قابل اعتراض نعرے لگائے جن کا مذہب سے کوئی بھی تعلق نہیں تھا۔ انھوں نے مدراس پولیس کی بھی تعریف کی جس نے شہر کو نقض امن سے بچانے کی موثر تدابیر اختیار کیں (صفحہ 3)۔

اس خبر پر غور کیجیے۔ ایک ہی واقعہ ایک ہی محلہ میں دو بار ہوتا ہے، ایک بار وہاں فساد ہو جاتا ہے، اور دوسری بار فساد نہیں ہوتا۔ اس فرق کا سبب جلوس والوں کا رویہ نہیں ہے، بلکہ محلہ والوں کا رویہ ہے۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ فساد کا ہونا یا نہ ہونا تمام تر محلہ والوں کے اختیار میں ہے۔ وہ چاہیں تو ایک قسم کا ردعمل اختیار کر کے معاملہ کو فساد تک پہنچا دیں اور چاہیں تو دوسرے قسم کا ردعمل اختیار کر کے فساد کی جڑ کاٹ دیں۔

دوسرا سبق اس میں یہ ہے کہ مسلمان اگر ان مواقع پر مخالفانہ ردعمل کا مظاہرہ کریں تو معاملہ پولیس اور مسلمان کا بن جاتا ہے۔ اس کے برعکس، اگر وہ اعراض کا طریقہ اختیار کریں تو معاملہ جلوس والوں کا اور پولیس کا رہتا ہے۔ ایک صورت میں مسلمان پولیس کے نشانہ پر آجاتے ہیں اور دوسری صورت میں جلوس والے۔

تیسرا سبق یہ ہے کہ تحمل کا رویہ نہایت اثر کرنے والا رویہ ہے۔ چنانچہ مدراس کے مذکورہ واقعہ پر جب مسلمانوں نے تحمل کا رویہ اختیار کیا تو خود اکثریتی فرقہ کے اندر سے ایسے افراد اٹھے جنھوں نے جلوس والوں کی مذمت کی۔ اور مسلمانوں کی شرافت کا واضح طور پر اعتراف کیا۔ اخبارات میں مسلمانوں کو سراہا گیا اور دوسرے گروہ کو کنڈم کیا گیا۔

یہ سارا کرشمہ صرف ایک چیز کا تھا، اور وہ صبر ہے، جس کو اخبار ”ہندو“ نے اپنے تبصرہ میں برداشت (restraint) کا نام دیا ہے۔

سماجی ہم آہنگی

(انگریزی سہ ماہی میگزین السلام، نئی دہلی سے موصول ہونے والے سوالنامے کے جواب میں یہ مضمون لکھا گیا تھا۔ الرسالہ، ستمبر 2003 میں چوں کہ سوال کے بغیر صرف جوابات شائع ہوئے تھے۔ اس لیے یہاں بھی صرف جوابات ہی نمبر وار نقل کیے جا رہے ہیں)۔

①

مختلف مذہبوں اور تہذیبوں کے سماج میں ہم آہنگی کیسے لائی جائے۔ اس کا ایک فارمولا یہ پیش کیا جاتا ہے کہ اس قسم کے اختلافات کو بلڈوز کر کے پورے سماج کو ایک مذہب اور ایک کلچر کا سماج بنایا جائے۔ مگر یہ کوئی فارمولا نہیں۔ کیوں کہ ایسا ہونا سرے سے ممکن ہی نہیں۔ فطرت کا نظام جو خالق نے بنایا ہے وہ یکسانیت کے اصول پر نہیں بنایا بلکہ تعدد اور تنوع کے اصول پر بنایا ہے۔ یہی تعدد اور تنوع مذہبی اور تہذیبی دنیا میں بھی موجود ہے۔

یہ خالق کے تخلیقی نقشہ کا ایک حصہ ہے اور جو چیز خود خالق کے تخلیقی نقشہ کا حصہ ہو، اُس کو مٹانا کسی کے لیے بھی ممکن نہیں۔ ایسی حالت میں انسانی دنیا میں مذہبی یکسانیت یا کلچرل یکسانیت کی بات کرنا اتنا ہی بے معنٰی ہے جتنا کہ مادّی دنیا کے تنوع کو ختم کر کے یکساں مادّی نظام قائم کرنے کا منصوبہ بنانا۔ اس سلسلے میں دوسرا فارمولا یہ پیش کیا جاتا ہے کہ تمام مذاہب یکساں ہیں۔ اس نظریہ کے حامی، لوگوں کو یہ یقین دلانے کی کوشش کر رہے ہیں کہ مختلف مذاہب میں کوئی اختلاف ہی نہیں۔

اس لیے لوگوں کو چاہیے کہ وہ فرق اور اختلاف کے ذہن کو ختم کر دیں، اس طرح اپنے آپ اتحاد قائم ہو جائے گا۔ یہ بات بھی سراسر بے معنٰی ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ مختلف مذہبوں اور مختلف تہذیبوں میں فرق اور اختلاف اتنا زیادہ حتمی صورت میں موجود ہے کہ کسی بھی دلیل سے اس کو غیر موجود ثابت کرنا ممکن نہیں۔ یہ

فارمولا یقینی طور پر ایک غیر حقیقی فارمولا ہے۔ وہ عملی طور پر نہ کبھی ممکن ہوا اور نہ آئندہ وہ کبھی ممکن ہوسکتا ہے۔ مزید یہ کہ فرق کوئی عیب نہیں، بلکہ وہ ایک خوبی ہے۔ وہ مذہبی فکر میں ارتقاء کا ذریعہ ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ اس معاملہ میں صرف ایک ہی فارمولا ہے جو مفید اور قابل عمل ہے، اور وہ فارمولا وہ ہے جو رواداری (tolerance) کے اصول پر مبنی ہے۔

اس اصول کا خلاصہ یہ ہے کہ — ایک کی پیروی کرو اور سب کا احترام کرو:

Follow one and respect all.

(۲)

ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان جو غلط فہمیاں موجود ہیں ان کی ذمہ داری ہندو اور مسلمان دونوں طرف کے رہنماؤں کے اوپر یکساں طور پر عائد ہوتی ہے۔ مختلف اسباب کے تحت دونوں طرف کے رہنماؤں نے اپنے اپنے عوام کو وہ ذہن دیا جس کو شناخت (identity) کہا جاتا ہے۔ دونوں ہی نے اپنے قومی وجود کے لیے شناخت کو اہم ترین مسئلہ قرار دیا۔

اس کو پختہ کرنے کے لیے ہندو رہنماؤں نے یہ نظریہ بنایا کہ مسلمان مَلِچھ ہیں اور مسلم رہنماؤں نے یہ نظریہ وضع کیا کہ ہندو کافر ہیں۔

میرے نزدیک یہ دونوں نظریہ یکساں طور پر غلط ہے۔ ہندو کو دل سے یہ ماننا چاہیے کہ مسلمان انھیں کی طرح انسان ہیں۔ اسی طرح مسلمانوں کو دل سے یہ ماننا چاہیے کہ ہندو انھیں کی طرح انسان ہیں۔ جب تک سوچ میں یہ تبدیلی نہ آئے ہماری سماجی زندگی میں معتدل تعلقات کا ماحول قائم نہیں ہوسکتا۔

اس معاملہ کا ایک اور پہلو ہے، اور اس کا تعلق زیادہ تر مسلمانوں سے ہے۔ مسلمان اپنے عقیدہ کی رو سے داعی ہیں اور ہندو اُن کے لیے مدعو کی حیثیت رکھتے ہیں۔

داعی مدعو کے اس رشتہ کا تقاضا ہے کہ مسلمان یک طرفہ طور پر ذمہ داری لیں کہ انہیں شرعی حکم کے مطابق، تالیف قلب کے اصول پر عمل کرنا ہے۔ انہیں یہ کرنا چاہیے کہ وہ ہندوؤں کی شکایتوں کو یک طرفہ طور پر اپنے اوپر لے لیں تا کہ دونوں فرقوں کے درمیان وہ معتدل ماحول قائم ہو جو دعوتی عمل کے لیے ضروری ہے۔

یہاں میں یہ اضافہ کروں گا کہ ہندوؤں کی کئی شکایتیں جن کو مسلمان ''غلط فہمی'' قرار دیتے ہیں اور غلط فہمی دور کرنے کے نام پر ایک غیر مؤثر مہم لمبی مدت سے چلا رہے ہیں۔ اس کو انہیں مکمل طور پر ترک کر دینا چاہیے۔ کیوں کہ جو معاملہ ہندوؤں کے نزدیک صحیح فہمی کا ہو اس کا خاتمہ اس طرح نہیں ہو سکتا کہ ہم اس کو غلط فہمی کہہ کر نظر انداز کر دیں۔

مثال کے طور پر مسلم بادشاہوں کی کئی کارروائیوں پر ہندوؤں کو بجا طور پر شکایت ہے۔ مسلمانوں کو چاہیے کہ وہ کھلے طور پر ان کارروائیوں کی مذمت کریں۔ وہ کھلے طور پر یہ کہیں کہ ہندستان کی مسلم حکومتیں خاندانی حکومتیں تھیں، نہ کہ اسلامی حکومتیں۔ اس کے سوا کسی اور طریقہ سے اس معاملہ کا خاتمہ ممکن نہیں۔

(۳)

اقلیت و اکثریت کے تعلقات کو کس طرح بہتر بنایا جائے۔ میں سمجھتا ہوں کہ اس معاملہ میں پہل مسلمانوں کو کرنا چاہیے۔ مثلاً مسلمانوں کے اندر دو قومی نظریے کے بجائے ایک قومی نظریہ کو فروغ دینا۔ مسلمانوں کے اندر فرقہ وارانہ سوچ کو ختم کر کے قومی سوچ (national thinking) پیدا کرنا، اسی طرح مسلمانوں کے اندر سے اس ذہن کو مکمل طور پر ختم کرنا کہ وہ ہندوؤں کے ایک طبقہ کو دشمن ہندو اور دوسرے طبقہ کو سیکولر ہندو سمجھتے ہیں۔

وہ الیکشن میں دھوم مچاتے ہیں کہ مفروضہ دشمن ہندو ہاریں اور سیکولر ہندو جیتیں۔ اس

قسم کی سیاست دین اور عقل دونوں کے خلاف ہے۔ مسلمان اس قسم کی تفریقی سیاست کا تحمل نہیں کر سکتے۔ اب آخری وقت آ گیا ہے کہ اس غیر دانشمندانہ سیاست کا مکمل طور پر خاتمہ کر دیا جائے۔

اس سلسلہ میں دوسری ضروری چیز یہ ہے کہ ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان میل ملاپ (interaction) زیادہ سے زیادہ بڑھایا جائے۔ قدیم زرعی دور میں یہ میل ملاپ فطری طور پر موجود تھا۔ مگر اب صنعتی دور میں یہ خطرناک حد تک کم ہو گیا ہے۔ اس مسئلہ کا حل یہ ہے کہ مسلمان زیادہ سے زیادہ تعلیم حاصل کریں۔ وہ ہندو اسکول اور مسلم اسکول کی تفریق کے بغیر ہر تعلیمی ادارہ میں داخلہ لے کر پڑھیں۔

مسلمانوں میں اگر بھرپور طور پر اس قسم کی تعلیمی سرگرمیاں جاری ہو جائیں تو اس کا دو یقینی فائدہ ان کو حاصل ہوگا۔ اوّل یہ کہ تعلیمی اداروں میں تعلیم کے دوران غیر مسلموں سے ان کا میل ملاپ بڑھے گا، اور interaction اپنے آپ میں ہر مسئلہ کا حل ہے۔

دوسرے یہ کہ مسلمان جب تعلیم میں آگے بڑھیں گے تو اس کے بعد فطری طور پر وہ دفتروں اور کمپنیوں اور تجارتی اداروں میں بڑی تعداد میں پہنچیں گے۔ اس طرح وہ دوری اپنے آپ ختم ہو جائے گی جو زمانی تبدیلی کے نتیجہ میں پیدا ہو گئی ہے۔

④

پُرامن بقائے باہم کی اہمیت اسلام میں اتنی زیادہ ہے کہ مسلمانوں پر یہ لازم کر دیا گیا کہ وہ یک طرفہ قربانی کے ذریعہ پُرامن بقائے باہم کا ماحول سماج میں قائم رکھیں۔ اسی قربانی کا نام صبر ہے۔

صبر کا مطلب یہ ہے کہ دوسروں کی طرف سے اشتعال انگیزی ہو تب بھی مشتعل نہ ہونا۔ دوسرے اگر نادانی کریں تب بھی اس سے اعراض کرنا۔ دوسرے اگر ستائیں تب بھی اس کو

برداشت کرلینا۔ دوسرے اگر نزاع کھڑی کریں تو پہلے ہی مرحلے میں صلح کرکے اس کا خاتمہ کردینا۔ دوسرے اگر نقصان پہنچائیں تو دوسروں سے لڑنے کے بجائے خدا سے اس کی تلافی کی امید رکھنا۔ دوسرے اگر فساد کریں تب بھی ان کے لیے اصلاح کی دعائیں کرنا۔ دوسرے اگر کاٹنے کی کوشش کریں تب بھی ان سے جڑے رہنا۔ دوسرے اگر نہ دیں تب بھی ان کو دینے کی کوشش کرنا۔ دوسرے اگر ظلم کریں تب بھی انھیں معاف کردینا۔

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم اس معاملہ میں اس حد تک گئے کہ ہجرت کے بعد مدینہ میں آپ تقریباً سولہ ماہ تک کعبہ کے بجائے بیت المقدس کی طرف رخ کرکے نماز پڑھتے رہے تاکہ وہاں بسنے والے یہودیوں سے غیر ضروری ٹکراؤ نہ پیش آئے۔

قرآن میں اس معاملہ میں یہ اصول مقرر کیا گیا— تمہارے لیے تمہارا دین اور ہمارے لیے ہمارا دین (109:6)۔ مدینہ میں ہجرت کے بعد پیغمبر اسلام نے جو منشور جاری کیا، اُس میں آپ نے یہ درج فرمایا کہ مسلمانوں کے لیے مسلمان کا دین اور یہود کے لیے یہود کا دین: لِلْيَهُودِ دِينُهُمْ، وَلِلْمُسْلِمِيْنِ دِينُهُمْ (سیرت ابن ہشام، جلد 2، صفحہ 107)۔

اس مقصد کے لیے یہ اعلان کیا گیا کہ تمام انسان ایک ہی جوڑے کی اولاد ہیں۔ تمام انسان آپس میں بھائی اور بہن ہیں۔ تمام انسان خدا کی عیال ہیں۔ ایک انسان اور دوسرے انسان میں دنیوی تعلقات کے اعتبار سے کوئی فرق نہیں۔ یہی وہ حقیقت ہے جس کو مولانا الطاف حسین حالی نے اپنی مسدّس میں اس طرح نظم کیا ہے:

یہ پہلا سبق تھا کتابِ ہدیٰ کا   کہ ہے ساری مخلوق کنبہ خدا کا

مثبت سوچ، منفی سوچ

مثبت سوچ

ایک ہندستانی کو پہلی بار جاپان جانے کا موقع ملا۔ ایک روز انھوں نے اپنے جاپانی میزبان سے ازراہِ ہمدردی کہا: ”آپ لوگوں کے ساتھ امریکا نے بڑا ظلم کیا۔ اس نے تاریخ کے پہلے ایٹم بم آپ کے ملک پر گرائے اور آپ کے دو شہروں کو کھنڈر بنا دیا۔“

”نہیں کوئی ظلم نہیں“ جاپانی نے کہا۔ ”یہ بم تو ہمارے لیے رحمت ثابت ہوئے۔ ہمارے یہ شہر قدیم طرز پر آباد تھے۔ تنگ اور خم دار سڑکیں، فرسودہ مکانات، گندے محلّے، ان کا نام تھا ہیروشیما اور ناگاساکی۔ معمولی حالات میں ہم نئے طرز پر ان کی تعمیر نہیں کر سکتے تھے۔ مگر جب جنگ نے اچانک ان کو صفحۂ ہستی سے مٹا دیا تو ہم کو موقع مل گیا اور ہم نے قدیم ملبہ پر انتہائی جدید قسم کے منصوبہ بند شہر آباد کر دیے“۔ مثبت سوچ اسی طرح کام کرتی ہے۔ وہ ہر بربادی میں اپنے لیے نئی تعمیر کے امکانات ڈھونڈ لیتی ہے۔

مثبت سوچ اسی طرح کام کرتی ہے۔ وہ ہر بربادی میں اپنے لیے نئی تعمیر کے امکانات ڈھونڈھ لیتی ہے۔

مثبت سوچ کی ضرورت

مثبت سوچ (positive thinking) کا مطلب کیا ہے۔ اس سے مراد وہ سوچ ہے جو ہر قسم کے منفی جذبات سے خالی ہو۔ جس میں شکایت اور احتجاج کے بجائے، مکمل طور پر حقیقتِ واقعہ کی بنا پر رائے قائم کی جائے۔ مثبت سوچ وہ ہے جو ہر قسم کے فخر اور تعصب سے خالی ہو۔ مثبت سوچ دوسرے الفاظ میں مبنی بر حقیقت سوچ کا نام ہے۔

مثبت سوچ کا تعلق انسان کی پوری زندگی سے ہے۔ منفی سوچ سے منفی شخصیت بنتی ہے، اور مثبت سوچ سے مثبت شخصیت۔ مثبت سوچ فطرت کی آواز ہوتی ہے، اور منفی سوچ ابلیس کی آواز۔ مثبت سوچ انسان کو پاکیزہ شخصیت بناتی ہے، اور منفی سوچ اس کی شخصیت کو آلودہ

شخصیت بنا دیتی ہے۔ مثبت سوچ والے آدمی کو جنت میں بسانے کے لیے منتخب کیا جائے گا، اور منفی سوچ والا آدمی ہمیشہ کے لیے جنت میں داخلے سے محروم رہے گا۔

منفی سوچ سے بچنا، اور مثبت سوچ کا طریقہ اختیار کرنا، اتفاق سے نہیں ہوتا۔ یہ خصوصیت آدمی کے اندر اس وقت پیدا ہوتی ہے جب کہ وہ اس معاملہ میں بہت زیادہ باشعور ہو، جب وہ شعوری طور پر اپنے آپ کو ایسا بنانے کی کوشش کرے۔ اس کے لیے ضرورت ہوتی ہے کہ آدمی برابر اپنا محاسبہ کرتا رہے۔

مثبت سوچ کا معاملہ، مثبت سوچ برائے مثبت سوچ نہیں ہے۔ یعنی مثبت سوچ بذاتِ خود اصل مقصود نہیں ہے، بلکہ مثبت سوچ کا فائدہ یہ ہے کہ مثبت سوچ والا آدمی ہر قسم کے ڈسٹریکشن سے بچ جاتا ہے۔ وہ اس قابل ہو جاتا ہے کہ وہ اپنے ذہن کو صرف ضروری باتوں میں مشغول کرے، وہ غیر ضروری باتوں میں اپنے وقت کو ضائع نہ کرے۔ مثبت سوچ آدمی کو بامقصد انسان بناتی ہے۔ مثبت سوچ آدمی کو ایسی مصروفیت سے بچاتی ہے جس کا کوئی فائدہ، نہ دنیا میں ہے اور نہ آخرت میں۔

منفی سوچ کا نقصان

تمام ناکامیوں کا سبب منفی سوچ ہے اور تمام کامیابیوں کا سبب مثبت سوچ — یہی ایک لفظ میں زندگی کا خلاصہ ہے۔ منفی سوچ والا آدمی اس دنیا میں کبھی کامیاب نہیں ہوسکتا اور اگر وہ بظاہر کامیاب دکھائی دے تو اس کی کامیابی وقتی ہوگی۔ اس کے برعکس مثبت سوچ والے آدمی کے لیے کامیابی پائیدار بھی ہے اور یقینی بھی۔

منفی سوچ کیا ہے اور مثبت سوچ کیا۔ منفی سوچ یہ ہے کہ آدمی اپنے آپ کو جانے مگر وہ دوسروں کو نہ جانے۔ وہ مسائل کو جانے مگر وہ مواقع کو نہ جانے۔ وہ حال کو جانے مگر وہ مستقبل سے بے خبر ہو۔ وہ اپنے قریبی حالات کو جانے مگر وہ دور کے حالات سے باخبر نہ ہو۔

منفی سوچ والے آدمی کی سب سے بڑی کمزوری یہ ہے کہ وہ اپنے ذہنی خول میں جیتا ہے۔ اُس کے ذہن کے اندر جو خیال آجائے اُسی کو وہ اصل حقیقت سمجھ لیتا ہے۔ وہ اپنی نفسیاتی پیچیدگی کی بنا پر اس قابل نہیں ہوتا کہ اُس کے ذہن کے باہر جو حقیقتیں ہیں اُن کو جانے اور ان کی روشنی میں زیادہ درست رائے قائم کرے۔ منفی سوچ دراصل بند سوچ کا دوسرا نام ہے۔

اس کے مقابلہ میں مثبت سوچ وہ ہے جو کُھلی سوچ ہو۔ مثبت سوچ والا آدمی تعصّبات سے آزاد ہو کر سوچتا ہے۔ وہ معاملات میں بے لاگ رائے قائم کرتا ہے۔ اس کی رائے ہمیشہ انصاف پر مبنی ہوتی ہے۔ وہ وہی سوچتا ہے جو ازروئے واقعہ اس کو سوچنا چاہیے اور وہی بولتا ہے جو ازروئے واقعہ اس کو بولنا چاہیے۔ یہی وجہ ہے کہ مثبت سوچ والے آدمی کی راہیں کبھی بند نہیں ہوتیں، جب کہ منفی سوچ والے آدمی کو ہر طرف اپنی راہیں بند دکھائی دیتی ہیں۔

منفی سوچ مایوسی کی سوچ ہے اور مثبت سوچ امید کی سوچ۔ منفی سوچ راستہ کو بند حالت میں دیکھتی ہے، جب کہ مثبت سوچ والے آدمی کو ہر طرف راستے کھلے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔ مثبت سوچ بصیرت ہے اور منفی سوچ بے بصیرتی۔

مثبت سوچ، منفی سوچ

قرآن کی سورہ الاحزاب میں بتایا گیا ہے کہ انسان کو ایک ایسی چیز دی گئی ہے، جو سارے زمین وآسمان کو نہیں دی گئی، اور وہ امانت ہے، یہی امانت وہ چیز ہے جو انسان کو اشرف المخلوقات بناتی ہے۔ امانت سے مراد دراصل وہی چیز ہے جس کو فری تھنکنگ (free-thinking) کہا جاتا ہے، یعنی آزادانہ طور پر سوچنا اور آزادانہ طور پر اپنے عمل کی پلاننگ کرنا۔ اس امانت کی صحیح ادائیگی انسان کو جنت کا مستحق بناتی ہے، اور اس امانت کی ادائیگی میں ناکام ہونا انسان کو جہنم کا مستحق بنا دیتا ہے (33:72-73)۔

اس موقع پر قرآن میں دو الفاظ استعمال کیے گئے ہیں، ظلوم اور جہول، یعنی غیر عادل اور

نادان۔ انسان اپنی آزادی کو غلط استعمال کرنے کی بنا پر بہت جلد عدل (justice) سے ہٹ جاتا ہے، اور اسی طرح وہ آزادی کے غلط استعمال کی بنا پر دانش مندی (wisdom) کے راستے سے ہٹ جاتا ہے۔ یہی انحراف (deviation) اس کو جہنم کا مستحق بنا دیتا ہے۔

غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ انسان کی اصلاح کے لیے یہی بات کافی ہے کہ وہ اپنی فطرت (nature) سے نہ ہٹے۔ اگر آدمی اپنے آپ پر کنٹرول کرے اور فطرت کے راستے سے نہ ہٹے تو فطرت خود ہی اس کی راہ نما بن جائے گی۔ فطرت سے ہٹنا آدمی کو تباہی کی طرف لے جاتا ہے، اور فطرت پر قائم رہنا آدمی کو کامیاب بناتا ہے۔

مزید غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ آدمی کی آزمائش اس بات میں ہے کہ وہ ہمیشہ صحیح انتخاب (right choice) کو لے، وہ اپنے آپ کو غلط انتخاب سے بچائے۔ صحیح انتخاب اور غلط انتخاب کا یہ معاملہ فکر سے بھی تعلق رکھتا ہے، اور عمل سے بھی۔

فکر کے اعتبار سے صحیح انتخاب وہ ہے جس کا نمونہ آغازِ حیات کے وقت فرشتوں نے اختیار کیا، اور غلط انتخاب وہ ہے جس کو ابلیس نے اپنا شیوہ بنایا۔ فرشتوں سے جب کہا گیا کہ انسان کے آگے جھک جاؤ تو وہ جھک گئے۔ اس کے برعکس، ابلیس اس پر راضی نہ ہوا۔ اس نے یہ اعتراض کیا کہ انسان کو خلیفۃ الارض کیوں بنایا گیا۔ یہ اعتراض انتخابی سوچ (selective thinking) کی ایک مثال تھی۔ ابلیس جنوں کا سردار تھا۔ جن کو خدا نے اس سے زیادہ چیز دی تھی، یعنی خلافت کائنات۔ لیکن ابلیس نے اس پہلو کو نظر انداز کیا اور صرف یہ سوچا کہ انسان کو زمین کی خلافت کیوں دی گئی۔

یہی برائی پوری تاریخ میں رائج ہے۔ انسانوں کی ننانوے فیصد سے زیادہ تعداد منفی سوچ میں پڑی ہوئی ہے، یعنی انتخابی سوچ۔ ملے ہوئے کو نظر انداز کرنا، اور نہ ملے ہوئے کو مسئلہ بنا کر اس کو اپنی سوچ کا محور بنانا۔

اس معاملے میں مسلمانوں کا استثنا نہیں۔ موجودہ زمانے کے مسلمان ساری دنیا میں ہر قسم کے بہترین مواقع پائے ہوئے ہیں، جس طرح دوسرے لوگ ان کو پائے ہوئے ہیں۔ لیکن فطرت کے قانون کے تحت ایسا ہے کہ کوئی چیز ایسی بھی ہے جو مسلمانوں کو نہیں ملی۔ مسلمان یہ کررہے ہیں کہ اسی نہ ملے ہوئے کو اپنی سوچ کا مرکز ومحور بنائے ہوئے ہیں اور ملے ہوئے کو نظر انداز کر رکھا ہے۔ اسی کا یہ نتیجہ ہے کہ مسلمان ساری دنیا میں منفی سوچ کی دلدل میں پڑے ہوئے ہیں، اور اس کا نتیجہ یہ ہے کہ وہ شکر سے محروم ہیں جو کسی انسان کی سب سے بڑی عبادت ہے۔

مسلمانوں کی اس منفی سوچ کا سبب کیا ہے، وہ ہے 99 فی صد کو نظر انداز کرنا، اور ایک فی صد کو لے کر اپنی رائے بنانا۔ یہ نہایت برا طریقہ ہے۔ یہ اللہ کی سنت کے خلاف ہے۔ جو لوگ اس میں مبتلا ہوں، ان کو اس کی سب سے بڑی قیمت یہ دینی پڑے گی کہ ان کے اندر مثبت شخصیت نہ بنے — مثبت شخصیت سے محرومی کا مطلب ہے اللہ کی رحمت سے محرومی۔

صحیح طرزِ فکر

صحیح طرزِ فکر (right thinking) حکیمانہ طرزِ فکر کی ایک اعلیٰ قسم ہے۔ اصل یہ ہے کہ ہم جس دنیا میں جیتے ہیں، یا صبح وشام گزارتے ہیں، اس میں چیزیں الگ الگ نہیں ہیں، بلکہ مخلوط (mixed) حالت میں ہیں۔ اس بنا پر بظاہر چیزوں کے بارے میں صحیح رائے قائم کرنا مشکل ہوجاتا ہے۔ چیزوں کے بارے میں صحیح رائے اس وقت قائم ہوتی ہے، جب کہ آپ چیزوں کو الگ الگ کرکے دیکھ سکیں۔ اس طرح تجزیاتی مطالعے کے بغیر آدمی کے اندر صحتِ فکر پیدا نہیں ہوسکتی، وہ مبنی بر واقعہ سوچ کا حامل نہیں بن سکتا۔

مثلاً ایک شخص اپنے بارے میں یا اپنی کمیونٹی کے بارے میں یہی کہے گا کہ ہمارے اوپر ظلم ہورہا ہے۔ اگر اس سے یہ کہا جائے کہ تمھارے باپ دادا کا جو اسٹینڈرڈ تھا، کیا تمھارا اسٹینڈرڈ

اس سے کم ہے۔ وہ جواب دے گا کہ نہیں اس سے تو بہت اچھا ہے۔ مثلاً میرے باپ دادا بائیسکل پر سفر کرتے تھے، آج میں کار پر سفر کرتا ہوں۔ میرے دادا کے زمانے میں بچے معمولی مدرسے میں پڑھتے تھے، آج وہ شہر کے ایک اچھے انگریزی اسکول میں پڑھ رہے ہیں۔ میرے دادا کچے گھر میں رہتے تھے، آج میں اور میرے بچے پکے گھر میں رہ رہے ہیں، وغیرہ۔ اب اگر آپ اس سے پوچھیں کہ جب تمھاری فیملی کا اسٹینڈرڈ پہلے کے مقابلے میں بہت زیادہ بہتر ہے، تو ظلم کہاں ہو رہا ہے۔ اب وہ حیران ہو جائے گا، اور کہے گا کہ میں نے اس اعتبار سے کبھی نہیں سوچا۔

اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اصل مسئلہ کہاں ہے۔ اصل مسئلہ خارج میں نہیں ہے، بلکہ داخل میں ہے۔ لوگوں کے اندر صحیح طرز فکر نہیں ہے۔ اس لیے لوگ شکایت میں جی رہے ہیں، حالاں کہ انھیں شکر میں جینا چاہیے۔ صحیح طرزِ فکر تجزیاتی فکر کا نام ہے۔ اگر آپ کے اندر ڈی ٹیچڈ تھنکنگ (detached thinking) ہو، اگر آپ تجزیاتی انداز میں سوچنا جانتے ہوں، تو آپ درست طرزِ فکر کے حامل بن سکتے ہیں۔

ہر چیز پرچۂ امتحان

حدیث میں آیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک صحابی کو نصیحت کرتے ہوئے فرمایا: تَعْلَمَ أَنَّ مَا أَصَابَكَ لَمْ يَكُنْ لِيُخْطِئَكَ، وَمَا أَخْطَأَكَ لَمْ يَكُنْ لِيُصِيبَكَ (سنن ابن ماجہ، حدیث نمبر 77)۔ یعنی، یاد رکھو، جو تم کو ملا، وہ تم سے کھویا جانے والا نہ تھا۔ اور جو کچھ تم سے کھویا گیا، وہ تم کو ملنے والا ہی نہ تھا۔

اِس حدیثِ رسول پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ موجودہ دنیا میں کسی آدمی کو جو کچھ ملتا ہے، وہ نہ اتفاقاً ملتا ہے اور نہ بطور انعام۔ موجودہ دنیا میں کسی آدمی کو جو کچھ ملتا ہے، وہ صرف پرچۂ امتحان کے طور پر ملتا ہے۔ خدا کے فیصلے کے تحت، ہر عورت اور مرد کو کچھ چیزیں دی جاتی ہیں، تاکہ اُن چیزوں میں آزما کر دیکھا جائے کہ آدمی کا رویّہ کیسا تھا۔ خدا

کبھی کوئی چیز دے کرامتحان لیتا ہے کہ آدمی نے اُس پر شکر کیا، یا اُس کو پا کر وہ گھمنڈ میں مبتلا ہو گیا۔ اِسی طرح کوئی چیز چھین کر خدا آدمی کا امتحان لیتا ہے کہ اُس سے محروم ہو کر اُس نے صبر کیا، یا وہ شکایت کی نفسیات میں مبتلا ہو گیا۔

یہ خدا کا تخلیقی نقشہ (creation plan) ہے۔ ایسی حالت میں آدمی کی نظر اِس پر نہیں ہونی چاہیے کہ اُس نے کیا پایا اور اُس سے کیا چھینا گیا۔ اِس کے بجائے اُس کو اپنا سارا دھیان اِس پر لگانا چاہیے کہ اُس کو جن حالات میں رکھ کر خدا نے اُس کا امتحان لینا چاہا تھا، اُس میں اُس نے مطلوب رسپانس (response) دیا، یا وہ مطلوب رسپانس دینے میں ناکام ہو گیا۔

یہ زندگی کا مثبت تصور ہے۔ یہ زندگی کا مثبت فارمولا ہے۔ جس آدمی کے اندر یہ مزاج پیدا ہو جائے، وہ کبھی ٹنشن میں مبتلا نہیں ہوگا۔ وہ کسی بھی حال میں مایوسی یا تلخی کا شکار نہیں ہوگا۔ کوئی تجربہ اُس کو زندگی کی تعمیری شاہراہ سے ہٹانے والا ثابت نہ ہوگا۔ وہ کبھی فکری انتشار کا شکار نہ ہوگا۔ اُس کی زندگی میں کبھی یہ حادثہ پیش نہیں آئے گا کہ اُس کی زندگی حالات کے بھنور میں پھنس کر رہ جائے اور وہ آخری منزل تک نہ پہنچے۔

مثبت طریقہ

قرآن میں یہ حکم دیا گیا ہے کہ بھلائی اور برائی دونوں یکساں نہیں ہو سکتے۔ اس لیے تم برائی کا بدلہ اچھائی کے ذریعہ دو: وَلَا تَسْتَوِي الْحَسَنَةُ وَلَا السَّيِّئَةُ ادْفَعْ بِالَّتِي هِيَ أَحْسَنُ (41:34)۔ یہ بات قرآن میں مختلف الفاظ میں بار بار کہی گئی ہے۔

اس کا مطلب یہ ہے کہ اہلِ ایمان کو ہمیشہ مثبت ردِعمل کا ثبوت دینا چاہیے۔ انھیں ہر حال میں منفی ردِعمل سے بچنا چاہیے۔ ان کا سلوک دوسروں کے ساتھ عام حالات میں بھی بہتر ہونا چاہیے۔ اور اگر کوئی شخص یا گروہ اپنی طرف سے برے سلوک کا مظاہرہ کرے تب بھی خدا پرستوں کے اوپر فرض ہے کہ وہ ردِعمل کی نفسیات میں مبتلا نہ ہوں۔ اس وقت بھی وہ

بااصول انسان کا ثبوت دیں۔ برائی کے جواب میں بھی وہ اپنے اچھے سلوک پر قائم رہیں۔

مذکورہ آیت کی تشریح میں حضرت عبداللہ بن عباس فرماتے ہیں: أَمَرَ اللّٰہُ المؤمنین بالصبر عِنْدَ الْغَضَبِ وَالْحِلْمِ عِنْدَ الْجَہْلِ وَالْعَفْوِ عِنْدَ الْإِسَاءَۃِ (تفسیر ابن کثیر، جلد 7، صفحہ 165)۔ یعنی، اللہ نے اس آیت میں مسلمانوں کو یہ حکم دیا ہے کہ جب انھیں غصہ آجائے تو وہ صبر وبرداشت سے کام لیں۔ ان کے ساتھ جب کوئی شخص جہالت کرے تو وہ بردباری کا طریقہ اختیار کریں۔ اور جب ان کے ساتھ کوئی شخص برا سلوک کرے تو وہ اسے معاف کردیں۔

اس اسلامی سلوک کو ایک لفظ میں مثبت سلوک کہا جاسکتا ہے۔ یعنی جوابی معاملہ نہ کرتے ہوئے ہر ایک سے معتدل معاملہ کرنا۔ دوسروں کی روش خواہ کچھ بھی ہو، اپنے آپ کو ہمیشہ اعلیٰ انسانی سلوک پر قائم رکھنا۔

مومن وہ ہے جو برتر حقیقتوں میں جینے لگے۔ جس کے سوچنے کی سطح عام انسانوں سے اوپر اٹھ جائے۔ ایسے انسان کے اندر بے پناہ تحمل کی کیفیت پیدا ہوجاتی ہے۔ اس کو اندرونی طور پر اتنا سکون مل جاتا ہے کہ وہ باہر کے کسی بھی ناموافق واقعہ سے بے حوصلہ نہیں ہوتا۔ جہاں لوگ غصہ کرتے ہیں وہاں اسے لوگوں کے اوپر ترس آتا ہے، جہاں لوگ بھڑک جاتے ہیں وہاں وہ سمندر کی طرح پرسکون بنا رہتا ہے۔

مصیبت کا مثبت پہلو

ایک حدیث قدسی ان الفاظ میں آئی ہے:

مَا دَعَا اللّٰہَ الْمُؤْمِنُ بِدَعْوَۃٍ إِلَّا وُکِّلَ بِحَاجَتِہِ جِبْرِیلُ عَلَیْہِ السَّلَامُ فَیَقُولُ: لَا تَعْجَلْ بِإِجَابَتِہِ فَإِنِّي أُحِبُّ أَنْ أَسْمَعَ صَوْتَ عَبْدِي الْمُؤْمِنِ (حلیۃ الاولیاء، جلد 2، صفحہ 327)۔ یعنی، جب کوئی بندہ اللہ کو پکارتا ہے، تو جبریل فرشتہ کو اس کی حاجت برآری کے لیے مقرر کردیا جاتا ہے، اور اللہ کہتا ہے کہ (اے

جبریل) اس کی حاجت کو پورا کرنے میں جلدی نہ کر، کیوں کہ مجھے یہ محبوب ہے کہ میں مومن بندے کی آواز کو سنوں۔

اللہ ایک مومن بندہ کی صوت (آواز) کو کیوں پسند کرتا ہے۔ اس کا سبب یہ نہیں ہے کہ اس کی صوت (voice) میں کوئی نغمہ (melody) ہوتا ہے۔ بلکہ اس کا سبب یہ ہوتا ہے کہ جب کوئی بندہ مصیبت کے وقت اللہ کو پکارتا ہے تو اس سے اس کی روحانی ارتقا (spiritual development) میں اضافہ ہوتا ہے۔ اللہ کو یہ روحانی ارتقا پسند ہے، نہ کہ صوت کا نغمہ۔

اصل یہ ہے کہ انسان کے اوپر جب کوئی مصیبت آتی ہے تو وہ اس کی حساسیت (sensitivity) کو بڑھاتی ہے۔ حساسیت کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ آدمی کی قوتِ اخذ (grasp) بڑھ جاتی ہے۔ اس بنا پر ایسا آدمی، اگر وہ منفی سوچ میں مبتلا نہ ہو تو وہ اس قابل ہو جاتا ہے کہ وہ اپنے تجربے سے زیادہ سے زیادہ سبق لے، وہ چیزوں میں چھپی ہوئی حکمت کو زیادہ سے زیادہ دریافت کر سکے۔

مصیبت حساسیت کو بڑھاتی ہے، اور حساسیت آدمی کی قوت اخذ میں اضافہ کرتی ہے، اور قوت اخذ اپنے نتیجہ کے اعتبار سے آدمی کی معرفت کو بہت زیادہ بڑھا دیتی ہے۔ مصیبت بجائے خود کوئی مطلوب چیز نہیں، مگر اس کا نتیجہ (result) اس کو مطلوب بنا دیتا ہے۔ معرفت جسمانی اعضاء کی طرح ایک تخلیقی عطیہ نہیں ہے، بلکہ وہ ایک خود دریافت کردہ چیز (self-discovered item) ہے، اور دریافت کا یہ عمل (process) ہمیشہ ناخوش گواری کے راستے سے گزرتا ہے۔ معرفت کے حصول کا اس کے علاوہ کوئی دوسرا طریقہ نہیں۔

مثبت روش کا نتیجہ

اسلام کی ایک تعلیم قرآن میں ان الفاظ میں آئی ہے: وَلَا تَسْتَوِي الْحَسَنَةُ وَلَا السَّيِّئَةُ ادْفَعْ بِالَّتِي هِيَ أَحْسَنُ فَإِذَا الَّذِي بَيْنَكَ وَبَيْنَهُ عَدَاوَةٌ كَأَنَّهُ وَلِيٌّ حَمِيمٌ (41:34)۔ یعنی، اور بھلائی اور برائی دونوں برابر نہیں، تم جواب میں وہ کہو جو اس سے بہتر ہو پھر تم دیکھو گے کہ تم میں اور جس میں دشمنی تھی، وہ ایسا ہو گیا جیسے کوئی دوست قرابت والا۔ قرآن کی اس آیت میں عام اجتماعی زندگی میں حسنِ اخلاق (good behaviour) کا حکم نہیں دیا گیا ہے۔ حسن اخلاق بلاشبہ ایک اہم اسلامی قدر (Islamic value) ہے۔ لیکن قرآن کی اس آیت میں جو بات کہی گئی ہے، وہ عداوت کی نسبت سے ہے، نہ کہ نارمل تعلقات کی نسبت سے۔

اسلام ایک مشن ہے، پرامن دعوتی مشن۔ باعتبارِ حقیقت یہ مشن پوری طرح پرامن اور غیر سیاسی مشن ہے۔ لیکن کسی ماحول میں جب اس مشن کے لیے کام کیا جائے تو کچھ لوگ نظریاتی بنیاد پر اس کے خلاف ہوجاتے ہیں۔ اس طرح داعی اور مدعو کے درمیان عملاً نزاع (controversy) کی صورت پیدا ہوجاتی ہے۔ ایسے موقع پر مدعو کی طرف سے داعی کی مخالفت شروع ہوجاتی ہے۔ مذکورہ قرآنی تعلیم اسی طرح کی نزاعی صورتِ حال کے بارے میں ہے۔

اس طرح کی صورتِ حال میں داعی کو یہ حکم دیا گیا ہے کہ وہ ہرگز اپنے کلام میں منفی ردِّعمل (negative reaction) کا طریقہ اختیار نہ کریں۔ بلکہ وہ یک طرفہ طور پر مثبت رسپانس (positive response) کی روش پر قائم رہیں۔ داعی اگر اپنے آپ کو منفی ردِّعمل سے بچائے، مکمل طور پر دونوں کے درمیان اعتدال کی فضا قائم رہے، تو فطرت اپنا کام کرے گی۔ فطری پراسس کے تحت مدعو کی نفسیات بدلنا شروع ہوجائے گی، یہاں تک کہ یہ واقعہ پیش آئے گا کہ جو شخص بظاہر مخالف نظر آرہا تھا، وہ داعی کا حامی اور موافق بن جائے گا۔ منفی ردِّعمل مدعو کی ایگو (ego) کو بھڑکاتا ہے، مثبت رسپانس اس کو معتدل بنا دیتا ہے۔

ری ایکشن کا طریقہ

زندگی کے معاملے میں اصولی بات یہ ہے کہ تشدد کا طریقہ دراصل ری ایکشن کا طریقہ ہے، اور ری ایکشن کا طریقہ کبھی بھی کسی مثبت نتیجہ تک نہیں پہنچتا۔ اس کا سبب یہ ہے کہ ہمیشہ ایک ری ایکشن کے بعد دوسرا ری ایکشن پیدا ہوتا ہے، اور اس طریق کار کے نتیجہ میں جو چیز وجود میں آتی ہے، وہ چین ری ایکشن (chain reaction) ہے، نہ کہ ری ایکشن کا خاتمہ۔ قدیم زمانے میں ٹرائبل ایج میں ایسا ہی ہوتا تھا۔ لوگ برابر لڑتے رہتے تھے۔ اسلام نے یہ کیا کہ یک طرفہ طور پر امن کا طریقہ اختیار کر کے چین ری ایکشن کو ختم کر دیا۔ اس کے بعد دنیا میں امن کا دور آیا۔

اس سلسلے میں قرآن کی ایک متعلق آیت کا ترجمہ یہ ہے: اور بھلائی اور برائی دونوں برابر نہیں، تم جواب میں وہ کہو جو اس سے بہتر ہو پھر تم دیکھو گے کہ تم میں اور جس میں دشمنی تھی، وہ ایسا ہو گیا جیسے کوئی دوست قرابت والا (41:34)۔ قرآن کی اس آیت میں جس طریقِ کار کا ذکر کیا گیا ہے، اس کو دوبارہ اختیار کیا جائے تو دوبارہ وہی نتیجہ حاصل ہوگا، جس کا مذکورہ آیت میں ذکر کیا گیا ہے، یعنی جو بظاہر دشمن نظر آتا ہے اس کا دوست بن جانا۔

لوگ اکثر اپنے حریف کی شکایت کرتے ہیں۔ لیکن غور کیجیے تو یہ ظلم نہیں ہوتا، بلکہ وہ چین ری ایکشن کا نتیجہ ہوتا ہے۔ آپ نے اپنے حریف کو پتھر مارا، اس کے بعد اس نے آپ کو بم مارا۔ آپ نے دوبارہ حریف کے خلاف کوئی کارروائی کی، اس کے جواب میں اس نے بھی کوئی کارروائی کی۔ اس طرح ایک چین ری ایکشن شروع ہو گیا، جو کبھی ختم نہیں ہوتا۔

تشدد کا خاتمہ جوابی تشدد سے نہیں ہوتا۔ تشدد کے خاتمہ کی صرف ایک صورت ہے۔ وہ یہ ہے کہ آپ یک طرفہ طور پر تشدد کی کارروائی کرنا چھوڑ دیں، آپ یک طرفہ طور پر خاموش ہو جائیں، آپ یک طرفہ طور پر امن کا طریقہ اختیار کر لیں۔

مثبت تجربہ

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں کئی غزوات پیش آئے، ان میں سے ایک وہ ہے جس کو احد کہا جاتا ہے۔ اس غزوہ میں مسلمانوں میں سے ستر آدمی مارے گئے تھے، اور ستر زخمی ہوئے تھے، یہاں تک کہ رسول اللہ بھی زخمی ہو گئے تھے۔ اس مناسبت سے یہ آیت نازل ہوئی:

فَأَثَابَكُمْ غَمًّا بِغَمٍّ لِكَيْلَا تَحْزَنُوا عَلَى مَا فَاتَكُمْ وَلَا مَا أَصَابَكُمْ (3:153)۔

یعنی، پھر اللہ نے تم کو غم پر غم دیا تاکہ تم رنجیدہ نہ ہو اس چیز پر جو تمہارے ہاتھ سے کھوئی گئی اور نہ اس مصیبت پر جو تم پر پڑے۔ اس موقع پر قرآن میں یہ نصیحت کی گئی— تاکہ تم رنجیدہ نہ ہو اس چیز پر جو تمہارے ہاتھ سے کھوئی گئی۔

so that you might not grieve for what you lost,

یہاں رنجیدہ برائے رنجیدہ نہیں ہوسکتا۔ ضرور ہے کہ رنجیدہ نہ ہونے کا کوئی مثبت مقصد ہو۔ وہ مقصد یہ ہے کہ غزوۂ احد کے موقع پر جو کچھ پیش آیا، وہ بظاہر ایک منفی واقعہ تھا، لیکن تم کو چاہیے کہ اس منفی واقعہ کو مثبت تجربہ میں بدلو۔ ایسا کس طرح ہوسکتا ہے۔ ایسا اس طرح ہوسکتا ہے کہ لوگ خالص غیر متاثر ذہن کے تحت پورے معاملے پر سوچیں، اور خالص سوچ کے ذریعے اس نتیجے تک پہنچیں کہ موت زندگی کا خاتمہ نہیں، بلکہ وہ نئی زندگی کا آغاز ہے۔

مصیبت پر رنجیدہ نہ ہونا، کوئی سادہ بات نہیں۔ اس کا مطلب ہے کہ آدمی اپنی جسمانی مصیبت کو ذہنی مصیبت نہ بنائے۔ وہ ایسا نہ کرے کہ اس سے جو کچھ کھویا گیا، اس کے غم میں اپنا یہ حال کرلے کہ جو کچھ اب بھی اس کے پاس باقی ہے، اس سے غافل ہوجائے۔ آدمی کو چاہیے کہ وہ کھوئے ہوئے کو فراموشی کے خانے میں ڈالے، اور جو کچھ اب بھی اس کے پاس بچا ہوا ہے، اس کو لے کر اپنے عمل کی نئی منصوبہ بندی کرے۔ یہی اس دنیا میں کامیابی کا

راز ہے۔ اس دنیا میں ہر ایک کو نقصان کا تجربہ ہوتا ہے۔ عقل مند وہ ہے جو بچے ہوئے کو جانے، اور اس کی بنیاد پر اپنے لیے نئی زندگی کی تعمیر کرے۔ اسی کا نام دانش مندی ہے، اور یہی دانش مندی اس دنیا میں کامیابی کا واحد راز ہے۔

منفی سوچ کا مزاج

قرآن میں ایک کردار کا ذکر ان الفاظ میں آیا ہے۔ یہ دو آیتیں ہیں، ان کا ترجمہ یہاں نقل کیا جاتا ہے — اور ان کو اس شخص کا حال سناؤ جس کو ہم نے اپنی آیتیں دی تھیں تو وہ ان سے نکل بھاگا۔ پس شیطان اس کے پیچھے لگ گیا اور وہ گمراہوں میں سے ہو گیا۔ اور اگر ہم چاہتے تو اس کو ان آیتوں کے ذریعہ سے بلندی عطا کرتے مگر وہ تو زمین کا ہو رہا اور اپنی خواہشوں کی پیروی کرنے لگا۔ پس اس کی مثال کتے کی سی ہے کہ اگر تو اس پر بوجھ لادے تب بھی ہانپے اور اگر چھوڑ دے تب بھی ہانپے۔ یہ مثال ان لوگوں کی ہے جنھوں نے ہماری نشانیوں کو جھٹلایا۔ پس تم یہ احوال ان کو سناؤ تا کہ وہ سوچیں (7:175-176)۔

یہاں آیت سے مراد ربانی رہنمائی ہے اور ہانپنے سے مراد شکایت کا مزاج (complaining mentality) ہے۔ جو شخص یا گروہ ربانی رہنمائی سے سبق نہ لے، وہ ہر حال میں شیطان کا پیرو بن جائے گا۔ ایک صورتِ حال میں ایک قسم کی منفی بات کہے گا اور اگر صورتِ حال بدل جائے تو وہ دوسری قسم کی منفی بات بولنا شروع کر دے گا۔ مثلاً ایک شخص اگر شیطان کے زیر اثر منفی انداز میں سوچنے کا عادی بن جائے۔ تو اس کا حال یہ ہوگا کہ اگر اس کو ایک اعتبار سے اچھے حالات ملیں تو وہ غلط تقابل کر کے اس میں شکایت کا ایک پہلو نکال لے گا۔ اور اگر حالات بدل جائیں تو وہ دوبارہ اپنی بے اعترافی کے مزاج کی بنا پر ایک اور پہلو شکایت کا نکال لے گا۔ وہ دونوں حالتوں میں منفی بولی بولے گا۔ ایک نوعیت کے حالات ہوں تب بھی، اور دوسری نوعیت کے حالات ہوں تب بھی۔

اصل یہ ہے کہ قانونِ فطرت کے مطابق، زندگی کسی کے لیے بھی مکمل طور پر بے مسئلہ نہیں ہوتی۔ کبھی ایک مسئلہ تو کبھی دوسرا مسئلہ۔ اس معاملے کا حل صرف ایک ہے۔ وہ یہ کہ آدمی اپنی منفی سوچ کو بدلے۔ وہ بظاہر شکایت کے حالات میں بھی مثبت ذہن سے سوچنے کا طریقہ اپنائے، وہ مکمل طور پر مثبت انداز میں سوچنے والا بن جائے۔

رُجز کو چھوڑو

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے 610 عیسوی میں مکہ میں اپنا مشن شروع کیا۔ اس وقت آپ کو ایک بنیادی ہدایت یہ دی گئی کہ وَالرُّجْزَ فَاهْجُرْ (74:5)۔ یعنی، رجز کو چھوڑ دے۔ رجز کا مطلب گندگی ہے۔

وہ رجز کیا تھا جس کو آپ نے چھوڑ کر اپنا مشن چلایا۔ اس کی تفصیل آپ کی سیرت کے مطالعے سے معلوم ہوتی ہے۔ اس کا تعلق آپ کے مشن کے طریقہ کار (method) سے تھا۔ اگر رسول اللہ کی عملی روش کو لے کر اس کو سمجھنے کی کوشش کی جائے۔ تو اس کا جواب یہ ہوگا کہ نزاعی طریقہ کار (confrontational method) کو چھوڑو، اور غیر نزاعی طریقہ کار (non-confrontational method) کو اختیار کرو۔

رسول اللہ کی سیرت کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ نے اپنا مشن پوری طرح غیر نزاعی اصول پر چلایا۔ کعبہ میں اس وقت کے لوگوں نے 360 بت رکھ دیے تھے۔ مگر آپ نے اس سے ٹکراؤ نہیں کیا، بلکہ اس سے اعراض کا طریقہ اختیار کیا۔ مکہ میں دارالندوہ (tribal parliament) تھا۔ مگر آپ نے اس میں قبضہ کرنے کی کوشش نہیں کی، بلکہ اس سے مکمل طور پر اعراض کرتے ہوئے اپنا مشن غیر سیاسی انداز میں چلایا۔ مکہ کے سرداروں نے کہا کہ آپ مکہ چھوڑ دیجیے، تو آپ نے ان کے اس فیصلہ پر کوئی ٹکراؤ نہیں کیا، بلکہ خاموشی کے ساتھ مکہ چھوڑ کر مدینہ چلے گئے۔

اس واقعے کی روشنی میں رجز کو چھوڑنے کا مطلب یہ ہوگا کہ ہر قسم کے ٹکراؤ کو چھوڑتے ہوئے، اپنا مشن جاری رکھا جائے۔ یعنی مذہبی ٹکراؤ، سیاسی ٹکراؤ، قومی ٹکراؤ، حقوق کا ٹکراؤ، وغیرہ سے مکمل طور پر اجتناب کرتے ہوئے توحید کا مشن جاری رکھا جائے۔ یہی طریقہ ابدی طور پر اہل اسلام کا طریقہ ہے۔ وہ جس ملک یا جس زمانے میں ہوں، ہر جگہ اسی غیر نزاعی طریقہ کو اختیار کرنا ہے۔ یہی کامیابی کا واحد طریقہ ہے۔ قانونِ خداوندی کے مطابق کوئی اور طریقہ کامیابی کا طریقہ نہیں ہوسکتا۔

چُپ کی طاقت

ایک پرانا مثل ہے— ایک چُپ ہزار بلا ٹالتی ہے۔ یہ مثل تقریباً ہر زبان میں مختلف الفاظ میں موجود ہے۔ اِس لحاظ سے تمام لوگ اِس مثل کو جانتے ہیں، مگر ایسے لوگ بہت کم ہیں جو اِس مثل کو عملاً اپنی زندگی میں استعمال کریں۔ جاننے میں اور عمل میں اِس فرق کا سبب کیا ہے۔

اصل یہ ہے کہ جب کوئی عورت یا مرد اِس مثل کو سنتا ہے یا پڑھتا ہے، اُس وقت وہ معتدل ذہن (normal mind) کے ساتھ ہوتا ہے۔ لیکن جب اُس کے استعمال کا وقت آتا ہے تو اُس وقت وہ غیر معتدل ذہن (abnormal mind) کی حالت میں ہوجاتا ہے۔ اِس کے عملی استعمال کا وقت وہ ہوتا ہے، جب کہ کوئی آدمی بھڑکا کر اُس کو غصہ دلادے، وہ اس کے خلاف نازیبا کلمات بول دے۔ اُس وقت یہ ہوتا ہے کہ سننے والا بھی بھڑک اٹھتا ہے۔ وہ اینٹ کا جواب پتھر سے دینا چاہتا ہے۔ یہی سبب ہے جس کی بنا پر لوگ جانتے ہوئے بھی چپ کی پالیسی کو اختیار نہیں کرپاتے۔ چپ رہنے سے بات وہیں کی وہیں ختم ہوسکتی تھی، لیکن بولنے کا طریقہ اختیار کرنے کی وجہ سے بات بڑھتی ہے اور بریک ڈاؤن (break down) کی نوبت آجاتی ہے، ایک وقتی چیز مستقل خرابی کا سبب بن جاتی ہے۔

اشتعال کے موقع پر چپ رہنا سب سے زیادہ کامیاب پالیسی ہے۔ اشتعال کے موقع

پر نہ بولنا فتنے کے دروازے کو بند کر دیتا ہے، اور اشتعال کے موقع پر بولنا فتنے کا دروازہ کھول دیتا ہے، ایسا دروازہ جو پھر کبھی بند نہیں ہوتا۔ اشتعال کے موقع پر بولنے سے بات بڑھتی ہے، اور اشتعال کے موقع پر نہ بولنے سے بات وہیں کی وہیں ختم ہوجاتی ہے۔ اِسی حقیقت کو حدیث میں اِن الفاظ میں بیان کیا گیا ہے: الْفِتْنَةُ نَائِمَةٌ لَعَنَ اللّٰهُ مَنْ أَيْقَظَهَا (کنز العمال، حدیث نمبر 30891)۔ یعنی، فتنہ سویا ہوا ہے، اُس شخص پر لعنت ہے جو اِس سوئے ہوئے فتنے کو جگائے۔ ہر آدمی اپنے اندر منفی نفسیات لیے ہوئے ہے۔ اگر آپ چپ رہیں تو یہ منفی نفسیات دبی رہے گی۔ لیکن اگر آپ بول دیں تو یہ منفی نفسیات جاگ اٹھے گی اور پھر اس کے وہ برے نتائج نکلیں گے جس کا پیشگی اندازہ بھی نہیں کیا جاسکتا تھا۔

بگ برڈ تھنکنگ

صبر کی حقیقت کیا ہے، اس کو بیان کرتے ہوئے خلیفہ ثانی عمر بن الخطاب (وفات 23ھ) کا ایک قول کتابوں میں ان الفاظ میں نقل کیا گیا ہے: إِنَّ أَفْضَلَ عَيْشٍ أَدْرَكْنَاهُ بِالصَّبْرِ، وَلَوْ أَنَّ الصَّبْرَ كَانَ مِنَ الرِّجَالِ كَانَ كَرِيمًا (الصبر لابن ابی الدنیا، اثر نمبر 6)۔ یعنی، بیشک افضل زندگی ہم نے صبر میں پائی، اور اگر صبر ایک انسان ہوتا، تو وہ کریم انسان ہوتا۔

یہ دراصل صابر انسان کی پہچان (identity) ہے۔ جس آدمی کے اندر صبر کا مزاج ہو، اس کے اندر اسی قسم کی اعلیٰ انسانی صفت موجود ہوگی۔ کریم انسان سے مراد شریف اور سنجیدہ انسان ہے۔ جو اعلیٰ سوچ کا مالک ہو، جو بولنے سے پہلے سوچے، جو بدلہ لینے کے بجائے معاف کرنے کو بہتر سمجھتا ہو، جو بولے کم، اور سوچے زیادہ، جس کے اندر ردِّ عمل (reaction) کا مزاج نہ ہو، وغیرہ۔

اعلیٰ سوچ کیا ہے۔ اعلیٰ سوچ ایک لفظ میں بگ برڈ تھنکنگ (big bird thinking) کا دوسرا نام ہے۔ بگ برڈ تھنکنگ کی حقیقت یہ ہے کہ جب خطرناک طوفان آتے ہیں،

تو وہاں پر موجود چھوٹے چھوٹے پرندے جو زیادہ اوپر نہیں اڑ پاتے ہیں، وہ طوفان میں پھنس کر ہلاک ہوجاتے ہیں۔ اس کے برعکس، بڑے پرندے، جو اونچائی پر اڑان بھرتے ہیں، وہ طوفان سے بچنے کے لیے مزید اوپر چلے جاتے ہیں جہاں طوفانی ہواؤں کا اثر نہیں ہوتا۔ اس طرح وہ طوفان سے اپنے آپ کو بچا لیتے ہیں۔ ایک سچے انسان کو اپنے اندر یہی مزاج ڈیولپ کرنا چاہیے، یعنی مثبت سوچ کا مزاج — عقل مند آدمی وہ ہے جو ان چیزوں کے ساتھ پرامن طور پر رہ سکے، جن کو وہ بدل نہیں سکتا:

> In countries where there are severe storms, birds with small wings are caught up in them, but large birds with strong wings fly upwards and save themselves from becoming victims of these storms. This phenomenon has given rise to the saying: 'Big bird of the storm.'A spiritual person is one who has developed the capacity for 'big bird' thinking.

منفی جذبات کی قربانی

دین کی راہ میں قربانی کو بہت زیادہ اہمیت حاصل ہے۔ کیوں کہ قربانی کے بغیر دین کا کوئی بڑا کام نہیں کیا جاسکتا۔ جتنی بڑی قربانی اتنا ہی بڑا کام۔ قربانی سے عام طور پر عید الاضحیٰ کے موقع پر جانوروں کا ذبح کرنا مراد لیا جاتا ہے۔ قربانی کی ایک قسم وہ ہے جب کہ آدمی کو اللہ کے راستے میں مال دینا پڑے۔ اسی طرح قربانی کی ایک قسم وہ ہے جب کہ آدمی کو اللہ کے راستے میں جسمانی مصیبت اٹھانی پڑے۔ یہ قربانی کی صورتیں ہیں۔ لیکن دین میں سب سے اعلیٰ قربانی وہ ہے جب کہ آدمی کو اپنے منفی جذبات پر روک لگانا پڑے۔

بعض اوقات اس کا تقاضا ہوتا ہے کہ اپنے منفی جذبات پر روک لگا کر اس کی قربانی پیش کی جائے۔ دین پر چلتے ہوئے انسان کی انا کو چوٹ لگے، اس کے باوجود اللہ کی راہ میں

اس کی استقامت پر فرق نہ آئے۔ اس کی بڑائی کا جذبہ مجروح ہو، مگر وہ کسی شکایت کے بغیر اس کو بخوشی برداشت کرلے۔ اللہ کی راہ میں اس کو اپنی خواہشات کو دبانا پڑے، مگر وہ اس کو رضامندی کے ساتھ گوارا کرلے۔

قربانی کی یہ قسم ایک غیر معمولی قربانی ہے۔ ایسی قربانی کو جھیلنا، بلاشبہ ایک سخت مشکل کام ہے۔ لیکن کوئی بندہ اللہ کی راہ میں جب اپنی رضامندی سے ایسی قربانی کو برداشت کرے، تو اس پر اس کو بلاشبہ اجر عظیم عطا ہوگا۔ اس حقیقت کو ایک حدیثِ رسول میں ان الفاظ میں بیان کیا گیا ہے کہ کسی بندے کا گھونٹ اللہ تعالیٰ کے نزدیک غصہ کے گھونٹ سے افضل نہیں، جسے وہ اللہ تعالیٰ کی رضا کے لیے پی جائے (سنن ابن ماجہ، حدیث نمبر 4189)۔

ایسی قربانی کی ضرورت اس وقت پیش آتی ہے، جب کہ اللہ کی راہ میں آدمی کو اپنا ایک رول ادا کرنا ہو۔ لیکن یہ قربانی دینے کے لیے ضروری ہے کہ آدمی صبر اور ماڈسٹی کا طریقہ اختیار کرے۔ وہ سادہ زندگی پر راضی ہوجائے۔ اسلام کی تاریخ میں ایسے لوگ موجود ہیں، اور ایسے لوگوں نے اپنے عمل سے اسلام کی عظیم تاریخ بنائی ہے۔

مثبت ذہن

اسلامک سوسائٹی آف آرنج کاونٹی (کیلی فورنیا، امریکا) کے زیر اہتمام چھٹی انٹرنیشنل کانفرنس کیلی فورنیا 26-25 دسمبر 1993ء میں ہوئی۔ کانفرنس کی دعوت پر میرا سفر ہوا۔ اس کانفرنس میں امریکا کے مختلف حصوں سے ڈیڑھ ہزار مسلمان شریک ہوئے۔ یہ سب تعلیم یافتہ لوگ تھے۔ ان میں بہت سے الرسالہ پڑھنے والے بھی ملے۔ میں نے پایا کہ جو لوگ الرسالہ برابر پڑھتے ہیں ان کے اندر مثبت طرز فکر پائی جاتی ہے۔ یہ کوئی سادہ بات نہیں۔

قرآن و حدیث کا مطالعہ خالی الذہن ہوکر کیا جائے تو ان میں مثبت فکر کا پیغام ملے گا۔

مثلاً آپ قرآن کھولیں تو اس کی دوسری آیت شکر کی آیت ملے گی (الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ)۔ گویا کہ قرآن وہ ذہن بنانا چاہتا ہے جو احساس یافت سے سرشار ہو۔ مگر آج مسلمانوں کا ذہن احساس محرومی سے بھرا ہوا ہے۔ اسی طرح آپ صحیح البخاری کھولیں تو اس کی پہلی حدیث آپ کو یہ پڑھنے کو ملے گی کہ إِنَّمَا الْأَعْمَالُ بِالنِّيَّاتِ (اعمال کا دارومدار نیتوں پر ہے)۔ گویا پیغمبر اسلام مسلمانوں میں وہ ذہن پیدا کرنا چاہتے ہیں جو اندرونی حقیقتوں کو اہمیت دے اور ظاہری باتوں کو نظر انداز کردے۔ مگر آج مسلمانوں کی پوری سوچ ظواہر پر اٹکی ہوئی ہے۔ حقائق کی انھیں سرے سے خبر ہی نہیں۔

اس کی وجہ یہ ہے کہ موجودہ تعلیم یافتہ مسلمانوں کے فہم اسلامی کا ماخذ حقیقتاً قرآن وحدیث نہیں ہے۔ اس کا ماخذ ان مفکرین کی کتابیں ہیں جو ردعمل کی نفسیات میں مبتلا تھے۔ اسی نفسیات کے تحت انھوں نے اسلام کی تعبیر پیش کی۔ اس تعبیری لٹریچر نے مسلمانوں کے اندر قرآن وسنت والا ذہن نہیں بنایا بلکہ ردعمل کا ذہن بنا دیا۔ یہی منفی ذہن ہے جس کا مظاہرہ آج ہر طرف نظر آتا ہے۔ اسی ذہن کا یہ نتیجہ ہے کہ آج ہر جگہ یا تو لفظی ٹکراؤ جاری ہے یا شمشیری ٹکراؤ۔

شخصیت کا ارتقا

قرآن کی ایک اصطلاح تزکیہ ہے۔ انسانی فلاح کا ذریعہ قرآن میں تزکیہ (91:9-10) کو بتایا گیا ہے۔ قرآن کے مطابق جنت کی اعلیٰ دنیا میں صرف ان افراد کو داخلہ ملے گا جنھوں نے موجودہ دنیا میں اپنا تزکیہ کیا تھا (20:76)۔

تزکیہ کا لفظی مطلب تطہیر (purification) ہے۔ جس طرح خام لوہا (ore) مختلف قسم کے شدید مراحل سے گزر کر ایک بامعنی مشین کی صورت اختیار کرتا ہے، اسی طرح انسان کی شخصیت بھی مختلف قسم کے شدید مراحل سے گزر کر ایک مزکّٰی شخصیت (purified soul) کی صورت اختیار کرتی ہے۔

یہ شدید مراحل کیا ہیں، یہ شدید مراحل وہ ہیں جب کہ انسان کو غیر مطلوب حالات سے سابقہ پیش آتا ہے۔ یہ غیر مطلوب حالات وہ مواقع ہیں جن سے گزرتے ہوئے انسان اپنی شخصیت کی تعمیر کرتا ہے۔

جب انسان کی ایگو پر ضرب لگے اور وہ عدل پر قائم رہے، جب انسان کو غصہ آئے اور وہ اپنے غصہ کو کنٹرول کرلے، جب انسان کو کوئی بڑائی ملے لیکن وہ متواضع (modest) بنا رہے، جب انسان کے اندر انتقام کی آگ بھڑکے اور وہ اپنے اندر ہی اندر اس آگ کو بجھا دے، جب انسان کے اندر کسی کے خلاف نفرت جاگ اٹھے اور وہ پھر بھی اس کے لیے اپنی خیر خواہی کو باقی رکھے، جب انسان پر کوئی دباؤ نہ ہو، اس کے باوجود وہ اعتراف (acknowledgement) کا ثبوت دے، وغیرہ۔ یہی وہ مواقع ہیں جو انسان کا تزکیہ کرتے ہیں اور انسان کے اندر اعلیٰ شخصیت کی تعمیر کرتے ہیں۔

یہ مواقع معتدل حالات میں پیدا نہیں ہوسکتے، یہ صرف غیر معمولی حالات (abnormal situation) میں پیدا ہوتے ہیں۔ قرآن کے مطابق اس امتحان میں وہی شخص کامیاب ہوسکتا ہے جس کے اندر صبر کی صفت پائی جائے (41:35)۔

تعمیر شخصیت

قرآن کی سورہ نمبر 83 میں اہل تکذیب کا ذکر کرتے ہوئے ارشاد ہوا ہے: كَلَّا بَلْ رَانَ عَلَى قُلُوبِهِمْ مَا كَانُوا يَكْسِبُونَ (83:14)۔ یعنی، ان کے دلوں پر اُن کے اعمال کا زنگ چڑھ گیا ہے۔ اس آیت میں ایک نفسیاتی معاملہ کی طرف اشارہ کیا گیا ہے جو ان لوگوں کے ساتھ پیش آتا ہے جو ضد اور سرکشی کا طریقہ اختیار کرتے ہیں۔ اس معاملہ کو حدیث میں ان الفاظ میں بیان کیا گیا ہے:

إِنَّ الْمُؤْمِنَ إِذَا أَذْنَبَ كَانَتْ نُكْتَةٌ سَوْدَاءُ فِي قَلْبِهِ، فَإِنْ تَابَ وَنَزَعَ وَاسْتَغْفَرَ، صُقِلَ قَلْبُهُ، وَإِنْ زَادَ زَادَتْ، حَتَّى يَعْلُوَ قَلْبَهُ (**ابن ماجہ، حدیث نمبر** 4245 **؛ مسند احمد، حدیث نمبر** 4245)۔ **یعنی مومن جب کوئی گناہ کرتا ہے تو اس کے دل پر ایک کالا دھبہ پڑ جاتا ہے۔ اگر وہ توبہ کرے اور اُس سے باز آجائے اور استغفار کرے تو اس کا دل دھبہ سے پاک ہوجاتا ہے۔ اور اگر گناہ میں مزید اضافہ ہو تو دھبہ بڑھتا رہتا ہے یہاں تک کہ وہ اس کے پورے دل پر چھا جاتا ہے۔**

یہ تمثیل کی زبان میں ایک نفسیاتی معاملہ کو بتایا گیا ہے۔ جب کوئی انسان برائی کرے اور پھر وہ جلد ہی متنبہ ہوجائے۔ وہ برائی کرنے کی خواہش کو اپنے دل سے نکال دے تو اس کا دل پاک و صاف ہوجاتا ہے۔ لیکن اگر ایسا ہو کہ آدمی ایک کے بعد ایک برائی کرتا رہے۔ وہ اپنا محاسبہ کرکے اپنے دل سے اس کے اثر کو زائل نہ کرے تو دھیرے دھیرے اس کا پورا دل بے حسی کا شکار ہوجاتا ہے۔ اب وہ برائیوں ہی میں جینے لگتا ہے اور سچائی کی بات اس کو متاثر نہیں کرتی۔

جدید نفسیاتی مطالعہ نے اس معاملہ کو مزید واضح کیا ہے۔ اب یہ بات ایک پراسرار عقیدہ نہیں رہی، بلکہ وہ ایک معلوم حقیقت بن گئی ہے۔ اب وہ خالص علمی اعتبار سے انسان کے لیے قابل فہم ہے۔

جدید نفسیاتی تحقیق سے معلوم ہوا ہے کہ انسان کے دماغ کے تین بڑے حصے ہیں۔ یہ تینوں حصے ہر عورت اور ہر مرد کے دماغ میں پائے جاتے ہیں۔ وہ پیدائشی طور پر ہر انسانی دماغ کا حصہ ہیں۔ وہ تین حصے یہ ہیں:

1۔ شعوری ذہن (conscious mind)

2۔ تحت شعور (sub-conscious mind)

3۔ لاشعور (unconscious mind)

تجربہ وتحقیق سے معلوم ہوا ہے کہ کوئی بھی خیال جب وہ ایک بار دماغ میں آجائے تو وہ ہمیشہ کے لیے انسانی دماغ کا حصہ بن جاتا ہے، اور جیسا کہ معلوم ہے، انسانی دماغ ہی دراصل انسانی شخصیت کا دوسرا نام ہے۔اس کا مطلب یہ ہے کہ جب کوئی خیال انسان کے دماغ میں آجائے تو وہ ہمیشہ کے لیے انسان کی شخصیت کا حصہ بن جاتا ہے۔حتیٰ کہ اگر وہ اس کو اپنی شخصیت سے الگ کرنا چاہے تو وہ اس کو الگ کرنے پر قادر نہیں ہوتا۔

جب کوئی بات انسان کے دماغ میں آتی ہے، خواہ وہ منفی ہو یا مثبت تو وہ سب سے پہلے دماغ کے شعوری حصہ میں آتی ہے۔اس کو زندہ حافظہ بھی کہا جاسکتا ہے۔اس کے بعد آدمی جب رات کو سوتا ہے تو فطری عمل کے تحت اپنے آپ ایسا ہوتا ہے کہ وہ بات شعوری ذہن سے چل کر ذہن کے تحت الشعور حصہ میں پہنچ جاتی ہے۔جب ایسا ہوتا ہے تو اس کے خیال کے اوپر آدمی کا شعوری کنٹرول صرف پچاس فیصد رہ جاتا ہے۔ پچاس فیصد وہ اس کے شعوری کنٹرول سے باہر ہوجاتا ہے۔اس کے بعد جب وہ اگلی رات کو سوتا ہے تو یہ خیال مزید سفر کرکے ذہن کے لاشعور حصہ میں پہنچ جاتا ہے۔جب ایسا ہوتا ہے تو اس کے بعد یہ خیال اس کے شعوری کنٹرول سے پوری طرح باہر ہوجاتا ہے۔

انسانی ذہن کے یہ تینوں حصے شعور کے اعتبار سے ذہن کی تین حالتوں کی نمائندگی کرتے ہیں۔مگر جہاں تک انسانی شخصیت کا تعلق ہے، وہ ہر حال میں یکساں طور پر اُس کا معمول بنی رہتی ہے۔ کوئی خیال جب تک زندہ حافظہ میں ہو تو وہ انسانی شخصیت کا معلوم حصہ ہوتا ہے۔مگر جب وہ تحت شعور میں پہنچ جائے تو اگرچہ اب بھی وہ مکمل طور پر انسانی شخصیت کا حصہ ہوتا ہے مگر عام حالات میں وہ انسان کے علم میں تازہ نہیں ہوتا۔

یہی روزمرہ کے افکار جو انسان کے ذہن میں آتے ہیں وہی اس کی شخصیت کی تعمیر کرتے ہیں۔ جیسے افکار ویسی شخصیت۔مثبت افکار سے مثبت شخصیت بنے گی۔لیکن اگر یہ

افکار منفی افکار ہوں تو انسان کی شخصیت بھی منفی بنتی چلی جائے گی۔

آج کل یہ حال ہے کہ آپ جس عورت یا مرد سے ملیے ہر ایک کو آپ منفی سوچ میں مبتلا پائیں گے۔ اگر کوئی شخص بظاہر مثبت باتیں کرتا ہوا نظر آئے تب بھی اس کی یہ بات صرف اوپری طور پر ہوگی۔ اگر آپ مزید گفتگو کر کے اس کی اندرونی شخصیت کو جاننے کی کوشش کریں تو آپ پائیں گے کہ اس کی اندرونی شخصیت بھی اُتنی ہی منفی تھی جتنی کہ دوسروں کی شخصیت۔ اس طرح موجودہ زمانہ کا ہر آدمی اپنے آپ کو منفی قبرستان میں دفن کیے ہوئے ہے، اگر چہ اس کو خود بھی اس ہلاکت خیز واقعہ کی خبر نہیں۔ اس میں غالباً مذہبی انسان اور سیکولر انسان میں کوئی فرق نہیں۔

یہ ایک حقیقت ہے کہ سب سے بُری شخصیت منفی شخصیت ہے اور سب سے زیادہ اچھی شخصیت وہ ہے جو مثبت شخصیت ہو۔ ایسی حالت میں یہ سوال ہے کہ مثبت شخصیت کی تعمیر کس طرح کی جائے۔ مذکورہ اسلامی تعلیم اور مذکورہ نفسیاتی تحقیق دونوں کو سامنے رکھ کر غور کیا جائے تو اس کی ایک واضح عملی صورت بنتی ہے۔ اس کو یہاں درج کیا جاتا ہے۔

اس عمل کا صحیح طریقہ یہ ہے کہ جب کوئی منفی خیال آدمی کے ذہن میں آجائے تو وہ اس کو پہلے ہی مرحلہ میں ختم کر دے۔ خصوصی تدبیر کے ذریعہ اُس کے منفی پہلو کو مثبت پہلو میں تبدیل کر لے۔ مثلاً وہ غصہ کو فوراً معاف کر دے تا کہ اس کا غصہ انتقام کی صورت اختیار نہ کرنے پائے۔ کسی کی ترقی اُس کو پسند نہ آئے تو اُسی وقت وہ اس کو نظر انداز کر دے تا کہ وہ اس کی شخصیت میں حسد بن کر شامل نہ ہو سکے، وغیرہ۔

ہر بُرے خیال کے ساتھ فوراً ہی تبدیلی کا یہ عمل کرنا چاہیے۔ اگر اس میں دیر ہوئی تو جلد ہی ایسا ہوگا کہ وہ آدمی کے تحت شعور میں چلا جائے گا۔ اور پھر کچھ عرصہ بعد وہ اس کے لاشعور میں داخل ہو جائے گا۔ اور جب ایسا ہوگا تو وہ آدمی کی شخصیت کا اس طرح لازمی حصہ بن جائے گا کہ آدمی چاہے بھی تو وہ اس کو اپنے سے جُدا نہ کر سکے۔

لوگ عام طور پر ایسا نہیں کرتے اور اس کی یہ بھیانک قیمت ادا کر رہے ہیں کہ ہر ایک خوبصورت کپڑوں کے پیچھے ایک منفی شخصیت کی لاش لیے ہوتا ہے۔منفی شخصیت دراصل جہنمی شخصیت ہے۔جو عورت یا مرد اس ہلاکت خیز انجام سے بچنا چاہتے ہوں ان کو چاہیے کہ وہ مذکورہ عمل کی تصحیح کو اپنی روزانہ کی زندگی میں شامل کرلیں۔اس کے سوا اس مسئلہ کا کوئی اور حل موجود نہیں۔

ہلاکت کیا ہے

ایک روایت کے مطابق، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:إِذَا سَمِعْتَ الرَّجُلَ يَقُولُ هَلَكَ النَّاسُ، فَهُوَ أَهْلَكُهُمْ (موطا امام مالک، حدیث نمبر 2070)۔یعنی، جب تم کسی کو یہ کہتے ہوئے سنو کہ لوگ ہلاک ہو گئے تو سب سے زیادہ ہلاکت میں وہی شخص ہے۔

اِس حدیثِ رسول میں 'هَلَكَ النَّاسُ' اپنے لفظی معنی میں نہیں ہے۔ اِس لیے کہ یہ ثابت ہے کہ رسول اور اصحابِ رسول نے خود بھی یہ زبان استعمال کی۔مثلاً حضرت علی بن ابی طالب نے ایک قاضی سے کہا :هلكتَ وأهلكتَ (السنن الكبرى للبيهقي، اثر نمبر 20857)۔یعنی، تم خود بھی ہلاک ہوئے اور تم نے دوسروں کو بھی ہلاک کیا۔

اِس حدیث رسول میں جس روش کی مذمت کی گئی ہے، وہ دراصل تنقید برائے تنقید (criticism for the sake of criticism) ہے، یعنی لوگوں کو برا بتانا، لیکن یہ نہ بتانا کہ ان کے لیے صحیح بات کیا ہے۔دوسروں کے خلاف منفی ریمارک دینا، لیکن مثبت نصیحت کا طریقہ اختیار نہ کرنا۔بے دلیل تنقید کرنا، لیکن مدلل تجزیہ کے ذریعے یہ نہ بتانا کہ صحیح کیا ہے اور غلط کیا۔نفرت کی زبان میں لوگوں کی مذمت کرنا، لیکن خیر خواہی کے انداز میں ان کو نصیحت نہ کرنا۔

بلا دلیل تنقید کا فائدہ تو کچھ نہیں، مگر اس کا نقصان بہت زیادہ ہے۔ بادلیل تنقید سے لوگوں کے اندر محاسبہ (introspection) کا مزاج بنتا ہے۔ اِس کے برعکس، بے دلیل تنقید سے لوگوں کے اندر نفرت اور بے اعترافی کا مزاج بنتا ہے۔بادلیل تنقید، اصلاح کا

ذریعہ ہے۔ اور بے دلیل تنقید صرف فساد کا ذریعہ۔ صالح تنقید وہ ہے جس میں خیر خواہی کا جذبہ پایا جائے۔ جس کا مقصد فریقِ ثانی کی اصلاح ہو۔ اس کے برعکس، غیر صالح تنقید کا مقصد صرف یہ ہوتا ہے کہ دوسرے کو بے عزت کرنا اور اس کی برائی بیان کرنا۔ صالح تنقید اسلام میں عین مطلوب ہے۔ اِس کے برعکس، غیر صالح تنقید کے لیے اسلام میں کوئی جگہ نہیں۔

تاریخ سے سبق

سبق کا سب سے بڑا ذریعہ تاریخ ہے۔ مگر تاریخ سے سبق لینے کے لیے ضروری ہے کہ آدمی منفی واقعات سے مثبت سبق لینے کا آرٹ جانتا ہو۔ تاریخ منفی واقعات سے بھری ہوئی ہے۔ اس لیے تاریخ کے معاملہ میں کبھی ایسا نہیں ہوسکتا ہے کہ پازیٹیو سے پازیٹیو سبق لینے کا موقع ملے۔ تاریخ میں ہمیشہ یہ کرنا پڑتا ہے کہ منفی سے پازیٹیو سبق حاصل کیا جائے۔ مگر اکثر لوگ ایسا نہیں کر پاتے۔ اس لیے تاریخ میں ایسی مثالیں بہت کم ہیں جب کہ کسی نے تاریخ سے کوئی بڑا سبق لیا ہو۔

تاہم تاریخ میں کچھ استثنائی واقعات ہیں۔ مثلاً مغرب کی صلیبی قوموں کی زندگی میں یہ انوکھا واقعہ ملتا ہے کہ انھوں نے 200 سالہ صلیبی جنگوں کے دوران ذلت آمیز شکست (humiliating defeat) کا تجربہ کیا۔ لیکن اس کے بعد ان کے اندر ری پلاننگ آئی۔ انھوں نے اپنی کوششوں کا میدان جنگ کے بجائے سائنس کے میدان کو بنا لیا۔ پھر دنیا نے یہ حیرت انگیز واقعہ دیکھا کہ صلیبی جنگوں کی ناکامی کے بعد انھوں نے ویسٹرن سویلائزیشن کا مینار کھڑا کرلیا۔

دوسری مثال جرمنی کی ہے۔ جرمنی کو دوسری عالمی جنگ میں ٹوٹل شکست ہوئی۔ یہاں تک کہ ان کے ملک کا تہائی حصہ کٹ کر الگ ہوگیا۔ مگر جرمنی کے لیڈروں نے دوسرے عالمی جنگ کے بعد ایک انوکھی پلاننگ (Planning on the remaining part of land)

کی، اور دنیا نے دیکھا کہ جرمنی اپنے کھوئے ہوئے ملک کو دوبارہ حاصل کرلیا۔ جدید صنعت کے میدان میں اتنی زیادہ ترقی کی کہ پہلے سے بھی زیادہ ترقی کا درجہ حاصل کرلیا۔

یہ طریقہ جس کے ذریعے ان قوموں نے کامیابی حاصل کی۔ اس کو ایک لفظ میں ری پلاننگ کہا جاسکتا ہے۔ جب بھی آپ کو آپ کے پہلے منصوبے میں ناکامی ہوجائے تو کبھی مایوسی کا راستہ مت اختیار کیجیے، بلکہ ایک تجارتی فارمولے کے مطابق، ایسا کیجیے:

think, think, there must be better way.

یہ فارمولا عملاً یہی ہے کہ آپ اپنے معاملے کی ری پلاننگ کیجیے۔

صحیح نقطۂ آغاز

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم ہجرت سے پہلے جب مکہ میں تھے تو وہاں کے سرداروں نے آپ کو حکومت کی پیش کش کی۔ انھوں نے کہا: وَإِنْ كُنْتَ تُرِيدُ بِهِ مُلْكًا مَلَّكْنَاكَ عَلَيْنَا (اگر تم حکومت چاہتے ہو تو ہم تم کو اپنے اوپر حاکم بنانے کے لیے تیار ہیں)۔ آپ نے فرمایا: مَا جئتُ بِمَا جِئْتُكُمْ بِهِ أَطْلُبُ ...الْمُلْكَ عَلَيْكُمْ (البدایۃ والنہایۃ، جلد 3، صفحہ 81)۔ یعنی، میں تمھارے اوپر حکومت نہیں چاہتا۔

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کے اِس جواب سے اسلامی تحریک کا ایک اہم اصول معلوم ہوتا ہے، وہ یہ کہ اسلامی تحریک کا نقطۂ آغاز (starting point) حکومت یا سیاسی اقتدار نہیں ہے، بلکہ اسلامی تحریک کا اصل نقطۂ آغاز فرد کی شخصیت میں تبدیلی لانا ہے، ایک ایک فرد کے ذہن کی تشکیل نو (re-engineering of the mind) کرنا ہے۔

اسلامی تحریک کا فارمولا دو نکات (points) پر مشتمل ہے— فرد کی شخصیت میں تبدیلی لانا، اور پولٹکل سسٹم کے معاملے میں حالتِ موجودہ کو تسلیم کرلینا:

Change in personality, status quoism in political system

اسلامی تحریک کی یہی فطری ترتیب ہے۔ اگر اِس ترتیب کو بدل دیا جائے، یعنی اگر پولٹکل سسٹم کو بدلنے سے تحریک کا آغاز کیا جائے تو سو سال کی جدو جہد کے بعد بھی کوئی مثبت نتیجہ نکلنے والا نہیں۔ فرد کی تبدیلی سے آغاز کرکے نظام کی تبدیلی تک پہنچنا ممکن ہوتا ہے۔ لیکن اگر نظام کی تبدیلی سے آغاز کیا جائے تو ایسی تحریک کسی انجام تک پہنچنے والی نہیں۔ ایسی تحریک صرف تباہی میں اضافہ کرے گی، اِس کے سوا اور کچھ نہیں۔

فرد کے اندر ذہنی تبدیلی سے تحریک کا آغاز کرنے کی صورت میں فی الفور تحریک کو مثبت آغاز مل جاتا ہے۔ لیکن سسٹم سے آغاز کرنے کا نتیجہ صرف یہ ہوتا ہے کہ آخر کار تحریک ایک بند گلی میں پہنچ کر رک جاتی ہے۔ اس کے پیچھے بھی اندھیرا ہوتا ہے اور اس کے آگے بھی اندھیرا۔

تجربہ سے سبق سیکھیے

تجربہ (experience) ہمیشہ سبق کے لیے ہوتا ہے۔ لیکن بہت کم لوگ ہیں، جو اپنے تجربے کو سبق بنا سکیں۔ تجربہ ہر انسان کی زندگی کا ایک سبق آموز واقعہ ہوتا ہے۔ تجربہ انسان کے لیے ذہنی ارتقا (intellectual development) کا ذریعہ ہے۔ لیکن عام طور پر لوگ تجربہ سے مثبت فائدہ حاصل نہیں کر پاتے۔ اس لیے کہ وہ تجربہ کو شکایت کے خانے میں ڈال دیتے ہیں۔

یہ فطرت کا قانون ہے کہ جب بھی کسی کے ساتھ کوئی ناخوش گوار واقعہ پیش آتا ہے تو وہ صرف دوسرے کی غلطی کی بنا پر نہیں ہوتا۔ ہمیشہ ایسا ہوتا ہے کہ ایسے کسی واقعے میں دونوں فریق کا حصہ ہوتا ہے، کسی کا کم کسی کا زیادہ۔ عام طور پر ایسا ہوتا ہے کہ لوگوں کے ساتھ جب کوئی ناخوش گوار واقعہ پیش آتا ہے تو وہ اس کو یک طرفہ طور پر دیکھتے ہیں۔ وہ اپنی غلطی کو حذف کرکے سارے معاملے کو دوسرے کی غلطی کے خانے میں ڈال دیتے ہیں۔ یہی تقریباً ننانوے فیصد مثالوں (cases) میں پیش آتا ہے۔

مگراس طرح یک طرفہ رائے قائم کرنا، قانونِ فطرت کے خلاف ہے۔ تاریخ بتاتی ہے کہ اصحابِ رسول جیسے سارے لوگ ہوں، تب بھی ناخوش گوار واقعات میں کچھ نہ کچھ اپنا حصہ شامل رہتا ہے۔ اس کی ایک مثال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں غزوۂ احد کا واقعہ ہے۔ اس غزوہ میں اصحاب رسول کو ابتداءً کامیابی ہوئی، لیکن بعد کو خود اپنی ایک غلطی سے سخت نقصان اٹھانا پڑا (آل عمران، 3:152-153)۔

تجربے کو سبق بنائیے، تجربے کو شکایت نہ بنائیے۔ تجربے کو سبق بنانے کا مطلب یہ ہے کہ آدمی نے اپنی زندگی کے ایک منفی واقعہ کو مثبت واقعہ میں تبدیل کردیا، آدمی نے اپنے نقصان کو دوبارہ اپنے لیے فائدہ بنالیا۔ اس کے برعکس، جو لوگ تجربے کو شکایت اور نفرت کا ذریعہ بنالیں، انھوں نے گویا نقصان کے بعد ملنے والے فائدہ سے بھی اپنے کو محروم کرلیا۔ انھوں نے پہلے موقع کو بھی کھویا، اور دوسرے موقع کو بھی کھودیا۔

مثبت فکر

دوراول کے مسلمانوں نے جو بے نظیر کامیابی حاصل کی اس کا سب سے بڑا راز یہ تھا کہ ان میں کا ہر فرد مکمل معنوں میں مثبت سوچ (positive thinking) کا مالک تھا۔ وہ قرآن کے مطابق عسر میں یسر کا پہلو تلاش کرلیتا تھا۔ وہ بظاہر شکست کے واقعہ میں فتح کا راز دریافت کرلیتا تھا۔ اس کے لیے پوری دنیا اپنی تمام وسعتوں کے ساتھ مثبت خوراک کا دسترخوان بن گئی تھی۔ مسلمانوں کا یہی مزاج تقریباً ہزار سال تک جاری رہا۔ انیسویں صدی میں جب مسلم سلطنتیں اہل مغرب کے ہاتھوں ٹوٹ گئیں تو اس کے بعد جو مسلم رہنما اٹھے وہ ردِّ عمل کی نفسیات میں مبتلا ہو چکے تھے۔ انہوں نے دور جدید کی مسلم نسلوں کو احتجاجی ذہن میں مبتلا کردیا۔ ساری دنیا کے مسلمان، خواص اور عوام دونوں احساس محرومی (persecution complex) میں مبتلا ہوگئے۔ اس نازک تاریخی موقع پر مسلم رہنماؤں کی اس غلطی کا نتیجہ یہ ہوا کہ مسلمان اس نفسیاتی

پیچیدگی میں مبتلا ہو گئے جس کو انگریزی میں پیرانوئیا (paranoia) کہا جاتا ہے۔

قرآن میں بتایا گیا ہے کہ لوگوں کا حال یہ ہے کہ وہ گمراہی کا راستہ دیکھیں تو وہ اس کو اختیار کر لیں گے اور اگر وہ فلاح کا راستہ دیکھیں تو وہ اس کو اختیار نہ کریں گے (7:146)۔ اس کو دوسرے لفظوں میں یوں کہا جاسکتا ہے کہ لوگ منفی پکار کی طرف تیزی سے دوڑتے ہیں، مگر مثبت پکار کی طرف وہ اس طرح نہیں دوڑتے۔ اس کا سبب یہ ہے کہ منفی کلام حال کی زبان میں ہوتا ہے اور مثبت کلام ہمیشہ مستقبل کی زبان میں، اور تاریخ کا تجربہ یہ ہے کہ مستقبل کی زبان سمجھنے والے ہمیشہ بہت تھوڑے ہوتے ہیں اور حال کی زبان سمجھنے والے ہمیشہ بہت زیادہ۔

اس دنیا میں ہر قسم کی ناکامیوں کا راز منفی طرز فکر ہے اور ہر قسم کی کامیابی کا راز مثبت طرز فکر۔ منفی طرز فکر ہر قسم کی دینی اور اخلاقی برائیوں کا سرچشمہ ہے اور مثبت طرز فکر اس کے مقابلے میں ہر قسم کے دینی اور دنیوی خیر کا سرچشمہ۔

مثبت جواب

ہجرتِ رسول کے تیسرے سال مدینہ میں قریش اور اہلِ اسلام کے درمیان ایک جنگ ہوئی جو غزوہ احد کے نام سے مشہور ہے۔ اِس میں بعض اسباب سے اہلِ ایمان کو شکست ہوئی۔ تقریباً 70 مسلمان مارے گئے۔ بہت سے زخمی ہوئے۔ زخمی ہونے والوں میں خود پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم شامل تھے۔ جنگ کے خاتمے پر قریش کے سردار نے فخر کے ساتھ اپنی فتح کا کریڈٹ اپنے بت عزیٰ کو دیتے ہوئے کہا: لَنَا العُزّٰی وَلاَ عُزّٰی لَکُم (ہمارے پاس عزیٰ ہے، اور تمھارے پاس کوئی عزیٰ نہیں)۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے کہنے پر صحابہ نے اِن الفاظ میں اِس کا جواب دیا: اللّٰہُ مَوْلاَنَا، وَلاَ مَوْلَی لَکُمْ (صحیح البخاری، حدیث نمبر 4043)۔ یعنی، اللہ ہمارا مولا ہے، اور تمھارا کوئی مولا نہیں۔

یہ صرف ایک واقعہ نہیں، بلکہ وہ زندگی کا ایک عمومی اصول ہے۔ دوسرے لفظوں میں،

اِس کا مطلب یہ ہے کہ اگر فریقِ ثانی کوئی اشتعال انگیز بات کہے تو تم اس کے جواب میں خود مشتعل نہ ہو، بلکہ مثبت انداز میں اس کا جواب دو۔ فریقِ ثانی کی طرف سے خواہ کچھ بھی کیا جائے، تمھارا طریقہ مثبت ردِّعمل کا طریقہ ہونا چاہیے، نہ کہ منفی ردِّعمل کا طریقہ۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم سے صحابہ نے فریقِ ثانی کو جو جواب دیا، اُس میں بیک وقت دو فائدے تھے: ایک، یہ کہ صحابہ نے اپنے آپ کو منفی ردِّعمل کی نفسیات سے بچالیا، اور منفی ردِّعمل سے بچانا ہی تزکیہ نفس کا اصل ذریعہ ہے۔ منفی ردِّعمل آدمی کے نفس کو آلودہ کرتا ہے اور مثبت ردِّعمل آدمی کے نفس کو پاک کرنے کا ذریعہ بنتا ہے۔

اِس طرح مثبت جواب دینے کا دوسرا فائدہ یہ تھا کہ قول محض قول نہ رہا، وہ ایک دعوت کا قول بن گیا۔ اِس کے ذریعے صحابہ نے فریقِ ثانی کو یہ پیغام دیا کہ شرک کا عقیدہ ایک بے بنیاد عقیدہ ہے۔ صحیح اور درست عقیدہ یہ ہے کہ آدمی اللہ واحد کو مانے اور اُسی سے ہر قسم کے خیر کی امید رکھے۔ ساری طاقت کا مالک اللہ ہے۔ کسی کو جو کچھ ملتا ہے، وہ صرف اللہ سے ملتا ہے، نہ کہ کسی اور سے۔

سفر کا آغاز

سفر کا آغاز ہمیشہ آج سے ہوتا ہے لیکن اکثر لوگ اپنے سفر کا آغاز کل سے کرنا چاہتے ہیں۔ یہی مزاج ترقی میں سب سے بڑی رکاوٹ ہے۔ اسی مزاج کا یہ نتیجہ ہے کہ اکثر لوگ غیر مطمئن زندگی گزار کر مر جاتے ہیں۔ وہ اپنا نشانہ پورا کیے بغیر موجودہ دنیا سے چلے جاتے ہیں۔

ہر آدمی جب پیدا ہوتا ہے تو پیدا ہوتے ہی اس کو کچھ حالات ملتے ہیں۔ اگر بالفرض خارجی طور پر اس کو کچھ چیزیں نہ ملیں تب بھی اس کا اپنا وجود اس کو یقینی طور پر حاصل رہتا ہے۔ زندگی کے سفر کا سب سے زیادہ کامیاب آغاز یہ ہے کہ آدمی جہاں ہے وہیں سے وہ اپنا سفر شروع کر دے۔ وہ حاصل شدہ مواقع کو استعمال کر کے اپنی دنیا بنائے۔ وہ ایسا نہ کرے کہ جو چیز اس

کو ابھی نہیں ملی ہے اس کو پانے کے لیے اپنی ساری توجہ لگا دے۔ اس طریقہ کو ایک لفظ میں پازیٹیو اسٹیٹس کوازم (positive status quoism) کہا جا سکتا ہے۔ یعنی ٹکراؤ کا طریقہ چھوڑ کر حالات موجودہ کو قبول کر لینا اور بروقت جو مواقع (opportunities) موجود ہیں ان کو استعمال کر کے پر امن انداز میں اپنی زندگی کی تعمیر کرنا۔

پیدا ہونے کے بعد آدمی کو بروقت جو کچھ ملا ہوا ہوتا ہے وہ اس کو اپنے حوصلہ کے مقابلہ میں کم معلوم ہوتا ہے۔ وہ چاہنے لگتا ہے کہ پہلے زیادہ حاصل کرے اور اس کے بعد زندگی کی مثبت تعمیر کی طرف بڑھے۔ مگر یہ سوچ غیر فطری ہے۔ صحیح یہ ہے کہ ملے ہوئے کو مواقع کی نظر سے دیکھا جائے اور اس کو لے کر فوراً ہی زندگی کی مثبت تعمیر شروع کر دی جائے۔

حاصل شدہ نقشۂ کار کے اندر مثبت جدوجہد کرنے کا نام پازیٹیو اسٹیٹس کوازم ہے۔ یہی کامیابی کا واحد طریقہ ہے۔ جو لوگ حاصل شدہ نقشۂ کار کو ناکافی سمجھ کر نئے نقشۂ کار کی طرف دوڑیں ان کے لیے اس دنیا میں تباہی کے سوا کوئی اور انجام مقدر نہیں۔

زندگی کی جدوجہد ہمیشہ ملے ہوئے سے ہوتی ہے۔ جو لوگ نہ ملے ہوئے سے زندگی کی جدوجہد شروع کرنا چاہیں وہ یہ خطرہ مول لے رہے ہیں کہ ان کی جدوجہد کبھی شروع ہی نہ ہو۔

بحران کا مثبت پہلو

سگمنڈ فرائڈ (Sigmund Freud) آسٹریا (سنٹرل یورپ) میں 1856ء میں پیدا ہوا، اور 1939ء میں اس کی وفات ہوئی۔ وہ نفسیات کا عالم (psychologist) تھا۔

فرائڈ اپنے ایک غلط نظریہ کی وجہ سے کافی بدنام ہوا۔ اُس کا نظریہ تھا کہ — نفسیاتی پیچیدگیاں ابتدائی دور کے جذباتی صدمات کا نتیجہ ہوتی ہیں، وہ دبی ہوئی صنفی توانائی کا اظہار ہیں:

> ...Symptoms were caused by early trauma, and were expressions of repressed sexual energy.

تاہم فرائڈ کی بعض تحقیقات سبق آموز ہیں۔ اُن میں سے ایک اُس کا یہ قول ہے کہ— زندگی کا ہر بحران امکانی طور پر انسانی شخصیت کے مثبت پہلو کو متحرک کرنے کا سبب بنتا ہے:

Every crisis is potentially a stimulus to the positive side of the personality.

یہ فطرت کے نظام کا ایک اہم پہلو ہے۔ خدا کے تخلیقی نظام کے تحت، ایسا ہوتا ہے کہ انسان کی زندگی میں جب کوئی غیر مطلوب واقعہ پیش آتا ہے تو وہ ایک مطلوب نتیجے کا سبب بن جاتا ہے۔ اِس کے بعد آدمی کے اندر نیا شوق، نیا ولولہ اور نیا جذبۂ عمل پیدا ہوتا ہے۔ آدمی کا ذہن زیادہ بیدار ہو کر زیادہ بہتر منصوبہ بندی کرنے لگتا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ہر بحران آدمی کی زندگی میں ایک نیا امکان کھول دیتا ہے، ہر ناکامی آدمی کے لیے ایک نئی کامیابی کا سبب بن جاتی ہے۔

آدمی کو چاہیے کہ وہ کسی بھی صورت حال میں مایوس نہ ہو، وہ ہر رکاوٹ کو اپنے لیے ترقی کا نیا زینہ سمجھے، وہ مسئلہ (problem) کو ایک چیلنج سمجھے، نہ کہ صرف ایک مسئلہ۔ مسئلے کو صرف مسئلہ سمجھنا آدمی کو مایوسی کی طرف لے جاتا ہے، اور مسئلے کو چیلنج سمجھنا آدمی کے لیے نیا دروازہ کھولنے کا سبب بنتا ہے۔

ماضی میں جینا

لوگوں سے بات کیجیے تو اکثر لوگ، بلکہ شاید سبھی لوگ کسی نہ کسی کے خلاف کوئی شکایت لے کر منفی احساسات میں مبتلا رہتے ہیں۔ پورے معنوں میں مثبت سوچ والا آدمی شاید کوئی بھی آج کی دنیا میں موجود نہیں۔

اِس قسم کی سوچ آدمی کے اندر منفی شخصیت (negative personality) پیدا کرتی ہے۔ اور منفی شخصیت کسی بھی عورت یا مرد کے لیے خود کُشی سے کم نہیں۔ عام خودکشی

اگر جسمانی خودکشی (physical suicide) ہے، تو منفی سوچ بلاشبہ نفسیاتی خودکشی (psychological suicide) ہے۔

اِس معاملے میں لوگوں سے پوچھ گچھ (scrutiny) کیجیے تو معلوم ہوگا کہ ان کی شکایت کسی نہ کسی ایسے واقعے پر مبنی ہے جس کا تعلق گزرے ہوئے ماضی سے ہے۔ لوگوں کی یہ ایک تباہ کن عادت ہے کہ اگر اُن کے ساتھ کوئی ناخوش گوار واقعہ پیش آجائے، تو وہ دوسروں سے اس کا چرچا کرتے ہیں، وہ ہمیشہ اس کو اپنی یاد (memory) میں لیے رہتے ہیں۔ یہی عادت کسی عورت یا مرد کے اندر منفی شخصیت کی تشکیل کا سب سے بڑا سبب ہے۔

ہر عورت اور ہر مرد کو چاہیے کہ جب بھی اس کے ساتھ کوئی ناخوش گوار واقعہ پیش آئے، تو اُسی وقت وہ اس کو فراموشی کے خانے میں ڈال دے۔ وہ ہرگز دوسروں سے اس کا چرچا نہ کرے، بلکہ وہ کوشش کرکے ناخوش گوار واقعہ کے کسی خوش گوار پہلو کو تلاش کرے۔ اِس طرح وہ ایک منفی تجربے کو، مثبت تجربے میں تبدیل کردے، ٹھیک اُسی طرح جیسے ایک مسافر کے پاؤں میں کانٹا چبھ جائے، تو وہ اُسی وقت اس کانٹے کو نکال کر باہر پھینک دیتا ہے۔ وہ اس کو اپنی زندہ یادداشت (living memory) کا جزء نہیں بناتا۔

دانش مند انسان وہ ہے جو تلخ یادوں کو بھلا دے۔ وہ اپنے ذہن کو ماضی کی ناخوش گوار یادوں کا جنگل نہ بننے دے۔ اس دنیا میں کامیاب زندگی کی اِس کے سوا کوئی اور صورت نہیں۔

بھولنا ایک مثبت عمل

موجودہ دنیا میں ہر انسان کو کسی نہ کسی قسم کے نقصان سے دوچار ہونا پڑتا ہے۔ نقصان کا یہ تجربہ ایک تلخ یاد بن کر اس کے ذہن میں بیٹھ جاتا ہے۔ یہ ایک ایسا مسئلہ ہے جو ہر عورت اور ہر مرد کے ساتھ عام طور پر پیش آتا ہے۔ اس مسئلے کا حل کیا ہے۔ ایک اردو شاعر اختر انصاری (1909-1988ء) نے کہا ہے:

یادِ ماضی عذاب ہے یارب

چھین لے مجھ سے حافظہ میرا

یہ نقصان کے مسئلے کا ایک منفی حل (negative solution) ہے، اور منفی حل صرف دل کی تسکین کے لیے ہوتا ہے، وہ اصل مسئلے کا حقیقی حل نہیں ہوتا۔ اِس مسئلے کا ایک حل جارج برنارڈ شا (وفات 1950ء) نے بتایا ہے۔ اُس نے کہا کہ — سب سے زیادہ غیر تعلیم یافتہ انسان وہ ہے جس کے پاس بھلا دینے کے لیے کچھ نہ ہو:

> The most uneducated person is one who has nothing to forget in his life.

نقصان، زندگی کا ایک لازمی حصہ ہے۔ وہ مختلف صورتوں میں ہر ایک کے ساتھ پیش آتا ہے۔ اِس مسئلے کا بے ضرر حل صرف یہ ہے کہ اُس کو بھلا دیا جائے۔ فراموشی اِس مسئلے کا سیکولر حل ہے۔ اِس کا مذہبی حل یہ ہے کہ اِس قسم کے تجربات کو خدا کے خانے میں ڈال دیا جائے۔

مزید یہ کہ اِس دنیا میں ہر چیز کا ایک مثبت پہلو ہوتا ہے۔ نقصان کے تجربے کا مثبت پہلو یہ ہے کہ وہ آدمی کے سوئے ہوئے ذہن کو جگاتا ہے۔ جب تلخ تجربہ ایک شاکنگ تجربہ (shocking experience) بن جائے، وہ آدمی کی سوچنے کی صلاحیت میں اضافہ کرتا ہے۔ وہ آدمی کو نئے نئے تجربات سے آشنا کرکے اس کے ذہنی اُفق (intellectual level) کو وسیع کرتا ہے۔ اس کے برعکس، بے حسی کسی انسان کے لیے نفسیاتی موت (psychological death) کی حیثیت رکھتی ہے۔

اختلافِ رائے

مغرب کے سفر میں میری ملاقات ایک بڑے مغربی اسکالر سے ہوئی۔ میں نے ان سے

پوچھا کہ مغرب (West) کی ترقی کا راز کیا ہے۔ انھوں نے جواب دیا— اختلافِ رائے کو انسان کا ناقابل تنسیخ حق سمجھنا:

To accept dissent as an absolute human right.

مغربی اسکالر کے اس جواب کو سننے کے بعد میں نے اس موضوع کا تفصیلی مطالعہ کیا۔ مجھے معلوم ہوا کہ اس موضوع پر کثرت سے کتابیں لکھی گئی ہیں، مثلاً:

Dissent: The History of an American Idea, by Ralph Young

On Liberty by John Stuart Mill

The Constitution of Liberty by F. A. Hayek

اس موضوع پر اپنے مطالعے کے نتیجے میں میں اس رائے کی صداقت پر مطمئن ہوگیا۔ میں سمجھتا ہوں کہ مغربی تہذیب سے پہلے انسانی تاریخ میں اختلاف رائے کو انسانی حق (human right) کا درجہ حاصل نہ تھا۔ یہ صرف مغربی تہذیب کے بعد ہوا ہے کہ اختلاف رائے کو متفقہ طور پر ایک یونیورسل نارم کی حیثیت حاصل ہوگئی ہے۔

اختلاف رائے کو ڈیسنٹ (dissent) کا نام دینا مغربی تہذیب کا ظاہرہ ہے۔ مغربی تہذیب سے پہلے یہ لفظ موجود نہ تھا۔ ڈیسنٹ ایک نیوٹرل (neutral) لفظ ہے، اور میں سمجھتا ہوں کہ مثبت اختلاف کے لیے یہ ایک صحیح ترین لفظ ہے۔ مثبت اختلاف صرف اختلاف ہوتا ہے، وہ نہ موافق ہوتا ہے، اور نہ مخالف۔ میں سمجھتا ہوں کہ مثبت اختلاف اجتماعی ترقی کے لیے شرط لازم ہے۔

اختلاف اگر صرف اختلاف ہو تو وہ نہایت آسانی سے مخالفت کی شکل اختیار کر لیتا ہے، اور مخالفت صرف ایک منفی سرگرمی ہے۔ مخالفت کو مثبت سرگرمی بنانے کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ اس کو مثبت معنی دے دیا جائے۔ یعنی اختلاف کو ڈیسنٹ کا معنی قرار دینا۔ مثبت اختلاف طرفین کے لیے ذہنی ارتقا کا ذریعہ ہے، جب کہ منفی اختلاف کا دونوں میں سے کسی کے لیے کوئی فائدہ نہیں ہے۔

میں ذاتی طور پر اختلاف رائے کو یہی درجہ دیتا ہوں۔ میں نے اپنے ذاتی تجربے سے یہ سمجھا ہے کہ اختلافِ رائے کو نہ ماننا خود اپنے ساتھ دشمنی کرنا ہے۔ اس لیے کہ اختلاف رائے کے ذریعہ زیرِ بحث مسئلے کے مختلف پہلو کھلتے ہیں۔ اس کے مختلف گوشے سامنے آتے ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اختلاف رائے کسی انسان کے لیے ذہنی ارتقا (intellectual development) کا ذریعہ بن جاتا ہے۔ میں اپنے ذاتی تجربے کی بنا پر کہہ سکتا ہوں کہ جو آدمی اختلاف رائے کو برداشت نہ کرے، وہ یقینی طور پر ایک بہت بڑی نعمت سے محروم ہو گیا، اور وہ نعمت ہے ذہنی ارتقا۔

کسی نے درست طور پر کہا ہے: مَنْ هُوَ نَاصِحُكَ خَيْرٌ لَكَ مِمَّنْ هُوَ مَادِحُكَ (جو شخص تمہیں نصیحت کرے، وہ اس سے بہتر ہے جو تمھاری تعریف کرے)۔ جو آدمی حقیقت پسند ہو، وہ یقیناً تنقید یا اختلاف رائے کو اپنے لیے ایک نعمت سمجھے گا۔ کیوں کہ تنقید اور اختلاف رائے ہمیشہ فکر کے نئے دروازے کھولنے والا ہے۔

تنقید یا اختلاف رائے کو کھلے ذہن کے ساتھ سننا میرے نزدیک کوئی تقویٰ کی بات نہیں ہے، بلکہ وہ خالص علمی بات ہے۔ یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ آدمی کے اندر سائنٹفک ٹمپر (scientific temper) موجود ہے۔ سائنٹفک ٹمپر اپنی اصل کے اعتبار سے یہ ہے کہ آدمی کے اندر اعترافِ حقیقت (acceptance of reality) کا مزاج ہو۔ جب آپ اپنا یہ حق سمجھتے ہیں کہ آپ آزادانہ سوچیں، اور آزادانہ رائے قائم کریں تو فطرت کے قانون کے مطابق آپ کو یہ بھی ماننا چاہیے کہ دوسرے شخص کو بھی یکساں طور پر اپنی رائے رکھنے اور اس کے اظہار کا حق حاصل ہے۔ اس اعتبار سے دیکھا جائے تو اختلاف رائے کو کھلے ذہن کے ساتھ سننا، گویا حقیقتِ واقعہ کا اعتراف کرنا ہے۔ اسی اعتراف کا دوسرا نام سائنٹفک اسپرٹ ہے۔

فطرت کا قانون

ایک مسلم رائٹر کا مضمون نظر سے گزرا۔ یہ مضمون انڈیا کے مسلم مسائل کے بارے میں ہے۔ اس میں وہ لکھتے ہیں کہ اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ مسلمان اس ملک میں امتیاز کا سامنا کررہے ہیں، ملازمتوں میں اور داخلوں میں، نیز فرقہ وارانہ تشدد کے وقت:

There is no denying that Muslims face discrimination in jobs and admissions and also communal violence.

عام طور پر مسلمانوں کا لکھنے اور بولنے والا طبقہ اسی قسم کی بات لکھتا اور بولتا ہے۔ لیکن ایسے لوگ مسلمانوں کی خدمت نہیں کررہے ہیں۔ ان کی یہ باتیں باعتبار نتیجہ حوصلہ شکنی کی باتیں ہیں۔ جب کہ صحیح طریقہ یہ ہے کہ ہر صورتِ حال میں ہمیشہ ایسی بات کہی جائے جو حوصلہ افزائی کے ہم معنی ہو۔

امتیاز (discrimination) کیا ہے۔ وہ ایک فطری صورتِ حال کو منفی اصطلاح میں بیان کرنا ہے۔ ہمارے لکھنے اور بولنے والے جس چیز کو امتیاز کہتے ہیں، وہ دراصل چیلنج کی صورتِ حال ہے۔ یہ دنیا کا قانون ہے کہ یہاں ہمیشہ اجتماعی زندگی میں چیلنج اور مسابقت کی صورتِ حال قائم رہتی ہے۔ اس کی بنا پر ہمیشہ ایسا ہوتا ہے کہ کچھ لوگ آگے بڑھ جاتے ہیں اور کچھ لوگ پیچھے ہوجاتے ہیں۔ مگر یہ ایک وقتی صورتِ حال ہے، وہ مستقل طور پر قائم رہنے والی نہیں۔

انسان کبھی اپنی ہار کو تسلیم نہیں کرتا۔ یہ فطرت کا ایک ابدی قانون ہے۔ اس بنا پر ہمیشہ ایسا ہوتا ہے کہ پیچھے رہ جانے والوں کے اندر داعیہ (incentive) جاگتا ہے۔ وہ عام حالات کے مقابلے میں زیادہ کوشش کرنے لگتے ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ آگے بڑھنے والا پیچھے ہوجاتا ہے، اور پیچھے رہ جانے والا آگے بڑھ جاتا ہے۔ یہ عمل ہر سماج میں اور ہمیشہ جاری رہتا ہے۔ یہ فطرت کا ایک قانون ہے، اور کوئی بھی اتنا طاقت ور نہیں کہ وہ

فطرت کے قانون کو بدل دے۔ مثال کے طور پر اس ملک میں ڈاکٹر بی آر امبیڈکر اور ڈاکٹر عبد الکلام جب پیدا ہوئے تو وہ ایک پچھڑے ہوئے انسان تھے، مگر بعد کے زمانے میں لوگوں نے دیکھا کہ وہ دونوں افراد اگلی صف میں جگہ حاصل کر چکے تھے۔

منفی سوچ نہیں

اگر کسی بات پر آپ کے اندر منفی سوچ پیدا ہو جائے، تو فوراً اس کو اپنے اندر سے ختم کر دیجیے۔ منفی سوچ کی نفسیات یہ ہے کہ اگر ایک بار آپ کے اندر کسی بات پر منفی سوچ پیدا ہو جائے تو وہ برابر جاری رہے گی۔ یہاں تک کہ وہ آپ کی کنڈیشننگ کا حصہ بن جائے گی۔ اس لیے منفی سوچ کو فوراً ختم کر دیجیے، اگر فوراً نہیں کیا تو پھر وہ کبھی ختم ہونے والی نہیں۔

انسان کے ذہن میں ہر وقت ٹرین آف تھاٹ (train of thought) چلتا رہتا ہے۔ وہ نان اسٹاپ طور پر خود بخود چلتا ہے۔ ٹرین آف تھاٹ کو روکنا ممکن نہیں۔ آپ صرف یہ کر سکتے ہیں کہ آپ اپنے ذہن میں منفی آئٹم نہ ڈالیں یا اگر کوئی منفی آئٹم پڑ گیا ہے تو فوراً اس کو نکال دیں۔ اگر آپ نے فوراً اس کو نہیں نکالا تو وہ مزید پختہ ہوتا چلا جائے گا۔ وہ آپ کی طبیعت ثانیہ (second nature) بن جائے گا۔

منفی سوچ کوئی سادہ بات نہیں۔ منفی سوچ آپ کے اندر تمام اچھی باتوں کے ڈیولپمنٹ کو روک دیتی ہے۔ اس کے بعد یہ ہوتا ہے کہ آپ ہمیشہ چیزوں کو منفی زاویے سے سوچنے کے عادی ہو جاتے ہیں۔ آپ کے اندر مثبت سوچ کا خاتمہ ہو جاتا ہے۔ آپ تخلیقی سوچ (creative thinking) کے قابل نہیں رہتے، اور سب سے زیادہ خطرے کی بات یہ ہے کہ منفی سوچ والا آدمی فرشتوں کی صحبت سے محروم ہو جاتا ہے۔

موجودہ دنیا میں بار بار ایسے اسباب پیش آتے ہیں، جو آدمی کو منفی سوچ میں مبتلا کر دیں۔

ایسا ہونا بالکل فطری بات ہے۔ آپ ایسا ہونے کو روک نہیں سکتے۔ البتہ آپ ایسا کرسکتے ہیں کہ منفی سوچ کو یاد کے خانے سے نکال کر فراموشی کے خانے میں ڈال دیں۔ آپ منفی بات کو اپنی کنڈیشننگ (conditioning) کے پراسس میں شامل ہونے سے دور رکھیں۔ آپ منفی سوچ کو اپنی شخصیت (personality) کا مستقل حصہ نہ بننے دیں۔

منفی تجربہ

منفی تجربہ (negative experience) صرف منفی تجربہ نہیں ہے، بلکہ اپنی حقیقت کے اعتبار سے وہ ایک صدمہ (shock) ہے۔ صدمہ کا تجربہ انسانی ذہن کے لیے ایک فکری طوفان (storm) کے ہم معنی ہوتا ہے، کبھی چھوٹا اسٹارم اور کبھی بڑا اسٹارم۔ منفی تجربہ کے وقت انسان کے ذہن میں طوفان پیدا ہوتا ہے۔ وہ درحقیقت ایک توانائی (energy) کے اخراج (release) کا واقعہ ہے۔ یہ صدمہ انسان کے لیے مطلق معنوں میں کوئی برائی نہیں ہے۔ اس کا استعمال اس کو اچھا یا برا بناتا ہے۔

اگر آپ اس صدماتی انرجی (shock energy) کو مثبت رخ پر موڑ سکیں تو ہر صدمہ آپ کے لیے انٹلکچول ڈیولپمنٹ کا ذریعہ بن جائے گا۔ آپ کے سوچنے کی طاقت، آپ کے تجزیہ (analysis) کی طاقت کچھ بڑھ جائے گی۔ آپ کا ذہن غیر تخلیقی ذہن سے بڑھ کر تخلیقی ذہن (creative mind) ہو جائے گا۔ آپ کے ذہن کی ایسی کھڑکیاں کھل جائیں گی، جو اس سے پہلے بند پڑی تھیں۔ آپ کسی بھی وقت اس حقیقت کا تجربہ کرسکتے ہیں۔ مثلاً آپ نے کسی سے ایک بات کہی۔ وہ آدمی آپ کی بات کو سن کر غصہ ہو گیا۔ اس نے آپ کو اس کا سخت جواب دیا۔ اس وقت آپ جوابی غصہ نہ کریں، اور ٹھنڈے طریقے سے مثبت انداز میں غور کریں۔ آپ بہت جلد محسوس کریں گے کہ آپ کی قوت تفکیر بڑھ گئی ہے۔ آپ کے ذہن میں نئے نئے پوائنٹ آرہے ہیں۔ آپ کی بات خود آپ کے لیے زیادہ

قابل فہم بن رہی ہے۔ آپ کے ذہن کی تخلیقیت میں اضافہ ہورہا ہے۔

جب بھی آپ کو کسی بات سے صدمہ پہنچے تو آپ صرف یہ کیجیے کہ آپ چپ ہوجائیے۔ آپ ری ایکشن کے بجائے خاموشی کا طریقہ اختیار کیجیے۔ آپ ایک شخص پر سوچنے کے بجائے اصل ایشو پر سوچنا شروع کردیجیے، اور پھر جلد آپ کو ایسا محسوس ہوگا جیسے آپ کی سوچ کے بند دروازے اچانک کھل گئے ہیں۔

غصہ کا نقصان

اگر تاریخ کے تمام واقعات کو اکھٹا کیا جائے اور دیکھا جائے کہ جو کام بگڑا وہ کس لیے بگڑا، اور جو کام بنا وہ کس لیے بنا۔ اس کا جواب یقینی طور پر یہ ملے گا کہ جو کام بگڑے ان سب کے پیچھے غصہ اور نفرت کا عنصر موجود تھا۔ اس کے مقابلہ میں جو کام بنے ان سب کے پیچھے اعتدال پسندی اور عفو ودرگزر کا عنصر پایا جاتا تھا۔

جب کسی آدمی کو غصہ آتا ہے تو اس کے اندر نفرت اور انتقام کی آگ بھڑک اٹھتی ہے۔ اس کے اندر منفی نفسیات اُبھر آتی ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ آدمی اپنے فطری ذہن کے تحت سوچ نہیں پاتا۔ وہ غیر فطری انداز میں سوچتا ہے اور غیر فطری فیصلہ کرتا ہے۔ اور یہ ایک مسلّم بات ہے کہ فطرت کے راستہ سے ہٹ کر جو کام کیا جائے اس کا ناکام ہونا یقینی ہے۔

اس کے برعکس، جب ایسا ہو کہ آدمی کو غصہ آئے تو وہ اپنے آپ کو سنبھال لے۔ وہ اپنی عقل کی صلاحیت کو معتدل انداز میں استعمال کرے۔ ایسا کرنے کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ آدمی کی سوچ فطرت کے دائرہ میں رہتی ہے۔ وہ اپنے عمل کا جو منصوبہ بناتا ہے وہ فطرت کے اصول کے مطابق ہوتا ہے۔ اس بنا پر فطرت کا پورا نظام اس کی موافقت پر آجاتا ہے۔ اور جس آدمی کو فطرت کے نظام کی موافقت حاصل ہوجائے اس کی کامیابی اُتنی ہی یقینی ہے جتنا کہ رات کے بعد روشن صبح کا آنا۔

غصہ ایک آگ ہے۔ صبر وتحمل اس آگ کو بجھا دینے والا ہے۔ غصہ اگر روکا نہ جائے تو وہ نفرت اور تشدد پیدا کرتا ہے اور نفرت اور تشدد ایک ایسی برائی ہے جس سے زیادہ بڑی برائی شاید اور کوئی نہیں۔ صبر وتحمل کے ذریعہ اعلیٰ انسانی شخصیت بنتی ہے۔ اور بے صبری اور عدم برداشت انسان کو اخلاقی پستی میں گرا دینے والی ہے۔

غصہ منفی ذہن پیدا کرتا ہے اور غصہ دلانے کے باوجود غصہ نہ ہونا مثبت ذہن کی تشکیل کرتا ہے۔ مثبت سوچ اعلیٰ انسانیت کی پہچان ہے، اور منفی سوچ پست انسانیت کی پہچان۔

غصہ کا مثبت پہلو

غصہ (anger) کو عام طور پر ایک بری چیز سمجھا جاتا ہے۔ لیکن خالق نے کوئی بری چیز پیدا نہیں کی۔ غصہ بھی ایک تخلیق ہے۔ اس لیے وہ شرِ محض نہیں ہوسکتا۔ غصہ انسانی فطرت کے اندر جاری ہونے والا ایک عمل ہے۔ غصہ اپنے آپ نہیں آتا۔ غصہ آنے کے لیے ضروری ہے کہ کوئی آدمی آپ کو مشتعل کردے۔ غصہ برین اسٹارمنگ (brainstorming) کا ذریعہ ہے۔

جب کسی آدمی کو غصہ آتا ہے تو اس کے دماغ میں غیر معمولی تعداد میں انرجی خارج (release) ہوتی ہے۔ یہ کسی انسان کے لیے ایک بے حد اہم وقت ہوتا ہے۔ اس وقت آدمی کے لیے دو امکانات ہوتے ہیں۔ وہ اپنی خارج شدہ انرجی کو منفی رخ میں ڈائیورٹ (divert) کرے۔ یا وہ اس کو مثبت رخ میں ڈائیورٹ کرے۔

آدمی اگر اپنی انرجی کو منفی رخ میں ڈائیورٹ کرے گا تو اس سے اس کے اندر ٹینشن، نفرت، انتقام حتیٰ کہ تشدد کا مزاج پیدا ہوجائے گا۔ یہ چیزیں بلاشبہ انسان کی ہلاکت کا ذریعہ ہیں۔ اس کے برعکس، اگر انسان اپنی انرجی کو مثبت رخ میں ڈائیورٹ کرے تو اس سے اُس کے اندر ذہنی ارتقا، فکری تخلیقیت، تعمیری مزاج اور مثبت سوچ پیدا ہوگی۔ اور یہ تمام چیزیں انسان کی شخصیت کی اعلیٰ تعمیر کے لیے نہایت ضروری ہیں۔

غصہ کے وقت پیدا ہونے والی انرجی کو مثبت رخ میں ڈائیورٹ کرنے کے لیے کسی مزید کوشش کی ضرورت نہیں۔ یہ عمل فطرت کے قانون کے تحت آدمی کے اندر اپنے آپ ظہور میں آتا ہے۔ شرط صرف ایک ہے۔ اور وہ یہ کہ آدمی غصہ کے وقت چپ ہوجائے۔

اگر آدمی اس وقت اِس ذہنی انضباط (intellectual discipline) کا ثبوت دے تو اس کی فطرت خود عمل کرے گی اور غصہ کے وقت خارج ہونے والی انرجی کو اپنے آپ مثبت رخ پر موڑ دے گی۔

اینگر انرجی

غصہ کو عام طور پر ایک منفی ظاہرہ سمجھا جاتا ہے۔ لیکن غصہ کا ایک مثبت پہلو ہے۔ آدمی اگر غصہ کے وقت بے صبر ہوجائے تو غصہ اس کے لیے نقصان کی چیز بن جاتا ہے۔ لیکن آدمی اگر غصہ کے وقت خود کو کنٹرول کرے تو غصہ اس کے لیے ایک مثبت عمل بن جائے گا۔ غصہ اجتماعی زندگی کا ایک ظاہرہ ہے۔ آدمی اگر تنہائی کی زندگی گزار رہا ہو تو اس کو غصہ نہیں آئے گا۔ غصہ اس وقت آتا ہے جب کہ آدمی دوسروں کے درمیان ہو، اور دوسروں کی کوئی بات اس کو پسند نہ آئے۔ اس وقت اس کے اندر غصہ بھڑکتا ہے۔ لیکن غصہ اپنی ذات میں کوئی برائی نہیں۔ غصہ اس وقت بری چیز بن جاتا ہے، جب کہ آدمی غصہ کے وقت ردعمل کا شکار ہوجائے۔ وہ غصہ کو مینج کرنے میں ناکام رہے۔

غصہ ایک فطری ظاہرہ ہے۔ غصہ کسی آدمی کے لیے ایک شاکنگ تجربہ ہوتا ہے۔ جب کسی آدمی کو غصہ آتا ہے تو فطری طور پر اس کے اندر سے بڑی مقدار میں اینگر انرجی (anger energy) خارج ہوتی ہے۔ غلط یہ ہے کہ آدمی اپنی اینگر انرجی کو مینج نہ کرسکے۔ لیکن اگر آدمی اپنی اینگر انرجی کو مینج کرلے تو وہ اس کی فکری طاقت میں اضافہ کا ذریعہ بن جائے گی۔

جب کسی بات پر آدمی کو غصہ آتا ہے تو اس کے اندر سوچنے کا عمل (thinking process) بہت تیز ہوجاتا ہے۔ یہ ظاہرہ اس کی فکری طاقت کو بہت بڑھا دیتا ہے۔ وہ زیادہ گہرائی کے ساتھ سوچنے کے قابل ہوجاتا ہے۔ اس کی قوت فیصلہ بہت بڑھ جاتی ہے۔ اس کی کارکردگی کی طاقت میں بہت اضافہ ہوجاتا ہے۔ اس کے اندر چھپی ہوئی توانائی شدت کے ساتھ جاگ اٹھتی ہے۔ اس کے دماغ کی بند کھڑکیاں کھل جاتی ہیں۔ وہ زیادہ گہرائی کے ساتھ سوچنے کے قابل ہوجاتا ہے۔ جب غصہ آئے تو صرف یہ کیجیے کہ چپ ہوکر سوچنا شروع کردیجیے، اور اس کے بعد فطری طور پر ایسا ہوگا کہ غصہ کے وقت ریلیز ہونے والی اینگر انرجی مثبت انرجی بن جائے گی۔

مشتعل نہ ہونے کا کرشمہ

کسی بات کا جواب اگر مشتعل ہو کر دیا جائے تو اس کا نتیجہ منفی صورت میں نکلتا ہے۔ اور اگر آدمی سخت بات سنے مگر وہ اپنے اعتدال کو نہ کھوئے، بلکہ اشتعال کے بغیر جواب دے تو نتیجہ معجزاتی طور پر موافق صورت میں نکلے گا۔ اس کا سبب یہ ہے کہ اشتعال انگیز جواب سے سننے والے کی انا بھڑک اٹھتی ہے۔ وہ غیر ضروری طور پر دشمن بن جاتا ہے۔ اس کے برعکس، اگر معتدل انداز میں جواب دیا جائے تو سننے والے کا ضمیر جاگ اٹھتا ہے۔ اور گفتگو فطری انداز میں ہونے لگتی ہے۔ پیدائشی طور پر ہر آدمی آپ کا دوست ہے۔ اس کے بعد آپ کا رویہ یا تو اس کی دوستی کو باقی رکھتا ہے یا اس کو دشمن بنا دیتا ہے۔ اس نوعیت کی ایک تاریخی مثال یہاں نقل کی جاتی ہے۔

تیرھویں صدی عیسوی میں تاتاری قبائل (Mongols) نے عباسی سلطنت پر حملہ کر دیا۔ انھوں نے سمرقند سے لے کر حلب تک مسلم سلطنت پر قبضہ کرلیا۔ اس کے کچھ سال بعد

یہ معجزاتی واقعہ ہوا کہ تاتاری قبائل کی اکثریت نے اسلام قبول کرلیا۔ اسلام کے دشمن اسلام کے خادم بن گئے۔

اس تاریخی واقعہ پر پروفیسر ٹی ڈبلیو آرنلڈ (1864-1930ء) نے ریسرچ کی ہے۔ ان کی کتاب دی پریچنگ آف اسلام (The Preaching of Islam) کے باب Spread of Islam among the Mongols کے تحت اس کی تفصیل دیکھی جاسکتی ہے۔

اس زمانے میں تاتاری لوگ مسلمانوں کو سخت حقیر سمجھنے لگے تھے۔ اس دور کا ایک واقعہ یہ ہے کہ ایک دن تاتاری شہزادہ تغلق تیمور خاں نے ایک ایرانی مسلمان شیخ جمال الدین کو دیکھا۔ اس نے نفرت کے ساتھ کہا کہ تم اچھے یا میرا کتا اچھا۔ شیخ جمال الدین نے اس کو سن کر معتدل انداز میں جواب دیا: اگر ہمارے پاس سچائی (true faith) نہ ہوتی تو ہم کتے سے بھی بدتر ہوتے۔ یہ جواب سن کر شہزادہ کا غصہ ختم ہو گیا۔ اس نے شیخ کو الگ سے بلا کر بات کی کہ مجھے بتاؤ یہ ایمان کیا چیز ہے۔ اس طرح شیخ کو موقع مل گیا کہ وہ شہزادے سے اسلام کے بارے میں تفصیل سے بات کرسکیں۔ پروفیسر آرنلڈ نے اس واقعہ کو اپنی کتاب میں ان الفاظ میں نقل کیا ہے:

> Tūqluq Timūr Khān (1347-1363), is said to have owed his conversion to a holy man from Bukhārā, by the name Shaykh Jamāl al-Dīn. This Shaykh, in company with a number of travellers, had unwittingly trespassed on the game-preserves of the prince, who ordered them to be bound hand and foot and brought before him. In reply to his angry question, how they had dared interfere with his hunting, the Shaykh pleaded that they were strangers and were quite unaware that they were trespassing on

forbidden ground. Learning that they were Persians, the prince said that a dog was worth more than a Persian. "Yes" replied the Shaykh, "if we had not the true faith, we should indeed be worse than the dogs." Struck with his reply, the Khan ordered this bold Persian to be brought before him on his return from hunting, and taking him aside asked him to explain what he meant by these words and what was "faith". The Shaykh then set before him the doctrines of Islam with such fervour and zeal that the heart of the Khān that before had been hard as a stone was melted like wax, and so terrible a picture did the holy man draw of the state of unbelief, that the prince was convinced of the blindness of his own errors, but said, "Were I now to make profession of the faith of Islam, I should not be able to lead my subjects into the true path. But bear with me a little and when I have entered into the possession of the kingdom of my forefathers, come to me again."

(*The Preaching of Islam*, London, 1913, p. 235)

شیخ جمال الدین سے ملاقات کے بعد کچھ اور واقعات پیش آئے یہاں تک کہ تغلق تیمور خاں نے اسلام قبول کرلیا۔ اس کے بعد اس نے حکمت کے ساتھ لوگوں کو اسلام کے بارے میں بتایا۔ یہاں تک کہ تاتاریوں کی اکثریت اسلام میں داخل ہوگئی۔ شیخ جمال الدین کا مشتعل جواب تاریخ کو دوسرا رخ دے دیتا۔ لیکن ان کے معتدل جواب نے تاریخ کو صحیح رخ پر ڈال دیا۔

نزاع کا معاملہ

یہ دیکھا گیا ہے کہ جب بھی دو یا زیادہ آدمیوں کے درمیان کوئی نزاع ہو، تو معمولی بات پر وہ بھڑک اٹھتا ہے، اور اکثر ایسا ہوتا ہے کہ آخری حد تک پہنچنے سے پہلے وہ ختم نہیں ہوتا۔

یہ ایک ایسی نادانی ہے، جو پوری تاریخ میں ایک ہی انداز پر جاری رہی ہے، اور آج بھی جاری ہے۔ تجربہ بتاتا ہے کہ جب تک نزاع کی صورت پیدا نہ ہو، فریقین نارمل انسان نظر آتے ہیں۔ لیکن اختلاف کی صورت پیدا ہونے کے بعد اچانک دونوں فریق غیر نارمل بن جاتے ہیں۔ پھر وہ اس کے لیے تیار نہیں ہوتے کہ نارمل انداز میں سوچیں، اور پر امن بات چیت سے نزاع کو ختم کرلیں۔

اس کا سبب یہ ہے کہ نزاع سے پہلے معاملہ عقل کے درمیان ہوتا ہے، لیکن نزاع شروع ہونے کے بعد عقل پس پشت چلی جاتی ہے، اور دونوں فریق ایگو کے زیرِ اثر آجاتے ہیں۔ پہلے اگر وہ نتیجہ کو سامنے رکھ کر سوچتے تھے، تو اب وہ جذبات کے زیر اثر سوچنے لگتے ہیں۔ اس معاملے میں بہترین تدبیر یہ ہے کہ معاملے کو عقل کی حد میں رکھا جائے، اس کو جذبات تک پہنچنے نہ دیا جائے۔ اس معاملے میں فارمولا یہ ہے:

When one's ego is touched, it turns into super ego, and the result is breakdown.

اگر فریقین ٹھنڈے ذہن کے ساتھ نتیجہ کو لے کر سوچیں تو ان کو سمجھ میں آجائے گا کہ نزاع جاری رکھنے کا انجام دونوں کے حق میں برا نکلے گا۔ دونوں کے حق میں صرف نقصان آئے گا۔ دونوں میں سے کسی کو بھی کوئی فائدہ ملنے والا نہیں۔ معاملے پر عقلی انداز میں سوچنا، دونوں کو ایک ہی انجام تک پہنچاتا ہے۔ وہ یہ کہ نزاع کا جاری رکھنا، کسی کے حق میں اچھا نہیں۔ جب کہ نزاع کو پہلی فرصت میں ختم کرلینا، دونوں کے لیے مفید ہے۔ نزاع کا واحد حل صرف یہ ہے کہ نزاع کو پہلی فرصت میں بلاشرط ختم کردیا جائے۔ اس حکمت کو ملحوظ رکھا جائے تو انسان بہت سے نقصانات سے بچ جائے گا۔ یہ نزاع کے مسئلے کا سب سے زیادہ آسان حل ہے۔

اپنی سوچ درست کیجیے

ایک مغربی سفر میں میری ملاقات ایک مسیحی خاتون سے ہوئی۔ انھوں نے کہا کہ میرا شوہر سخت (stubborn) ہے۔ مجھے اس کے لیے کیا کرنا چاہیے۔ میں نے کہا کہ یہ کوئی حقیقی مسئلہ نہیں، یہ صرف سوچ کا مسئلہ ہے۔ آپ اپنی سوچ درست کر لیجیے اور پھر یہ مسئلہ اپنے آپ ختم ہوجائے گا۔ آپ یہ نہ سوچئے کہ آپ کا شوہر سخت ہے۔ سخت ایک منفی لفظ ہے۔ منفی الفاظ میں آپ کسی بات کو سوچیں تو اس کے بارے میں معتدل انداز میں سوچنا ممکن نہیں ہوتا۔ اس کے بجائے آپ کو اِس بارے میں مثبت الفاظ استعمال کرنا چاہیے، تا کہ آپ جو کچھ سوچیں، وہ مثبت ذہن کے تحت سوچیں، نہ کہ منفی ذہن کے تحت۔

میں نے کہا کہ آپ یہ کہیے کہ آپ کے شوہر کے اندر عزم (determination) کا مادّہ ہے۔ وہ کسی چیز کے بارے میں سوچتے ہیں تو اَٹل انداز میں سوچتے ہیں۔ یہ ایک مردانہ صفت ہے اور وہ بلا شبہ ایک اچھی صفت ہے۔ اگر یہ صفت نہ ہوتو آدمی ہمت کے ساتھ زندگی کے چیلنج کا سامنا نہیں کرسکتا۔ اور جو آدمی چیلنج کا سامنا نہ کرسکے، وہ کبھی زندگی میں کامیاب بھی نہیں ہوسکتا۔

مذکورہ خاتون کئی زبان جانتی تھیں اور وہ پروفیشن کے اعتبار سے ترجمان (interpreter) تھیں۔ میں نے کہا کہ آپ کا پروفیشن چیلنجنگ پروفیشن نہیں ہے۔ اِس پروفیشن میں نرم ہونا ایک اچھی بات ہے۔ آپ کا نرمی کا مزاج آپ کے پروفیشن کے عین مطابق ہے، مگر آپ کے شوہر ایک ملٹی نیشنل کمپنی میں منیجر ہیں۔ اس کام میں ان کو ہر وقت چیلنج کا سامنا رہتا ہے۔ خدا نے آپ کو نرم بنایا، تا کہ آپ اپنے پروفیشن کو کامیابی کے ساتھ کرسکیں۔ اِس کے برعکس، خدا نے آپ کے شوہر کو سختی کا مزاج دیا جو کہ اُن کے پروفیشن کے اعتبار سے ضروری تھا۔ آپ کو چاہیے کہ اِس تقسیم پر آپ شکر کریں، نہ کہ شکایت۔

معاملات میں مثبت رخ پر سوچنا آدمی کو مثبت نتیجے تک پہنچاتا ہے، اور منفی رخ پر سوچنا اُس کو منفی نتیجے تک پہنچاتا ہے۔ اِس اصول کا تعلق جس طرح زندگی کے دوسرے معاملات سے ہے، اِسی طرح اس کا تعلق ازدواجی زندگی سے بھی ہے۔ اِس اصول کو جاننا بلاشبہ اِس دنیا میں کامیاب زندگی کی کلید ہے۔

ایک واقعہ

ستمبر 1992ء میں میرا ایک سفر لندن کے لیے ہوا۔ اس سفر میں لندن میں میرا قیام پروفیسر انیس قاری کی رہائش گاہ پر تھا۔ یہاں 26 ستمبر کو جناب جاوید حسن صاحب (Tel.5581523) سے ملاقات ہوئی۔ انھوں نے بتایا کہ میں ایک یہودی فرم میں کام کرتا ہوں۔ وہاں ایک کٹر قسم کا یہودی تھا۔ میں جب اس کے پاس سے گزرتا تو ہمیشہ اس کو گڈ مارننگ کہتا۔ مگر وہ مجھ کو جواب نہ دیتا، بلکہ منہ پھیر لیتا۔ آخر کار ایک روز اس نے کہہ دیا کہ تم کیوں مجھ کو گڈ مارننگ کہتے ہو۔ تم جانتے ہو کہ میں تم سے نفرت کرتا ہوں:

"Why you say good morning to me. You know, I hate you".

اس کے جواب میں جاوید صاحب نے کہا کہ آپ کا شکریہ۔ مگر میں تو آپ سے نفرت نہیں کرتا:

But I do not hate you

یہ جواب سن کر یہودی تعجب میں پڑ گیا۔ اس نے کہا میں تو سمجھتا تھا کہ سارے مسلمان یہودیوں سے نفرت کرتے ہیں اور تم ان سے الگ نہیں ہو، کیوں کہ میں ایک یہودی ہوں۔ اس دن کی گفتگو کے بعد وہ کافی نرم پڑ گیا۔ یہاں تک کہ چند دن کے بعد وہ نارمل ہو گیا۔ اس کا حال یہ ہو گیا کہ جاوید صاحب کو دیکھتا تو دور ہی سے ہیلو ہیلو کرنے لگتا۔ لوگوں کو تعجب

تھا کہ اتنا کٹر یہودی ایک مسلمان سے اتنا قریب کیسے ہوگیا۔ اس کا جواب ایک لفظ میں یہ ہے کہ: یک طرفہ حسن اخلاق سے۔

ایک لفظ کا فرق

ایک صاحب جن کی تعلیم ایک مدرسہ میں ہوئی ہے۔ 12 دسمبر 2017ء کو ان سے ملاقات ہوئی۔ انھوں نے کہا کہ اس سے پہلے 2005ء میں میں آپ سے ملا تھا۔ اس وقت میں نے کہا تھا کہ میرے اندر احساسِ کمتری بہت زیادہ ہے۔ اس کا کوئی حل بتائیے۔ میں نے کہا کہ آپ صرف ایک لفظ بدل دیجیے۔ ابھی تک آپ احساسِ کمتری کا لفظ بولتے ہیں۔ آج سے آپ احساسِ غلطی کا لفظ بولنا شروع کر دیجیے۔ اس کے بعد، ان شاء اللہ، آپ کا سارا معاملہ درست ہوجائے گا۔

آج کی ملاقات میں انھوں نے بتایا کہ یہ بات آپ نے ایک ڈائری میں لکھی اور وہ ڈائری مجھ کو دے دی۔ اسی وقت سے میں نے اس نصیحت کو پکڑ لیا ہے۔ اب میں یہ کرتا ہوں کہ ہمیشہ اپنی غلطی کو دریافت کرتا ہوں، اور اس کی اصلاح کی کوشش کرتا ہوں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ میرے سارے معاملات درست ہو گئے۔ گھر کے معاملات بھی، پڑوسیوں کے معاملات بھی، اور مسجد اور مدرسے کے معاملات بھی۔ پہلے میں برابر ٹینشن میں رہتا تھا، اب مجھے کوئی ٹینشن نہیں۔ کسی سے کوئی شکایت نہیں۔ کسی سے کوئی جھگڑا نہیں۔ اب میں یہ کرتا ہوں کہ کوئی مسئلہ پیش آتا ہے تو میں خود ہی سوچ کر اس کو درست کرلیتا ہوں۔ اب سب لوگ مجھ سے خوش رہتے ہیں۔ جب کہ پہلے ہر شخص کو مجھ سے شکایت ہوتی تھی۔

یہ کرشمہ صرف ایک پُر حکمت بات کا تھا۔ وہ یہ کہ اس سے پہلے وہ غلط تقابل (wrong comparison) کا شکار تھے۔ اب انھوں نے احساس کمتری کے جملے کو بدل

کر احساسِ غلطی بنالیا۔ پہلے وہ دوسروں کے خلاف سوچا کرتے تھے، اب وہ اپنی اصلاح آپ کے انداز میں سوچنے لگے۔ بظاہر یہ ایک لفظ کا فرق تھا، لیکن یہ لفظ اتنا زیادہ پرحکمت تھا کہ اس نے ان کی پوری زندگی کو بدل دیا۔ ان کو منفی شخصیت سے نکال کر مثبت شخصیت بنا دیا۔

منفی پہلو میں مثبت پہلو

1947ء سے پہلے ہندستان میں برٹش راج تھا۔ اُس زمانہ میں برٹش حکمرانوں نے ہندستان میں انگریزی زبان کو سرکاری زبان بنایا اور پوری طاقت سے انگریزی زبان کو ہندستان میں رائج کیا۔ یہاں تک کہ انگریزی زبان کے اعتبار سے امریکا اور برطانیہ کے بعد ہندستان تیسرا سب سے بڑا ملک بن گیا۔

برٹش حکمرانوں نے اپنے خیال کے مطابق، ہندستان میں انگریزی زبان کو اس لیے رائج کیا تھا کہ وہ اس ملک پر ہمیشہ کے لیے اپنا غلبہ قائم رکھیں۔ برٹش حکومت نے انگریزی زبان کو صرف اپنے مفاد کے لیے یہاں جاری کیا تھا۔ مگر آج یہی انگریزی زبان ہمارے ملک کے لیے سب سے بڑا سرمایہ بن گئی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ انفارمیشن ٹکنالوجی تمام تر انگریزی زبان پر قائم ہے اور انگریزی زبان میں ہندستان دوسرے ملکوں کے مقابلہ میں بہت آگے ہے۔ چین اور روس دونوں بہت بڑے ملک ہیں۔ مگر دونوں ہندستان سے کہہ رہے ہیں کہ ہم کو تمہاری انگریزی کی ضرورت ہے، ہمیں اپنی انگریزی اکسپورٹ کرو۔

اس مثال سے ایک اہم حقیقت معلوم ہوتی ہے۔ وہ یہ کہ آپ کا حریف خواہ اپنے ذاتی مفاد کے لیے کوئی عمل کرے، مگر عین ممکن ہے کہ مستقبل کے لحاظ سے وہ تمام تر آپ کے فائدے میں ہو۔ حتٰی کہ حریف اگر آپ کے خلاف کوئی سازشی منصوبہ بنائے تب بھی یہ امکان باقی رہے گا کہ اس کی سازش آپ کے لیے ترقی کا ایک زینہ بن جائے۔ حریف کی بنائی ہوئی دنیا آخر کار آپ کے حصہ میں آجائے۔

اس دنیا میں ہر منفی واقعہ میں مثبت پہلو موجود رہتا ہے۔ اگر آپ اس مثبت پہلو کو دریافت کرسکیں تو آپ کو کسی کے خلاف شکایت کرنے کی ضرورت نہ ہوگی۔ مثبت پہلو کی دریافت آپ کو اپنی تعمیر میں اتنا زیادہ مشغول کردے گی کہ آپ کے پاس دوسروں کے خلاف لکھنے اور بولنے کے لیے وقت ہی نہ رہے۔

مثبت اثر

مشہور نحوی عمرو بن عثمان سیبویہ (وفات 180ھ) ایران میں پیدا ہوا اور بصرہ میں پرورش پائی۔ اس کی نوجوانی کا واقعہ ہے جب کہ وہ حدیث وفقہ کا طالب علم تھا۔ ایک دن وہ محدث حماد بن سلمہ (وفات 167ھ) کی مجلس میں تھا۔ انھوں نے ایک حدیث کا املا کراتے ہوئے کہا: لَیسَ مِنْ أَصْحَابِي إِلَّا مَنْ شِئْتُ لأَخَذْتُ عَلَيهِ لَيسَ أَبَا الدَّرْدَاءِ۔ سیبویہ یہ سن کر بول اٹھا: لَيسَ أَبُو الدَّرْدَاءِ۔ اس پر حماد نے چلا کر کہا: سیبویہ تم غلطی پر ہو۔ یہ (عربی گریمر کے لحاظ سے) استثناء ہے (اس لیے "ابو" کے بجائے "ابا" ہوگا)۔ سیبویہ کو اپنی غلطی کا احساس ہوا۔ اس نے اپنے جی میں کہا کہ میری نحو کمزور ہے اور مجھے اس میں مہارت پیدا کرنی چاہیے۔ اب اس نے نحو سیکھنا شروع کردیا (طبقات النحویین واللغویین، صفحہ 66)۔

وہ بصرہ وکوفہ کے نحوی علماء خلیل، یونس اور عیسیٰ بن عمر کی مجلسوں میں جانے لگا۔ اس نے اس فن میں اتنی محنت کی کہ بالآخر وہ اس کا امام بن گیا۔ عربی نحو وادب کے شاذ مسائل میں اس کا کوئی ثانی نہ رہا۔ اس کے بعد اس نے نحو پر ایک ایسی کتاب لکھی جو اپنی اہمیت اور بلندی کی وجہ سے "الکتاب" کے نام سے مشہور ہے۔ اس فن کے علماء کا کہنا ہے کہ فن نحو پر اس کے برابر کی کوئی کتاب آج تک لکھی نہ جاسکی — جس شخص کی نحو کمزور تھی، وہ تاریخ کا سب سے بڑا نحوی بن گیا۔

ہر شخص کی زندگی میں ایسے واقعات آتے ہیں جب کہ اسے ٹھیس لگتی ہے۔ جب اس کو

دوسروں کی طرف سے بے اعترافی کی ذلت اٹھانی پڑتی ہے۔ جب وہ محسوس کرتا ہے کہ وہ لوگوں کے درمیان بے جگہ ہوگیا ہے۔

ایسے مواقع پر اثر لینے کی دو صورتیں ہیں۔ ایک یہ کہ آدمی ان تجربات کے بعد بے ہمتی اوراحساس کمتری میں مبتلا ہو جائے۔ ایسے آدمی نے گویا اپنے آپ کو مارلیا۔ دوسرا شخص وہ ہے جس کے لیے ایسا تجربہ ایک مہمیز بن جائے۔ ایسے آدمی کے لیے اس کا تجربہ اس کی صلاحیتوں کو جگانے کا باعث بن جاتا ہے۔ وہ ازسر نو محنت اور عمل کے رخ پر چل پڑتا ہے، یہاں تک کہ ماضی کا ناکام انسان مستقبل کا کامیاب انسان بن جاتا ہے۔ مثبت تاثر آدمی کو کامیابی کی طرف لے جاتا ہے اور منفی تاثر ناکامی اور بربادی کی طرف۔

'انا' کی دیوار

یوپی (انڈیا) کے ایک شہر کا واقعہ ہے۔ یہاں ایک مسلم عالم نے ایک مدرسہ بنایا۔ اِس کے بعد وہاں حکومت کی طرف سے ایک سڑک کی تعمیر کی گئی۔ یہ سڑک مدرسے کی عمارت کے پاس سے گزر رہی تھی۔ یہاں مدرسے کی ایک دیوار تھی جو سڑک کی تعمیر میں رکاوٹ بن رہی تھی۔ مدرسے کے لوگ اِس دیوار کو ہٹانے کے لیے تیار نہیں تھے۔ اُن کا کہنا تھا کہ یہ پختہ دیوار ہے، ہم اِس کو کیسے ہٹا سکتے ہیں۔ آخر کار یہ معاملہ بڑھ کر نزاع تک پہنچ گیا۔

ایک دوسرے مدرسے کے ذمے دار جو الرسالہ مشن سے وابستہ ہیں، اُن کو معلوم ہوا تو وہ اُس متنازعہ مقام پر گئے۔ انھوں نے مدرسے کے ذمے داروں سے کہا کہ یہ نہ پختہ دیوار ہے اور نہ غیر پختہ دیوار۔ یہ صرف انا کی دیوار ہے۔ اِس کے بعد مدرسے والے اِس دیوار کو ہٹانے پر راضی ہو گئے اور سڑک اپنے نقشے کے مطابق، تعمیر کردی گئی۔ اِس واقعے کے بعد اہلِ مدرسہ اور حکومت کے ذمہ داروں کے درمیان اچھے تعلقات قائم ہو گئے۔ اِس کا مزید فائدہ یہ ہوا کہ وہاں اسلامی دعوت کی راہ ہموار ہوگئی۔

اکثر حالات میں یہ ہوتا ہے کہ جس چیز کو لوگ رکاوٹ کہتے ہیں، وہ حقیقی رکاوٹ نہیں ہوتی، بلکہ وہ صرف ضد اورانا کی رکاوٹ ہوتی ہے جو بڑھتے بڑھتے ایک سنگین مسئلہ بن جاتی ہے۔ اِس طرح کے مسائل کے موقع پر اگر دانش مندی سے کام لیا جائے تو مسئلہ اِس طرح ختم ہوجائے گا جیسے کہ وہ تھا ہی نہیں۔ ہمیشہ یہی ہوتا ہے کہ مسئلہ صرف ایک ذہنی مسئلہ ہوتا ہے، وہ کوئی حقیقی مسئلہ نہیں ہوتا۔

ہر مسئلہ ابتداءً ایک چھوٹا مسئلہ ہوتا ہے۔ یہ صرف لوگوں کا غیر دانش مندانہ رویہ ہے جو ایک چھوٹے مسئلے کو بڑا مسئلہ بنا دیتا ہے۔ اِس طرح یہ ہوتا ہے کہ اصل مسئلہ بدستور باقی رہتا ہے اور نئے زیادہ پیچیدہ مسئلے پیدا ہوجاتے ہیں۔ دانش مندی یہ ہے کہ مسئلے کو پہلے ہی مرحلے میں ختم کردیا جائے۔ مسئلے کا بڑھنا کسی بھی حال میں مفید نہیں، خواہ وہ فرد کا معاملہ ہو یا جماعت کا معاملہ۔

منفی تأثر، مثبت تأثر

ایک صاحب نے ایم بی اے (ماسٹر آف بزنس ایڈمنسٹریشن) کا کورس کیا۔ اِس کے بعد اُن کو دہلی میں ایک ملٹی نیشنل کمپنی میں اچھی سروس مل گئی۔ انھوں نے اِس سروس کی بنیاد پر ہاؤس لون لے کر اپنا ایک گھر بنالیا۔ اِسی طرح انھوں نے کار لون لے کر اپنے لیے ایک کار حاصل کرلی۔ بظاہر اُن کے معاملات درست تھے۔ ایک عرصے کے بعد وہ مجھ سے ملے۔ وہ اُس وقت غصے میں تھے۔ انھوں نے بتایا کہ کمپنی والوں نے میرے ساتھ ایک بے انصافی کی ہے۔ انھوں نے میرے ایک جونیئر کا پروموشن کردیا۔ میں اس کے مقابلے میں سینئر تھا، مگر میرا پروموشن نہیں ہوا۔ میں اِس کو برداشت نہیں کرسکتا۔ میں نے کہا کہ اِسی کمپنی کی ملازمت کی وجہ سے شہر میں آپ کا گھر ہوگیا اور آپ کو کار مل گئی۔ اِس کا آپ نے کبھی اعتراف نہیں کیا، اور آپ کا پروموشن نہیں ہوا تو آپ اِس پر غصہ ہو رہے ہیں۔

یہی عام طور پر تمام عورتوں اور مردوں کا مزاج ہوتا ہے۔ وہ اپنے موافق باتوں کا چرچا نہیں

کرتے، لیکن اُن کے مخالف کوئی بات ہوجائے، تو وہ اس کا چرچا خوب کرتے ہیں۔ یہ مزاج انسانی شخصیت کے لیے قاتل ہے۔ ہر انسان کو بہت زیادہ اِس مزاج سے بچنا چاہیے۔

انسان کا مزاج یہ ہے کہ اگر سو میں ننانوے مثبت باتیں ہوں، تو وہ اس کی شخصیت کا حصہ نہیں بنیں گی، لیکن اگر ایک منفی بات ہوتو وہی اس کی شخصیت کا حصہ بن جائے گی۔ پانی کے گلاس میں اگر آپ پتھر کا ایک ٹکڑا ڈالیں تو وہ صرف ایک ٹکڑا بن کر پانی میں رہے گا، لیکن اگر آپ اس کے اندر رنگ ڈال دیں تو رنگ پورے پانی میں پھیل جائے گا۔ یہی معاملہ انسان کا ہے۔ انسان جب کسی واقعے سے منفی تاثر لے گا تو وہ تاثر اس کی پوری شخصیت کا حصہ بن جائے گا، لیکن اُس کے ساتھ کوئی مثبت واقعہ پیش آئے تو وہ اس کی شخصیت کا صرف ایک محدود جز بن کر پڑا رہے گا۔ یہ ایک نفسیاتی حقیقت ہے کہ منفی تاثر فوراً انسان کے فعّال حافظے کا جز بن جاتا ہے۔ اس کے برعکس، مثبت تاثر بہت جلد فراموشی کے خانے میں چلا جاتا ہے۔ آدمی کو چاہیے کہ جب کوئی منفی تاثر پیش آئے تو فوراً وہ اس کو بھلا دے، ورنہ اس کو منفی شخصیت کی صورت میں اس کی بھاری قیمت ادا کرنی پڑے گی۔

احتجاج کوئی پالیسی نہیں

احتجاج (protest) کوئی کام نہیں ہے۔ احتجاج صرف اس بات کا ثبوت ہے کہ آدمی کے پاس مثبت (positive) معنی میں کرنے کا کوئی کام نہیں ہے۔ وہ صرف دوسروں کے خلاف بولنا جانتا ہے۔ اپنے امکانات کو اویل کرنے کا آرٹ اس کو نہیں معلوم۔ وہ احتجاج کرنا تو جانتا ہے، لیکن ری پلاننگ (replanning) کا آرٹ اس کو نہیں معلوم۔

خالق نے انسان کو نہایت اعلیٰ صلاحیت دے کر پیدا کیا ہے۔ انسان ہر جنگل میں اپنا راستہ نکال سکتا ہے۔ انسان ہر مشکل میں نئی تدبیر دریافت کرسکتا ہے۔ انسان ہر ناکامی میں کامیابی کا راز دریافت کرسکتا ہے۔ کوئی بند گلی انسان کا راستہ روکنے والی نہیں۔

جہاں ایک راستہ بند ہوجائے، وہاں دوسرا راستہ موجود ہوتا ہے۔ حتیٰ کہ جب سامنے کا راستہ بند ہو، وہاں انسان یہ کرسکتا ہے کہ وہ یوٹرن (U-turn) لے، اور دوسرا راستہ اپنے سفر کے لیے تلاش کرلے۔

میں نے ایک مرتبہ ایک قصہ پڑھا تھا کہ ایک دکان دار کی دکان میں آگ لگ گئی، اس کا تمام سامان جل گیا۔ اس واقعے سے وہ مایوس نہیں ہوا، بلکہ اس نے اپنے کام کی ری پلاننگ کی۔ اس نے اپنی دکان کو دوبارہ درست کیا۔ اس نے جلے ہوئے سامان کو ردی میں ڈال دیا، اور تمام سامان نیا خرید کر اپنی دکان میں سجایا۔ اس کے بعد اس نے اپنی دکان پر ایک بورڈ لگا دیا، اس میں لکھا تھا: اس دکان میں آپ کو ہر سامان فریش ملے گا۔

اس بورڈ کو دیکھ کر لوگوں کے اندر شوق پیدا ہوا۔ وہ اس دکان میں بڑی تعداد میں آنے لگے۔ اس دکان کی بکری بہت بڑھ گئی۔ یہاں تک کہ وہ دکان پہلے سے بھی بہت زیادہ کامیابی کے ساتھ چلنے لگی۔ اس دنیا میں مسائل بھی ہیں، اور مواقع بھی۔ آدمی کو چاہیے کہ وہ مواقع کو اویل کرنا سیکھے، نہ کہ مسائل پر احتجاج کرنا۔

مثبت لٹریچر کی ضرورت

ایک مدرسہ کے طالب علم نے کراچی بک فیر 2019ء میں سی پی ایس انٹرنیشنل (پاکستان) کے اسٹال پر آ کر اپنا تاثر ان الفاظ میں نقل کیا ہے: چار سال قبل میں عورتوں کے بارے میں عرب کے دورِ جاہلیت سے بھی بدتر سوچتا تھا۔ میرے بڑے بھائی نے مولانا وحید الدین خاں صاحب کی کتابوں کے مطالعہ پر زور دیا۔ اس وقت میری ذہنی حالت بدتر ہو رہی تھی، میں سوچ سوچ کر اتنا پریشان ہو گیا کہ میں نے خودکشی کرنے کا ارادہ کرلیا۔ ایک دن میں بڑے بھائی کی لائبریری میں گیا، کتابیں دیکھتے ہوئے میری نظر مولانا وحید الدین خاں کی کتاب ”انسان کی منزل“ پر پڑی۔ میں نے اس کتاب کا مطالعہ

کیا۔ اس کتاب کا مطالعہ کرنے کے بعد ایسا محسوس ہوا کہ جیسے میرے ذہن سے بوجھ اتر گیا ہو۔ اس کے بعد مجھے مولانا صاحب کی مزید کتابیں پڑھنے کا شوق پیدا ہوا۔ اس وقت کسی نے مجھے عورت کے بارے میں اسلام کا غلط تصور بتایا کہ اسلام عورتوں کو کمتر درجہ دیتا ہے۔ اب میں عورتوں کے بارے میں اسلام سے کچھ حوالہ چاہتا تھا۔ میں چاہتا تھا کہ انھیں قید کرنے کی اسلام میں مجھے اجازت مل جائے گی۔ میں نے اسی نیت سے مطالعہ شروع کیا۔ لیکن جب میں نے کتاب پڑھی، تو انسانوں کے درمیان مجھے اپنا وجود جنگلی محسوس ہونے لگا۔ پہلے میں سوچتا تھا کہ مرد افضل ہے عورت سے۔ مطالعہ کرنے کے بعد میری سوچ کا پیمانہ بدل گیا۔ میں نے یہ کتابیں پڑھیں— خاتونِ اسلام، عورت معمارِ انسانیت، وغیرہ۔ ان کتابوں کا مطالعہ کرنے کے بعد میں نے دوسروں کا احتساب کرنے کے بجائے خود کا احتساب شروع کیا۔ گھر میں عورتوں کے ساتھ میں نے غلط رویہ ختم کردیا۔ میرے اندر بدلاؤ آیا تو میں نے اس نظر سے دیکھنا شروع کیا کہ عورت کا بھی درجہ ہے، وہ بھی اللہ کی مخلوق ہے، جیسے کہ مرد۔ اب گھر میں عورتوں سے جھگڑا نہیں کرتا ہوں۔ میں اب یہ سمجھتا ہوں کہ مجھے رب نے دوبارہ زندگی عطا کی ہے۔ (محمود السلام قاسمی، کراچی، 8 دسمبر 2019ء)

اس تاثر سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ آج کے نوجوان طبقے کی رہنمائی کے لیے مثبت لٹریچر کی کتنی زیادہ ضرورت ہے۔

دشمن سے سیکھنا

1949ء میں جاپانیوں نے اپنے یہاں ایک صنعتی سیمینار کیا۔ اس سیمینار میں انھوں نے امریکا کے ڈاکٹر ایڈورڈ ڈیمنگ (Dr Edward Deming) کو خصوصی دعوت نامہ بھیج کر بلایا۔ ڈاکٹر ڈیمنگ نے اپنے لیکچر میں اعلیٰ صنعتی پیداوار کا ایک نیا نظریہ پیش کیا۔ یہ کوالٹی کنٹرول (quality control) کا نظریہ تھا (ہندستان ٹائمس، 28 دسمبر 1986ء)۔

جاپان کے لیے امریکا کے لوگ دشمن قوم کی حیثیت رکھتے تھے۔ دوسری جنگ عظیم میں امریکا نے جاپان کو بدترین شکست اور ذلت سے دوچار کیا تھا۔ اس اعتبار سے ہونا یہ چاہیے تھا کہ جاپانیوں کے دل میں امریکا کے خلاف نفرت کی آگ بھڑکے۔ مگر جاپانیوں نے اپنے آپ کو اس قسم کے منفی جذبات سے اوپر اٹھا لیا۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے لیے یہ ممکن ہوا کہ وہ امریکی پروفیسر کو اپنے سیمینار میں بلائیں اور اس کے بتائے ہوئے فارمولا پر ٹھنڈے دل سے غور کر کے اس کو دل وجان سے قبول کر لیں۔

جاپانیوں نے امریکی پروفیسر کی بات کو پوری طرح پکڑ لیا۔ انہوں نے اپنے پورے انڈسٹری کو کوالٹی کنٹرول کے رخ پر چلانا شروع کیا۔ انہوں نے اپنے صنعت کاروں (industrialist) کے سامنے بے نقص (zero-defect) کا نشانہ رکھا۔ یعنی ایسی پیداوار مارکیٹ میں لانا جس میں کسی بھی قسم کا کوئی نقص نہ پایا جائے۔ جاپانیوں کی سنجیدگی اور ان کا ڈیڈیکیشن (dedication) اس بات کا ضامن بن گیا کہ یہ مقصد پوری طرح حاصل ہو۔ جلد ہی ایسا ہوا کہ جاپانیوں کے کارخانے بے نقص سامان تیار کرنے لگے۔ یہاں تک کہ یہ حال ہوا کہ برطانیہ کے ایک دکاندار نے کہا کہ جاپان سے اگر میں ایک ملین کی تعداد میں کوئی سامان منگاؤں تو مجھ کو یقین ہوتا ہے کہ ان میں کوئی ایک چیز بھی نقص والی نہیں ہوگی۔ چنانچہ تمام دنیا میں جاپان کی پیداوار پر صد فی صد بھروسہ کیا جانے لگا۔

اب جاپان کی تجارت بہت زیادہ بڑھ گئی۔ حتیٰ کہ وہ امریکا کے بازار پر چھا گیا، جس کے ایک ماہر کی تحقیق سے اس نے کوالٹی کنٹرول کا فارمولا حاصل کیا تھا— اس دنیا میں بڑی کامیابی وہ لوگ حاصل کرتے ہیں جو ہر ایک سے سبق سیکھنے کی کوشش کریں، خواہ وہ ان کا دوست ہو یا ان کا دشمن۔

منفی سوچ اسلام میں نہیں

ایک قوم کے اندر دوسری قوم کے خلاف منفی جذبات اُس وقت پیدا ہوتے ہیں، جب کہ پہلی قوم اپنی کسی مصیبت کا ذمّے دار دوسری قوم کو سمجھ لے۔ مگر اسلام میں اس قسم کی منفی سوچ کی قطعاً گنجایش نہیں۔ اس کا سبب یہ ہے کہ خدا نے قرآن میں حتمی طور پر اعلان کیا ہے کہ جو بھی مصیبت تمھارے اوپر آتی ہے وہ صرف تمھارے اپنے ہی کیے کا نتیجہ ہوتی ہے (42:30)۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اسلام کی تعلیم کے مطابق، کوئی مصیبت پیش آنے پر صرف یہ کرنا ہے کہ ذاتی احتساب (self-introspection) کرکے اپنی جانب کی کوتاہی کو معلوم کیا جائے جو کہ اصل وجہ ہے۔ اور پھر اس کو درست کیا جائے۔ اِس کے برعکس، اپنی مصیبت کا ذمے دار کسی دوسرے کو قرار دے کر اس کے خلاف نفرت اور انتقام میں مبتلا ہونا، اسلام میں سرے سے جائز ہی نہیں۔

پیغمبرِ اسلام کی حدیثوں میں بھی یہ حقیقت مختلف انداز سے بیان ہوئی ہے۔ اس سلسلے میں ایک حدیث یہ ہے۔ یعنی، تم اپنے دشمنوں پر اس وقت تک غالب رہو گے جب تک میری سنت کو پکڑے رہو گے۔ اور جب تم میری سنت سے نکل جاؤ گے تو اللہ تمھارے اوپر ایسے لوگوں کو مسلّط کردے گا جو نہ تم سے ڈرے گا، اور نہ تم پر رحم کرے گا، یہاں تک کہ تم میری سنت کی طرف لوٹ آؤ (مسند ابو یعلی، حدیث نمبر 5659)۔

قرآن سے مزید معلوم ہوتا ہے کہ دشمن خود مسلمانوں کی اپنی غلطی کے نتیجے میں پیدا ہوتا ہے۔ اس سے باہر، خارجی مسئلے کی حیثیت سے، دشمن کا کوئی وجود نہیں۔ قرآن کی ایک آیت میں بتایا گیا ہے: وَإِنْ تَصْبِرُوا وَتَتَّقُوا لَا يَضُرُّكُمْ كَيْدُهُمْ شَيْئًا (3:120)۔ یعنی، اگر تم صبر کرو، اور تقویٰ اختیار کرو تو ان کی سازش تم کو کچھ بھی نقصان نہیں پہنچائے گی۔ قرآن کی اس آیت سے معلوم ہوا کہ اہلِ ایمان کے لیے اصل مسئلہ، سازش کی موجودگی نہیں ہے

بلکہ صبر اور تقویٰ کی غیر موجودگی ہے۔ اگر اہلِ ایمان کے اندر صبر اور تقویٰ کی صفت پائی جائے تو وہ پوری طرح دشمنوں کی سازش سے محفوظ رہیں گے۔ انھیں دوسروں کی طرف سے کوئی گزند پہنچنے والا نہیں۔

اِس اصول کی عملی مثال بھی قرآن میں واضح طور پر موجود ہے۔ ایک مثال غزوۂ اُحد کی ہے۔ پیغمبر اسلام کی ہجرت کے تیسرے سال غزوۂ احد پیش آیا۔ اِس غزوہ میں مسلمانوں کو سخت نقصان پہنچا۔ یہ غزوہ واضح طور پر پیغمبرِ اسلام کے مخالفین کی زیادتی کی بنا پر پیش آیا۔ اس کا ایک کھُلا ہوا ثبوت یہ ہے کہ یہ غزوہ مدینہ کی سرحد پر ہوا۔ یعنی مخالفین اپنے وطن مکّہ سے تین سو میل کا فاصلہ طے کر کے جارحانہ طور پر مدینہ آئے اور مسلمانوں کے وطن پر حملہ کیا۔ لیکن قرآن میں جب غزوۂ احد پر تبصرہ کیا گیا تو اس میں مخالفین کے ظلم اور سازش کا کوئی حوالہ نہیں دیا گیا بلکہ یہ کہا گیا کہ مسلمانوں کی خود اپنی داخلی کوتاہی کے نتیجے میں یہ شدید نقصان انھیں بھگتنا پڑا۔

غزوۂ احد کے بارے میں قرآن میں ان الفاظ میں آیا ہے: حَتَّىٰٓ إِذَا فَشِلۡتُمۡ وَتَنَٰزَعۡتُمۡ فِي ٱلۡأَمۡرِ (3:152)۔ یعنی، جب تم کمزور پڑ گئے اور معاملے میں اپنے درمیان اختلاف کر لیا۔ قرآن کی اِس آیت میں واضح طور پر مسلمانوں کو یہ تعلیم دی گئی ہے کہ اُحد کی شکست اور نقصان کا ذمہ دار وہ دوسروں کو قرار نہ دیں۔ بلکہ خود اپنے آپ کو اس کا ذمّہ دار سمجھ کر اپنی اصلاح کریں۔

اس معاملے کو سمجھنے کے لیے خدا کے ایک اور قانون کو جاننا بہت ضروری ہے۔ اس قانون کا تعلق مخصوص طور پر اہلِ کتاب سے ہے۔ اس خدائی قانون کا اطلاق، پیغمبرِ اسلام کے ظہور سے پہلے، سابق اہلِ کتاب، یہود پر ہوا اور اب اس خدائی قانون کا تعلق مسلم امّت سے ہو گیا ہے جو کہ پیغمبرِ آخر الزماں کے ظہور کے بعد اہلِ کتاب کی حیثیت رکھتے ہیں۔

اِس خدائی قانون کے تعلق سے یہود کے ساتھ جو معاملہ ہوا اس کا ذکر قرآن میں اِس

طرح آیا ہے: ہم نے بنی اسرائیل کو کتاب میں بتا دیا تھا کہ تم دو بارہ زمین (شام) میں خرابی کروگے اور بڑی سرکشی دکھاؤ گے۔ پھر جب ان میں سے پہلا وعدہ آیا تو ہم نے تم پر اپنے بندے بھیجے۔ نہایت زور والے۔ وہ گھروں میں گھُس پڑے اور وعدہ پورا ہو کر رہا۔ پھر ہم نے تمہاری باری ان پر لوٹا دی اور اولاد سے تمہاری مدد کی اور تم کو زیادہ بڑی جماعت بنا دیا۔ اگر تم اچھا کروگے تو تم اپنے لیے اچھا کروگے اور اگر تم برا کروگے تب بھی اپنے لیے بُرا کروگے۔ پھر جب دوسرے وعدے کا وقت آیا تو ہم نے بندے بھیجے کہ وہ تمہارے چہرے کو بگاڑ دیں اور مسجد (بیت المقدس) میں گھُس جائیں۔ جس طرح اس میں پہلی بار گھُسے تھے، اور جس چیز پر ان کا زور چلے اس کو برباد کر دیں۔ بعید نہیں کہ تمہارا رب تمہارے اوپر رحم کرے۔ اور اگر تم پھر وہی کروگے تو ہم بھی وہی کریں گے۔ اور ہم نے جہنم کو منکرین کے لیے قید خانہ بنا دیا ہے (17:4-8)۔

اس آیت میں یہود کی تاریخ کے دو ایسے واقعے کا ذکر ہے جب کہ غیر یہودی حکمراں نے یہودی قوم کے اوپر چڑھائی کر کے ان کو سخت تباہی سے دو چار کیا۔ پہلا واقعہ 586 قبل مسیح میں (عراق) کے غیر یہودی حکمراں نبوکدنضر (Nebuchadnezar) کے ذریعے پیش آیا، اور دوسرا واقعہ 70 عیسوی میں رومی بادشاہ تیتس (Titus) کے ذریعے۔ مگر قرآن میں ان دونوں واقعات کو ظلم کا واقعہ نہیں بتایا گیا۔ یعنی یہ نہیں کہا گیا کہ فلاں ظالم حکمراں نے مظلوم یہودیوں کے اوپر متشددانہ کارروائی کی۔ اس کے برعکس، ان واقعات کو خدا نے اپنی طرف منسوب کیا۔ یعنی یہ کہ وہ خدا کے بندے تھے جو خدا کے منصوبے کی تکمیل کے لیے فلسطین بھیجے گئے۔

قرآن اور حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ اہلِ کتاب ہونے کی حیثیت سے مسلمانوں کا معاملہ بھی وہی ہے جو اس سے پہلے یہود کا معاملہ تھا۔ یعنی ایسا ہو سکتا ہے کہ جب مسلمانوں میں بگاڑ آ جائے تو خدا اپنے بندوں میں سے کسی بندے کے ذریعے مسلمانوں کے اوپر تنبیہی

عذاب بھیجے۔ ایسے وقت میں مسلمانوں کو چاہیے کہ وہ اس کو ظالم کا ظلم نہ سمجھیں، بلکہ خدا کی طرف سے بھیجی ہوئی تنبیہی سزا سمجھیں۔ ایسے موقع پر مسلمانوں کو یہ کرنا چاہیے کہ وہ کسی کو ظالم فرض کرکے اس کے خلاف نفرت اور تشدد کا سلسلہ نہ شروع کریں، بلکہ ذاتی احتساب کے ذریعے اپنی اصلاح میں لگ جائیں۔

اسلام کے ظہور کے بعد تقریباً ایک ہزار سال تک مسلمانوں کے اندر ذاتی احتساب کی یہی سوچ غالب رہی۔ پرنٹنگ پریس اور میڈیا کے دَور سے پہلے مسلمانوں کے لیے پڑھنے اور مطالعہ کرنے کی چیز زیادہ تر قرآن اور حدیث ہوا کرتا تھا۔ اس لیے ان کی سوچ وہی بنتی تھی جو قرآن اور حدیث کی مذکورہ تعلیم کے مطابق ہو۔ ہر ایسے موقع پر وہ محاسبۂ خویش میں مبتلا ہو جاتے تھے، نہ کہ دوسروں کو ملزم ٹھہرا کر ان کے خلاف نفرت اور انتقام کی باتیں کرنے لگیں۔ یہاں اس سلسلے میں پچھلی تاریخ کی دو مثالیں نقل کی جاتی ہیں۔

تیرھویں صدی میں یہ واقعہ ہوا کہ ترکستان کے پہاڑی علاقے میں بسنے والے جنگ جو تاتاری قبائل مسلم سلطنت کے حدود میں داخل ہوئے۔ انھوں نے سمرقند سے لے کر حلَب تک پورے علاقے کو تباہ کر دیا۔ ہر طرف آگ اور خون کے مناظر دکھائی دینے لگے۔ بظاہر یہ دوسروں کی طرف سے جارحیت کا معاملہ تھا مگر اس زمانے کے علماء نے اس معاملے میں وہ منفی انداز اختیار نہیں کیا جو موجودہ زمانے کے مسلم رہنما اس طرح کے معاملات میں عام طور پر اختیار کیے ہوئے ہیں۔

مشہور مسلم مؤرخ عزّالدین ابن الاثیر (وفات: 1232ء) تاتاری حادثے کے زمانے میں موجود تھے۔ انھوں نے خود ذاتی تجربات اور مشاہدات کی بنیاد پر اپنی کتاب "الکامل فی التاریخ" میں اِس واقعہ کی تفصیل بیان کی ہے۔ ابنُ الاثیر نے اس واقعے کی ہولناکی بیان کرتے ہوئے لکھا ہے کہ: "کون ہے جس کے لیے آسان ہو کہ اسلام اور مسلمانوں کی ہلاکت کی داستان لکھے۔ اور کون ہے جس کے لیے اس کا ذِکر آسان ہو۔ کاش میری ماں نے

مجھے نہ جنا ہوتا، اور کاش میں اس سے پہلے مر گیا ہوتا اور ختم ہو گیا ہوتا۔ اگر کوئی کہے کہ جب آدم پیدا کیے گئے، اس وقت سے لے کر اب تک ایسا حادثہ انسانیت پر نہیں آیا تو یقیناً وہ سچا ہوگا۔"

تاہم ابن الاثیر نے موجودہ زمانے کے مسلمانوں کی طرح یہ نہیں کیا کہ وہ تاتاری حملہ آوروں کے خلاف نفرت اور انتقام کی بولی بولنے لگیں۔ اور ان کو مجرم قرار دے کر ان کو بددعائیں دیں۔ اِس کے برعکس، ابن الاثیر نے جو کیا وہ یہ تھا کہ انھوں نے خود مسلمانوں کو اس حادثے کا سبب قرار دیا۔ انھوں نے لکھا کہ ایران کے مسلم حکمراں خوارزم شاہ نے تاتاری تاجروں کو قتل کروایا اور ان کے مال کو لوٹ لیا۔ یہ خبر جب تاتاری سردار چنگیز خاں کو پہنچی تو اس نے قسم کھا کر اعلان کیا کہ وہ مسلم سلطنت کو تباہ کر کے رہے گا۔ چنانچہ اس نے غضب ناک ہو کر سمر قند کی طرف سے مسلم سلطنت پر حملہ کر دیا، جس کی تکمیل اس کے پوتے ہلاکو خاں نے کی (ابن الاثیر، الکامل فی التاریخ، جلد 12، صفحہ 362)۔

دوسری مثال لیجیے۔ نادر خاں (وفات 1747ء) ایران کا بادشاہ تھا۔ وہ ظلم اور سخت گیری کے لیے مشہور ہے۔ اس نے 1739ء میں ہندستان پر حملہ کیا، اور پیش قدمی کرتا ہوا دلّی پہنچ گیا۔ اس نے دلّی میں فتح حاصل کرنے کے بعد یہاں قتلِ عام کروایا۔ اس کا اصل مقصد یہاں سونا چاندی لوٹنا تھا۔ چنانچہ اس نے یہی کیا۔ قتلِ عام کے بعد تختِ طاؤس اور کوہِ نور ہیرا اور دوسرے قیمتی اموال لے کر وہ اپنے وطن واپس چلا گیا۔

اِس سنگین واقعے پر بھی اُس وقت کے مسلم علماء کا ردِّ عمل موجودہ مسلمانوں جیسا نہیں تھا۔ بلکہ انھوں نے اس کو احتساب کے خانے میں ڈال دیا۔ اس زمانے کے ایک مشہور بزرگ مرزا مظہر جانِ جاناں (وفات 1586ء) نے نادر خاں کے واقعے پر اپنا یہ تبصرہ کیا کہ نادر خاں نے جو کچھ کیا وہ نادر خاں کا ظلم نہ تھا، بلکہ یہ خود ہمارے اعمال تھے جنھوں نے نادر خاں کی صورت اختیار کر لی:

شامتِ اعمالِ ما، صورتِ نادر گرفت

یہ صرف موجودہ زمانے کی بات ہے کہ مسلمانوں کے لکھنے اور بولنے والے مذکورہ قسم کے واقعات پر فوراً منفی ردّعمل اختیار کر لیتے ہیں۔ آج کل مسلمانوں کے جس اخبار یا میگزین کو دیکھا جائے تو ہر ایک میں یہ ملے گا کہ مسلمانوں کے خلاف ہونے والے واقعات کو دوسری قوموں کے ظلم کے طور پر پیش کیا جارہا ہوگا۔ اس قسم کی منفی رپورٹنگ اتنی عام ہے کہ اس میں غالباً کوئی استثناء نہیں۔

میرے تجربے کے مطابق، منفی رپورٹنگ کا یہ طریقہ زیادہ تر موجودہ زمانے میں پرنٹ میڈیا کا دَور آنے کے بعد شروع ہوا۔ جدید صحافت میں خبروں کی رپورٹنگ کا ایک خاص طریقہ ہے جس کو اُلٹا اَہرام (Inverted Pyramid) کہا جاتا ہے۔ یعنی کسی واقعے کے نقطۂ انتہا سے خبر کی رپورٹنگ کا آغاز کرنا۔

مثلاً نئی دہلی میں دو آدمیوں کے درمیان ایک مالی معاملے میں جھگڑا ہو، وہ بڑھ کر دشمنی بن جائے اور پھر ان میں سے ایک آدمی دوسرے کو مار ڈالنے کے درپے ہو جائے۔ وہ اس کا پیچھا کرنے لگے، یہاں تک کہ ایک دن وہ اس کو ایک پارک میں تنہا پا جائے اور اس کو قتل کر دے۔ اِس واقعے کی خبر اگلے دن اخبار میں آئے تو ایسا نہیں ہوگا کہ کہانی کو اس کی واقعاتی ترتیب کے ساتھ بیان کیا جائے اور پھر آخر میں قتل کی بات لکھی جائے۔ اس کے برعکس، خبر کا پہلا جملہ یہ ہوگا: نئی دہلی کے پارک میں قتل۔

واقعہ نگاری کا یہ طریقہ فطرت کے خلاف ہے۔ مثلاً قرآن جو کتابِ فطرت ہے اس میں واقعہ نگاری کی ایک مثال سورہ یوسف میں ملتی ہے۔ اس سورہ میں پیغمبر یوسف کے حالات بتائے گئے ہیں۔ مگر اس میں جو اسلوب ہے وہ واقعے کی تاریخی ترتیب کے مطابق ہے۔ واقعہ نگاری کے اس اسلوب میں قاری کا ذہن وہی بنتا ہے جو فطری طور پر اس کا ذہن بننا چاہیے۔ اس کے برعکس، مذکورہ صحافتی ترتیب میں قاری کا ذہن غیر فطری ہو جاتا ہے۔ اس کے ذہن میں واقعہ کا وہ نقشہ نہیں بنتا جو حقیقت کے اعتبار سے تاریخ کا نقشہ ہے۔

رپورٹنگ کے مذکورہ صحافتی طریقے کو دوسرے لفظوں میں اس طرح کہا جاسکتا ہے — کہانی کے نصف ثانی کو نمایاں طور پر بیان کرنا، اور اس کے نصف اوّل کو یا تو غیر مذکور چھوڑ دینا یا اس کو ناقص صورت میں بیان کرنا۔ جدید رواج کے مطابق، مسلمانوں کی صحافت میں بھی یہی طریقہ شعوری یا غیر شعوری طور پر اختیار کرلیا گیا۔ اور پھر وہ اتنا زیادہ عام ہوا کہ موجودہ پریس کے زمانے میں ہر لکھنے اور بولنے والا مسلمان اسی اصول پر لکھنے اور بولنے لگا۔ حالاں کہ یہ غیر فطری طریقہ، اسلام میں نہایت برا سمجھا گیا ہے اور اس کو تطفیف (المطففین، 83:1) کہا گیا ہے۔

رپورٹنگ کے اِس طریقے کا نتیجہ یہ ہوا کہ سارا مسلم میڈیا، منفی خبروں سے بھر گیا۔ یہی منفی خبریں ہیں جن کو پڑھ کر ساری دنیا کے مسلمانوں کا ذہن منفی بن گیا۔ اور یہی منفی ذہن ہے جو اپنے نقطۂ انتہاء پر پہنچ کر وہ خوف ناک تشدّد بن جاتا ہے، جس کو القاعدہ یا داعش (آئی ایس آئی ایس) یا بوکوحرام، وغیرہ جیسے ناموں سے جانا جاتا ہے۔

اس معاملے کو سمجھنے کے لیے ایک مثال لیجیے 1967ء میں اسرائیل اور مصر کے درمیان جنگ ہوئی۔ اس جنگ میں مصر کو زبردست شکست ہوئی اور اسرائیل نے پیش قدمی کر کے اپنے رقبے کو بہت زیادہ بڑھالیا۔ اس واقعے پر عربی، فارسی، انگریزی اور اُردو زبان میں جو رپورٹیں چھپیں یا اس واقعے پر مسلمانوں کی جو کتابیں شائع ہوئیں ان سب میں متفقہ طور پر ایک ہی بات کہی گئی تھی، اور وہ یہ کہ اسرائیل نے مغربی قوموں سے سازش کر کے ظالمانہ طور پر مصر کے اوپر حملہ کیا اور فلسطین میں اپنی وسیع تر حکومت قائم کرلی۔ مگر واقعات بتاتے ہیں کہ یہ اصل کہانی کا صرف نصف آخر ہے۔ کہانی کا نصف اول اس میں شامل نہیں۔ کہانی کے نصف آخر کو سامنے رکھیے تو بظاہر یہ معلوم ہوگا کہ یہ اسرائیل کی طرف سے ایک ظلم کا واقعہ تھا۔ لیکن اگر کہانی کے نصف اول کو شامل کر کے غور کیا جائے تو برعکس طور پر یہ معلوم ہوگا کہ 1967ء میں جو کچھ ہوا اس کی ذمے داری مکمل طور پر خود عربوں پر عائد ہوتی ہے۔ یہ خود عرب

قیادت کا ایک نادان اقدام تھا جس کی قیمت اسے ذلّت اور بربادی کی شکل میں بھگتنی پڑی۔

1967ء میں عربوں کے ساتھ جو المیہ پیش آیا اس پر پیغمبر اسلام کے یہ الفاظ پوری طرح صادق آتے ہیں: لاَ یَنْبَغِي لِلْمُؤْمِنِ أَنْ یُذِلَّ نَفْسَهُ قَالُوا: وَكَیْفَ یُذِلُّ نَفْسَهُ؟ قَالَ: یَتَعَرَّضُ مِنَ البَلاَءِ لِمَا لاَ یُطِیقُ (سنن الترمذی، حدیث نمبر 2254)۔ یعنی، کسی مسلم کے لیے یہ درست نہیں کہ وہ خود اپنے آپ کو ذلیل کرے۔ پوچھا گیا کہ کوئی شخص خود اپنے آپ کو کیسے ذلیل کرے گا۔ آپ نے فرمایا کہ وہ ایک ایسی بلا سے تعرض کرے جس کی وہ طاقت نہ رکھتا ہو۔ 1967ء کی جنگ میں عین یہی صورت پیش آئی۔

یہ قصہ نہر سوئز کی کہانی سے شروع ہوتا ہے۔ نہر سوئز کو مغربی کمپنیوں نے بنایا تھا۔ جو مکمل ہو کر نومبر 1869ء میں جہاز رانی کے لیے کھولی گئی۔ نہر سوئز کا ٹھیکہ برطانیہ اور فرانس کی ایک مشترکہ کمپنی کو حاصل تھا۔ نہر سوئز برطانیہ اور فرانس کی مشترک کمپنی کو پٹے (lease) کے طور پر دی گئی تھی۔ یہ پٹہ 1968ء میں ختم ہو رہا تھا۔ اس کے بعد حسب معاہدہ، نہر سوئز پوری طرح حکومت مصر کی ملکیت میں آجاتی۔ پٹّے کے ختم ہونے سے پہلے بھی مصری حکومت اور مصری عوام کو اس کے ذریعے بہت سے مالی فائدے مل رہے تھے۔

مگر پٹّہ ختم ہونے سے پہلے مصر کے صدر جمال عبد الناصر (وفات 1970ء) نے تمام عربوں کی تائید سے ایک اشتعال انگیز واقعہ کیا۔ 29 اکتوبر 1956ء کو انھوں نے اچانک یہ اعلان کر دیا کہ آج ہم نے نہر سوئز کو نیشنلائز کر لیا۔ اور اب اس کی ساری آمدنی حکومتِ مصر کو حاصل ہوگی (انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا، جلد 12، صفحہ 844)۔

جمال عبد الناصر کے اقدام پر سارا عرب رقص کر اٹھا۔ مگر برطانیہ اور فرانس کے لیے وہ ایک اشتعال انگیز واقعہ تھا۔ چنانچہ برطانیہ اور فرانس نے خفیہ طور پر اسرائیل کی بہت بڑی مدد کی۔ اور اس کے ذریعے مصر پر حملہ کرا دیا۔ اس حملے میں مصر کی فوجی طاقت کچل کر رہ

گئی۔ اسرائیل نے مزید اطراف کے علاقوں پر قبضہ کرکے اپنے رقبے کو پانچ گُنا بڑھا لیا۔

جمال عبدالناصر اگر اِس معاملے میں 12 سال انتظار کرتے تو سوئز کمپنی معاہدے کے مطابق، اپنے آپ ختم ہو جاتی۔ مگر ان کے عاجلانہ اقدام نے مصر کو تباہ و برباد کرکے رکھ دیا۔ اور اسرائیل کا رقبہ بہت زیادہ بڑھ گیا۔ جو چیز 1968ء میں اپنے آپ مل جاتی اس کو 1956ء میں پیشگی طور پر حاصل کرنے کی کوشش مصر کے حق میں الٹی ثابت ہوئی۔

اِس طرح اس کہانی کے دو حصے ہیں۔ اس کا ایک حصہ وہ ہے جو نہر سوئز کو غیر حکیمانہ طور پر قبضے میں لینے سے تعلق رکھتا ہے۔ اور اس کا دوسرا حصہ وہ ہے جو نہر سوئز پر غیر حکیمانہ قبضے کے بعد بطور ردّعمل پیش آیا۔ اگر اس کہانی کے صرف نصف ثانی کو دیکھا جائے تو اسرائیل ظالم اور سرکش دکھائی دے گا۔ لیکن اگر اس کہانی کے نصف اول کو ملا کر اس معاملے کو سمجھنے کی کوشش کی جائے تو معلوم ہوگا کہ مصر-اسرائیل جنگ کے بعد عربوں کے ساتھ جو بُری صورتِ حال پیش آئی وہ خود عربوں کی اپنی نادانی کا نتیجہ تھی۔ اِس معاملے میں عربوں کا کیس عمل کا کیس ہے اور اسرائیل کا کیس ردّعمل کا کیس۔ اسرائیل کا مزید استحکام، دراصل خود عربوں کی اپنی ناعاقبت اندیشانہ پالیسی کی قیمت تھی جو انھوں نے اَدا کی۔ مگر غلط رپورٹنگ کی بنا پر ایسا ہوا کہ تمام مسلمان، اسرائیل سے نفرت میں مبتلا ہو گئے۔ حالاں کہ اصل صورتِ حال کے مطابق، انھیں خود اپنے احتساب میں مصروف ہونا چاہیے تھا۔

ایک تقابلی مثال سے یہ معاملہ بخوبی طور پر سمجھ میں آسکتا ہے۔ یہ مثال وہ ہے جو ہانگ کانگ سے تعلق رکھتی ہے۔ برطانی استعمار کے زمانے میں انگریزوں نے ہانگ کانگ کو پٹّے پر 99 سال کے لیے لیا تھا۔ پٹّے کی یہ مدت 1997ء میں ختم ہو رہی تھی۔ دوسری عالمی جنگ کے بعد برطانی ایمپائر کمزور ہوا تو چین نے ہانگ کانگ کی واپسی کا مطالبہ شروع کر دیا۔ مگر چین نے اپنے آپ کو گفت وشنید کی حد تک محدود رکھا۔ اس نے کبھی اس معاملے میں یہ پروگرام نہیں بنایا کہ وہ ہانگ کانگ میں اپنی فوجیں داخل کرکے اس پر قبضہ کرلے۔ اگرچہ

ہانگ کانگ کا جزیرہ چین سے ملا ہوا ہے۔ برطانوی حکومت سے چین کی یہ گفت وشنید جاری رہی۔ یہاں تک کہ 1997ء میں جب پٹّے کی مدت پوری ہوئی تو ہانگ کانگ سے برطانیہ کا اقتدار بھی ختم ہوگیا۔ ہانگ کانگ اب چین کے باقاعدہ قبضے میں ہے۔

1967ء کی جنگ میں، اسرائیل نے فلسطین، اردن، شام اور مصر کے علاقوں پر قبضہ کر لیا۔ عربوں (فلسطین، اردن، شام، مصر) نے اِس جنگ میں اپنا قیمتی علاقہ کھودیا۔ مگر ٹھیک اسی قسم کی صورتِ حال میں ہانگ کانگ میں برعکس نتیجہ سامنے آیا۔ یہاں چین نے ایک قیمتی جزیرے کو اپنے علاقے میں شامل کرلیا۔ عربوں نے اپنی ناعاقبت اندیشانہ منصوبہ بندی کی قیمت ادا کی اور چین نے اپنی حقیقت پسندانہ منصوبہ بندی کی بنا پر قابلِ ذکر فتح حاصل کی۔

مذکورہ تفصیل بتاتی ہے کہ اسرائیل کا مسئلہ دراصل کسی کے ظلم یا سازش کا نتیجہ نہ تھا، بلکہ وہ خود عربوں کی اپنی نادانیوں کا نتیجہ تھا۔ موجودہ زمانے کا متشددانہ جہاد سب سے زیادہ فلسطین کی زمین سے اُبھرا ہے۔ تمام عرب اور تمام مسلمان اس جہاد کو انصاف کی لڑائی سمجھتے ہیں۔ حالاں کہ زیادہ صحیح بات یہ ہے کہ یہ ایک غیر عاقلانہ اقدام کے نقصان کی تلافی، ایک اور غیر عاقلانہ اقدام سے کرنے کے ہم معنیٰ ہے۔ اس قسم کا ہر اقدام فطرت کے قانون کے خلاف ہے۔ خدا کی اس دنیا میں ایسا اقدام کبھی کامیاب ہونے والا نہیں۔

بحران کا مسئلہ

ایک صاحب سے ملاقات ہوئی۔ انھوں نے کہا کہ آپ اکثر آرٹ آف کرائسس مینجمنٹ (the art of crisis management) کی بات کرتے ہیں۔ یہ نہایت اہم موضوع ہے۔ یہ ہر آدمی کا ایک ذاتی مسئلہ ہے۔ ہر آدمی کبھی نہ کبھی کرائسس میں مبتلا ہوجاتا ہے۔ مگر سوال یہ ہے کہ اِس کا کارگر فارمولا کیا ہے۔ میں نے کہا کہ اِس کا کارگر فارمولا صرف ایک ہے، اور وہ یہ ہے کہ جب زندگی میں کوئی کرائسس پیش آئے، تو اس کو خدا کے حوالے کردیا جائے۔

یہی وہ حقیقت ہے جس کی بابت، صحابیٔ رسول، حضرت علی بن ابی طالب نے فرمایا: الْخَیْرُ فِیمَا وَقَعَ۔ یعنی، جو کچھ پیش آئے، اس کو آدمی خدا کی طرف سے سمجھے اوراس پر راضی ہوجائے۔ اِسی حقیقت کو ایک فارسی مقولے میں اِس طرح بیان کیا گیا ہے— دشمن اگر قوی ہے، تونگہبان اس سے بھی زیادہ قوی ہے:

دشمن اگرقوی است، نگہباں قوی تراست

If the enemy is strong, the Saviour is stronger.

حقیقت یہ ہے کہ اِس دنیا میں جو کچھ پیش آتا ہے، وہ براہِ راست طور پر خدا کی طرف سے ہوتا ہے۔ یعنی حالات کا اہتمام خدا کی طرف سے کیا جاتا ہے۔ انسان کا حصہ اُس میں صرف یہ ہے کہ وہ مثبت رسپانس (positive response) دیتا ہے، یا منفی رسپانس (negative response)۔ وہ یاتو ایک قسم کا رسپانس دے کر کریڈٹ (credit) پاتا ہے، یادوسرے قسم کا رسپانس دے کر اپنے آپ کو ڈس کریڈٹ (discredit) کرلیتا ہے۔

ایسی حالت میں انسان کے بارے میں بہترین طریقہ یہ ہے کہ وہ اپنے آپ کو بے صبری سے بچائے اور بہتر انجام کے لیے خدا سے دعا کرتا رہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اِس دنیا میں صبر بھی ایک عمل ہے اور دعا بھی ایک عمل۔

شخصیت سازی کا عمل

روسو فرانس کا مشہور جمہوری مفکر ہے۔ وہ 1712ء میں پیدا ہوا اور 1778ء میں اس کی وفات ہوئی۔ وہ شخصی بادشاہت کے مقابلے میں عوامی حکمرانی کا علم بردار تھا۔ وہ اپنی مشہور کتاب معاہدۂ عمرانی (*Social Contract*) کا آغاز اس جملے سے کرتا ہے— انسان آزاد پیدا ہوا تھا، مگر میں اس کو زنجیروں میں بندھا ہوا دیکھتا ہوں:

Man was born free, but I see him in Chain.

مگرانسان کاایک اورمسئلہ ہے جوشایداس سے بھی زیادہ سنگین ہے،اوروہ کنڈیشننگ ہے۔ ہرعورت اورمرد کسی ماحول میں رہتے ہیں۔ماحول کی نسبت سے ہرایک کے ذہن کی کنڈیشننگ ہوجاتی ہے جواس کوصحیح طرزِفکر سے محروم کردیتی ہے۔آدمی اس قابل نہیں رہتا کہ وہ فطری اندازمیں سوچ سکے۔اِس مسئلے کودیکھتے ہوئے روسو کے جملے کوزیادہ بہترطور پراس طرح بیان کیاجاسکتاہے کہ—انسان فطرت پر پیداہواتھا،مگروہ ہرجگہ کنڈیشنڈ دکھائی دیتاہے:

Man was created on divine nature, but I see him psychologically conditioned.

ایک بچہ جب ماں کے پیٹ سے پیدا ہوتا ہے،اس وقت اس کو دیکھیےتو وہ معصومیت کاپیکر دکھائی دے گا۔ایسا معلوم ہوگا جیسے کہ فرشتے نے انسان کی صورت اختیارکرلی ہے۔ پیدائش کے وقت انسان اپنے ذہن کے اعتبار سے خالص ذہن کا حامل ہوتا ہے۔اس کی سوچ عین وہی فطری سوچ ہوتی ہے جوبطور واقعہ ہونا چاہیے۔مگر انسان ایک سماجی حیوان (social animal) ہے۔اس کواپنی ساری زندگی دوسروں کے بنائے ہوئے سماج کے اندرگزارنا ہوتا ہے۔اس بنا پراس کا ذہن ہرآن خارجی تأثرقبول کرتا رہتا ہے۔جس کو کنڈیشننگ کہا جاتا ہے۔یہ تاثر پذیری بڑھتی رہتی ہے، یہاں تک کہ انسان مکمل طور پر کنڈیشننگ کا کیس بن جاتا ہے۔

سن شعور کوپہنچنے کے بعد ہرعورت اورمرد کی یہ لازمی ذمّے داری ہے کہ وہ اس کنڈیشننگ کوسمجھے اوراپنے ذہن کی ڈی کنڈیشننگ کرکے دوبارہ اپنے آپ کوحالتِ فطری کی طرف واپس لے جائے،وہ اپنے آپ کوانسانِ مصنوعی کے بجائے انسانِ فطری بنائے۔

موجودہ زمانے میں علمِ نفسیات میں ایک نظریہ بہت عام ہوگیا ہے جس کو بہیویرازم (behaviourism) کہا جاتا ہے۔نفسیات کے اس مدرسۂ فکر میں یہ مان لیا گیا ہے کہ یہ کنڈیشننگ ہی انسان کی مستقل حالت ہے،انسان اپنی پیدائش کے اعتبار سے کچھ نہیں،

یہ دراصل ماحول کی کنڈیشننگ ہے جو انسان کی شخصیت سازی کرتی ہے۔ اس نظریے کے حاملین کہتے ہیں کہ انسان نیچر (nature) سے نہیں بنتا۔ بلکہ وہ نرچر (nurture) سے بنتا ہے۔ یعنی ماحول کی پرورش سے۔ اس نفسیاتی مدرسۂ فکر کے لوگ کہتے ہیں کہ — انسان جہاں پیدا ہوتا ہے وہیں کے حالات اس کی شخصیت کی تشکیل کرتے ہیں:

He was nurtured when he was born. (Wotton)

انسانی شخصیت کی زیادہ گہری تحقیق اس نظریے کو ردّ کر رہی ہے۔ زیادہ گہرا مطالعہ بتاتا ہے کہ انسان اپنی پیدائش کے اعتبار سے ایک مکمل شخصیت ہوتا ہے۔ جنیٹک کوڈ کی حالیہ دریافت مذکورہ نظریے کی مکمل تردید ہے۔ اس دریافت کے ذریعے یہ ثابت ہوا ہے کہ جنیٹک کوڈ کے اندر پیدائشی طور پر ہر انسان کی مکمل شخصیت موجود ہوتی ہے۔ بعد کے دور میں انسان کی جو شخصیت بنتی ہے، وہ اسی جنیٹک کوڈ کی صرف اَن فولڈنگ (unfolding) ہے۔

اِس نقطۂ نظر کے مطابق، زیادہ صحیح بات یہ ہے کہ ماحول کی کنڈیشننگ اصل انسان کے اوپر ایک مصنوعی پردے کی حیثیت رکھتی ہے۔ گویا انسان کی شخصیت پیاز کی مانند ہے۔ پیاز کے اندر مٹر کی مانند ایک مغز ہوتا ہے۔ اس داخلی مغز کے اوپر خارجی پردے کے مانند بہت سے چھلکے ہوتے ہیں۔ اگر ان چھلکوں کو ہٹایا جائے تو پیاز کا اندرونی مغز کھل کر سامنے آجائے گا۔ یہی معاملہ انسان کا ہے۔ انسان کی شخصیت کے اوپر ماحول کے اثر سے مصنوعی پردے پڑ جاتے ہیں۔ ان پردوں کو ہٹا دیا جائے تو انسان کی اصل شخصیت کھل کر سامنے آجائے گی۔

انسانی شخصیت کے انھیں خارجی پردوں کو ہٹانے کا نام ڈی کنڈیشننگ ہے۔ جو آدمی سچائی کا طالب ہو، اس پر لازم ہے کہ وہ اپنی ڈی کنڈیشننگ کر کے مصنوعی پردوں کو ختم کرے تا کہ اس کی اصل شخصیت سامنے آسکے۔

مذہب میں یہ تسلیم کیا گیا ہے کہ انسان خدا کی خاص تخلیق ہے۔ انسان جب پیدا ہوتا

ہے تو وہ اسی خدائی شخصیت (divine personality) پر پیدا ہوتا ہے۔ وہ اپنے داخلی وجود کے اعتبار سے ایک صحیح اور کامل شخصیت ہوتا ہے۔ ابدی کامیابی کے لیے لازمی شرط یہ ہے کہ آدمی سب سے پہلے اپنی اس فطری شخصیت کی حفاظت کرے۔ وہ اپنے آپ کو اس حالتِ فطری پر قائم کرے جس پر اس کے پیدا کرنے والے نے اس کو پیدا کیا ہے۔ اسی خود تعمیری جدو جہد کا نام ڈی کنڈیشننگ ہے۔

مطالعہ بتاتا ہے کہ انسان جب ایک ماحول میں پرورش پاتا ہے تو ہر دن اس کے ساتھ مختلف منفی تجربے پیش آتے ہیں۔ یہ تجربے اس کی اصل شخصیت پر غیر مطلوب پردے ڈالتے رہتے ہیں۔ مثلاً ایک شخص اس کے مقابلے میں زیادہ ترقی کر گیا۔ یہ تجربہ اس کے اندر حسد کے جذبات پیدا کرتا ہے۔ اور اس کی شخصیت کے اندر حسد کا ایک عنصر شامل ہوجاتا ہے۔ اسی طرح ایک شخص اس کے ساتھ ناپسندیدہ سلوک کرتا ہے۔ یہ تجربہ اس کی شخصیت میں نفرت کا ایک عنصر شامل کردیتا ہے۔ ایک مشاہدہ اس کے سامنے آتا ہے اس کو دیکھ کر اس کے اندر وہ چیز پیدا ہوتی ہے جس کو لالچ کہا جاتا ہے۔ یہ تجربہ اس کی شخصیت میں لالچ کا ایک عنصر داخل کردیتا ہے۔ اسی طرح کبھی ایسا ہوتا ہے کہ ایک شخص اس کے ساتھ ظلم کا معاملہ کرتا ہے۔ یہ تجربہ اس کے اندر تشدد کا جذبہ جگاتا ہے، اور اس کی شخصیت میں تشدد کا عنصر شامل ہوجاتا ہے۔

اس طرح ماحول کے اندر آدمی کو مختلف قسم کے تجربات سے سابقہ پیش آتا رہتا ہے، اور ہر تجربہ ایک منفی عنصر بن کر اس کی شخصیت کی تشکیل کرتا رہتا ہے۔ یہاں تک کہ انسان کی اصل شخصیت پردوں میں ڈھک جاتی ہے۔ انسانِ فطری بدل کر انسانِ مصنوعی بن جاتا ہے۔

ڈی کنڈیشننگ اسی مصنوعی صورتِ حال کی تصحیح ہے۔ یہ ڈی کنڈیشننگ ہر انسان کی ایک لازمی ضرورت ہے۔ اس کے بغیر انسان کی شخصیت ایک ناقص شخصیت بنی رہے گی، وہ کبھی کامل شخصیت کا درجہ نہ پاسکے گی۔ اس ڈی کنڈیشننگ کا بنیادی ذریعہ احتساب خویش (introspection) ہے۔ ہر عورت اور مرد کو یہ کرنا ہے کہ وہ خود اپنا نگراں بن جائے۔ وہ

ڈھونڈ ڈھونڈ کر اپنے اندر سے ہر منفی آئٹم کو نکالے اور اس کو فکری تصحیح کے عمل سے گزار کر مثبت آئٹم بنائے۔ اور پھر اسی مثبت آئٹم کو اپنی شخصیت میں واپس داخل کرے۔ جس طرح مویشی جگالی (rumination) کر کے اپنے اندر سے غیر ہضم شدہ غذا کو نکالتے ہیں اور پھر اس کو قابل ہضم بنا کر اپنے پیٹ میں دوبارہ داخل کرتے ہیں۔ اسی طرح ہر عورت اور مرد کو چاہیے کہ وہ ڈی کنڈیشننگ کے ذریعے اپنی شخصیت کی تعمیر و تشکیل کریں۔

نفسیات کا مطالعہ بتاتا ہے کہ انسان کے دماغ کے دو بڑے حصے ہیں— شعور اور لاشعور۔ انسان کے ساتھ جب کوئی ناخوشگوار تجربہ گزرتا ہے تو وہ سب سے پہلے اس کے ذہن کے شعوری خانے میں ایک منفی آئٹم کے طور پر داخل ہوتا ہے۔ یہ منفی آئٹم چند دن تک زندہ شعور کے خانے میں رہتا ہے۔ اس کے بعد دھیرے دھیرے وہ اس کے لاشعور کے خانے میں چلا جاتا ہے۔ اور پھر ہمیشہ کے لیے اس کے ذہن کا حصہ بن جاتا ہے اس لیے ضروری ہے کہ ہر آدمی پہلے ہی دن یا چند دن کے اندر ہر منفی آئٹم کو مثبت آئٹم میں تبدیل کرے۔ تاکہ یہ آئٹم جب زندہ شعور سے گذر کر اس کے لاشعور میں یا حافظے کے اسٹور میں پہنچے تو وہ ایک مثبت آئٹم کے طور پر وہاں محفوظ ہو۔

یہی وہ عمل ہے جو انسانی شخصیت کی تعمیر میں اصل فیصلہ کن عامل (factor) کی حیثیت رکھتا ہے۔ اسی عمل کے دوران یہ فیصلہ ہوتا ہے کہ کوئی انسان منفی شخصیت کا حامل ہوگا یا مثبت شخصیت کا حامل۔ جو آدمی اپنے روزمرّہ کے تجربات پر تصحیح کا عمل کر کے اس کو مثبت آئٹم میں ڈھالتا رہے، اس کے لاشعور یا حافظے کے اسٹور میں تمام آئٹم مثبت آئٹم کے طور پر جمع ہوں گے۔ ایسے انسان کی شخصیت ایک مثبت شخصیت ہوگی۔ اس کے برعکس، جو انسان تجربے کے پہلے ہی مرحلے میں تصحیح کا یہ عمل جاری نہ کر سکے اس کو پیش آنے والے تمام منفی آئٹم اس کے لاشعور کے خانے میں صرف منفی آئٹم کے طور پر جگہ پائیں گے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ اس کی پوری شخصیت ایک منفی شخصیت بن جائے گی۔

انسان جو بھی عمل کرتا ہے، خواہ وہ اس کی سوچ ہو یا وہ اس کا قول ہو یا وہ اس کا عمل، سب کچھ اس کے لاشعور کے تحت ہوتا ہے۔ کوئی انسان اپنے شعور کے کم اور اپنے لاشعور کے زیادہ تابع ہوتا ہے۔ جس انسان کا لاشعور منفی آئٹم کا ذخیرہ بن جائے، اس کے تمام اقوال و اعمال منفی نوعیت کے ہوں گے۔ اس کے برعکس، جس انسان کا لاشعور خود تعمیری کے نتیجے میں مثبت آئٹم کا ذخیرہ بنا ہوا ہو، اس کے تمام اقوال و اعمال صحت مند اور مثبت انداز کے حامل ہوں گے۔

حق کی تلاش یا حق کی یافت دونوں ہی مثبت شخصیت کا فعل ہیں۔ یہ دراصل مثبت شخصیت ہے جس کے اندر تلاشِ حق کا اعلیٰ جذبہ جاگتا ہے۔ اور یہ مثبت شخصیت ہی ہے جو اپنی سلامتِ فکر کی بنا پر آخر کار حق کی یافت کے مرحلے تک پہنچتی ہے۔

مثبت شخصیت، منفی شخصیت

اسلامی فقہ کا یہ مسئلہ ہے کہ اگر ایک ٹب پاکیزہ پانی ہو، اُس میں گندگی کا ایک قطرہ ڈال دیا جائے تو ٹب کا پورا پانی گندا ہو جائے گا۔ اِس کے برعکس، اگر ایک ٹب گندا پانی ہو اور اس میں ایک قطرہ پاک پانی ڈال دیا جائے تو اُس سے وہ پانی پاک نہیں ہو جائے گا، بلکہ وہ بدستور گندا رہے گا۔ یہ ایک خارجی نوعیت کی مادی مثال ہے۔ یہی معاملہ انسان کی داخلی شخصیت کا ہے۔

ایک شخص کے ذہن میں اگر 99 مثبت آئٹم ہوں اور صرف ایک منفی آئٹم اس کے اندر داخل ہو جائے تو یہی منفی آئٹم غالب آجائے گا اور آدمی کی پوری شخصیت منفی شخصیت بن جائے گی۔ یہ ایک نفسیاتی حقیقت ہے کہ مثبت سوچ کسی درجے میں بھی منفی سوچ کو قبول نہیں کرتی۔ آدمی کی شخصیت یا تو صد فی صد مثبت شخصیت ہوگی، یا وہ سرے سے مثبت شخصیت ہی نہ ہوگی۔

یہ ایک اہم نفسیاتی اصول (psychological principle) ہے جو آدمی اپنے اندر مثبت شخصیت (positive personality) کی تعمیر کرنا چاہتا ہے، اُس کو لازمی طور پر یہ

کرنا ہے کہ وہ سختی کے ساتھ اپنا محاسب بن جائے۔ وہ ہر وقت اِس بات کی نگرانی کرتا رہے کہ اس کے ذہن میں ادنیٰ درجے میں بھی کوئی منفی سوچ داخل نہ ہو۔ شکایت یا نفرت کا کوئی ایک آئٹم بھی اگر اس کے اندر موجود ہے تو وہ ڈھونڈ کر اس کو باہر نکال دے۔ اِس معاملے میں وہ خود اپنا نگراں بن جائے۔

تعمیر شخصیت کا یہ ایک مستقل عمل ہے جو ہر آدمی کو ہر صبح وشام انجام دینا ہے۔ کوئی بھی دوسرا عمل اِس معاملے میں غفلت کی تلافی نہیں بن سکتا۔

یاد رکھنا چاہیے کہ مثبت شخصیت ہی ربانی شخصیت ہے اور ربانی شخصیت ہی وہ شخصیت ہے جس کو آخرت کے دورِ حیات میں جنت میں داخلہ ملے گا۔ منفی شخصیت رکھنے والے لوگ بلا شبہ جنت میں داخلے کے لیے غیر مستحق قرار پائیں گے۔

سوال وجواب

سوال

ایک تعلیم یافتہ مسلمان سے ملاقات ہوئی۔ انہوں نے کہا کہ میں الرسالہ سے پورا اتفاق رکھتا ہوں۔ مگر ایک چیز سے میں ابھی تک پورا اتفاق نہ کرسکا۔

وہ یہ کہ الرسالہ میں مثبت انداز میں کام کرنے کو کہا جاتا ہے، مگر خود الرسالہ میں تنقیدی اُسلوب پایا جاتا ہے۔ حالاں کہ تنقید کا اُسلوب منفی اُسلوب ہے۔ مزید یہ کہ الرسالہ کی تنقید یک طرفہ تنقید ہوتی ہے۔ اِس میں زیر تنقید شخص کے مثبت پہلو کو عام طور پر بیان نہیں کیا جاتا۔ (ایک قاری الرسالہ، نئی دہلی)

جواب

ماہ نامہ الرسالہ میں کبھی یہ نہیں لکھا گیا کہ تنقیدی اُسلوب درست نہیں۔ الرسالہ میں جو کچھ لکھا گیا ہے، وہ صرف منفی اُسلوب کے بارے میں ہے، نہ کہ تنقیدی اُسلوب کے بارے میں۔ منفی اُسلوب میں دو قسم کی چیزیں شامل ہیں، شکایتی اُسلوب اور عیب زنی کا اُسلوب۔ یہ دونوں چیزیں بلاشبہ حرام کے درجے میں قابلِ ترک ہیں۔

جہاں تک تنقیدی اُسلوب کی بات ہے، وہ سرے سے قابلِ اعتراض ہی نہیں۔ تنقید کے بغیر کبھی ذہنی ترقی نہیں ہوسکتی۔ تاہم تنقید سے مراد تنقیص نہیں ہے، بلکہ اِس سے مراد علمی تجزیہ ہے۔ اور علمی تجزیہ ہمیشہ نہایت مفید ہوتا ہے۔ الرسالہ میں جو تنقید ہوتی ہے، وہ ہمیشہ علمی تجزیہ کے معنی میں ہوتی ہے، نہ کہ شکایتی اُسلوب اور عیب زنی کے اُسلوب کے معنی میں۔

اصل یہ ہے کہ لوگوں نے خود ساختہ طور پر بعض شخصیتوں کو اکابر کا درجہ دے رکھا ہے۔ اِس لیے جب اُن کے مفروضہ اکابر پر تنقید کی جائے تو اِس سے اُنھیں تکلیف پہنچتی ہے۔ مگر ملت کے افراد کو اصاغر اور اکابر میں تقسیم کرنا بجائے خود ایک بدعت ہے، اور بدعت کو

حدیث میں ضلالت کہا گیا ہے (مسند احمد، حدیث نمبر 17144)۔

اُسلوبِ کلام کے دو طریقے ہیں۔ ایک اصلاحی اُسلوب، اور دوسرا قانونی اُسلوب۔ دونوں کے تقاضے الگ الگ ہیں۔ اِس لیے دونوں کا انداز یکساں نہیں ہوسکتا۔

اصلاحی اُسلوب کا مقصد کسی شخص یا اشخاص کی اصلاح ہوتا ہے۔ اِس لیے حکمت کا تقاضا ہوتا ہے کہ سارا زور کمی والے پہلو پر دیا جائے، تاکہ آدمی کا ذہن اُس کو پکڑ سکے۔ اصلاحی اُسلوب میں اگر ”عیب مے جملہ بہ گفتی، ہنرش نیز بگو“ (تم نے تمام عیب بیان کردیے، اب اس کی خوبی بھی بیان کردو) کا طریقہ اختیار کیا جائے، تو کلام بے اثر ہو کر رہ جائے گا۔

مثلاً حضرت عائشہ سے ایک بار بتایا گیا کہ ابوہریرہ فلاں حدیث بیان کرتے ہیں۔ حضرت عائشہ نے کہا: كَذَبَ أَبُو هُرَيْرَةَ (ابوہریرہ نے جھوٹ کہا)۔ حضرت عائشہ نے یہ انداز اختیار نہیں کیا کہ — پہلے وہ حضرت ابوہریرہ کے تمام کارنامے بیان کریں اور اس کے بعد یہ کہیں کہ صرف ایک حدیث کے بیان میں ابوہریرہ سے غلطی ہوگئی ہے۔

اِس قسم کا ”متوازن“ طریقہ رسول نے یا اصحابِ رسول نے کبھی اختیار نہیں کیا۔ حقیقت یہ ہے کہ اِس قسم کا طریقہ متوازن طریقہ نہیں ہے، بلکہ وہ غیر مفید طریقہ ہے۔

واضح رہے کہ قانونی اُسلوب میں مختلف پہلوؤں کا احاطہ مقصود ہوتا ہے۔ لیکن اصلاحی اُسلوب یہ ہے کہ دوسرے تمام پہلوؤں کو چھوڑ کر صرف اُس پہلو کو بیان کیا جائے جو موقع کی نسبت سے مطلوب ہے۔ یہی اصلاح یا دعوت کا صحیح اُسلوب ہے، اور یہی وہ اُسلوب ہے جس سے حقیقی نتیجہ برآمد ہوتا ہے۔

سوال

میں دعوتی کام کرتا ہوں۔ مگر دعوتی کام کے دوران میں نے پایا ہے کہ کچھ لوگ لمبی لمبی بحثیں کرتے ہیں۔ میں اُن کو بہت زیادہ سمجھانے کی کوشش کرتا ہوں، مگر وہ مطمئن نہیں

ہوتے۔ ایسی حالت میں مجھ کو کیا کرنا چاہیے؟ (ایک قاری الرسالہ، حیدرآباد)

جواب

اصل یہ ہے کہ جب آپ ایک شخص سے براہ راست گفتگو کریں تو اس میں آپ اور دوسرا شخص دونوں آمنے سامنے ہوتے ہیں۔ اِس بنا پر ایسا ہوتا ہے کہ گفتگو کے دوران ایگو پرابلم (ego problem) پیدا ہوجاتا ہے۔

شعوری یا غیر شعوری طور پر یہ احساس جاگ اُٹھتا ہے کہ میں دوسرے کی بات کیوں مانوں۔ اگر میں نے دوسرے کی بات مانی تو میں اُس کے مقابلے میں چھوٹا ہو جاؤں گا۔ اِس لیے دعوت کا صحیح طریقہ یہ ہے کہ جب تک آپ دیکھیں کہ گفتگو سنجیدہ انداز میں ہو رہی ہے، تو آپ اپنی گفتگو جاری رکھیں، ورنہ آپ اُس کو مطالعے کے لیے کوئی کتاب پیش کر دیں۔ آدمی جب کتاب پڑھتا ہے، تو ایک طرف وہ خود ہوتا ہے اور دوسری طرف صرف ایک کتاب، نہ کہ اُس کے جیسا کوئی انسان۔

اِس لیے کتاب کے مطالعے میں ایگو پرابلم نہیں ہوتا۔ آدمی کھلے ذہن کے تحت پڑھتا ہے اور کھلے ذہن کے تحت اس کو سمجھنے کی کوشش کرتا ہے۔ اِس طریقے کا نام حکمتِ دعوت ہے، اور حکمت کے بغیر دعوت کا کام مؤثر طور پر نہیں ہوسکتا۔

سوال

میں آپ کے قول وفکر سے بہت متاثر رہا ہوں۔ یہ اس بنا پر کہ میں نے آپ کی تحریر کی ہوئی باتیں آپ کے ماہنامہ الرسالہ میں پڑھی ہیں۔ میں نے آپ کی بتائی ہوئی اچھی باتیں دوسروں تک پہنچانے کی کوشش کی ہے۔ لیکن میں نے پایا کے میرے اطراف کے لوگوں میں کچھ لوگ آپ کے بارے میں اچھی رائے نہیں رکھتے۔

جب میں نے ان سے وجہ دریافت کی تو وہ مجھے کوئی قابلِ قبول وجہ نہیں بتا سکے۔ یہ لوگ صرف سنی سنائی باتوں کا ذکر کرتے ہیں۔ میں ان سے کہتا رہا ہوں کہ وہ خود اپنا کوئی ذاتی تجربہ

یا مشاہدہ بتائیں تو وہ بتانے سے قاصر رہتے ہیں۔ اس طرح میں ان کو نظر انداز کر کے خاموشی سے تعمیری سوچ اور کام میں لگا ہوا ہوں۔ میرا ایک مشاہدہ آپ کے بارے میں ایسا ہوا ہے جو میری سمجھ سے غیر مناسب ہے اور آپ جیسی شخصیت سے بالکل مطابقت نہیں رکھتا۔

کل کے اخبار (*The Hindu*, Aug.7, 2009) سے معلوم ہوا کہ آپ نے اڈوانی صاحب کی لکھی ہوئی کتاب ''میرا وطن میری زندگی'' کے Release Function میں شامل ہیں۔ ایک طرح سے یہ اُس شخصیت کا endorsement ہے جس کی لکھی ہوئی یہ کتاب ہے۔ اس مصنف کی جو قدریں (values) ہیں، وہ اس کے قول اور اُس سے زیادہ اس کے عمل اور کردار سے ظاہر ہوتی ہیں۔ اس بارے میں زیادہ لکھنے کی ضرورت نہیں۔

میرا تجربہ ہے اور دانش مندوں کی کہاوت ہے کہ خود غرض اور ظالم کی دوستی فائدہ مند نہیں ہوتی، خواہ وہ ظالم آپ پر مہربان ہو۔ ایسے لوگوں کے دعوت نامہ کو قبول کرنے سے پہلے اچھی طرح غور کرنا چاہیے۔ اگر کسی وجہ سے ایسی دعوت قبول کرنا بھی پڑے تو ایسے موقع پر اپنی بات پوری وضاحت اور مضبوطی سے کہنا چاہیے۔ تاکہ negative values کا endorsment نہ ہونے پائے۔ آپ سے درخواست ہے کہ اس معاملہ میں آپ وضاحت کریں اور میری غلط فہمی دور کریں۔ (ایم اے صدیقی، کان پور)

جواب

اصل یہ ہے کہ کسی واقعہ کو دیکھنے کے دو زاویے (angles) ہوتے ہیں۔ ایک مثبت زاویہ اور دوسرا منفی زاویہ۔ ایک واقعہ مثبت زاویہ سے دیکھنے میں صحیح واقعہ نظر آئے گا۔ اسی واقعہ کو دوسرے زاویے سے دیکھا جائے تو وہ منفی واقعہ بن جائے گا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں صلح حدیبیہ پیش آیا۔ اس وقت ایک صحابی حضرت عمر فاروق نے منفی زاویہ سے دیکھا تو ان کو وہ پسپائی کا ایک واقعہ نظر آیا۔ انھوں نے کہا کہ لِمَ نعطِي الدَّنيّة في دِيننا (مسند احمد، حدیث نمبر 18928)۔ اس کے برعکس،

اللہ نے اس کو مثبت زاویہ سے دیکھا اور قرآن میں اعلان کیا کہ یہ فتح مبین ہے (48:1)۔ آپ کی غلط فہمی یہ ہے کہ آپ نے مذکورہ اجتماع میں میری شرکت کو دوستی کے زاویہ سے دیکھا اور اس کو صاحب کتاب کا endorsement سمجھ لیا۔

آپ کے لیے صحیح یہ تھا کہ آپ اس کو دعوت کے زاویہ سے دیکھتے تو آپ کو معلوم ہوتا کہ مذکورہ اجتماع میں میری شرکت ایک صحیح اور باعثِ ثواب معاملہ تھا۔ جو شخص بھی ماہ نامہ الرسالہ اور اس کا خبر نامہ باقاعدگی کے ساتھ پڑھے تو اس کو معلوم ہو گا کہ مذکورہ واقعہ کوئی استثنائی واقعہ نہ تھا، بلکہ وہ بہت سے واقعات میں سے صرف ایک واقعہ تھا۔

میں اور میرے ساتھی دعوت الی اللہ کا مشن چلا رہے ہیں۔ یہ مشن ایک مبنی بر لٹریچر مشن ہے۔ ہم مسلسل یہ کر رہے ہیں کہ انڈیا کے اندر اور انڈیا کے باہر ہونے والے اجتماعات میں شرکت کرتے ہیں۔ وہاں ہم لوگوں کے درمیان اسلامی لٹریچر تقسیم کرتے ہیں۔ اس مقصد کے لیے ہم ہر مذہب اور ہر گروہ اور ہر پارٹی کے اجتماعات میں جاتے ہیں۔ اگر ہم آپ کے بیان کردہ زاویے سے چیزوں کو دیکھیں تو ہم دعوت کے مواقع (opportunities) کو استعمال نہ کر سکیں گے اور اللہ تعالیٰ کے یہاں گناہ گار ثابت ہوں گے۔

ہمارا یہ طریقہ پیغمبر کے سنت کے عین مطابق ہے۔ حضرت یوسف نے قدیم مصر میں وہاں کے بادشاہ کے ایڈمنسٹریشن میں ایک ذمہ دارانہ عہدہ قبول کیا، حالاں کہ یہ بادشاہ ایک مشرک بادشاہ تھا۔ حضرت یوسف اگر اس معاملہ کو (شرک) کے زاویے سے دیکھتے، تو بادشاہ کے ایڈمنسٹریشن (administration) میں شرکت نہ کرتے۔ مگر آپ نے اس کو اپنے دعوتی مشن کی حیثیت سے دیکھا اور قبول کر لیا۔

اسی طرح پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم اپنی نبوت کے ابتدائی زمانہ میں 13 سال تک مکہ میں تھے۔ وہاں آپ کعبہ میں جاتے اور نماز ادا فرماتے اور لوگوں کو دعوت پہنچاتے، حالاں

کہ اس زمانے میں کعبہ کی عمارت میں کھلے طور پر 360 بت رکھے ہوئے تھے۔ اگر اس واقعہ کو منفی زاویہ سے دیکھا جائے تو وہ شرک کا انڈورسمینٹ نظر آئے گا۔ لیکن رسول اللہ نے اس کو دعوت کے زاویے سے دیکھا۔

آپ نے یہ فارمولا اختیار کیا کہ — بتوں کی موجودگی کو نظر انداز کرو اور وہاں موجود لوگوں میں اپنا پیغام پہنچاؤ۔

ہم نے اپنے دعوتی مشن میں اسی پیغمبرانہ طریقہ کو اختیار کیا ہے۔ ہم لوگوں کو دشمن اور دوست کے اعتبار سے نہیں دیکھتے۔ ہم ہر انسان کو صرف انسان کے روپ میں دیکھتے ہیں۔ ہر عورت اور ہر مرد کو ہم حق کا پیغام پہنچانا چاہتے ہیں۔

اس مقصد کے لیے ہم ہر اجتماعی موقع پر جاتے ہیں۔ ہمارے پاس قرآن کا ترجمہ اور دوسری اسلامی کتابیں ہوتی ہیں ان کو ہم ایک ایک شخص تک پہنچاتے ہیں۔ مذکورہ اجتماع میں پورے انڈیا کے تقریباً تمام ٹاپ کے کٹر ہندو لیڈر موجود تھے۔ ہمارے ساتھیوں نے بڑے پیمانے پر قرآن کا انگریزی ترجمہ اور دعوتی لٹریچر اُن لوگوں کو مطالعے کے لیے دیا۔

حقیقت یہ ہے کہ یہ معاملہ النَّاسُ أَعْدَاءُ مَا جَهِلُوا (لوگ اس کے دشمن ہوتے ہیں جس کو وہ نہیں جانتے) کی مثال ہے۔ جو لوگ دعوت کے فرض سے غافل ہیں، جو یہ نہیں سمجھتے کہ مسلمان کا دوسرے انسانوں سے تعلق داعی اور مدعو کا تعلق ہے، وہ اس معاملے میں غلط فہمی میں پڑ جاتے ہیں۔ وہ انسانوں کو دوست اور دشمن کی نظر سے دیکھتے ہیں۔ وہ کسی کو اپنا اور کسی کو غیر سمجھتے ہیں۔ وہ کسی سے محبت کرتے ہیں اور کسی سے نفرت۔ ایسے لوگ ایک داعی کی پوزیشن کو سمجھ نہیں پاتے۔ آپ کو چاہیے کہ آپ ہمارے بارے میں کسی انگریزی یا ہندی اخبار میں ایک خبر پڑھ کر رائے نہ بنائیں بلکہ خود ہماری تحریروں کو پڑھ کر ہمارے بارے میں رائے بنائیں۔ اگر آپ ایسا کریں تو آپ کو کبھی مذکورہ قسم کی غلط فہمی نہیں ہوگی۔

سوال

مولانا صاحب، میں نے آپ کی آن لائن کافی تقریریں سنی ہیں۔ لیکن میرا سوال یہ ہے کہ ہم کیا کریں، ہم اپنی اصلاح کا سفر کہاں سے شروع کریں۔ پاکستان کے حالات میں آپ ہماری اصلاح کے لیے کیا رہنمائی تجویز فرمائیں گے۔ (بشریٰ عامر، پاکستان)

جواب

سب سے پہلے آپ یہ کیجیے کہ اپنے اندر مکمل معنوں میں مثبت ذہن کی تعمیر کریں، ایک ایسا ذہن جو منفی سوچ سے پوری طرح خالی ہو۔

اِس کے بعد دوسرا کام یہ ہے کہ آپ افراد کی سطح پر دوسروں میں بھی مثبت سوچ والے انسان بنانے کی کوشش کریں، اور جب آپ کو ایسے کچھ ساتھی مل جائیں تو ہفتے وار اجتماع کی شکل میں اُن کو منظّم کرنے کی کوشش کریں۔

میرا مشورہ یہ ہے کہ آپ حقیقت پسند (realist) بنیں، رومانی تصورات میں جینے کی ہرگز کوشش نہ کریں۔ اس مقصد کے لیے ضروری ہے کہ آپ امت کے ماضی کی عظمت کے خول سے مکمل طور پر باہر آجائیں، ورنہ آپ کے لیے کبھی بھی اپنی اصلاح ممکن نہ ہوگی۔

سوال

کہا جاتا ہے کہ امریکا اور افغانستان کی جنگ میں امریکا ناکام ہوگیا اور افغانستان جیت گیا۔ وہ اس طرح کہ اگر دو فریقوں کی جنگ میں ایک فریق کے لیے جنگ منفی نتائج کا سبب ہوتی ہے تو اس کا واضح مطلب یہی ہے کہ دوسرے فریق کے لیے وہ جنگ یقینی طور پر مثبت نتائج کا سبب بن رہی ہے۔

یہ بات امریکی محکمہ خارجہ کے ایک اعلیٰ افسر کے اِس بیان کی روشنی میں کہی جاتی ہے کہ امریکا جو کچھ افغانستان میں کر رہا ہے، وہ سب اُس کے لیے الٹے نتیجوں کا ہی سبب بن رہا ہے۔

براہِ کرم، اِس معاملے کی وضاحت فرمائیں۔ (عبدالباسط عمری، قطر)

جواب

افغان جنگ کے بارے میں امریکی افسر نے جو بات کہی، وہ صرف ایک جنگی تبصرہ ہے، اِس سے وہ نتیجہ ہرگز نہیں نکلتا جو مذکورہ قسم کے لوگ اُس سے نکال رہے ہیں۔ کوئی بھی منفی تبصرہ، مثبت نتیجے کا سبب نہیں بن سکتا۔

امریکا نے جب عراق اور افغانستان پر ہوائی حملے کیے، تو اس کا مقصد اصلاً القاعدہ کا زور توڑنا تھا، اور اسامہ بن لادن کی ہلاکت (2011ء) کے بعد یہ مقصد ایک حد تک حاصل ہو چکا ہے۔ لیکن امریکی قائدین کو غالباً اِس کا اندازہ نہ تھا کہ اُن کے اقدام سے القاعدہ کی طاقت تو کمزور ہوسکتی ہے، لیکن اس اقدام کے ردعمل میں امریکا کے خلاف مسلمانوں میں جو نفرت پیدا ہوگی، اس کا کوئی توڑ ممکن نہ ہوگا۔

امریکی افسر نے جو کچھ کہا وہ صرف امریکی قائدین کے غلط اندازے کو بتاتا ہے۔ اُس سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ اِس جنگ میں افغانستان کی جیت ہوئی ہے، واقعات بتاتے ہیں کہ افغانستان کی اقتصادی طاقت بالکل تباہ ہوگئی ہے۔ افغانستان کی تعمیر وترقی کا کام بالکل رکا ہوا ہے۔ مزید یہ کہ افغانی لوگوں میں آپس کی جنگ چھڑ گئی ہے۔ یہ واقعات افغانستان کی تباہی کو بتاتے ہیں، نہ کہ اس کی جیت یا کامیابی کو۔ اِس معاملے میں جہاں تک اسلامی نقطۂ نظر کا تعلق ہے، اسلام میں وہی اقدام مثبت اقدام ہے جو مثبت نتیجہ برآمد کرنے والا ہو۔ فریقِ ثانی کے نقصان پر خوش ہونا اسلام کا طریقہ نہیں۔

اسلامی نقطۂ نظر کے مطابق، قابلِ لحاظ بات یہ نہیں ہے کہ اِس جنگ میں امریکا کو کچھ نقصان پہنچا، اصل قابلِ لحاظ بات یہ ہے کہ افغانستان بدستور پچھڑا ہوا ایک ملک ہے، وہ تعمیر وترقی کے راستے میں آگے نہ بڑھ سکا۔ یہی وجہ ہے کہ لوگ اب بھی بدستور اپنے بیٹوں کو امریکا بھیج رہے ہیں، کوئی بھی شخص اپنے بیٹوں کو افغانستان بھیجنے کے لیے تیار نہیں۔

سوال

آپ نے کشمیر کی نسبت سے کافی لکھا ہے۔ یہ کشمیریوں کے ساتھ آپ کی خیرخواہی کی دلیل ہے۔ آپ نے "کشمیر میں امن" (*Peace in Kashmir*) اور "صبحِ کشمیر" (*The Dawn over Kashmir*) نام کی کتابوں کو تحریر کر کے کشمیریوں کو صحیح رہنمائی دی ہے۔ ایک اگر historical document ہے تو دوسری ideological document ہے۔ دونوں تحریروں میں تاریخ اور مذہب کی حقیقی تصویر پیش کی گئی ہے۔

میں کشمیر کے gun culture میں جوان ہوا، لہٰذا میں کشمیر کے صوفی کلچر سے عملاً بے خبر ہوں۔ البتہ میرے والد بتاتے ہیں کہ "میں جب اپنے بچپن کو یاد کرتا ہوں تو کشمیر کی موجودہ صورت حال مجھے ایک خواب نظر آتی ہے۔ جب گاؤں میں ہمارا کوئی مہمان آتا تھا تو اس کی تواضع کے لیے ہم مرغ ذبح کرتے تھے، لیکن مرغ ذبح کرنے کے لیے ہمیں مشکل ہی سے کوئی آدمی ملتا تھا۔ اکثر لوگوں کے پاس چاقو تک نہ ہوتا تھا۔ لوگ جانور کو مارنے سے کتراتے تھے، کسی انسان کو تکلیف دینے کو تو کوئی سوچ بھی نہیں سکتا تھا"۔

ایک روز میں نے کیڑے مار دوا چھڑکی۔ صبح کو میرے والد نے مجھے بلایا۔ مرے ہوئے کیڑے مکوڑوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا — یہ قتل ہے۔

میں اِس رحم دلی کے مزاج کو یاد کر کے آج روتا ہوں۔ یہ ایک شخص کی کہانی نہیں، بلکہ یہی کشمیریوں کی فطرت تھی جس کو عرف عام میں ہم "کشمیریت" سے یاد کرتے ہیں۔

جہاں تک میں نے آپ کے لٹریچر کا مطالعہ کیا ہے، کشمیر کی نسبت سے آپ کا مشن کشمیر کو دوبارہ اپنی فطری حالت پر لانا ہے، تا کہ ہم دنیا کو امن وسلامتی (اسلام) کا پیغام دے سکیں۔ برائے مہربانی مزید رہنمائی سے نوازیں۔ (انجینئر سید عابد حسین، بڈگام، کشمیر)

جواب

کشمیر کا مسئلہ ہو یا اس قسم کے دوسرے مسائل، ہر ایک کا سبب صرف ایک ہے، وہ یہ کہ لوگ محدود طور پر صرف اُس مسئلے کو لے کر سوچتے ہیں جس سے وہ عملاً دو چار ہیں۔ وہ اُن مسائل سے اوپر اٹھ کر سوچ نہیں پاتے۔ یہ اوپر اٹھ کر سوچنا۔ وہی چیز ہے جس کو قرآن میں خلقِ عظیم (68:4) کہا گیا ہے۔ خلق عظیم کا لفظی مطلب ہے برتر کردار، لیکن برتر کردار برتر آئڈیالوجی سے پیدا ہوتا ہے۔ برتر آئڈیالوجی نہیں تو برتر کردار بھی نہیں۔

مومن کے لیے برتر آئڈیالوجی صرف ایک ہے اور وہ یہ ہے کہ آدمی دوسری چیزوں کو لے کر سوچنے کے بجائے اللہ رب العالمین کو لے کر سوچے۔ اس کے اندر خدا رخی سوچ (God oriented thinking) آجائے۔ موجودہ زمانے کے مسلمانوں کا اصل مسئلہ یہ ہے کہ ان کے اندر خدا رخی سوچ نہیں، وہ صرف اپنے معاشی اور سیاسی مسائل کو جانتے ہیں۔

ان کی موجودہ سوچ اسی بنیاد پر بنی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ موجودہ زمانے کے مسلمان اللہ کی نصرت سے محروم ہو گئے ہیں۔ ان کے پاس صرف شکایت کی زبان ہے، ان کے پاس شکر کی زبان نہیں۔

موجودہ زمانے میں عالمی سطح پر مسلمانوں کے دو بڑے مسئلے ہیں: کشمیر کا مسئلہ اور فلسطین کا مسئلہ۔ غیر معمولی قربانیوں کے باوجود یہ دونوں مسئلے عملاً لاینحل مسئلے بنے ہوئے ہیں۔ اِن دونوں مسائل کا حل اگر موجودہ قسم کی کوششوں سے ممکن ہوتا تو اب تک وہ ہو چکا ہوتا۔ لیکن 60 سال سے زیادہ مدت کی غیر معمولی کوششوں کے باوجود یہ دونوں مسئلے کسی بھی درجے میں حل نہیں ہوئے۔

ایسی حالت میں کشمیریوں اور عربوں دونوں کو چاہیے کہ وہ اپنی سوچ کو بدلیں۔ اس کے سوا، ہر دوسری تدبیر صرف نقصان میں اضافہ کرے گی، وہ کوئی مثبت نتیجہ پیدا کرنے والی نہیں۔

کشمیر کے مسلمان اب تک دو چیزوں کو اپنا نشانہ بنائے ہوئے تھے، آزاد کشمیر یا پاکستانی کشمیر۔ مگر یہ دونوں نشانے قومی سوچ پر بنے ہیں، نہ کہ خدائی سوچ پر۔ صحیح یہ ہے کہ کشمیر کے مسلمان اپنی سوچ پر نظر ثانی کریں اور یہ کہیں کہ ہمارا نشانہ نہ آزاد کشمیر ہے اور نہ پاکستانی کشمیر، ہمارا نشانہ صرف خدائی کشمیر (divine Kashmir) ہے۔ خدائی کشمیر کو اپنا نشانہ بنانے کا مطلب ہے، خدا والی سوچ کے تحت اپنے عمل کا نقشہ بنانا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت مکہ میں ہوئی تو آپ نے وہاں یہ اشو نہیں کھڑا کیا کہ مکہ سیاسی طور پر کس کے قبضے میں ہو۔ اس کے برعکس، آپ نے یہ کیا کہ صورتِ موجودہ (status quo) کو تسلیم کرتے ہوئے دعوت الی اللہ کا کام شروع کر دیا۔

کشمیریوں کو بھی اِسی نہج پر کام کرنا ہے۔ کشمیریوں کو یہ کرنا ہے کہ جموں وکشمیر میں جو سیاسی اسٹیٹس کو (political status quo) بن گیا ہے وہ اُس سے ٹکراؤ نہ کریں بلکہ اس کو تسلیم کرتے ہوئے وہ اپنی ساری کوشش پُرامن دعوت الی اللہ کے کام میں لگا دیں۔

یہی وہ سنت ہے جو عربوں کو فلسطین میں اختیار کرنا ہے۔ فلسطین میں عربوں کے کرنے کا واحد کام یہ ہے کہ وہ اسرائیل کے خلاف اپنی متشددانہ تحریک کو مکمل طور پر ختم کر دیں۔ وہ یک طرفہ طور پر ٹکراؤ کی پالیسی کو چھوڑ دیں اور اپنی ساری طاقت پرامن دعوت میں لگا دیں۔ فلسطین میں دعوت الی اللہ کے عظیم مواقع ہیں، اسرائیل کے درمیان بھی اور سیاحوں (tourists) کے درمیان بھی، جو دنیا بھر سے بکثرت روزانہ فلسطین کے علاقے میں آتے ہیں۔

دعوت الی اللہ کا کام اہلِ ایمان کا اصل مشن ہے۔ اسی مشن کی ادائیگی پر اُن کو اللہ کی نصرتیں حاصل ہوں گی۔ موجودہ زمانے کے مسلمان جن چیزوں کو اپنا مسئلہ سمجھتے ہیں، اُس

مسئلے کا حل اللہ کی نصرت کے ذریعے ممکن ہے، نہ کہ محض ذاتی کوشش کے ذریعے، اور اللہ کی نصرت صرف اُن لوگوں کو ملتی ہے جو دعوت الی اللہ کا کام کریں۔ یہی وہ حقیقت ہے جس کو قرآن کی اِس آیت میں بتایا گیا ہے: وَلَيَنصُرَنَّ اللّٰهُ مَن يَّنصُرُه (22:40)۔ یعنی، اور اللہ ضرور اس کی مدد کرے گا جو اللہ کی مدد کرے۔

سوال

میں ایک طالب علم ہوں اور جدید تعلیم حاصل کررہا ہوں لیکن اِسی کے ساتھ دینی معلومات بھی حاصل کرنا چاہتا ہوں۔ ڈیڑھ سال پہلے میں نے آپ کا نام سنا تھا لیکن جن کے ذریعے آپ کا تعارف ہوا انہوں نے آپ کا کوئی مثبت ذکر نہیں کیا بلکہ دلخراش واقعات سنائے جو کہ میرے لیے باعث تشویش رہے کہ کیا دین اسلام کا داعی اس قسم کی باتیں کہہ سکتا ہے، کیا ایسا ممکن ہے؟

آپ کے حقیقی تعارف کے بغیر میں ہر وقت کشمکش و پیچ میں رہتا تھا۔ پھر میں نے فیصلہ کیا کہ ان باتوں کی حقیقت کو جاننے کے لیے از خود آپ کی کتابوں کا مطالعہ کروں۔ آخر کار اپنے ایک عزیز کی وساطت سے میں نے آپ کی ایک کتاب ”کاروانِ ملت“ خریدی۔ کتاب مذکور میں ان سب سوالوں کا جواب تھا جس کی وجہ سے میں پریشان ہو چکا تھا۔ وہ منفی تاثرات جو آپ کے متعلق مجھے بتائے گئے تھے، وہ سب گمراہ کن لگے۔ بعد میں آپ کی کتابوں کا مطالعہ میرے روزمرہ کے شیڈول کا ایک جزء بن گیا۔ میں نے جن کتابوں کا مطالعہ کیا ان میں یہ کتابیں قابلِ ذکر ہیں: کتابِ معرفت، عظمتِ اسلام، تعمیر انسانیت، دعوتِ اسلام The Quran for all Humanity, Creation plan of God، وغیرہ۔

اب میں اس خدا کا شکر کرتا ہوں جس کے دست قدرت میں میری جان ہے کہ میرے خدا

کی طرف سے یہ سب ممکن ہوا کہ میں روحِ دین کو سمجھنے کی کوشش کروں۔ اِس ”عُسر“ کے دور میں ”یُسر“ کا ایک موقع مجھے ضرور ملا جس کو میں نے استعمال کیا۔ آپ کی کچھ باتیں جن کی وجہ سے میری زندگی میں بدلاؤ آیا، وہ مفہوم میں کچھ اس طرح ہیں:

○ غیر مسلم ہمارے دشمن یا حریف نہیں بلکہ وہ ہمارے لیے مدعو کی حیثیت رکھتے ہیں۔ لہٰذا ہمیں ان سے داعی اور مدعو کا رشتہ قائم کرنا ہوگا۔

○ یک طرفہ طور پر دکھ درد کو برداشت کر کے ہی ہم اسلام کا پیغامِ امن ان تک پہنچا سکتے ہیں۔

○ دینِ سلامتی کو دینِ قتل نہ بنائیں۔ دینِ امن کو دینِ جنگ وجدال نہ بنائیں۔

○ گمراہ کن نعروں سے مسلمانانِ دنیا کے جان، مال اور آبرو کو مباح نہ بنائیں۔

○ دعوت کے لیے ہر قربانی دینے کے لیے تیار رہنا، وغیرہ وغیرہ۔

ان جیسی اہم باتوں نے مجھے آپ کی فکر کو اختیار کرنے پر مجبور کر دیا۔ اِس دوران میرے ذہن میں بہت سے اشکالات رہے جن کے جوابات جاننا میرے لیے ضروری ہو گیا۔

امید ہے کہ آپ اپنی حددرجہ مشغولیت کے باوجود ذیل کی باتوں میں میری رہنمائی فرمائیں گے:

1۔ اسلامی حکومت کے قیام کے لیے کیا لائحہ عمل اپنانا ہوگا؟

2۔ قرونِ اول میں جو فتوحات ہوئیں، مثلاً مصر، روم، ایران وغیرہ، ان کو دفاعی جنگ (defensive war) کہنا کیسے ممکن ہے؟

3۔ ”نہی عن المنکر“ غیر اسلامی حکومت کے اندر کیسے کیا جائے؟

4۔ دفاعی طریقہ کار سے کیا آج کے دور میں ہم کسی ملک کو زیر کر سکتے ہیں؟

(احمد وانی، کشمیر)

جواب

کسی کے بارے میں رائے قائم کرنا، ایک بے حد سنگین بات ہے۔ آدمی کو چاہیے کہ وہ متعلق شخص کے بارے میں براہ راست معلومات حاصل کرے، اور پھر معلومات کے مطابق وہ اپنی رائے بنائے۔ اگر کوئی شخص یہ کہے کہ میرے پاس اتنا وقت نہیں تو اس کو یہ جواب دیا جائے گا کہ پھر آپ کے اوپر فرض ہے کہ آپ ایسے شخص کے بارے میں کوئی رائے نہ بنائیں، بلکہ خاموشی کا طریقہ اختیار کریں۔

آدمی کے اوپر یہ فرض نہیں ہے کہ وہ ہر شخص کے بارے میں ضرور کوئی رائے بنائے۔ لیکن اگر اس کو کسی شخص کے بارے میں اپنے رائے کا اظہار کرنا ہے تو اس پر فرض ہو جاتا ہے کہ پہلے وہ براہِ راست طور پوری معلومات حاصل کرے، اور اس کے بعد متعلق شخص کے بارے میں اپنی رائے قائم کرے۔ جہاں تک مذکورہ سوالات کا تعلق ہے۔ یہ سوالات ہماری کتابوں میں زیرِ بحث آ چکے ہیں۔ آپ نے مطالعے کا جو سلسلہ شروع کیا ہے، اس کو جاری رکھیے، ان شاء اللہ آپ کو تشفی حاصل ہو جائے گی۔

سوال

2015ء سے میں ماہ نامہ الرسالہ کا قاری ہوں۔ آپ کی کتابیں بالخصوص پیغمبر انقلاب، غیر ملکی اسفار، وغیرہ کا مطالعہ کر چکا ہوں۔ پوسٹ گریجویشن میں تاریخ خصوصی مضمون ہے۔ ایم اے کے دوران آپ کے مضمون تاریخِ انسانی کے مطالعے سے تاریخ کے متعلق مستفید ہوا۔ عالمی منظر نامے سے واقفیت رکھنے کے لیے Indian Express پڑھتا ہوں۔

انسانی تاریخ کے مختلف مراحل کو ذہن میں رکھ کر اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ آپ کا مشن صلح

حدیبیہ پر اتفاق، صبر وضبط کا فارمولا ہی انسانی زندگی اوراس کی بقاء اور ارتقاء کے لیے لازم ہیں۔ اس دورِ انسانی میں، جس میں ہم جی رہے ہیں، آپ حالات کی سنگینی سے زیادہ واقف ہیں۔ ایسے وقت میں جب کہ لوگ اسلام کے نام پر، اسلام کواس طرح پیش کرر ہے ہیں جو اسلام کی تعلیمات کے منافی ہیں، صلح حدیبیہ ماڈل کو سامنے رکھ کر مسلمانوں کو کیا کرنا چاہیے۔ صبر وضبط اپنی جگہ، ان کی غلط فہمی رفع کرنے کے لیے کس راستے کا انتخاب کیا جائے ؟ (محمد اسماعیل اشفاق احمد، مسلم پورہ، مالیگاؤں)

جواب

ہمارا لٹریچر پورا کا پورا اِسی سوال کا جواب ہے۔ آپ نے ابھی صرف چند کتابیں پڑھی ہیں، اس لیے آپ کو یہ شک پیدا ہوا۔ اگر آپ تمام کتابیں پڑھیں، اور اسی کے ساتھ ہمارا ماہ نامہ الرسالہ (اردو) اور اسپرٹ آف اسلام (انگریزی) کا مطالعہ جاری رکھیں تو آپ کے تمام سوالات رفع ہو جائیں گے، ان شاء اللہ۔ اصل یہ ہے کہ عام طور پر لوگ وقتی مسائل میں الجھے رہتے ہیں۔ لوگوں کا یہی مزاج ہے جو لوگوں کے اندر ردّ عمل (reaction) کی نفسیات پیدا کرتا ہے۔

ردّعمل کی نفسیات مزید بڑھ کر نفرت کی نفسیات بن جاتی ہے۔ اور نفرت کی نفسیات آخر کار لوگوں کو تشدد تک پہنچا دیتی ہے۔ لوگوں کا حال یہ ہو جاتا ہے کہ اگر وہ فعال تشدد (active violence) میں مبتلا نہ ہوں تب بھی وہ منفعل تشدد (passive violence) کا شکار ہو کر رہ جاتے ہیں۔ اس نفسیات کا سب سے زیادہ برا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ لوگ مثبت سوچ سے محروم ہو جاتے ہیں۔ حالاں کہ مثبت سوچ ہی تمام ترقیات کا اصل زینہ ہے۔

سوال

یہاں ہمارے ساتھی اِس بات سے منفی (negative) ہو رہے ہیں کہ وہ دعوتی کام کرتے ہیں، لیکن لوگ تبدیل نہیں ہوتے ہیں۔ اِس کا حل کیا ہو، اور اپنے دعوتی ساتھیوں کو کیسے سمجھایا جائے؟ (طارق بدر، پاکستان)

جواب

جو لوگ دعوت کے معاملے میں اس طرح کی منفی بات کہتے ہیں، اُن کو قرآن کا مطالعہ کرنا چاہیے۔ قرآن میں نبیوں کا تذکرہ ہے۔ انبیاء وہ لوگ ہیں، جو دعوت کے معیاری ماڈل تھے۔ انہوں نے جب لوگوں کے سامنے دعوت پیش کی تو اکثریت نے منفی ردّعمل کا اظہار کیا۔ چنانچہ قرآن میں اس تجربے کو ان الفاظ میں بیان کیا گیا ہے: يٰحَسْرَةً عَلَى الْعِبَادِ ۚ مَا يَأْتِيهِمْ مِّنْ رَّسُولٍ إِلَّا كَانُوا بِهِ يَسْتَهْزِءُونَ (36:30)۔ یعنی، افسوس ہے بندوں کے اوپر، جو رسول بھی اُن کے پاس آیا، وہ اُس کا مذاق ہی اڑاتے رہے۔ اِس آیت کا مطلب یہ ہے کہ دعوت کے مقابلے میں منفی ردّعمل کے باوجود انبیاء اپنا دعوتی کام کرتے رہے۔ انہوں نے لوگوں کی شکایت نہیں کی، اور نہ اپنا دعوتی کام چھوڑا۔

اِس کا سبب یہ تھا کہ انبیاء جو دعوتی کام کرتے تھے، وہ مدعو کے لیے نہیں کرتے تھے، بلکہ اللہ کے لیے کرتے تھے۔ ہمارا عقیدہ ہے کہ انبیاء دعوت کے کام میں ماڈل کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اِس لیے جو لوگ دعوت کا کام کریں، اُن کو چاہیے کہ وہ ہمیشہ اِس ماڈل کو اپنے سامنے رکھیں۔ مثلاً پیغمبر اسلام آخری پیغمبر ہیں۔ آپ کی مثال بتاتی ہے کہ دعوت کا ایک اصول — ری پلاننگ ہے۔ مکی دور کا طریقہ مؤثر نہیں ہوا، تو آپ نے دعوت کا دوسرا منصوبہ بنایا، اور یہ دوسرا منصوبہ اتنا زیادہ کامیاب ہوا کہ پوری قوم نے اُن کی دعوت کو قبول کرلیا۔

اِس نمونے سے معلوم ہوتا ہے کہ دعوت کا ایک اصول ری پلاننگ ہے۔ اگر ایک طریقہ (method) مؤثر نہ ہو، تو داعی کو چاہیے کہ وہ دوسرے طریقہ کا تجربہ کرے۔ عین ممکن ہے کہ دوسرا طریقہ اللہ کی مدد سے کامیاب ثابت ہو۔

خاتمہ

تعمیر شخصیت کا راز

ہر انسان کامیابی چاہتا ہے، مگر قرآن میں بتایا گیا ہے کہ کامیابی کا حصول درست طریقے سے ہونا چاہیے، نہ کہ غلط طریقے سے۔ اس سلسلے میں قرآن کا ایک حکم ان الفاظ میں آیا ہے: یَاأَیُّهَا النَّاسُ کُلُوا مِمَّا فِی الْأَرْضِ حَلَالًا طَیِّبًا وَلَا تَتَّبِعُوا خُطُوَاتِ الشَّیْطَانِ إِنَّهُ لَکُمْ عَدُوٌّ مُبِینٌ (2:168)۔ یعنی، اے لوگو! زمین کی چیزوں میں سے حلال اور پاکیزہ چیزیں کھاؤ اور شیطان کی پیروی مت کرو، بیشک وہ تمہارا کھلا ہوا دشمن ہے۔

قرآن کی اس آیت میں بتایا گیا ہے کہ انسان کو چاہیے کہ وہ رزق کے معاملے میں حلال کا طریقہ اختیار کرے۔ یہاں یہ الفاظ محدود طور پر صرف کھانے پینے کے بارے میں نہیں ہے، بلکہ پوری زندگی کے بارے میں ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ انسان آزاد ہے کہ وہ اپنے لیے کامیابی حاصل کرے، لیکن انسان کو طریقہ (method) کے معاملے میں آزادی نہیں ہے۔ انسان پر لازم ہے کہ وہ خدا کے مقرر کیے ہوئے صرف حلال اور طیب طریقے کو اختیار کرے۔ اللہ کا حلال اور طیب طریقہ ہے، صبر اور شکر کا طریقہ، جس میں منفی سوچ نہ ہو، اشتعال انگیزی نہ ہو، دوسروں کے ساتھ رواداری کا معاملہ کیا جائے۔ اس کے برعکس، وہ ایسے طریقے کو اختیار نہ کرے جو اللہ کے قائم کردہ حدود کے مطابق غیر حلال اور غیر طیب حیثیت رکھتا ہو۔ یعنی بے صبری کا طریقہ۔

مثلاً دوسروں پر ظلم کرکے کامیابی حاصل کرنا، استحصال (exploitation) کا طریقہ اختیار کرکے اپنے کو کامیاب بنانا، جو چیز دوسرے کا حق ہو، اس کو غلط طریقہ اختیار کرکے اپنا بنانا، وغیرہ۔ حلال طریقے کا مطلب کوئی پراسرار طریقہ نہیں ہے۔ حلال طریقے کا مطلب یہ ہے کہ آدمی خدا کی اسکیم آف تھنگس (scheme of things) کو سمجھے، اور اس سے مطابقت کرتے ہوئے زندگی گزارے۔ جو شخص یا قوم خدا کی اسکیم آف تھنگس سے مطابقت کرے گا،

وہ کامیاب ہوگا، اور جو اس سے مطابقت نہیں کرے گا، وہ ناکام ہو کر رہے گا۔ اس معاملے میں انسان کا اصل کام یہ ہے کہ وہ خالق کی اسکیم آف تھنگس کو جانے، اور اس کی کامل مطابقت کرتے ہوئے اپنی زندگی کا منصوبہ بنائے۔

کامیابی کے دس اصول

امریکا میں چھپی ہوئی ایک کتاب نظر سے گزری۔ یہ کتاب ایک کامیاب امریکی تاجر کی لکھی ہوئی ہے۔ اس نے یہ کتاب اپنے 20 سالہ تجارتی تجربات کی روشنی میں تیار کی ہے۔ اس خوبصورت کتاب میں ہر صفحہ پر دو تجارتی اصول جلی حرفوں میں درج ہیں۔ مصنف کا کہنا ہے کہ ٹاپ پرفارمرس نے ہمیشہ مثبت عادات (positive habits) کے ذریعہ ترقی کی ہے:

The Book of Excellence by Byrd Baggett.
236 habits of effective salespeople

ان مثبت عادتوں کو مصنف نے 236 چھوٹے چھوٹے جملوں میں مرتب کیا ہے۔ کتاب کو پڑھ کر میں نے دس جملے منتخب کیے ہیں جو کہ حسب ذیل ہیں:

A bad attitude cancels all other positive skills.

ایک برا رویہ تمام دوسری خوبیوں پر پانی پھیر دیتا ہے۔

Be as critical of yourself as you are of others.

اپنے بارے میں بھی اتنا ہی تنقیدی بنو جتنا تم دوسروں کے لیے تنقیدی ہو۔

You are not learning anything when you are talking.

جب تم بولتے ہو تو تم کچھ سیکھ نہیں رہے ہو۔

Excellence is not optional.

امتیاز کوئی اختیاری چیز نہیں۔

Take an active, not passive, role in helping your community.

اپنی کمیونٹی کی مدد کرنے میں فعال کردار ادا کرو۔

Customers love humility.

گاہک ہمیشہ تواضع کو پسند کرتے ہیں۔

Patience is a virtue. Don't give up.

برداشت ایک نیکی ہے، اس کو کبھی نہ چھوڑو۔

There is no replacement for effort.

کوشش کا کوئی بدل نہیں۔

Success does not come easily. Are you willing to pay the price?

کامیابی آسانی سے نہیں آتی، کیا تم اس کی قیمت ادا کرنے کے لیے تیار ہو۔

Stop, listen, and think before you respond.

ٹھہرو، سنو، اور جواب دینے سے پہلے غور کرو۔

یہ اقوال اس فطری حکمت کو بیان کرتے ہیں، جن کو اختیار کر کے کوئی شخص دنیا میں اپنی کامیابی کو یقینی بنا سکتا ہے۔ یہ اقوال کامیابی کی کنجی ہیں۔

back cover text

موجودہ دنیا میں جو انسان پیدا ہوتا ہے، وہ گویا نرسری کا ایک پودا ہے۔ ایک محدود مدت تک وہ اِس دنیا میں رہتا ہے۔ اِس دوران اُس کے ساتھ مختلف قسم کے حالات گزرتے ہیں۔ یہ گویا اُس کے لیے تربیتی کورس ہیں جو اس کو موقع دیتے ہیں کہ وہ اپنے اندر مطلوب شخصیت تعمیر کرے۔ یعنی صبر، شکر، اعراض اور مثبت سوچ جیسی صفات پیدا کرے۔ موت اِس تربیتی کورس کے خاتمے کا اعلان ہے۔ جو انسان اِس ملی ہوئی مدت کے دوران اپنے اندر مطلوب شخصیت کی تعمیر کرلے، اس کو ایک ابدی دنیا (جنت) میں بسا دیا جاتا ہے۔ اور جو لوگ اپنے اندر مطلوب شخصیت کی تعمیر نہ کرسکیں، اُن کے لیے ابدی محرومی مقدر ہے۔

back cover text

موجودہ دنیا میں جو انسان پیدا ہوتا ہے، وہ گویا نرسری کا ایک پودا ہے۔ ایک محدود مدت تک وہ اِس دنیا میں رہتا ہے۔ اِس دوران اُس کے ساتھ مختلف قسم کے حالات گزرتے ہیں۔ یہ گویا اُس کے لیے تربیتی کورس ہیں جو اس کو موقع دیتے ہیں کہ وہ اپنے اندر مطلوب شخصیت تعمیر کرے۔ یعنی صبر، شکر، اعراض اور مثبت سوچ جیسی صفات پیدا کرے۔ موت اِس تربیتی کورس کے خاتمے کا اعلان ہے۔ جو انسان اِس ملی ہوئی مدت کے دوران اپنے اندر مطلوب شخصیت کی تعمیر کرلے، اس کو ایک ابدی دنیا (جنت) میں بسا دیا جاتا ہے۔ اور جو لوگ اپنے اندر مطلوب شخصیت کی تعمیر نہ کرسکیں، اُن کے لیے ابدی محرومی مقدر ہے۔